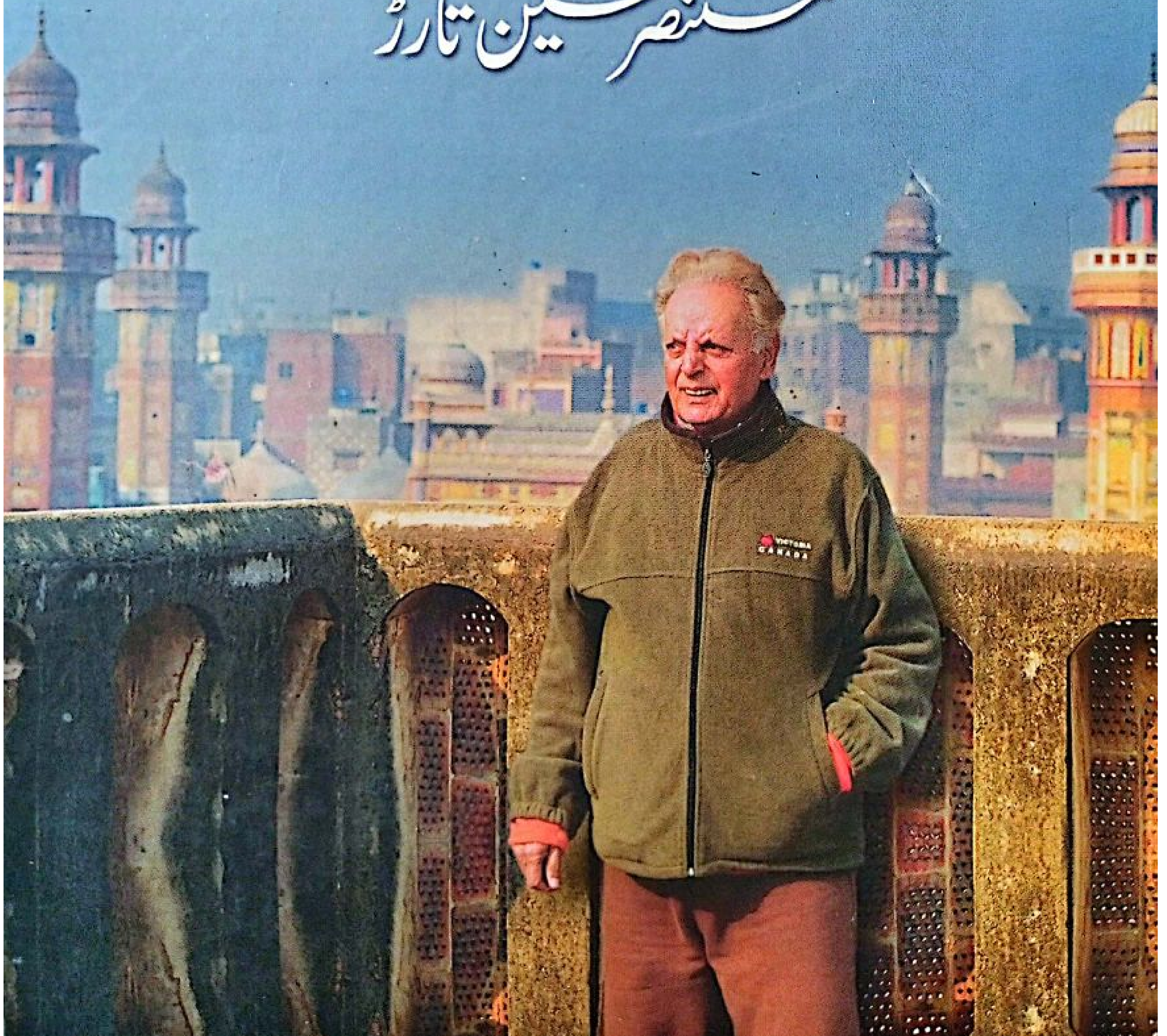
"لاہور آوارگی"

(سفرنامہ)

مُستنصر حسین تارڑ





فہرست

''رُوپ شہر لاہور کے''

ابتدائیہ

اس گیلری کی دیواروں پر میں نے جتنی تصویریں آویزاں کی ہیں وہ سراسر حقیقت کی ہو بہو نقاشی نہیں کرتیں.. وہ ریمبرانت، رافیل، ڈی ونچی، مائیکل انجلو گویا، کانسٹیبل، سعید اختر یا خالد اقبال کی کلاسیک انداز کے پورٹریٹ شاہکار نہیں، کہ اُنہیں یکدم دیکھ کر دل رُک جائے، اتنی کاملیت اور رنگوں کے قدرتی پن میں ایک ایسا حیات بخش نکھار کہ آپ منتظر ہو جائیں کہ یہ پورٹریٹ ابھی سانس لینے لگے گی..

منتظر کب سے تحیّر ہے تری تقریر کا
بات کر تجھ پر گماں ہونے لگا تصویر کا

بلکہ اس پکچر گیلری کی تصویریں حقیقت، خوابناک سراب اور تاثر کے دھاگوں کے بجھے بجھے اگرچہ ازحد شوخ رنگوں کے امتزاج سے پینٹ کی گئی ہیں... میں وہ جولاہا ہوں جو اپنی کھڈی پر بیٹھا رنگ رنگ کے مختلف دھاگوں سے لاہور کی تصویر کا ایک ایسا کھیس بُن رہا ہوں جس کے نقش اور آرائشیں واضح نہیں ہیں، یوں جانئے کہ آپ سر شام اپنے صحن میں ایک تصویر پینٹ کرتے ہیں اور اُس کی نگہداشت کرنا بُھول جاتے ہیں، کینوس کُھلی فضا میں پڑا رہ جاتا ہے اور اگلی تصویر اوس کی نمی سے اُس تصویر کے رنگ بھیگ کر اِک دوجے میں یُوں سرایت کر چکے ہوتے ہیں کہ اُس کے نقش پہچانے تو جاتے ہیں لیکن اُن کی الگ الگ شناخت ایک خواب کی صورت کینوس پر نمایاں ہوتی ہے.. سب تو نہیں کُچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو جاتے ہیں.. مختصر یہ کہ وہ امپریشنٹ پینٹرز کی تصویروں کی مانند حقیقت کی عکاسی ہو بہو نہیں کرتے اُن میں مصّور کے تصور اور خوابوں کی آمیزش کرتے ہیں.. چنانچہ لاہور کی پکچر گیلری میں آویزاں بیشتر تصویروں میں اینوئر، مانے، مونے، لاٹرک، پکاسو اور خاص طور پر فان گوگ کی جھلکیاں جھلکتی جائیں گی یعنی فان گوگ کی ''تاروں بھری رات'' میں تاریک آسمان پر جو بڑے بڑے سورج نما ستارے گردش میں ہیں، ستارے ایسے تو نہیں ہوتے، لیکن فان گوگ کے ذہنی جنون کی شب میں ایسے ہی اور اتنے ہی بڑے بڑے ستارے جنم لیتے تھے، اب یہ فیصلہ کون کرے کہ حقیقت میں جو ستارے ہمیں دکھائی دیتے ہیں وہی اصل ہیں یا جو ستارے فان گوگ دیکھتا تھا، خالق کائنات نے حقیقت میں اتنے ہی بڑے سورج نما ستارے تخلیق کیے تھے جنہیں ہماری آنکھ دیکھنے سے قاصر ہے، صرف

فان گوگ نے اُنہیں ایک شب دیکھا اور اپنے کینوس پر اُتار کر ہمارے لیے حیرتوں کے ساماں کر دیئے..

بلاشبہ مُنشی کنہیا لال کی ''تاریخ لاہور'' اِک حرفِ آخر ہے..اس شہر کی قدیم عمارتوں، مندروں، مسجدوں، گلی کُوچوں، پیروں فقیروں، شاعروں اور مجذوبوں کی جو تاریخ اُس نے بیان کر دی ہم سب جو لاہور کے بارے میں کچھ بھی لکھنے بیٹھتے ہیں تو منشی کنہیا لال ہماری راہنمائی کرتا ہے..جج عبداللطیف نے بھی لاہوری ہونے کا حق ادا کر دیا..اُن کے پوتے کسی زمانے میں میرے دوست ہوا کرتے تھے...طاہر لاہوری، اے حمید، یونس ادیب کے لاہوری تذکرے بے مثال تاریخ میں منتقل ہو چکے.. پران نول نے بھی اپنے آبائی شہر کے عشق کی اداسی میں جو لکھا پُرتاثیر لکھا... ماضی میں رڈیارڈ کپلنگ نے بادشاہی مسجد کے ایک مینار میں بیٹھ کر شاعری کی اور شہر لاہور کی توصیف کی جب کہ زمانۂ حال میں یہ مجید شیخ ہیں جو لاہور کی قدامت کے بھید کھولتے ہیں، اس شہر کی شان میں قصیدے کہنے والے شاید آخری شخص ہیں، میں نے ان کی تحقیق اور جستجو سے بہت کچھ مستعار لیا..

مجھ سے تحقیق، تاریخ اور حقیقت کی تمنا نہ کیجئے گا.. یہ دانتے کی ''ڈیوائن کامیڈی'' ہے، اقبال کا ''جاوید نامہ'' ہے، جن میں تصور اور عشق، عرشوں کے مسافر ہوتے ہیں، یہ مہابھارت کی ایک دیو مالائی رَتھ ہے جس پر خواب سراب کے مسافر سوار ہو کر اپنے اپنے خوابوں اور سرابوں کی جستجو میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

''لاہور آوارگی'' کی پکچر گیلری میں کہیں کہیں آپ کو تکرار کا احساس بھی ہو گا..تکرار ثابت کرتی ہے کہ آپ ثابت قدم ہیں، تکرار سچ کی مُہر ہے..اِن سفری کتھاؤں میں تاریخی اور واقعاتی غلطیاں بھی ہوں گی، اگر وہ چند ایک ہیں تو درگزر کر دیجئے گا اور اگر کثرت سے ہیں تو اپنے نسخے پر ہی خود ہی درست کر کے ثوابِ دارین حاصل کر لیجئے گا..یہ ایک مبسوط بیانیہ نہیں ہے، بکھرا بکھرا سا ہے کہ لاہور بھی ایک مبسوط شہر نہیں ہے، بکھرا بکھرا سا ہے..

میں نجیب الطرفین نوعیت کا لاہوریا نہیں ہوں کہ میرے طرفین میں سے ابّا جی دریائے چناب کے کناروں میں جو کالیاں نام کے غیر معروف گاؤں سے آئے اور امی جان گکھڑ منڈی کے محلّہ مغربی کی پیدائش تھیں..اور میری جم پَل لاہور میں ہوئی۔ چنانچہ آپ مجھے ایک نو لاہوری کہہ سکتے ہیں جیسے نو مُسلم لوگ ہوا کرتے ہیں، اور آپ آگاہ ہیں کہ جتنے بھی نو مُسلم ہوتے ہیں، وہ مارٹن لنگز ہوں یا علامہ اسد وہ دیگر پیدائشی مسلمانوں کی نسبت زیادہ بنیاد پرست ہوتے ہیں..جیسے میمونہ کی بھتیجی انگریزی کی معروف ناول نگار عُظمےٰ اسلم خان نے ایک امریکی ڈیوڈ سے شادی کی، اُسے مسلمان کر کے عثمان کا نام دیا تو ایک بار میں اور میمونہ ماہِ رمضان کے دوران اُن سے ملنے کے لیے گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ نو مُسلم عثمان روزے سے ہے اور عُظمےٰ نہایت مزے سے مرغ پلاؤ کھا رہی ہے..

تو میں بھی ایک نو لاہوریا، اس شہر کے عشق میں تخلیق کے روزے رکھ رہا ہوں جیسے گلزار، مینا کماری کی یاد میں اب بھی روزے رکھتے ہیں..

تمام ادوار میں ہر مہان لکھنے والے نے اپنی تحریروں میں اپنے اپنے شہر کی خمار آلودئے کشید کی..وہ ان شہروں کے باسی نہ ہوتے تو مہان لکھنے والے تو ہرگز نہ ہوتے..یہ شہر ہیں جن کے گلی کوچے اور قصّے ان کی تحریروں کو تاریخ اور ثقافت کے پانیوں سے سیراب کرتے ہیں اور اُنہیں ادب کی عظمت کے راج سنگھاسن پر براجمان کر دیتے ہیں..ٹالسٹائی کا ماسکو، دوستووسکی کا سینٹ پیٹرزبرگ..ڈکنز کا لنڈن..ٹیگور اور ستیاجیت رے کا کلکتہ..قرۃ العین حیدر کا لکھنؤ، صادقین اور جون ایلیا کا امروہہ..گارسیا لورکا کا غرناطہ..جیمز جوائس کا ڈبلن، اسماعیل قادارے کا ترانہ..نجیب محفوظ کا قاہرہ..پاموک کا استنبول..یہاں آپ ایک اُلجھن کا شکار تو ہو سکتے ہیں کہ آخر پنجاب کے پیدائشی ناول نگاروں میں سے بیشتر نے لاہور سے کیوں بے اعتنائی کی، سرسری گزر گئے..وہ ایسے شہروں کے گیت گاتے رہے جن کے تذکرے انہوں نے کتابوں میں پڑھ رکھے تھے..البتہ عبداللہ حسین اور اے حمید نے اس شہر میں اپنے کچھ کرداروں کی حیات کو رواں کیا..اگرچہ عبداللہ گجرات کے تھے اور اے حمید کے سانسوں میں صرف امرتسر آباد تھا...ہر کسی نے لاہور سے بے اعتنائی اختیار کی یہاں تک کہ انتظار حسین نے بے شک اپنے کالم کا عنوان ''لاہور نامہ'' رکھا لیکن اُن کی تحریروں میں ان کا ڈبائیوں آبائی قصبہ حکومت کرتا رہا....اُن سے کچھ شکایت نہیں کہ اگر میں لاہور سے بچھڑ کر مجبوراً ڈبائیوں میں رہائش پذیر ہو جاتا تو مجھ پر بھی لاہور ہی حکومت کرتا رہتا..

''موت، موت ہے، اور لاہور، لاہور ہے..''

پہلی جنگ عظیم کے دوران بلجیم میں انگریزوں کی وفادار لاہوری پلٹن کے سپاہی، ان کے دشمن پر حملہ آور ہوتے تھے، مسلمان، سکھ اور ہندو لاہوری تو نعرہ لگاتے تھے کہ..موت موت ہے اور لاہور لاہور ہے..

وطن وہ ہوتا ہے جہاں آپ کا پہلا بچہ پیدا ہوتا ہے، اور پہلی قبر کھودی جاتی ہے..

آپ کو اُس وطن کی شہریت تب عطا ہوتی ہے جب وہاں آپ کا پہلا بچہ ماں کی کوکھ سے سر نکالتا ہے، اُس کی شہریت تب عنایت ہوتی ہے جب آپ کے ماں باپ میں سے کوئی ایک اس کی مٹی میں دفن ہو جاتا ہے، اگرچہ میری پیدائش تکنیکی طور پر خالص لاہور کی نہیں ہے یعنی اُن زمانوں کے مروّجہ رواجوں کے مطابق اپنے پہلے بچے کی پیدائش کی قربت میں میری والدہ اپنے میکے گکھڑ منڈی چلی گئیں جہاں ایک کوٹھڑی میں نانی جان اور مقامی دائی کی معاونت سے میرا جنم ہوا جب کہ میری پھوپھی جان رحمت بی بی صحن میں بدرُوحوں کو بھگانے کے لیے برتنوں اور دیگچیوں کو کھڑکا کر خوب غُل مچاتی تھیں..اگرچہ اس قدیم رواج کی پیروی کے باوجود چند ایک مستقل مزاج بدرُوحیں بہرطور میرے نومولود بدن میں یوں سرایت کر گئیں کہ پھر عمر

بحران سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوا.. آوارگی اور جنوں کی بدرُوحیں.. ''چِھلے'' کے چالیس روز بسر کر کے میری والدہ مجھ سمیت لاہور واپس آ گئیں.. ویسے میرے پاسپورٹ اور دیگر محدود دے چند تعلیمی اسناد پر اور مجھ پر جتنے بھی مقالے لکھے گئے اور اُن میں پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ بھی شامل ہے، میری پیدائش لاہور کی درج ہے.. کہ اس میں آسانی بہت تھی.. بہر طور میرا پہلا بچہ سلجوق، ٹمپل روڈ کے طُوری کلینک میں پیدا ہوا اور پھر میرے اباّ جی اور امی جان لاہور کے گلبرگ کے قبرستان میں دفن ہوئے..

ویسے تو آپ کا پہلا عشق بھی آپ کو ایک شہر سے ہمیشہ کے لیے جوڑ دیتا ہے لیکن ان حکایتوں کا تذکرہ کیا کرنا! اگر اپنے آپ کو خالص لاہوری ثابت کرنے کے لیے یہ سب دعوے آپ کو کسی حد تک بودے لگتے ہیں تو.. یوں کہہ لیجئے کہ جس شہر کے کسی فٹ پاتھ پر آپ اپنی زندگی کی پہلی لاش اوندھی پڑی دیکھتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ شخص مسلمان ہے، ہندو یا سکھ ہے، کیا ہے.. کہ ابھی آپ ایک چھوٹے سے خوفزدہ بچے ہیں، رنگ محل مشن ہائی سکول سے بھاگتے ہوئے اور روتے ہوئے اپنے گھر کی جانب گرتے پڑتے چلے جاتے ہیں اور آپ کے سامنے ایک لاش ہے، فٹ پاتھ پر اوندھی پڑی، فٹ پاتھ پر شدید گرمی کے باوجود اُس کا خُون کچھ دیر بہا اور پھر جم گیا.. اُس خون سے نقشے بنتے ہیں، پاکستان وجود میں آ رہا ہے، پرانے نقش مِٹ رہے ہیں، نئے نقشے ابھر رہے ہیں...

چنانچہ لاہور میرے لیے میرا پہلا بچہ، پہلی قبر اور پہلی لاش ہے.. کیا آپ میرے ان دلائل سے مطمئن ہوئے.. نہیں ہوئے تو اللہ کرے آپ کا تختہ ہو جائے.. میں نے کسی انٹرویو کے دوران کہا تھا، جب مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ کیا آپ پاکستانی یا اسلامی ادب پر یقین رکھتے ہیں تو میں نے کہا تھا کہ مذہب کا ادب تو ہوتا ہے لیکن ادب کا کوئی مذہب نہیں ہوتا.. اسی طور کسی بھی قدیم شہر کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، البتہ ہر دور میں اس کے باسی کسی خاص مذہب کے پیروکار ہوتے ہیں اور پھر زمانے گزرتے ہیں تو وہ کسی اور عقیدے کا دامن تھام لیتے ہیں.. شہر نہیں باسی مذہب بدلتے رہتے ہیں.. قرطبہ، کبھی رُومی، کبھی عیسائی، پھر مسلمان اور پھر عیسائی، استنبول، رومی، عیسائی، مسلمان.. فی الحال.. دمشق، بلخ، بابل، بیت المقدس سب کے سب مختلف عقیدوں کے چہروں والے شہر.. یہاں تک کہ مکّہ بھی کبھی کافر تھا اور یثرب یہودیوں کی بستی تھی..

لاہور بھی، کبھی جَین، کبھی ہندو اور وہ بھی راجپوت، کبھی افغان مسلمان اور کبھی ایک سِکھ راجدھانی، اور پھر سلطنت انگریز صاحب بہادر کی اور تادم تحریر ایک مسلمان شہر.. اور زمانوں اور تاریخ پر کچھ دھیان کیجئے تو کیا جانئے کل کیا ہو گا، یہ کس عقیدے کا شہر ہو گا، جو بھی ہو گا، لاہور، لاہور ہو گا..

''لاہور آوارگی'' محض ایک تاریخی اور تاثراتی بیانیہ نہیں ہے، ایک احتجاج بھی ہے، نہ صرف ایک مرتبہ پھر افغانیوں نے اس شہر پر قبضہ کر لیا ہے بلکہ ترقی کے نام پر اس کے چہرے کو مسخ کیا جا رہا ہے، اس کی

سب تاریخی نشانیاں مسمار کی جا رہی ہیں، اس کے درمیان میں ایک دیوار برلن تعمیر کر کے اس کی پہچان کو معدوم کر دیا گیا ہے.. میں اس شہرِ بے مثال کا نوحہ گر ہوں، جانتا ہوں کہ میری فغاں کا کچھ اثر نہ ہوگا، میں نے بھی تو ارسطو کا کہا نہ مانا تھا کہ کبھی کسی سوداگر کو اپنا حکمران نہ بنانا، وہ تمہارے قدیم معبد ڈھا دے گا، عہدرفتہ کے سب قصر مسمار کر کے وہاں تجارتی منڈیاں قائم کر دے گا..

نوحہ گروں کی فریاد نہ کبھی سوداگروں نے سُنی اور نہ ہی یزید نے.. کہ اصل میں دونوں ایک ہیں...

ویسے میری کیا بساط، چوبرجی کی مُغل شہزادی مہرالنساء بھی تو نوحہ کناں ہے، قدیم کلیساؤں پر آویزاں صلیبوں میں سے خُون بہتا ہے.. لکشمی چوک کی بربادی پر لکشمی دیوی کے آنسو نہیں تھمتے، جین مندر کے آثار مسمار ہو گئے.. شاہ حسین فریاد کرتا ہے کہ شالیمار باغ جہاں کبھی اُس کے میلہ چراغاں کے چراغ جلتے تھے، اُس کے بُرج منارے اور آبشاریں اور فوارے لرزش میں ہیں.. کہ وہاں سے کوئی اورنج ٹرین چھک چھک کرتی گزرے گی.... یہ شہرِ بے وفا تو نہ تھا پر تُو نے اسے برباد کر کے رکھ دیا..

میں جن دنوں بیک وقت سندھ اور پنجاب کے دو سفرنامے مرتب کر رہا تھا اور پنجاب کی کتاب میں لاہور کی کچھ آوارگیاں بھی شامل تھیں تو یہ سرفراز ملک گُجر تھا جو اس قبیلے کا پہلا شریف گجر ہے جس نے مجھے مائل کیا کہ مجھے لاہور کے بارے میں ایک الگ کتاب لکھنی چاہیے.. اور میں فوراً مائل ہو گیا.. کیا آپ جانتے ہیں کہ میں نے سنگِ میل کے افضال احمد کے دریافت کرنے پر کہ تارڑ صاحب، کیا "لاہور آوارگی" مکمل ہو گئی تو میں نے کہا تھا کہ افضال میں نے اب تک جو کچھ بھی لکھا ہے اسے فوراً شائع کر دو کہ ہر شب لاہور اپنا ایک اور رُوپ میرے سامنے سجا دیتا ہے اور میں لکھتا ہی چلا جاتا ہوں، یوں تو لاہور آوارگی کبھی مکمل نہ ہوگی... اگر میری قبر لاہور میں ہوئی تو بقول غالب

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ، بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے، اندر کفن کے، پانو

کفن کے اندر میرے پاؤں ہلتے ہوں گے اور میں اپنی خوش بختی پر فخر کرتا کہ مجھے لاہور کی مٹی نے قبول کیا، میں تب بھی لکھتا چلا جاؤں گا.. مجھے فوراً دفن کر دو..

؎ موت موت ہے، اور لاہور، لاہور ہے..



''اِک دن رہیں لاہور میں''

1- ''رنجیت سنگھ کی رانی موراں کی مسجد اور حویلی نونہال سنگھ''

2- ''داراشکوہ کا دروازہ، آنند پال اور اوم پرکاش''

3- ''شاہی گذرگاہ..چاٹی کی لسّی اور ثریلا جاوید''

4- ''ٹھیکیدار سلطان کا پوشیدہ شیش محل''

5- ''محمود غزنوی کے ایاز کی قبر..ہیرامنڈی اور رقص کرتا کھسرا''

6- ''قرۃ العین حیدر کا لکھنؤ اور میرا لاہور''

7- ''شاہی حمام میں ناشتہ اور بیجاناتھ کی حویلی''

8- ''لاہور، جو لاہور تھا''

''رنجیت سنگھ کی رانی موراں کی مسجد اور حویلی نونہال سنگھ''

یہ جو موسمِ سرما کے ٹھٹھرتے دن ہیں..میرے صحن میں سربلند چیڑ کا درخت دُھند میں ملفوف ہو جاتا ہے، دُھند اس کی شاخوں اور باریک بالوں سے لپٹتی ہے تو نمی میں بدل جاتی ہے اور آنسوؤں کی صورت فرش پر گر کر اُسے گیلا کرتی ہے..صبح کی سیر کے لیے پارک میں جاتا ہوں تو سب شجر، جھاڑیاں اور سیر کرتے لوگ دھند کی سفید عبا میں لپٹے اُس میں روپوش ہو جاتے ہیں اور جب دھوپ نکلتی ہے تو اُس کی [illegible] بدن کو بھلی لگتی ہے تو ان دنوں میں مجھے لاہور کا قدیم اندرون بلاتا ہے، سینکڑوں برس قدیم شکستہ بُرج، مینار، جھروکے، حویلیاں، کھنڈر ہو چکے گھر، تاریخی مسجدیں اور گئے زمانوں کے آثار بلاتے ہیں..گلی کوچوں کی گندگی کی بُو اور حلوہ پُوڑی اور نہاری کی مہک بلاتی ہے تو میں پارک کے ساتھیوں کو آمادہ کرتا ہوں کہ آؤ کچھ وقت لاہور کے قدیم گلی کوچوں میں گذارتے ہیں کہ آثار مٹتے جاتے ہیں، پرانا لاہور ٹریڈر مافیا کے اژدھے نگلنے والے ہیں.. اُنہیں کوئی نہیں پوچھتا کہ حکمران بھی تو تاجر ہیں..پچھلے دنوں تاریخی شیرانوالا دروازے کے باہر ایستادہ شیروں کو ڈھا دیا گیا اور جب لوگوں نے احتجاج کیا تو خیر سے ایک نوخیز شیرِ لاہور نے جنہیں ان دنوں ہم پر مستقبل میں حکمران ہونے کے لیے گروم کیا جا رہا ہے، انہوں نے ذاتی طور پر مداخلت کی کہ نہیں ان لوگوں کو شیر تو کیا پورا دروازہ گرانے دو کہ یہ ان کا حق ہے، یہاں پلازہ تعمیر کیا جائے گا، تاریخ کو محفوظ رکھنے سے کچھ فائدہ نہیں، پلازے تعمیر کرنے سے ہی سیاست ہو سکتی ہے اور مال پانی کی فراوانی ہو سکتی ہے..مجھے اندرون شہر کے باسیوں نے بتایا کہ ایک مشہور پہلوان کی خدمات ایک کثیر معاوضہ ادا کر کے حاصل کی گئیں تا کہ وہ شیرانوالا دروازے کے آس پاس جو مکین اور دکاندار ہیں اُنہیں کچھ دے دلا کر مائل کرے اگر نہ مائل ہوں تو زور بازو سے انہیں بے دخل کر کے نئی تعمیرات کی راہ ہموار کرے..چنانچہ یہ سب کچھ گُم ہونے کو ہے تو آؤ اس شہر بے مثال کی آخری جھلکیاں دیکھ لو..

لاہور یاترا کا جو پہلا اتوار تھا اُس میں کیچڑ بہت تھا کہ پچھلی روز مینہ بہت زور کا برسا تھا..ہم لاہوری دروازے کے عظیم الشان پھاٹک سے اندرون شہر داخل ہوئے..میں دیکھ سکتا تھا کہ تاریخی ''بیٹھک کا تباں'' اور وہ جھروکے دار کوٹھا اب موجود نہ تھا جہاں روایت کے مطابق برصغیر کے ایک عظیم موسیقار کی قریبی عزیزہ رقص

کیا کرتی تھی..لوہاری کے آغاز میں ہر جانب خوراکوں اور مٹھائیوں کی دکانوں پر اُس سویر بھی لاہوریوں کے ہجوم تھے، دنیا کے بہترین کھانے، حلوہ پُوڑی، نہاری، سُرخ بوٹی، سری پائے اور جانے کیا کیا..ذرا آگے جا کر ایک دوراہا آیا..ڈاکٹر انیس نے ایک نانبائی سے پوچھا کہ بھائی جی اس جگہ کو کیا کہتے ہیں تو وہ کہنے لگا ''بھا جی..یہ چوک چکلا ہے..'' ڈاکٹر انیس نے حیرت سے میری طرف دیکھا ''تارڑ صاحب آپ کے ناول ''راکھ'' کا آغاز مجھے بے حد پسند ہے کہ چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں مجھے بلاتی ہیں..قادر آباد جھیل میں مرغابیوں کا شکار..دریائے راوی کے کنارے کامران کی بارہ دری..سورت کا ایک سلیٹی منظر اور..چوک چکلا..تو میرا خیال تھا کہ چوک چکلا آپ کے تصوّر کی پیداوار ہے..یہ تو واقعی ہے..یہی ہے؟''

''ہاں..کسی زمانے میں یہاں طوائفوں کے کوٹھے تھے جن کی نسبت سے یہ چوک چکلا کہلایا اور پھر یہ نام شرعی طور پر کچھ لوگوں کی طبع پر گراں گذرا..انہوں نے اسے ایک شرعی نام دیا لیکن..لاہور کے پرانے باسی اسے آج بھی اس کے پرانے نام سے پکارتے ہیں''

گلیوں میں کیچڑ بہت تھا یہاں تک کہ بجری سے لدے گدھے بھی پھسلتے تھے اور ڈاکٹر نسیم دندان ساز تو بہت ہی پھسلتا تھا کہ وہ گردن اٹھائے جھروکوں میں سے جھانکتی گھریلو خواتین کو دیکھتا تھا اور کبھی کبھار ''ہائے اوئے'' کا نعرہ لگاتا تھا..ہمارے ہمراہ بلوری آنکھوں والا ملک سرفراز بھی تھا..اُس کا کہنا تھا کہ وہ تین چیزوں کو جانتا ہے..دودھ، دہی اور مکھن کو کیونکہ وہ ایک گوجر ہے..کاغذ کے کاروبار کو اور تیل کو کہ یہی اُس کا روزگار ہے..اندرون شہر وہ ایک شہزادہ تھا، جدھر بھی جاتا پہلوان، دکاندار، بوڑھے لاہوریئے اُس کے آگے بچھتے چلے جاتے..وہ ایک حیرت انگیز شخص ہے جو خود تو ایک لقمہ بھی نہیں لیتا لیکن اپنی لاہوری خوراکوں کی دعوتوں میں دوستوں کو کھلا کھلا کر نڈھال کر دیتا ہے..مجھے اُس کی آنکھیں بے حد پسند ہیں..

اگرچہ میں متعدد بار دیکھ چکا تھا لیکن خواجہ تنویر، امجد، صدیق بلوچ، سعید بٹ اور فرزند علی کی خواہش تھیں کہ وہ ''نیویں مسجد'' اور ''کنجری کی مسجد'' دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ فرزند علی وہی دراز قامت کاؤبوائے قسم کے صاحب ہیں جو ایک ماہ ابوظہبی کے صحراؤں میں تیل تلاش کرتے ہیں اور پھر ایک ماہ کے لیے رخصت پر پاکستان آتے ہیں اور پارک کے دوستوں کے لیے دنیا کا بہترین پنیر، شہد، کریم، دہی..ٹیونا فش اور لبنانی قیمہ بھری روٹیاں، کافی اور دودھ لاتے ہیں اور کسی سویر اس عجیب پر کیف ناشتے کا اہتمام کرتے ہیں..چنانچہ پارک میں انہیں پنیر والے صاحب کے نام سے بہت یاد کیا جاتا ہے..''نیویں مسجد'' بند پڑی تھی، اُس کے صحن میں اترنے کے لیے سیڑھیاں اترنی پڑتی تھیں کہ وہ بازار کی سطح سے بہت نیچے تھی..

''کنجری کی مسجد'' کا نام بھی ذرا گراں گذرتا تھا اس لیے آج وہ ''مائی موراں کی مسجد'' کہلاتی ہے، اور یہ موراں کون تھی..لاہور کی ایک دل رُبا طوائف جو ایک مور کی مانند رقص کرتی تھی اس لیے موراں

کہلائی.. مہاراجہ رنجیت سنگھ جس کا کہنا تھا کہ مجھے دو چیزیں پسند ہیں..ایک اتھری گھوڑی..یعنی ایک ایسی تھرکتی بے چین گھوڑی جو کسی کو اپنے اوپر سوار نہ ہونے دے اور دوسری..ایک اتھری رَن..مہاراجہ نے موراں کو اپنے حرم میں داخل کر لیا..اتنا گرویدہ ہوا کہ لاہور ٹکسال سے اُس کے نام کا سونے کا سکّہ ڈھالا گیا.. محقق حضرات کے مطابق برصغیر میں موراں پہلی عورت تھی جس کے نام کا سکّہ جاری ہوا..

''مائی موراں کی مسجد'' بھی مقفل تھی..

اور تب ہم تنگ گلیوں اور نیم تاریک کُوچوں میں سے گذرتے یکدم ٹھٹھک گئے کہ ہمارے سامنے شہزادہ نونہال سنگھ..رنجیت سنگھ کے پوتے کی..ایک ایسی پرشکوہ اور شاندار حویلی ظاہر ہوئی کہ ہم سب کا دم رُکنے کو آیا..ایک لاہوری تاج محل..جس کی پیشانی پر شیروں کے مجسمے آرام کرتے تھے..کیا یہ ممکن ہے کہ لاہور شہر کی گھناوٹ اور بوسیدگی کے اندر ایک ایسی عمارت ہو جو الف لیلے کا ایک خواب ہو..ایک مقامی مہربان نے مجھے پہچان کر دعوت دی کہ تارڑ صاحب..میرا گھر اس حویلی کے مقابل میں ہے اور اُس کی چھت سے اس کا منظر دیکھنے کے لائق ہے..میں آپ کو لے چلتا ہوں تو ہم سب چلے..تنگ اور مختصر سیڑھیاں بمشکل چڑھتے، ہونکتے ہانپتے چھت پر پہنچے..وہاں سے حویلی نونہال سنگھ کا بالائی منظر بے شک حیرت انگیز تھا لیکن..ڈاکٹر انیس فرش پر گرے اور بے ہوش ہو گئے....



''داراشکوہ کا دروازہ، آنند پال اور اوم پرکاش''

حویلی نونہال سنگھ کے بالائی منظر کو دیکھنے کی چاہت میں جب ہم تنگ تاریک سیڑھیاں چڑھتے اُس کے مقابل میں ایک گھر کی چھت پر پہنچے تو ڈاکٹر انیس تقریباً بے ہوش ہو گئے..

ننگے فرش پر لیٹ گئے اور بے جان سے ہو گئے اور ہم سب کی جان نکل گئی..اور میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ انہیں اگر یہاں خدانخواستہ کچھ ہو جاتا ہے تو بیٹی تزئین کا سامنا کیسے کروں گا کہ تارڑ انکل..آپ کیوں میرے اسّی برس سے تجاوز کرتے ابو کو ورغلا کر لے گئے..اور میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں کہ اُس لمحے یہ حساب کتاب کر رہا تھا کہ اگر ڈاکٹر انیس کو یہاں کچھ ہو جاتا ہے تو ہم انہیں نیچے کیسے لے جائیں گے..سیڑھیاں تو بہت تنگ ہیں..

تب ڈاکٹر رانجھا نے ڈاکٹر انیس کی نبض پر ہاتھ رکھا..اُن سے کچھ سوال جواب کیے اور پھر اہل خانہ کو نمک ملا پانی لانے کے لیے کہا..ڈاکٹر انیس نے دو چار گھونٹ بھرے اور جی اٹھے اور کہنے لگے ''میں کہاں ہوں؟'' پھر فوراً ہی کہنے لگے ''اوہو.. یہ سامنے حویلی نونہال سنگھ کا کیسا شاندار منظر ہے..تارڑ صاحب ذرا دیکھئے..''

یہ ڈاکٹر رانجھا..ایک خوش نظر ہپّو قسم کے ڈاکٹر ہیں..اپنے دوست ناصر اعوان کے ہمراہ کبھی کبھار پارک میں چلے آتے ہیں اور میری تحریر کے متاثرین میں سے ہیں..

مجید شیخ جو معروف صحافی ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے ایڈیٹر حمید شیخ کے بیٹے ہیں، ہر ہفتے ایک انگریزی اخبار میں لاہور کے بارے میں کوئی تاریخی اور تحقیقی مضمون تحریر کرتے ہیں..میں سمجھتا ہوں کہ مُنشی کنہیا لال کے بعد اگر کسی نے لاہور کے سپوت ہونے کا حق ادا کیا ہے تو وہ مجید شیخ ہیں..اُنہی کے کالم ''پارکنگ بیک'' میں مجھ پر کُھلا کہ موری دروازے کے باہر اب بھی وہ ایک ہزار برس پرانا برگد موجود ہے جہاں لاہور کے راجپوت راجہ جے پال نے محمود غزنوی سے پشاور کے قریب شکست کھا کر زندہ رہنا توہین جانا اور شاہانہ لباس میں ملبوس، اپنے عوام کے سامنے ''جوہر'' کی رسم ادا کی یعنی اپنے آپ کو آگ کے سُپرد کر دیا..جے پال سے پیشتر اُس کا باپ اور وہ بھی ایک جرّی شخص تھا، محمود غزنوی کے سامنے نہ ٹھہر سکا..البتہ جے پال نے طے کر لیا کہ

وہ بہر طور محمود غزنوی کا راستہ روکے گا..اس غرض سے اُس نے ان علاقوں کے دیگر راجوں سے رابطے کیے، انہیں اپنے ساتھ ملایا اور پشاور کے آس پاس محمود غزنوی کے سامنے سینہ سپر ہو گیا..کہا جاتا ہے کہ وہ بے مثال بے جگری سے لڑا..لیکن جنگ کے دوران بہت سے راجے اُس کا ساتھ چھوڑ گئے..وہ چاہتے تھے کہ جے پال کو شکست ہو..اور جانتے تھے کہ محمود غزنوی بہر طور اپنے ہاتھیوں پر ہندوستان کے خزانے لاد کر واپس غزنی چلا جائے گا اور پھر وہ جے پال کی سلطنت پر قابض ہو جائیں گے، بری طرح شکست کھانے کے بعد جے پال واپس لاہور پہنچا، اپنی رعایا سے معافی کا خواستگار ہوا اور موری دروازے کے باہر ایک برگد تلے اپنی چِتا تیار کر کے جل مرا..دراصل موری دروازہ نہ تھا..شہر کی فصیل میں ایک سوراخ یا موری تھی جہاں سے مُردوں کو فصیل کے باہر جلانے کے لیے چوری چھپے لایا جاتا تھا..ان دنوں جہاں مچھلی منڈی ہے وہاں ایک شمشان گھاٹ ہوا کرتا تھا..اب نہ کسی موری کا نشان ہے اور نہ ہی کسی دروازے کا البتہ وہاں کم از کم تین برگداب بھی موجود ہیں..حسب توقع وہاں بھی ایک لاہوری بزرگ نے ملک سرفراز کو دیکھا تو اُن سے لپٹ گیا، چائے پانی کے لیے اصرار کرنے لگا تب میں نے پوچھا کہ بزرگوان پرانے برگدوں میں سے کونسا برگد زیادہ بوڑھا ہے.. ان بزرگ نے ایک اصطبل کی جانب اشارہ کیا، کوٹھڑیاں.. کچے گھروندے..میرا خیال ہے کہ وہ ہے..گمان غالب ہوا کہ اسی برگد تلے آج سے ایک ہزار برس پیشتر راجہ پال نے محمود غزنوی سے شکست کھا کر زندہ رہنا اپنی راجپوتی شان کے منافی سمجھا تھا اور اپنے آپ کو آگ لگالی تھی..ہم اپنی تاریخ پر ایک نظر کریں تو کیا ہم میں سے کسی نے اپنا مشرقی راج پاٹ کھونے کے بعد..بری طرح شکست کھا کر خودکشی کی، اپنے آپ کو جلایا..کسی نیازی نے اس توہین کو برداشت کرتے ہوئے ''جوہر'' کی رسم ادا کی..

ملک سرفراز نے ہمیں ایک قدیم اکھاڑا دکھایا جہاں اب بھی کچھ پہلوان زور کر رہے تھے..

''تارڑ صاحب..آپ جانتے ہوں گے کہ اداکار اوم پرکاش ایک لاہوریا تھا اور پہلوانی کا شوقین تھا، وہ اسی اکھاڑے میں زور کیا کرتا تھا..''

پرانی تاریخ کی پکار اپنی جگہ لیکن بھوک کی فریاد اُس سے کہیں بلند ہوتی تھی..ناشتے کے لیے ہم نے حاجی نہاری ہاؤس کا رُخ کیا..اور ہاں اس دوران عادل بھی ہمارے ساتھ تھا..اور وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا..آخر یہ لاہوریئے اتنے گندے کیوں ہیں، ہر جانب گندگی کے ڈھیر ہیں اور یہ اُن کے کناروں پر بیٹھے سری پائے کھا رہے ہیں..غلاظت سے بھری نالیوں کے ساتھ نان چھولے کھا رہے ہیں..گلیاں کیچڑ سے بھری ہیں اور یہ ان میں موٹر سائیکلیں چلاتے پھرتے ہیں..تاریک اور سیلن زدہ کوٹھڑیوں میں رہتے ہیں جن کے آگے کُوڑے کے انبار ہیں، ہر جانب کیسی ناگوار بُو ہے..آخر یہ لوگ بنیادی ستھرائی یا ہائی جین سے کیوں واقف نہیں ہیں، لاہور

کے یہ سوکالڈز ندہ دلان اتنے غلیظ ماحول میں کیسے زندگی بسر کرتے ہیں..عادل ایک ہیرا شخص ہے اگرچہ وہ کبھی ہیرامنڈی نہیں گیا، اُس کی حِس مزاح..مشرق اور مغرب کے امتزاج سے دوآتشہ ہوتی ہے، کم از کم میں نے ایسا ہنس مُکھ، گہری دانش رکھنے والا، داستان گو ایسا کہ ماڈل ٹاؤن پارک کے شجروں میں اداس بیٹھے پرندے اُس کی خوش نوائی سے نہ صرف چہکنے لگیں بلکہ چہکتے چہکتے لوٹ پوٹ ہوکر درختوں سے گر جائیں، ایسا شخص نہیں دیکھا..اُس کا تکیہ کلام ''بہترین'' ہے..گُڑ کے باسی چاولوں پر دہی کی ملائی ہو..بہترین! وہ جو میڈم تھیں، شادی شدہ نہیں تھیں، بہترین..کل میں فیصل آباد گیا..ایک جنازہ تھا، بہترین!...بہرطور صدیق بلوچ نے زرکثیر خرچ کے ہمیں حاجی کی نہاری کھلائی..بہترین! بلوچ صاحب اگلے کئی روز تک پارک میں اداس پھرتے رہے.. بہترین!..چونکہ وہ ایک شوقیہ گلوکار بھی ہیں اس لیے گاتے پھرے کہ..میں زندگی میں ہردم روتا ہی رہوں گا.. حاجی نہاری کا بل اتنا زیادہ تھا کہ بلوچ صاحب..یعنی، بہترین!



''شاہی گذرگاہ..چاٹی کی لسّی اور ثریلا جاوید''

اگلے اتوار کی دُھندلی سویر میں ہم سب زائرین دلّی دروازے کے باہر رُکتے جاتے تھے..لاہور کا دروازہ جس کا رُخ دلّی کی جانب تھا.. جہاں سے لاہور کا گورنر داراشکوہ.. جس کے نام کا شاہ دارا اب شاہدرہ کہلاتا ہے فجر کی نماز کے بعد نکلتا تھا اور اپنے مُرشد میاں میر صاحب کی قبر پر حاضری دینے کے لیے پیدل جاتا تھا..اُس نے راجپوتانے کا سرخ پتھر منگوایا..وہی سرخ پتھر جس سے فتح پور سیکری کے محلات تعمیر ہوئے اس لیے منگوایا کہ مُرشد کی قبر تک ایک روش تعمیر کی جائے، باغ بنائے جائیں لیکن..یہ حسرت تعمیر ادھوری رہ گئی..اگرچہ کراؤن پرنس تھا،شاہجہان کے تخت کا قانونی وارث تھا..لیکن اورنگ زیب جس نے بقول ابن انشاء نہ کبھی کوئی نماز چھوڑی اور نہ ہی کوئی بھائی..اُسے معزول کیا اور قتل کروا دیا.. چند تاریخ دان ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اگر اصول کے مطابق داراشکوہ مغلیہ تخت کا وارث ہوتا تو شاید مُغل سلطنت کا زوال قدرے تاخیر سے ہوتا..دلّی دروازہ..داراشکوہ کا دروازہ ہے..

لاہور کا دلّی دروازہ..داراشکوہ کا دروازہ ہے..وہ فجر کی نماز ادا کر کے لاہور کے گورنر ہونے کی حیثیت میں نہیں ایک مُرید کے طور پر پیدل اپنے مُرشد میاں میر صاحب کے آستانے پر جا کر حاضری دیتا.. اُس نے اپنے مُرشد کی قبر تک جانے کے لیے،اُس راستے کی تعمیر کے لیے راجپوتانے سے جو سُرخ پتھر منگوایا تھا پارسا اورنگ زیب نے اُسے قتل کرنے کے بعد اُسی پتھر سے بادشاہی مسجد تعمیر کی..میں دیکھ نہیں سکا لیکن بتایا جاتا ہے کہ میاں میر صاحب کے مزار کی دیوار پر اُسی سرخ پتھر کی ایک سِل نصب ہے..یہ وہی بزرگ باکمال ہیں جنہوں نے سِکھوں کے سب سے مقدس مقام دربار صاحب امرتسر کی بنیاد اپنے ہاتھوں سے رکھی تھی...اگر میاں میر صاحب آج کے زمانوں میں ہوتے تو طالبان یا اُن کے ہمدرد ''دانشور'' اُنہیں دائرہ اسلام سے خارج کر کے ہلاک کر دیتے کہ اُنہوں نے کفار کے ''مکّہ'' کی بنیاد رکھی تھی..

دلّی دروازے کے باہر..ڈاکٹر نسیم کا مہیا کردہ جاوید نام کا ایک ٹورسٹ گائیڈ بے چینی سے ہماری آمد کا منتظر تھا..ہم میں سے جب کسی نے پوچھا کہ آپ ٹورسٹ گائیڈ ہیں تو یہ جاوید خفا ہو گیا..سَر میں ایک سینئر ٹورازم آفیسر ہوں..ڈاکٹر نسیم اور تارڑ صاحب کے لیے خصوصی طور پر حاضر ہوا ہوں ورنہ میں تو صرف گورے

لوگوں کی راہنمائی کیا کرتا ہوں.. اُس کی لچھے دار اور پُرمزاح گفتگو سے میں نے اندازہ کیا کہ موصوف خاندانی ہیں، نہایت اُلجھے اور سُلجھے ہوئے ہیں.. جاوید اندرون شہر کا پروردہ ایک جاندار شخص تھا، بات کرتا تھا تو سُر میں کرتا تھا، بلکہ سُر تال میں کرتا تھا.. اُس نے بتایا کہ اُس کے والد صاحب ایک ماہر جانے پہچانے طبلہ نواز تھے.. بعد میں اُس نے مجھے اپنے ہونہار فرزند سے بھی ملوایا جو اپنے دادا کے فن کو آگے بڑھانے کے لیے طبلہ بجانا سیکھ رہا ہے.. چنانچہ جاوید ایک آبائی طور پر سُریلا شخص تھا جو ہمیں دلّی دروازے کے اندر شاہی حمام میں لے گیا.. میں اس حمام کو دیکھ چکا تھا لیکن ابھی حال ہی میں اس کی کھدائی کے دوران کچھ قدیم آثار ظاہر ہوئے ہیں.. کیسے زیرزمین گرم پانیوں کی ندیاں بہتی تھیں اور مُغل شہزادیاں بھاپ آلود حمام میں غسل کرتی تھیں.. دلّی دروازے میں داخل ہو کر آپ ''شاہی گذرگاہ'' کے کُوچے میں چلتے ہیں.. یہ پورا علاقہ ناروے کی مدد سے اور آغا خان پروجیکٹ کے تعاون سے دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے.. اور ''دیکھ لاہور'' کے منصوبے کے تحت اسے بہت سے لوگ، غیرملکی لوگ بھی دیکھنے آتے ہیں..

اس شاہی گذرگاہ کے کُوچے میں ایک دھندلی سویر تھی.. صبح کے ناشتے کے ٹھیلے اور خوانچے پُرہجوم ہوتے تھے، ایک چاٹی کی لسّی پیش کرنے والے ریڑھی والے نے مجھے پکارا ''تارڑ جی.. ہم آپ کے چاہنے والے ہیں، ہماری کچی چاٹی کی لسّی کے دو گھونٹ بھر کے دیکھو.. نظارے آ جائیں گے..'' اُس نے کچی لسّی میں تازہ مکھن کا ایک پیڑا گھولا اور گلاس مجھے تھما دیا.. واقعی نظارے آ گئے.. لسّی اتنی پُرکیف تھی کہ میں پوری چاٹی پی سکتا تھا.. مجھے اُس مہربان کا نام یاد نہیں لیکن.. اے دلّی دروازے کے اندر اُس دھندلی سویر میں چاٹی کی کچی لسّی فروخت کرنے والے میں تمہارا شکرگزار ہوں اور تمہیں یاد کرتا ہوں..

ہم پھر سے تزئین کردہ ''گلی سُرجن سنگھ'' گئے جس کے بیشتر پرانے مکان جو شکستہ ہو رہے تھے، انہیں نہایت عرق ریزی اور محبت سے دوبارہ بحال کیا گیا ہے.. سُرجن سنگھ پرانے لاہور کے ایک معروف حکیم اور شاعر تھے اور وہ یہاں رہتے تھے.. اسی گلی کی بغل میں شاید نہیں یقیناً دنیا کی تنگ ترین ایک گلی ہے اور اُس میں متعدد خاندان رہائش پذیر ہیں، یہ اتنی تنگ ہے میرے جیسا بھدّے اور موٹے بدن کا شخص آسانی سے اس میں داخل نہیں ہو سکتا، بمشکل ذرا پیٹ سکیڑ کر پہلے کندھے اندر داخل کر کے نہایت ناپ تول کر کے داخل ہو سکتا ہے.. صرف ڈاکٹر نسیم اور ڈاکٹر انیس اپنے مختصر سراپے کے ساتھ بے دھڑک جا سکتے تھے جب کہ عادل اس گلی میں پھنس سکتا تھا یہ اتنی تنگ تھی.. بتایا گیا کہ اگر خدانخواستہ کوئی موت واقع ہو جائے تو چارپائی کے لیے تو جگہ نہیں ہے اس لیے متوفی کو اٹھا کر بمشکل باہر گلی سُرجن سنگھ میں لاتے ہیں اور پھر چارپائی پر ڈال کر جدھر لے جانا ہو لے جاتے ہیں.. اس تنگ گلی میں البتہ ایک خوبی تھی کہ اگر خُوباں دوسری جانب سے چلا آئے.. تو آپ سے لپٹ ہی جائے.. کہاں جائے.. آئے ہیں اس گلی میں تو.. لپٹ ہی جائیں.. جاوید مسلسل چہکتا تھا.. اور اس چہکار

کے دوران اُس نے کہا ''سر.. میں اب آپ کو شیش محل میں لے جاؤں گا.. شاہی قلعے میں جو مشہور زمانہ شیش محل ہے وہاں نہیں، آج تک لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ، ایک خفیہ، ایک ذاتی شیش محل میں.. آئیں!''

''جاوید..'' میں نے اُسے ڈانٹا ''تم اتنے سُریلے نہ ہو جاؤ کہ مجھے یہ خبر کرو کہ لاہور میں شاہی قلعے کے شیش محل کے سوا بھی کوئی اور شیش محل موجود ہے.. اگر ہے تو کہاں ہے؟''

ہم میں سے بیشتر لوگ جھونپڑوں میں زندگی کرتے ہیں اور خواب دیکھتے ہیں شیش محلوں کے.. تو اس زندگی میں اگر کوئی خبر کرے کہ.. شیش محل موجود ہیں، تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہیں پر وہ ایک حقیقت ہیں اور تم اُنہیں دیکھ سکتے ہو تب دل پہ کیا گذرتی ہے.. وہی مجھ پہ گذری..

''سر آپ نے سلطان ٹھیکیدار کا نام سنا ہے؟''

''ہاں.. وہ لاہور کی تاریخ کا ایک اہم شخص ہے.. مولانا احمد علی کے مدفن کے قریب اُس کی قبر ہے جہاں میں جا چکا ہوں.. جس کے نام کی سلطان کی سرائے ہے، جس نے مغل عہد کے کھنڈرات سے اینٹیں اکھاڑ کر انگریزوں کے لیے عمارتیں تعمیر کیں، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ اُس نے کچھ مسجدوں کو بھی مسمار کر دیا اور اس پاداش میں اس کی موت دردناک ہوئی اور غربت میں ہوئی، لاہور کا برصغیر کا سب سے پرشکوہ قلعہ نما ریلوے سٹیشن اُسی سلطان ٹھیکیدار نے تعمیر کیا تھا، میں اُس کے نام سے واقف ہوں..''

''آپ تو بہت واقف ہیں..''

''میں نے کنہیا لال کی ''تاریخ لاہور'' پڑھ رکھی ہے.. فارسی اور عربی کا وہ عظیم سکالر منشی کنہیا لال.. اس لیے میں سلطان ٹھیکیدار کے نام سے واقف ہوں..''

''سلطان ٹھیکیدار نے مسجد وزیر خان کے پہلو میں اُس عہد کی سب سے شاندار حویلی تعمیر کی تھی.. ہمارے ہمراہ جو نوجوان گائیڈ نعمان چلا آتا ہے یہ حویلی اس کے دادا شیر محمد جلیل نے خریدی تھی۔ ٹھیکیدار سلطان کی کوئی اولاد نہ تھی.. اُس نے ایک بچی کو گود میں لیا جس کے ہاں چار بیٹیوں نے جنم لیا، ان میں سے دو لنڈن اور دو حیدرآباد چلی گئیں.. ان چاروں نے عمر کے آخری حصے میں یہ حویلی 1968ء میں شیخ محمد جلیل کو فروخت کر دی.. اور اُس کی بالائی منزل پر سلطان ٹھیکیدار کا شیش محل ابھی تک موجود ہے.. تارڑ صاحب.. آپ اور آپ کے دوست وہ پہلے لوگ ہوں گے جو اُسے دیکھیں گے.. یہ شیش محل آج تک کسی اور نے نہیں دیکھا..''



''ٹھیکیدار سلطان کا پوشیدہ شیش محل''

مجھے یقین نہیں تھا کہ حویلی میاں سلطان ٹھیکیدار ابھی تک موجود ہے۔ سلطان ٹھیکیدار لاہور کی تاریخ کا ایک اہم اور داستانوی کردار ہے.. سلطان کی سرائے کا معمار.. لاہور سٹیشن کو تعمیر کرنے والا انگریزوں کی چھاؤنی میاں میر کی بیشتر کولونیل عمارتیں بھی اُسی کی نگرانی میں تعمیر کی گئیں، جس نے مغل عہد کے مقابر، مساجد، حویلیاں جو کھنڈر ہو چکے تھے اُن کی اینٹیں ان تعمیرات میں استعمال کیں اور کہا جاتا ہے کہ اُس نے اینٹوں کے حصول کے لیے کئی شاندار مغل عمارتیں جن میں مساجد بھی شامل تھیں اور وہ شاہی شان و شوکت سے ابھی قائم تھیں، اُنہیں بھی ڈھا دیا.. وہ لاہور کا ایک رئیس اعظم ہوا اور پھر آخر میں پائی پائی کا محتاج ہو گیا، بہت برے حالوں میں اپنے انجام کو پہنچا..

ایک بہت بلند محراب تلے سلطان کی حویلی میں داخلے کا دروازہ تاریکی میں روپوش تھا..

''سیڑھیاں تنگ ہیں اور تاریک ہیں، ہمیں حویلی کی چھت پر پہنچنا ہے، میں روشنی کا بندوبست کرتا ہوں.. تارڑ صاحب کیا آپ اتنی سیڑھیاں طے کر سکیں گے؟'' جاوید نے پوچھا..

''اگر وہاں چھت پر بقول تمہارے ایک مختصر شیش محل میرا منتظر ہے تو تارڑ صاحب جان پر کھیل جائیں گے اور سیڑھیوں کی سُولی پر چڑھ جائیں گے..''

ڈاکٹر انیس ابھی پچھلے ہفتے حویلی نونہال سنگھ کا بالائی منظر دیکھنے کے چاؤ میں قلانچیں بھرتے بے شمار سیڑھیاں طے کر گئے تھے اور چھت پر پہنچ کر بے ہوش ہو گئے تھے اس لیے انہوں نے دوبارہ بے ہوش ہونے سے معذرت کر لی.. نعیم قریشی صاحب نے بھی انکار میں سر ہلا دیا اور اچھا کیا.. کیونکہ صرف تین روز بعد اُنہیں دل کا عارضہ لاحق ہوا اور اُن کا بائی پاس آپریشن کیا گیا.. ماشاءاللہ اب وہ روبہ صحت ہیں.. اگر اُس روز وہ سلطان کی حویلی کی سیڑھیاں چڑھتے تو کیا معلوم کیا ہو جاتا.. اور وہاں تو تنگ گلیوں میں ایمبولینس بھی نہیں آ سکتی تھی تو اچھا ہی ہوا.. میں نے اپنے کوہ نوردی کے فارمولے پر عمل کیا، پہاڑوں سے مقابلہ مت کرو.. دو قدم چلو اور پھر سانس درست کر لو.. یہاں بھی دو سیڑھیاں چڑھو اور رُک جاؤ، بے شک شام تک چھت پر پہنچو..

حویلی کی شکستہ ہوتی چھت پر قدم رکھا تو یکدم قدیم لاہور کی آوازیں کانوں میں گونجنے لگیں، شہر کی

زندگی میں سے جنم لیتا ہلکا شور.. کبوتروں کی غٹرغوں، چھتوں پر دھوپ سینکتی خواتین کی سرگوشیاں اور سردیوں کی دھندلی ہوا کی تازگی جس میں قدیم لاہور کے گلی کوچوں کی سرخ اینٹوں کی مہک رچی ہوئی تھی.. چھت کے اوپر بوسیدہ ہو چکی لکڑی کے کچھ تختے تھے اور ان میں دو بارشوں سے بھیگے ہوئے خستہ ہو چکے کواڑ تھے.. نعمان نے انہیں دھکیلا تو سورج کی روشنی ہم سے پہلے اندر داخل ہوئی اور وہاں واقعی ایک عجوبہ شیش محل کے آثار تھے جس کے اکھڑتے اور شکستہ ہوتے، بجھتے ہوئے شیشوں کو روشنی نے جگ مگ کر دیا تھا، سینکڑوں آراستہ شیشوں میں دھوپ کے چراغ روشن ہو گئے تھے.. شاہی قلعہ کے شیش محل کی نسبت بہت مختصر لیکن ہو بہو وہی.. بلکہ کسی حد تک خوشنمائی میں اُس سے بہت بہتر اور دلکش.. اور وہاں ایک محراب دار بالائی منزل تھی جس کے نازک ستون بھی شیشے کے نفیس جڑاؤ سے آراستہ تھے، ہم سب دم بخود تھے، سانس بھی آہستہ لیتے تھے کہ بقول میر..

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے، بہت کام.. آفاق کی کارگہہ شیشہ گری کا

نعمان نے مجھے بتایا کہ یہ کمرہ ہمارے کسی کام کا نہ تھا.. ایک عرصہ اسے کاٹھ کباڑ کے سٹور کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا اور پھر شہر لاہور کو دریافت کرنے والے ادارے نے اسے تلاش کر لیا اور ہم سے کہا کہ ہمیں سٹور کے لیے کوئی اور کمرہ انتخاب کر لینا چاہیے تو کچھ عرصہ پہلے تک یہ ناکارہ اشیاء کا گودام ہوا کرتا تھا..

''اور یہ اس کے حق میں بہت اچھا ہوا نعمان.. اگر یہ کمرہ آپ کے مسلسل استعمال میں رہتا تو یقیناً بچے اس کے شیشے کُھرچتے.. یہاں چولہے جلتے اور جو کوئی بھی آتا کہتا کہ.. بھئی یہ شیشے کیسے ہیں، کیا یہ اکھڑ سکتے ہیں.. تو یہ بند پڑا رہا اس لیے ابھی تک محفوظ رہا.. کامران سلیم اور عاتف سعید پاکستان کے مایہ ناز فوٹوگرافر پاگل ہو رہے تھے.. وہ ان دنوں لاہور کے بارے میں ایک تصویری کتاب کے لیے تصویر کشی کر رہے ہیں... اوپر جو محراب دار جھروکا تھا مخدوش لگتا تھا لیکن میں احتیاط سے قدم رکھتا ہولے ہولے اوپر پہنچ گیا.. بے شک بہت سا شیشہ گری کا بے مثال کام.. گُل بوٗٹے، آرائشیں اور بناوٹیں اکھڑ چکی تھیں لیکن اس کے باوجود تقریباً ستر فیصد آرائش ابھی تک قائم تھی..

آخر سلطان ٹھیکیدار نے اپنی عظیم الشان حویلی کی چھت پر ہی ایک مختصر شیش محل کیوں تعمیر کیا اور جان لیجئے کہ اُس زمانے میں سلطان کے پاس مغل عہد کے بے مثال کاریگر موجود تھے کہ وہ برصغیر کا سب سے بڑا ٹھیکیدار تھا اور میرا قیاس یہ ہے کہ وہ ہر رئیس کی مانند موسیقی اور رقص سے شغف رکھتا ہوگا اور یہ شیش محل اسی لیے چھت کی علیحدگی میں تعمیر کیا گیا اور وہ یہاں انگریز صاحب بہادروں کی آؤ بھگت بھی کرتا ہوگا.. میرے اس قیاس کو تقویت ڈاکٹر نسیم نے بھی دی.. وہ سیڑھیاں طے کر کے اوپر محراب دار جھروکے میں پہنچا اور نیچے کھڑے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر ہاتھ لہرا کر کہنے لگا ''ناچو..''

میرا حال کچھ اچھا نہ تھا، میں ایک اضطراب میں تھا، اگر آپ تاج محل دیکھنے جاتے ہیں تو آپ

جانتے ہیں کہ وہ وہاں موجود ہے لیکن آپ پر کیا گذرے گی اگر آپ لاہور کے قدیم شہر کی ایک چھت پر جاتے ہیں تو وہاں وہ موجود ہو جسے آپ نہ جانتے ہوں..کوئی ایک شب..شبِ وصال کی..عشقِ خاص کے کمال کی..اس شیش محل کی شب میں کبھی بسر ہو جائے تو ہم جانیں..اس چھت کے اوپر ایک اور چھت تھی..جسے پنجابی میں ''دھور کوٹھا'' کہتے ہیں یعنی کوٹھے پر ایک اور کوٹھا..اور وہاں تک سیڑھیاں تو جاتی تھیں پر شگاف در شگاف تھیں..وہ بوجھ نہ سہہ سکتی تھیں، آس پاس کی اینٹیں سہارا لینے سے اکھڑ جاتی تھیں اور جاوید نے بتایا کہ اُس کوٹھے پر سے شہر لاہور اور وزیر خان مسجد کا جو منظر نظر آتا ہے اُس کا بیان ممکن نہیں.. پہلے سعید بٹ نے مجھے سہارا دیا، دو چار سیڑھیوں کے بعد جب ایک اینٹ پاؤں میں آ پڑی تو کہنے لگا ''نہیں سر..خطرناک ہے..اوپر نہیں جا سکتے'' ہم واپس آ گئے..پھر کامران جو میرے ہمراہ راکاپوشی کے بیس کیمپ تک گیا تھا اس نے میرا ہاتھ تھام لیا ''تارڑ صاحب، آپ جا سکتے ہیں..'' اور وہ مجھے لے گیا، اگرچہ ہمارے بوجھ سے کم از کم ایک سیڑھی منہدم ہوگئی..

اور وہاں.. بقول منیر نیازی.. بڑھتی جاتی دھند تھی اور اس کے پیچھے شہر تھا..ہلکی سردیوں کی دُھندلاہٹ دُھند میں لاہور شہر کے قدیم بام و در تھے، بُرج مینار تھے اور مسجد وزیر خان کے چوکور مینار تھے، ایک سحر تھا جو شہر پر پھونکا گیا تھا اور میں تھا..



''محمود غزنوی کے ایاز کی قبر.. ہیرا منڈی اور رقص کرتا کھُسرا''

حویلی میاں سلطان ٹھیکیدار کی چھت پر جو سب کی نظروں سے اوجھل ایک مختصر شیش محل تھا اور اُس کے کوٹھے پر سے شہر لاہور اور مسجد وزیر خان کا دھندلا سرمائی منظر تھا اس نے میری آنکھوں میں وہی پُرمسرت حیرت بھری جو تاج محل دیکھنے کے بعد میری آنکھوں میں نقش ہوئی تھی.. یہ میری زندگی کے خوبصورت ترین تجربوں میں سے ایک تھا..

نیچے شہر لاہور کے گلی کوچے پُررونق اور آباد تھے.. اور ان پر حویلی دینا ناتھ کا نوتعمیر شدہ چہرہ جھلکتا تھا اور وہ کیسا دل نشیں تھا.. ذرا آگے دینا ناتھ کا ڈھکا ہوا قدیم کنواں تھا جس کے برابر میں کیسے خستہ پراٹھے اور کڑک چائے میسر تھی... ایک مزدور صبح کے ناشتے کے طور پر چنگیر میں پراٹھا رکھے چائے کے ساتھ کھاتا تھا جب سعید بٹ نے خوشبو کی تاب نہ لا کر کہا ''سر جی.. آپ مائنڈ نہ کریں تو میں اس مزدور کی اجازت سے پراٹھے کا ایک لقمہ لے لوں..''

''خبردار'' میں نے اسے ڈانٹا اگرچہ میں بھی اسی سوچ میں تھا.. دینا ناتھ کے کنویں کے سامنے پیپلز پارٹی کے سب سے وفادار سیاستدان جہانگیر بدر کے والد کی مچھلی اور پکوڑوں کی دکان اب بھی موجود ہے.. اختلاف اپنی جگہ لیکن جہانگیر بدر نے اپنے اس خاندانی پس منظر کو کبھی نہیں چھپایا، اس پر فخر کیا ہے اور مجھے یہ فخر پسند ہے.. وہ پیپلز پارٹی کے وڈیروں اور جاگیرداروں کے ہجوم میں ایک واقعی عوامی نمائندہ ہے.. اگرچہ وہ بھی خاصا متمول ہو چکا ہے.. اور ہاں دینا ناتھ لاہور کا گورنر ہوا کرتا تھا..

سنہری مسجد کا دروازہ مقفّل تھا لیکن جاوید نے سفارش کی اور وہ ہم پہ کھل گیا.. ایک دمکتی ہوئی قدیم تاریخی مسجد جس کے گنبد سرما کی دھوپ میں روشن ہوتے تھے..

اور تب ہم دکانوں اور مکانوں کی بھیڑ میں سے ایک تنگ راستے میں داخل ہوئے تو سنہری مسجد کے عقب میں ایک وسیع باغ ہماری نظروں میں پھیل گیا.. یہ ممکن نظر نہ آتا تھا کہ پرانے لاہور کے اندر اُس شیش محل کی مانند ایک چمن زار بھی پوشیدہ ہو سکتا ہے..

''یہ گوروارجن دیو کی باؤلی والا باغ ہے..'' جاوید سُریلا بولتا چلا جاتا تھا..

"باؤلی تو کب کی معدوم ہو چکی لیکن سکھ حضرات اب بھی اس کی یاترا کے لیے آتے ہیں.." ہم اس پوشیدہ باغ سے نکلے اور دائیں جانب کچھ قدم چلے تو وہاں میرا رنگ محل مشن ہائی سکول تھا، اُس میں میرا بچپن ہمکتا تھا.. اور میں 47ء میں اسی سکول کی شاندار کولونیئل طرز تعمیر سے نکلا تھا، شہر میں کرفیو نافذ ہو چکا تھا اور میں روتا ہوا بھاگتا چلا جاتا تھا.. جب سرکلر روڈ کی ویرانی میں، میں نے اپنی زندگی کی پہلی لاش دیکھی تھی.. کچھ پہچان نہ ہوتی تھی کہ ہلاک کیا گیا شخص کس مذہب کا تھا، اُس کا خون سڑک پر پھیلتا تھا اور خون سے کچھ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ یہ ایک ہندو کا ہے یا مسلمان کا..

رنگ محل مشن ہائی سکول کے سامنے محمود غزنوی کے ایاز کی قبر تھی.. لاہور کے گورنر ایاز کی.. اُس کی قبر کے گرد تعمیر کی گئی مسجد ایاز بھی مقفل پڑی تھی..

جاوید ہمیں ایک تنگ گلی میں لے گیا جہاں گئے زمانوں میں "کابلی حویلی" ہوا کرتی تھی اور اب اُس کے چہرے کے کچھ آثار، کچھ جھروکے رہ گئے تھے..

"کابلی حویلی" والی گلی سے باہر آئے تو ایک عجیب سانحہ ہو گیا.. ایک سالخوردہ، عمر رسیدہ خاتون مجھے دیکھ کر جذباتی ہو گئیں، جھک کر کہنے لگیں "تارڑ صاحب.. میں آپ کو بچپن سے دیکھتی آئی ہوں.. آپ ہمارے بزرگ ہیں، مجھے پیار دیں.." ان کے سر کے بال مہندی رنگے تھے میں نے مجبوراً ان کے سر پر ایک تھپکی دی لیکن یقین کیجیے بے حد تکلیف محسوس ہوئی البتہ میرے ساتھی از حد پُر مسرت اور کمینے ہو گئے کہ تارڑ صاحب.. آپ کا ایسا دردناک انجام ہونا تھا.. اس دوران ایک اور برقعہ پوش خاتون ان گنت انواع و اقسام بچوں کے ہمراہ وارد ہو گئیں "اُدھر دیکھئے، مسجد وزیر خان کے برابر میں جو مکان ہے، میں وہاں سے آپ کو دیکھ کر نیچے آ گئی ہوں.. آپ تو ہمارے چاچا جی ہیں، میرے بچوں کو پیار دیجئے، دعا کیجئے.." چنانچہ میں نے باری باری ہر بچے کے رخساروں کو تھپکا اور اُس خاتون کے سر پر بھی مجبوراً پیار کی تھپکی دی.. کیسا دردناک انجام تھا..

انگریزوں کے زمانے میں تعمیر شدہ "پانی والا تالاب" کے وسیع قلعہ نما کمپلیکس نے بھی ہمیں حیران کر دیا.. ان وقتوں میں شہر لاہور کو اسی تالاب سے تازہ اور شفاف پانی مہیا کیا جاتا تھا..

چند قدم چلے تو ایک نوگز لمبی قبر تک پہنچے.. یہ بابا نوگزے کی تاریخی قبر تھی.. قبر کے احاطے کے باہر ایک کُوزے میں نمک پڑا تھا.. بابا کا ایک ملنگ نمودار ہو گیا "حق اللہ" اُس نے نعرہ لگایا "پیٹ میں درد ہو.. مروڑ اٹھتے ہوں.. سر پھٹا جاتا ہو تو بابا نوگزے کے نمک کی ایک چٹکی لے لو.. سب کافور.. درد دُور.."

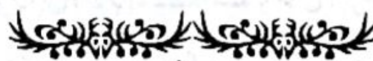
ہم نے ایک گھر میں قید ایک مندر کا مخروطی مینار دیکھا جس پر بہت سے ہندو دیوتا نقش تھے، یہ کالی کا مندر تھا.. یہ وہی کالی کلکتے والی تھی جو لاہور میں گمنام ہوئی جاتی تھی..

تاریخ کی بھوک برداشت ہو جاتی ہے لیکن پیٹ کی بھوک برداشت نہیں ہو سکتی اور ہم خوراک کی تلاش میں سردار ہیرا سنگھ کے نام سے موسوم ہیرا منڈی میں آ نکلے جہاں ہیروں کی فروخت پر پابندی لگ چکی

ہے البتہ موسیقی کے ساز تیار کرنے والے دنیا کے بہترین کاریگر اب بھی موجود ہیں..لاہور کی ساختہ ستار اور طبلے کی دھوم بالی وڈ میں بھی سنی جاسکتی ہے..ہیرے نہ سہی وہاں ''پھجے کے پائے'' تو خریدے جاسکتے تھے..اور وہاں ایک ہجوم تھا.. پائے اور مغز کا ناشتہ کرتے ہوئے نعیم قریشی کہنے لگے'' تارڑ صاحب..ہم کس علاقے میں ہیں..'' میں نے عرض کیا'' حضور آپ ہیرامنڈی میں فروکش ہیں..'' قریشی صاحب کا تو رنگ فق ہو گیا' ''ہیں؟..ہیرامنڈی؟ لاحول ولا..وہ..یعنی اگر کسی نے ہمیں یہاں دیکھ لیا تو کیا ہوگا..'' میں نے اُن کی ڈھارس بندھائی کہ'' قریشی صاحب اب یہ علاقہ توبہ تائب ہو کر شریف ہو چکا ہے..آپ فکر نہ کریں..''

ہم واپس دلّی دروازے آ رہے تھے کہ سامنے سے ایک بارات آ گئی..ایک بے چارہ سا دولہا تھا جو زرق برق سہرے سے پاؤں تک ڈھکا ہوا تھا..اُس کے پیچھے کوئی درجن بھر فلاکت زدہ سی عورتیں سر پر شادی کے صندوق اٹھائے چلی آ رہی تھیں..دولہے کے ہمراہ ایک ڈھول والا تھا اور اُس کے برابر میں ایک لیپا پوتا ہوا غریب سا خواجہ سرا یعنی کھسرا..ڈھول بجنے لگا اور کھسرا ناچنے لگا.. باراتیوں نے اپنی معمولی حیثیت کے مطابق ناچتے ہوئے خواجہ سرا پر دس روپے کے دو تین نوٹ نچھاور کیے..سعید بٹ کو اُس ناچتے ہوئے خواجہ سرا پر بے حد ترس آیا اور موصوف نے آگے بڑھ کر سو کا ایک نوٹ دولہا کے سر پر گھما کر خواجہ سرا پر نچھاور کر دیا..وہ یقین نہ کر سکا اور پُرمسرت ہو کر اپنا رقص تیز کر دیا..سعید بٹ نے ایک اور سو کا نوٹ نکالا اور کھسرے پر وار دیا.. پُرلطف بات یہ ہوئی کہ اس دوران دولہا نہایت حیرت زدہ ہو گیا کہ اُسے بھی سلامی میں صرف دس دس کے نوٹ مل رہے تھے چنانچہ جونہی بٹ نے ایک اور سو کا نوٹ خواجہ سرا کی جانب بڑھایا تو دولہا میاں نے اُسے دبوچ کر اپنی جیب میں رکھ لیا..بعد میں میں نے بٹ کو سرزنش کی کہ اُس نے کیوں پانچ چھ سو روپے فضول میں نچھاور کر دیئے تو اس نے بڑی حساس توجیہہ پیش کی'' تارڑ صاحب یہ خواجہ سرا بہت غریب لگتا ہے..اسے کبھی کبھار دس کا ایک نوٹ مل جاتا تھا..آج شام جب وہ گھر جائے گا تو اُس کی جیب میں پانچ چھ سو روپے ہوں گے تو وہ کتنا خوش ہوگا اور وہ اپنے لیے کوئی نیا لباس خریدنے کا منصوبہ بنائے گا، اچھا کھانا خریدے گا، آپ نے مجھے روک لیا ورنہ میں اُسے اس سے زیادہ رقم دینا چاہتا تھا..''

یہ درست کہ سلطان ٹھکیدار نے ایک شاندار شیش محل تعمیر کیا، لیکن اپنے لیے کیا، اپنے دوستوں کی عیش و عشرت کے لیے لیکن سعید بٹ نے ایک غریب خواجہ سرا کے خوابوں میں خواہشوں کی تکمیل کا ایک شیش محل بنا دیا..اپنے رزق حلال سے اُس کی حسرتوں کی آبیاری کر دی تو میرے لیے یہ شیش محل زیادہ خوبصورت اور روشن ہے..



''قرۃ العین حیدر کا لکھنؤ اور میرا لاہور''

''گلی گھنگھروسازاں'' کی نیم تاریکی میں کسی گھنگھرو کی چھنک سنائی نہ دیتی تھی، البتہ ایک مسجد کے ماتھے پر ''مسجد... گھنگھروسازاں'' نقش دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس گلی کا نام ابھی تک مشرف بہ اسلام کیوں نہیں ہوا.. جیسے لوہاری کے اندر ''چوک چکلا'' کا نام بدل دیا گیا اور کنہیالال کی تاریخ لاہور میں جس ''کنجری کی مسجد'' کا تذکرہ ہے، اُسے اب مائی موراں کی مسجد کہا جاتا ہے تو اسی طور ''گلی گھنگھروسازاں'' کا نام بدل کر ''گلی پرہیزگاراں'' کیوں نہیں رکھ دیا گیا..

''پھولوں والی گلی'' کے آغاز پر گیندے اور گلاب کے چند پھول سجائے ایک بزرگ براجمان تھے.. وہ جالا پھولوں والا کے فرزندار جمند تھے اور اُسی مقام پر براجمان تھے جہاں ڈیڑھ دوسو برس پیشتر اُن کے کسی بزرگ نے پھول فروخت کرنے کے کاروبار کا آغاز کیا تھا..

''گلی سُرجن سنگھ'' کے پہلو میں بمشکل تین فٹ چوڑی ایک تنگ گلی تھی.. اتنی تنگ کہ آپ بانہیں پھیلا دیں تو آپ کی ہتھیلیاں اس کے قدیم در و دیوار سے چھونے لگیں.. اتنی تنگ کہ اگر محبوب دوسری جانب سے چلا آ رہا ہو تو وہ آپ کے پہلو سے نکل کر آگے نہیں جاسکتا، بانہوں میں آ جائے گا اور اتنی تنگ کہ جنازہ اٹھ نہیں سکتا.. کہ اُس کی چوڑائی ایک چارپائی سے کم ہے، اُسے کاندھوں پر اٹھا کر گلی سرجن سنگھ میں لا کر چارپائی پر ڈالا جاتا ہے..

کوچہ دھوبیاں اور کوچہ قصائیاں میں ان دنوں نہ کوئی دھوبی ہیں اور نہ کوئی قصائی.. کوچہ کمانگراں میں اب کوئی ایسی کمانیں نہیں بناتا جن سے نکلے ہوئے تیر دلّی فتح کرتے تھے.. اور نہ ہی کوچہ تیراندازاں میں وہ تیر بنانے والے رہے تھے.. کوچہ چڑی ماراں میں بھی وہ لوگ نہ رہے تھے جو چڑیوں کو دام میں لاتے، اُن کے پر نوچ کر انہیں آزاد کرتے اور پھر ان پروں کو تیروں میں نصب کر کے انہیں ایسے توازن کرتے کہ وہ فضائے بسیط میں پرواز کرتے ہوئے ہوا کے دباؤ سے ذرّہ بھر اپنے نشانے سے نہ چوکتے.. یہاں تلواروں کو ڈھالنے والوں کے بھی کوچے تھے.. ان پر نقش و نگار بنانے والے باکمال ہنرمندوں کی گلیاں تھیں.. دنیا کے کتنے ہی عجائب گھروں میں خاص طور پر برلن میں ایسی تلواریں محفوظ ہیں جن پر نقش کیے گئے آرائشی گُل بوٹے حیرت

انگیز ہیں اور ان پر لاہوری ہنرمندوں کے نام درج ہیں.. ہمارے رسول اللہؐ کی شان میں کہے گئے ایک قصیدے میں ہندی تلوار کی تشبیہ تھی اور ان زمانوں میں وہ ہندی تلوار لاہور کے انہی کوچوں میں ساخت ہوتی تھی، اس تشبیہ کو رسول اللہؐ نے پسند فرمایا لیکن اسے بدلنے کا حکم دیا..

یہ کیسے کیسے ہنرمندوں اور ساجنوں کی گلیاں تھیں جن میں مَیں گھومتا تھا.

ایک صبح نوبہار میں اندرون شہر کے گلی کوچوں میں نکل آیا تھا..

بہت عرصہ گذر گیا جب قرۃ العین حیدر، پاکستان منتقل ہوکر، یہاں اپنے تئیں ہمیشہ کے لیے آباد ہو کر، اس سرزمین کو اپنا گھر بنا کر، ہر دل میں جاگزیں ہوکر، پھر "آگ کا دریا" لکھ کر شنید ہے کہ قدرت اللہ شہاب اور جمیل الدین عالی ایسے قابل صد تعظیم بزرگوں کی سرزنش سے پاکستان ترک کر کے پھر سے ہندوستان چلی گئیں. صرف شنید ہے اور شنیدہ کے بود مانند دیدہ..تو ہم تو ان زمانوں میں نابینا تھے، دید نہیں رکھتے تھے صرف سنی سنائی باتوں کی بات کرتے ہیں..عین ممکن ہے کہ ہماری سماعت میں ہی کچھ خلل واقع ہو تو جب قرۃ العین حیدر از اں بعد پہلی بار لاہور تشریف لائیں تو میرے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ مجھے عینی آپا کو فقیر خانہ میوزیم لے کر جانا ہے اور اندرونِ شہر کے گلی کوچوں میں لے جانا ہے..میں نے اس کا مختصر تذکرہ اپنے ناول "راکھ" میں بھی درج کیا ہے. فقیر خانہ میوزیم..مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پسندیدہ اور قابل اعتماد فقیر وزیر کے آباؤ اجداد کے نوادرات پر مشتمل ایک حیرت کدہ ہے. عینی آپا اس میوزیم کے نگہبان کی نسبت وہاں نمائش پر رکھے ہوئے نوادر کے بارے میں زیادہ جانتی تھیں..یہ وہ چوغا ہے جس کے اندر پورا قرآن پاک نقش ہے اور سلاطین اسے پہن کر میدان جنگ میں اترا کرتے تھے.. یا یہ وہ تسبیح ہے جو.. فقیر خانہ میوزیم میں عینی آپا کے جو مشاہدات تھے انہیں بیان کرنے کے لیے بہت وقت درکار ہے چنانچہ میں قصہ مختصر کرتا ہوں..

عینی آپا بار بار اپنے سرخ رنگے ہوئے بالوں کو سنوارتی، ہونٹوں پر لپ سٹک اور وہ بھی شوخ رنگ کی لپ سٹک درست کرتی لاہور کے اندرون کی ہر گلی، ہر کوچے میں جھانکتی، اُن کے ناموں کی تختیاں پڑھتی، ایک بار پلٹ کر انہوں نے کہا "مستنصر..یہ تو ہو بہو پُرانا لکھنؤ ہے.."

اس پر میں نے اُن سے بہت ڈرتے ہوئے کہ وہ ایک نہایت مختصر برداشت کی، قہر آلود آپا تھیں، کہا کہ.. عینی آپا لکھنؤ اور لاہور میں ایک فرق ہے..وہ لکھنؤ تو کب کا مر چکا..اور یہ لاہور زندہ ہے..ظاہر ہے یہ مکالمے کسی ٹیپ ریکارڈر میں تو محفوظ نہ ہوئے کہ ہو بہو اُن کی نقل کی جائے لیکن..اُن کا نچوڑ جو یادداشت میں ہے، بس یہی تھا..میرا خیال ہے کہ انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا تھا.. ہاں تم ٹھیک کہتے ہو..

وہ ایک الگ قصّہ ہے جب ایک دوپہر وہ میرے گھر کے گیٹ کے باہر اپنی ایک کزن جو کہ حیدر تھیں اُن کے ہمراہ میرے لیے ایک کیک تھامے کھڑی تھیں کہ کہاں ہے وہ تمہاری اکلوتی بیٹی جس کا نام تم

نے قرۃ العین رکھا ہے، میں تو اُسے ملنے کے لیے آئی ہوں..

اُس صبح نو بہار میں دلّی کی جانب رخ کیے ہوئے قدیم لاہوری..دلّی دروازے کے باہر ماڈل ٹاؤن پارک میں جو دوست ''تکیہ تارڑ'' کے ملنگ تھے ان کی کاریں پارک ہونے لگیں، تنویر خواجہ، قریشی صاحب، شیخ مبارک، ڈاکٹر نسم، سعید بٹ، نعیم قریشی، ڈاکٹر انیس احمد، سیف، امجد..دلّی دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ لگے ایک باریش اور نہایت نستعلیق اردو بولنے والے ایک بزرگ عوام الناس کو مخاطب کر رہے تھے ''حضرات جوڑوں کا درد ہو، آدھے سر کا درد ہو، گھٹنے کام نہ کرتے ہوں، سرسام ہو گیا ہو..بخار جان نہ چھوڑتا ہو..قوت مردمی میں زوال کے آثار ہوں تو میرے اُن بزرگوں کے کُشتے ..صرف پچیس روپے میں حاصل کریں جو مُغل بادشاہوں کی تقویت کا سبب بنتے تھے..''میں بے شک زوال کے آثار والے حوالے سے ان بزرگ کے قدیمی نسخوں سے استفادہ کرنے کے لیے رُک جاتا.. پر کیسے رُکتا وہاں ہمارے استقبال کے لیے نہایت ہی شریف اور متشرع ایوب اور اعجاز تھے اور وہ شیخ بھی تھے..انہیں ہم شیروں کی جوڑی کہا کرتے ہیں..



''شاہی حمام میں ناشتہ اور دِینا ناتھ کی حویلی''

چنانچہ لاہور کے دلّی دروازے کے باہر جہاں ایک بزرگ قوت مردمی کے کُشتے فروخت کر رہے تھے، جو مغل بادشاہوں کی تقویت کا سبب بنتے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر پچیس روپے میں ہاتھ آئے تو برا کیا ہے جب میں نے دیکھا کہ شیخوں کی جوڑی جنہیں ہم شیروں کی جوڑی کہتے تھے یعنی محترم ایوب اور اعجاز ہمارے استقبال کے لیے چلے آ رہے ہیں.. ان دونوں حضرات کی آبائی رہائش گاہیں اسی علاقے میں ہوا کرتی تھیں جہاں سے وہ جدید آبادیوں کی جانب کُوچ کر گئے تھے لیکن اُن کے دل ابھی تک اپنے پرانے لاہور میں ہی بھٹکتے تھے.. چھٹی کا دن تھا اس لیے قدیم کوچہ و بازار میں ہجوم نہ تھا. صرف ان دکانوں، تھڑوں اور ریڑھیوں کے گرد ہجوم تھا جہاں سے صبح کے لذیذ ناشتے دستیاب تھے.. ہر دو شیخ حضرات نے نہایت فخر سے ان دکانوں کی نشاندہی کی جہاں اُن کے بزرگ کاروبار کیا کرتے تھے.. سب سے پہلے وہ ہمیں گلی سُرجن سنگھ لے گئے جس کے بوسیدہ ہو چکے قدیم مکانوں کو آغا خان فاؤنڈیشن کے مالی تعاون سے یوں بحال اور نوتعمیر کیا گیا ہے جیسے وہ صدیوں پیشتر اس شہر میں چھب دکھلاتے لوگوں کے دلوں کو اپنی تعمیراتی زیبائش اور کشش سے موہ لیتے تھے.. یہاں شیخ حضرات کی ایک عزیزہ وجیہہ اشرف ہماری راہنمائی کے لیے موجود تھیں.. وجیہہ نیشنل کالج آف آرٹس کی طالبہ ہے اور اُس نے آغا خان فاؤنڈیشن کے قدیم لاہور کو بحال کرنے کے منصوبے میں رضاکارانہ طور پر دو برس کام کیا ہے، وہ انہی قدیم گلیوں کی جم پَل ہے اور ایک پکّی لاہورن ہے جسے اپنے قدیم شہر سے عشق ہے..

ان پرانے مکانوں کی نوتعمیر کے لیے وہی میٹریل استعمال کیا گیا ہے جو صدیوں پیشتر تعمیر کے لیے استعمال کیا جاتا تھا.. نانک شاہی چھوٹی اینٹوں کو خصوصی طور پر بنوایا گیا.. وہی جھروکے اور شہتیروں کی وہی چھتیں اور وہی فرش.. یہ جسے انگریزی میں کہتے ہیں کہ محبت کی مزدوری تھی.. ایک گھر کے خصوصی لاہوری انداز میں بولنے والے مکین نے بتایا کہ اُن کے گھر کو جو بوسیدہ ہو کر گرنے کو تھا، پچاس لاکھ روپے کی لاگت سے بحال کیا گیا اور انہیں صرف پانچ لاکھ ادا کرنے کے لیے درخواست کی گئی اور وہ بھی قسطوں میں.. وہ آٹھ ماہ کے لیے کسی اور مکان میں شفٹ ہو گئے اور جب واپس آئے تو اپنے مکان کی شاہانہ اور دیدہ زیب شکل دیکھ کر حیران رہ

گئے..ان کے برابر میں جو مکان تھا وہ اتنا خوش نما اور شاندار شکل کا تھا کہ اُس سے نظریں نہ ہٹتی تھیں..اُس کی تیسری منزل پر واقع ایک جھروکے میں سے سرخ کپڑوں میں ملبوس ایک خوش نظر خاتون بار بار گلی میں جھانکتی ہمیں دیکھتی تھی اور روپوش ہو جاتی تھی..وہ صاحب ہمیں اپنے گھر کے اندر لے گئے.... باورچی خانہ اور واش روم جدید ترین سہولتوں سے آراستہ تھے لیکن بقیہ گھر قدامت کی پرسکون ٹھنڈک میں ڈوبا ہوا تھا..اگرچہ عدم نے تو مے خانے کے بارے میں کہا تھا کہ یہاں کوئی آفت نہیں آتی لیکن اس قدیم گھر کے ایک کمرے میں قدم رکھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ دراصل یہاں کوئی آفت نہیں آ سکتی..اس پوشیدہ نیم تاریک کمرے کی ٹھنڈک بھری پرسکون تنہائی میں بیٹھ کر ایک کیسا شاندار ناول لکھا جا سکتا تھا..

سُرجن سنگھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک شہرۂ آفاق حکیم تھا، شاعری بھی کرتا تھا اور اس گلی میں اُس کا مطب تھا..

ایک پرانی پنجابی لاہوری کہاوت ہے جس کا بہت ہی آزاد ترجمہ کچھ یوں ہے کہ..ذرا مجھے بتاؤ تو سہی کہ اس لاہور شہر اندر کتنے دروازے اور کتنی کھڑکیاں ہیں..اور ذرا مجھے بتاؤ تو سہی کہ اس شہر لاہور اندر کتنے کنویں ہیں اور ان میں کتنے میٹھے پانی کے ہیں اور کتنے کڑوے پانی کے ہیں..اس سوال کا جواب آتا ہے کہ..جن کنویں سے معشوق پانی بھرتے ہیں اُن کے پانی میٹھے ہیں اور باقی سب کے سب کڑوے پانیوں والے ہیں..

مجھے اُس قدیم مکان کے جھروکے میں سے جھانکتی اور پھر پیچھے ہٹتی لڑکی کو دیکھ کر خیال آیا کہ یہ جس کنویں سے پانی بھرتی ہوگی اُس کے پانی یقیناً میٹھے ہوں گے..

چونکہ ہم میں سے بیشتر باباجات تھے..بابا بلیک شیپ تھے اس لیے تھکاوٹ، نقاہت اور بھوک سے ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا..اس اندھیرے کو روشن کرنے کی خاطر ہر دو شیخ برادران نے دلّی دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی بائیں جانب جو مغل عہد کا شاہی حمام تھا اُس میں ہمارے لیے ایک شاہی ناشتے کا اہتمام کر رکھا تھا..انہوں نے شیخ حضرات کی روایتی کنجوسی کی داستانوں کو باطل ثابت کر دیا..ویسے مجھے قیمہ اور بند گوبھی بھرے قتلمے، انڈوں سے مزّین چنوں کے ساتھ کھاتے ہوئے مسلسل یہ خیال آتا رہا کہ اس شاہی حمام میں جانے کیسے کیسے لوگ... مغل شہزادے.. سکھ سردار نہاتے ہوں گے یا پھر انہوں نے کس کس کو نہلایا ہوگا..ان میں سے کچھ شہزادیاں اور سردارنیاں بھی تو ہوں گی..جنہیں غسل کی حاجت ہوگی..

پھولوں والی گلی کے آغاز پر جالا پھولوں والا کا بزرگ ہو چکا بیٹا گیندے اور گلاب کے چند پھولوں پر پانی چھڑک رہا تھا..

اس گلی کے اختتام پر حویلی دِینا ناتھ کی ایک دیوار بلند ہوتی تھی..دیواروں میں کہیں کہیں کبوتروں

کے بسیرے تھے..گلی کے آخر میں ایک سکول تھا جس کے بارے میں شیخ ایوب کہنے لگے" تارڑ صاحب میں آج سے ساٹھ برس پیشتر اس سکول میں داخل ہوا تو ماسٹر صاحب نے کہا" اوئے تیرے کپڑے اتنے صاف ستھرے ہیں کہ میں تمہیں کہاں بٹھاؤں؟"

حویلی دینا ناتھ کے اندر بُھول بھلّیاں تھیں، درجنوں خاندان آباد تھے..نیم تاریک چھوٹی اینٹوں کی سیڑھیاں تھیں، ایسے سالخوردہ دروازے تھے جن کی چوکھٹ پر زمانوں کے اتنے قدم پڑ چکے تھے کہ وہ دم توڑنے کو تھیں..

ایک بوڑھا ہاتھ میں ایک دَف تھامے تاریکی میں سے برآمد ہوا..میں ٹھٹک گیا..اور وہ بھی ٹھٹک گیا..

"بابا جی آپ کیا کرتے ہو؟" میں نے پوچھا..

"میں..صدا دیتا ہوں.."

"کس کو صدا دیتے ہیں؟"

"میں اپنے پیارے رسول ﷺ کو صدائیں دیتا ہوں.."

وہ دف بجانے لگا..اور پھر اپنے اور پیارے رسول ﷺ کو صدائیں دینے لگا..



''لاہور، جو لاہور تھا''

بوڑھا دَف نواز حویلی دِینا ناتھ کی بھول بھلیوں میں اپنی دَف سے حیرت انگیز تال سُر میں لاتا تھا اور رسول اللہؐ کو صدائیں دیتا تھا، اُن کی شان بیان کرتا تھا، کسی چلمن کے پیچھے سے ایک چوڑیوں سے کھنکتا ہاتھ آتا اور اسے کچھ رقم تھما دیتا...... ایک بچہ آیا جس نے دف نواز کی پوٹلی میں ایک دو روٹیاں رکھ دیں۔ ہم نے بھی حسب توفیق اُس کے فن کی داد دی...... بابا کب سے یہ دف بجاتے صدائیں دیتے ہو؟...... بچپن سے، تب میرا باپ دف بجاتا تھا...... اور میرے باپ کا باپ بھی...... ہم صدائیں دینے والے ہیں...... جب ندیم شیخ نے اپنے کیمرے کا رخ اس کی جانب کیا تو وہ کہنے لگا...... نہیں باؤ جی...... میں فوٹو نہیں کھنچواتا۔ بے ادبی ہوتی ہے۔

ہم لاہور شہر کی قدامت میں حیرت زدہ بچوں کی مانند گھومتے تھے، سینکڑوں برس پرانے دروازوں کی نقاشی کو چھوتے تھے تو گویا اُن ہنرمندوں کی انگلیوں کو چھوتے تھے جنہوں نے انہیں تخلیق کیا۔ گلیوں میں اُڈتے مسمار ہونے والے جھروکوں کو سر اٹھا کر تکتے تھے...... ہم ایک قدیم تاریخی سحر کی قید میں آ گئے تھے۔

یہ جو ماڈل ٹاؤن پارک کے صبح کی سیر والے دوستوں کا گروپ تھا، اس میں بھانت بھانت کے دوست شامل تھے۔ کچھ تصویریں اتارتے تھے اور کچھ ان قدیم در و دیوار کو دل میں اتارتے تھے۔ تھڑے پر بیٹھے کچوریاں کھاتے چند لاہوری بابو نے ہمیں دیکھ کر کہا...... اوئے پتہ ہے یہ کون لوگ ہیں...... یہ ہماری تصویریں اتار کر بڑے ڈالر کماتے ہیں۔ انہیں باہر کے ملکوں والے بہت بڑی تنخواہیں دیتے ہیں ورنہ یہ یہاں دھکّے کھانے کے لیے کیوں آ جاتے...... ظاہر ہے وہ ہمیں کسی این جی او کے ارکان سمجھ رہے تھے۔

ایک حلوہ پوڑی کی دکان پر اتنا ہجوم تھا کہ شاید آخری گاہک کی باری شام کو آنی تھی...... شیخ ایوب نے بتایا کہ یہ ایک سینکڑوں برس پرانی دکان ہے جس کی پوڑیوں کی خستگی اور ذائقے کا کوئی جواب نہ تھا...... سری پائے اور مغز وغیرہ کے علاوہ وہاں ناشتے کی ایک ایسی خوراک تھی جو معدوم ہو جانے کے قریب تھی...... انہیں داس کلچہ کہا

جاتا ہے۔انہیں چنوں، اچاراور ''لونچڑوں'' کے ساتھ کھایا جاتا ہے......لونچڑے بُوندنما چھوٹے چھوٹے پکوڑے ہوتے ہیں۔ایک صاحب کڑاہی کے آگے آلتی پالتی مارے یہ لونچڑے تل رہے تھے۔بسم اللہ تارڑ صاحب...... ذرا ہمارا ایک لونچڑا تو چکھ لو...... مُنہ میں گھُل جائے گا۔میں نے ایک نہیں بہت سے لونچڑے چکھے اور واقعی ان کا ذائقہ عام پکوڑوں سے جدا تھا۔کہا جاتا ہے کہ قدیم شہر کے اندر اب صرف ایک تندور باقی ہے جہاں داس کلچے لگتے ہیں۔تندورچی بہت عمر رسیدہ ہو چکا ہے۔اس کے رخصت ہونے پر داس کلچوں کی سینکڑوں برس پرانی روایت بھی رخصت ہو جائے گی۔

لاہور کا فصیلوں اور دروازوں کے اندر جو شہر اپنی قدامت میں زندہ ہے، دمشق اور قرطبہ کی گلیوں سے کم نہیں لیکن بہت کم تخلیق کاروں نے اس کی جانب توجہ کی ہے...... ہم مرے ہوئے دفن ہو چکے شہروں کو اپنے افسانوں اور ناولوں میں بیان کرتے رہے اور اپنے زندہ شہر کی جانب توجہ نہ کی......لیکن یہ بھی نہیں کہ یہ کسی کے لیے بھی ایک شہرِ آرزو نہ بنا۔اے حمید کا ناول ''ڈربے'' جو اس کی رومانوی تحریروں کے انبار میں دب گیا۔ریاض شاہد کی فلم ''سسرال'' جس میں یوسف خان پرانے شہر کی چھتوں پر کبوتر اڑاتا ہے......علاؤ الدین ایک بینڈ کے ساتھ بھونپو بجاتا ہے۔جی ہاں وہی ''سسرال'' جس میں حسن لطیف ملک کی ترتیب شدہ موسیقی تھی۔منیر نیازی کے گیت تھے اور نور جہاں پکارتی تھی کہ جا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سو جا اور مہدی حسن کی آواز دل میں اترتی تھی کہ......جس نے میرے دل کو درد دیا، اُس شکل کو میں نے بھلایا نہیں۔

''نقوش'' کے لاہور نمبر نے اس شہر کے ادیبوں، شاعروں...... موسیقاروں، تاریخ نگاروں، گویّوں، اکھاڑوں اور تکیوں کو محفوظ کر لیا......مصوروں میں ڈاکٹر اعجاز انور نے اپنے واٹر کلرز کے معجزے میں مسمار ہوتی، کمرشل ازم کی یلغار سے گم ہوتی لاہور کی عمارتوں کو محفوظ کر لیا۔محبوب اور غلام مصطفیٰ نے اس کے کوچہ و بازار میں اترتی روشنیوں کو تصویر کیا، نذیر احمد نے دریائے راوی کو اپنے کینوس پر یوں اتارا کہ وہ بہتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ہیرا منڈی میں جنم لینے والے اقبال حسین نے اپنی خالاؤں اور پھوپھیوں کو مصّور کیا جو اس بازار کی رونق ہوا کرتی تھیں اور پھر اپنے آبائی گھر میں ایک ایسا ریستوران قائم کیا جس کی چھت سے دنیا کا سب سے شاندار اور شاہی منظر نظر آتا ہے۔امریکی جریدہ ''ٹائم'' میں اس کا تذکرہ ہوا۔قریب ہی احمد چیمہ کا ریستوران ''انداز'' ہے جہاں ایک انگریزی روزنامے کے کالم نگار کے مطابق لاہور کی بہترین خوراک دستیاب ہے...... میں نے بھی ایک کمتر سطح پر اندرون شہر کو اپنے ڈراموں اور ناولوں کا موضوع بنایا ہے...... ''سورج کے ساتھ ساتھ'' میں آج سے اسّی برس پیشتر کا لاہور ہے۔''راکھ'' اور ''خس و خاشاک زمانے'' میں اگر قدیم لاہور نہ ہوتا تو یہ ناول بھی نہ ہوتے۔

''شیراں والا دروازہ'' ایک زمانے میں ''خضری دروازہ'' کہلاتا تھا کہ دریائے راوی اس کی چوکھٹ

تلے بہتا تھا، خواجہ خضر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس کے دروازے کے دونوں جانب دو شیر باندھ دیئے اور یہ تب سے شیراں والا دروازہ کہلاتا ہے۔

حویلی دھیان سنگھ...... رنجیت سنگھ کے ایک وزیراعظم کی حویلی...... جسے نوتعمیر کیا گیا اور اب وہاں ایک گرلز کالج ہے جس کا نام فاطمہ جناح گرلز کالج رکھ دیا گیا ہے۔ اگر اسے دھیان سنگھ گرلز کالج کے نام سے پکارا جاتا تو کیا قباحت تھی۔ میں نے دنیا بھر کے شاہی محلات، حویلیاں، شاہانہ گھر اور قلعے دیکھے ہیں لیکن حویلی دھیان سنگھ اُن سب پر سبقت رکھتی ہے۔ اس لیے بھی کہ وہ میرے لاہور میں ہے۔ اس کا تفصیلی تذکرہ پھر کبھی سہی۔ حویلی کے قریب مغل عہد کی مسجد مریم زمانی کی دیدہ زیب نقاشی کی چھاؤں تلے ہم نے دو نفل ادا کیے اور پھر اُس سحر سے نکل آئے جو کہ قدیم لاہور تھی۔ باہر جدید عمارتوں، بے ہنگم ٹریفک کا شور تھا...... یہاں کوئی بھی اپنے رسول اللہ ﷺ کو صدائیں نہ دیتا تھا...... صدائیں، لالچ، خودغرضی اور کرپشن کی تھیں۔



"آوارگی میں ہم نے لاہور کے
زمانوں کی سیر کی"

1- ''وہ گمشدہ نہر جو کبھی لاہور کے گلے کا آبی ہار ہوا کرتی تھی''

2- ''حویلی ثانی نواب میاں خاں المشہور پتھراں والی حویلی''

3- ''مسجد بوکن خاں..کعبۂ ثانی بنا شد ایں مقام 1257 ہجری''

4- ''تکیہ سادھواں اور مزار گنج شہیداں''

5- ''مسجد چینیاں والی..نابود!''

6- ''محلّہ تیراندازاں اور کمانگراں گلی''

7- ''مسجدِ زیبا نگار، مسجد محمد صالح کمبوہ''

8- ''موچی دروازے میں دل ہوا بوکاٹا''

9- ''گوروارجن دیو کا لال کھوہ اور میاں میر صاحب کی برفی''

10- ''بابا چور بادشاہ، معصوم شاہ اور بابا شاہ مراد''

11- ''کوچہ پیر گیلانیاں اور مسجد میاں گاماں''

12- ''آصف، ایک کٹھور گڈریا اور سنہری مسجد کا سنہرا پن''

13- ''حویلی مراتب علی شاہ اور حویلی علی سائیں پہلوان کا خواجہ نائک''

14- ''دل کے خلوت کدہ کا چراغ..مُوسے آہن گر''

''وہ گمشدہ نہر، جو کبھی لاہور کے گلے کا آبی ہار ہوا کرتی تھی''

ایک اور دِن..

ایک اور نیم سرد سویر میں یہ ہم تھے، موچی دروازے کی قربت میں مُردوں والی گھاٹی کے پہلو میں سرکلر روڈ کے فٹ پاتھ پر کھڑے یہ ہم تھے..

یہیں وہ نہر تھی، جس کے پانی سرد اور ٹھنڈک بھرے تھے، دریائے راوی سے جدا ہو کر لاہور کے قدیم شہر کے گرد ایک آبی گہنے کی مانند سجے ہولے ہولے بہتے تھے اور جہاں سے لاہور کا پہلا پرانا مکان نانک شاہی اینٹوں سے تعمیر کردہ خبر کرتا تھا کہ اب جو بھی ایک بوسیدہ اور کھنڈر ہوتے طلسم کی گرفت میں آنا چاہے تو میرے پہلو میں جو تنگ گلی ہے، اس میں داخل ہو جاوے وہاں تک باغ، باغیچے اور گلزار تھے، گلابوں کے تختے تھے..اُس نہر اور شہر کی پہلی دیواروں کے درمیان کیسے کیسے باغ بہاراں اور گلزاراں تھے..گویا مہاراجہ رام چندر کے بیٹے مہاراج لوہ کے بسائے ہوئے شہر کے گرد ایک تو اُس مختصر پاٹ کی نہر کی روانی حمائل تھی اور دوسرے ہریاول، پھولوں اور گھنے شجروں کی ہریاول ایک آراستہ زیور کی مانند اُسے اپنے گھیرے میں لیتی تھی..

مجھے وہ گدلے لیکن سرد مزاج کے پانیوں والی نہر اور اُس کے کناروں پر جو گلشن بہار کے تھے، وہ ذرا ذرا سے یاد ہیں..

''مجھے یاد ہے ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو..''

سردیوں کی سویروں میں اور گرمیوں کی شاموں میں، اہل لاہور اپنے تنگ اور سورج کی روشنی سے محروم، گیلے سیلے گھروں کی کوٹھڑیوں میں سے نکلتے اور یہاں رونقیں لگ جاتیں، اس نہر کے کنارے پیپل، برگد اور آم کے شجروں کے سائے میں میلے لگ جاتے..بوڑھے چوپٹ کھیلتے، بٹیر باز اپنے بٹیر پنجروں سے نکال کر انہیں ٹہلاتے..کبوتر باز اپنے من پسند کبوتروں کو پرواز کی مشق کرواتے..جگہ جگہ پرندوں کے پنجرے نہر کنارے اور پرندے چہکتے اور گوکتے..پہلوان ڈنڈ بیٹھکیں لگاتے اور باغ میں اپنے مخصوص اکھاڑوں میں زور کرتے، اپنے پٹھوں کو داؤ پیچ سکھاتے اور جوان ہوتے لاہوری بچوں کو ہدایت کی جاتی کہ ان پہلوانوں کی قربت سے گریز کریں کہ ان میں سے کچھ نہ بٹیر باز اور نہ کبوتر باز بلکہ کچھ اور باز ہوتے تھے چنانچہ مُنڈے اُن

سے پرے پرے رہتے..

پنجابی شاعروں کی منڈلیاں جمتیں جن میں اُستاد گام اور استاد عشق لہر کے تازہ ترین کلام کی کشتیاں نہر کے پانیوں پر ہلکورے لینے لگتیں.. عورتوں کی محفلیں ذرا الگ ہوتیں اور وہ اکثر اسی نہر میں اپنے کپڑے دھوتیں اور پھر فارغ ہو کر تازہ ترین سکینڈلز کے بارے میں سرگوشیاں کرتیں کہ اُن زمانوں میں کوٹھا عشق کا چلن تھا، مکان ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوتے تھے اور عاشق حضرات صرف وہی ہوتے تھے جو کوٹھے پھلانگ کر اُس کوٹھے پر دھم سے کود جائیں جہاں اُن کا محبوب ننگے پاؤں اور ننگے سر اپنے ماں باپ کو بھری دوپہر میں سوتا چھوڑ کر منتظر ہو...وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے...

بے شک یہ اندرونِ شہر نہ تھا، مال روڈ، یعنی ٹھنڈی سڑک پر واقع لکشمی مینشن کا محلّہ تھا، پر وہاں بھی تو کوٹھے تھے اور سلگتی دوپہر میں مجھے بھی اُس کا ننگے پاؤں آنا یاد ہے..

لاہور کی وہ نہر جو شہر کے گلے میں پانی کی ایک مالا تھی، مجھے یاد ہے ذرا ذرا.. میں اپنی تیسری ممانی کے کالے کلوٹے بھائی اعظم کے ساتھ، اُس کے بہلانے پھسلانے پر چوری چھپے، محض پانچ برس کی عمر میں، چیمبرلین روڈ کے مکان سے فرار ہو کر اُس چمن زار میں جا نکلا تھا اور..وہاں موجود درجنوں لاہوری بچوں کو نہر میں چھلانگیں لگاتے، ڈبکیاں لگاتے دیکھ کر رہ نہ سکا تھا اور میں بھی اُس کے پانیوں میں کود گیا تھا، خوب خوب ڈبکیاں لگائی تھیں اور مجھے یاد ہے کہ پانی اتنے برفیلے تھے کہ میرا بدن کانپنے لگا تھا اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اُن پانیوں کی سرد تازگی نے مجھے زندگی کے سرور سے آشنا کیا تھا..

اگرچہ گھر واپسی پر وہ سرور کافور ہو گیا.. ماموں جان قبلہ نے میرے بالوں میں اٹکے کچھ تنکوں سے اندازہ لگا لیا، میرے گیلے بالوں سے جان گئے کہ برخوردار نہر میں ڈبکیاں لگا کر آیا ہے تو انہوں نے مجھے حسب دستور زدوکوب یوں کیا کہ سب سرور، کافور ہو گیا.. مجھے یاد ہے ذرا ذرا.. یہ ستّر برس سے زائد کے قصّے ہیں جب آتش نہیں تار ڑ جوان نہیں ایک بچہ ہوا کرتا تھا..

یہیں وہ نہر تھی..وہ کدھر گئی، کیا ہوئی..

''حاجی صاحب، یہ جو سر کلر روڈ کے کناروں پر سینکڑوں دکانیں اور کھوکھے ہیں، وہ نہر یہاں ہوا کرتی تھی، ان کے نیچے دفن ہو چکی ہے..''

ہم مُردوں والی گھاٹی کے پہلو میں کھڑے اپنے دوستوں کی آمد کے منتظر تھے..شہر لاہور کے اندرون میں اٹھنے والے جنازے اسی گھاٹی سے اترتے میانی صاحب کے قبرستان کی جانب اپنا آخری سفر کرتے...اور میں اگر ان دنوں ایک ایسے شخص کی مانند ہیجان اور بے چینی میں مبتلا تھا جسے خبر ہو گئی ہو کہ کسی بھی لمحے موت اُس کے شکستہ بدن کو، اس ناپائیدار حویلی کے ستونوں اور چھجوں اور جھروکوں کو مسمار کر دے گی تو اُس

پر ایک فنا کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ جو کچھ کرنا ہے کر لو، جو دیکھنا ہے دیکھ لو، وہ جو سانس نقارہ کوچ کا ہے، اُس کی نوبت باج رہی ہے.. تو اسی لیے میں نے محسوس کر لیا تھا کہ صرف میری روح کی حویلی ہی نہیں، شہر لاہور کی حویلیاں، قدیم محلے، مسجدیں، مندروں کے آثار، گلی کوچے، تاریخ کی سب عمارتیں، تمام نشانیاں، ساری گواہیاں، مٹنے کو ہیں، نابود ہونے والی ہیں تو انہیں دیکھ لو..

اِن عبارتوں، عمارتوں اور گواہوں کے جنازے اُٹھتے جا رہے ہیں، انہیں دیکھ لو.. چیمبرلین روڈ پر اترتی مُردوں کی گھاٹی سے جنازے اتر رہے ہیں، میں کم از کم اُس جنازے کو تو کاندھا دوں جو اس شہر کی بے مثال نہر اور باغ باغیچوں کا ہے، اُن باغوں میں..

باغوں میں پڑے جھولے.. تم بھول گئے ہم کو.. ہم تم کو نہیں بھولے..

تو اُن جھولوں کے جنازے بھی مُردوں کی گھاٹی سے اترتے جاتے ہیں..

''حاجی صاحب.. ماڈل ٹاؤن پارک کے سب دِلدار آ گئے ہیں، میرا یہ پُتر جو بیٹیوں جیسا ہے، آ گیا ہے.. یہ آپ کا میزبان ہے، آج آپ کو موچی دروازے کے اندر جو بھول بھلیاں ہیں، جو گلیاں ہیں، اُن میں لے چلے گا..''

دلدار جتنے بھی تھے سب کے سب اپنی ذات میں انجمن تھے.. اگرچہ فلموں والی فربہ، موٹی انجمن کب کی ایک زنگ آلود انجن ہو چکی تھی..

ایک سیاہ کشش کا حامل، روٹھا ہوا، فہد.. ڈاکٹر نسیم دندان ساز، شیخ ندیم مزنگ والا، کرنل عامر تازہ ترین رنگروٹ.. ایسے دِلدار تھے.. اور اُس بادامی آنکھوں والے شرمیلے گوجر کے بارے میں کیا کہوں کہ وہ.. سُن وے بلوری اَکھ والیا.. تھا.. ہم نے آج موچی دروازے کے گلی کُوچوں میں بھٹکنا تھا..

موچی دروازے کا نام عہدِ اکبری میں جب کہ لاہور مغل سلطنت کا صدر مقام تھا، موتی گیٹ تھا، موتی نام کا ایک ہندو چوکیدار تھا جو تمام عمر اس دروازے کی حفاظت پر تعینات رہا اور اُس کی خدمت کے اعزاز میں اسے موتی گیٹ کا نام دیا گیا جو کہ بگڑ کر موچی گیٹ ہو گیا..

ہم سرکلر روڈ کے پار گئے..

یکدم میں ٹھٹک گیا.. بس یہیں 1947ء میں جب میں مشن ہائی سکول سے نکل کر اپنے گھر جانے کے لیے ایک خوفزدہ بچہ تھا کہ شہر میں کرفیو کا اعلان ہو چکا تھا تو میں نے، بس یہیں اِسی فٹ پاتھ پر اپنی زندگی کی پہلی لاش دیکھی تھی.. اور لاش کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، وہ ہندو تھی یا مسلمان، مجھے یاد نہیں..

حیرت انگیز طور پر سرکلر روڈ کے کناروں پر ہجوم کرتی دکانوں اور کھوکھوں کے درمیان میں داخلے کا ایک شگاف تھا..

اور ہم اُس شگاف میں داخل ہوئے تو یکدم میں شدید حیرت اور سرخوشی میں مبتلا ہوا کہ بے شک وہ نہر تو کب کی دکانوں تلے دفن ہو چکی لیکن وہاں میرے سامنے ابھی تک موجود ایک فراموش ہو جانے والا گلزار، ایک باغ، ایک صحن تھا.. بے شک گلاب کی کیاریوں پر بہار نہ تھی، پژمردگی تھی لیکن.. ابھی تک وہ پرانے درخت، اگرچہ ڈھول سے اٹے، پیپل، آم اور برگد کے درخت موجود تھے.. میرے لیے یہ ایک خوشگوار ہیجان خیزی کا لمحہ تھا.. مجھے یاد تھا ذرا ذرا.. ہاں یہی شجر آج سے ستّر برس پیشتر سایہ دار اور گھنے ہوتے تھے اور ان کی ڈالیوں میں جھولے پڑتے تھے اور میں اُن کو نہیں بُھولا تھا..

یقیناً یہ میرا واہمہ تھا کہ مجھے ایک آبی سسکی سنائی دی جو کہ بہت سرد تھی.. تصور کی اتھری گھوڑی کو ذرا مہمیز دو، میں اگرچہ کب کی تاجروں اور دکانداروں کی ہوس کا شکار ہو کر دفن ہو چکی ہوں لیکن آؤ.. میرے راوی کے پانیوں میں کچھ دیر تو ڈوب جاؤ.. بے شک تم چھہتر برس کے ہو گئے ہو لیکن میرے پانیوں میں اترو گے تو نوخیز ہو جاؤ گے.. جیسے رائڈر ہیگرڈ کی ''شی'' عائشہ جب بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ کر ایک جھریوں بھری بوڑھی ہو جاتی تھی تو ایک آگ میں جل کر پھر سے نوخیز اور حسن انگیز ہو جاتی تھی.. تم بھی میرے پانیوں میں اترو، پانچ برس کے وہی بچے ہو جاؤ گے، اترو تو سہی..

یہ سب بڑھاپے کی سرگوشیاں تھیں.. خبط کے آثار تھے..



''حویلی ثانی نواب میاں خاں المشہور پتھراں والی حویلی''

یہ جو لاہور شہر کے گرد باغات کے سلسلے تھے، ہم نے ان کو پار کیا اور ایک گندے نالے کو عبور کیا جسے بدرو بھی کہتے ہیں، اور شہر لاہور کی گندگی اور غلاظت کا اخراج بہتا ہوا، بوڑھے راوی میں جا گرتا تھا... یہ بدرو.. یعنی بُری بہنے والی شے، مغلوں کے زمانے میں تعمیر ہوئی، ذرا سا جھانکنے سے گندگی کے انباروں تلے، ابھی تک چھوٹی اینٹوں کی تعمیر دکھائی دیتی ہے..

اس بدرو کو عبور کر کے ہم ایک تنگ گلی میں قدم رنجہ فرماتے ہیں اور ان قدموں تلے بے شک مغل عہد کی سرخ اینٹیں ہیں پر گندگی بھی ہے..

مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ان نیم تاریک کوچوں میں وہ کون لوگ ہیں جو زندگی بسر کرتے ہیں، جن کے چہرے دھوپ سے کم آشنا ہوتے ہیں، سیلن زدہ تنگ اور نیم اندھیاری کوٹھریوں میں پرورش پانے والی لڑکیاں بھی تو سیلی سیلی ہوں گی.. البتہ جن مکانوں کے کوٹھے ہوتے تھے اور سب کے تو نہیں ہوتے تھے، وہاں وہ چھت پر جا کر اپنے آپ کو دُھوپ لگواتی ہوں گی اور ان کی سیلن قدرے کم ہو جاتی ہو گی، کچھ نکھرتی جاتی ہوں گی، کچھ گدرا جاتی ہوں گی.. ایسے نیم اندھیارے مکانوں میں جو قیام کیے جاتے ہیں وہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں، زیادہ تر ایسے جن کے پاس حیات بسر کرنے کا کوئی اور متبادل مقام نہیں ہوتا اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو شہر لاہور کی ان تنگ گلیوں.. اور وہاں متعدد ایسی گلیاں بھی ہیں جہاں مجھ ایسا بدہیئت شخص اپنی توند کے ساتھ داخل ہو جائے تو پھنس جاتا ہے اور اسے ذرا پہلو بدل کر سرکنا پڑتا ہے.. سامنے کوئی اور مکین چلا آئے تو اسے راہ دینے کی خاطر کسی چوکھٹ کے ساتھ سانس روک کر کھڑا ہونا پڑتا ہے.. یہاں مرگ ہو جائے تو چارپائی کے لیے گذرگاہ ممکن نہیں ہوتی چنانچہ مُردے کو کاندھوں پر ڈال کر باہر لے جا کر قدرے فراخ گلی میں منتظر چارپائی پر ڈال کر مُردوں کی گھاٹی کا رخ کیا جاتا ہے.. تو کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو شہر لاہور کی تنگ گلیوں میں حیات کرتے ان بوسیدہ مکانوں کی چھوٹی اینٹوں کے درمیان جڑیں پکڑ جاتے ہیں، وہ پیپل کے بوٹوں کی مانند ان کی درزوں میں سے اُگ آتے ہیں، جیسے کنویں کی گولائی میں سے نم آلود اینٹوں میں سے پیپل پھوٹنے لگتے ہیں.. تو ایسے لوگوں کے لیے اپنی جڑیں اکھاڑ کر کسی اور مکان میں منتقل ہو کر پھر سے جڑیں پکڑنا ممکن اس لیے نہیں ہوتا کہ اُن کی جڑوں کو

ہوا لگ جاتی ہے، بُوٹے کی جڑوں کو ہوا لگ جائے تو وہ زندہ نہیں رہتا، مرجھا کر ڈھلک جاتا ہے..

آصف جسے میں پیار سے مولوی کہتا ہوں شہر لاہور کی سینکڑوں بھول بھلیاں گلیوں کوچوں میں آنکھیں بند کر کے چلا جاتا ہے، ہم بھٹک جاتے ہیں پر وہ نہیں بھٹکتا، چلا جاتا ہے اور بالآخر ہم ایک کھلے میدان میں نمودار ہو جاتے ہیں جہاں کچھ بھی نہیں، جو کچھ تھا وہ مسمار ہو چکا، ایک ہموار ہو چکا کھنڈر ہے..البتہ سامنے جو ایک چھوٹی اینٹوں سے تعمیر کردہ دیوار ہے اس میں چند محرابیں عریاں ہو رہی ہیں.''حاجی صاحب..'' سرفراز اپنی بلوری آنکھوں سے بات کرتا ہے ''یہاں پتھروں والی حویلی ہوا کرتی تھی جسے حویلی ثانی نواب میاں خاں بھی کہتے تھے..''

''حویلی ثانی نواب میاں خاں المشہور پتھراں والی''

یہ عالی شان حویلی نواب میاں خاں کی موچی دروازے کے علاقے میں مشہور اور معروف تھی، چونکہ اس عمارت میں کالا پتھر لگا ہوا تھا، اس لیے پتھراں والی حویلی کہلاتی تھی..

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پاس جانے اتنا بارود کہاں سے آ گیا تھا کہ اُس نے نہ صرف بادشاہی مسجد، بلکہ کچھ عرصہ تک مسجد وزیر خاں اور مغل عہد کی متعدد حویلیوں کو بارود خانوں میں بدل دیا..وہاں بارود کے کارخانے قائم کیے..چنانچہ پتھراں والی حویلی میں جو ہزاروں من بارود بھرا ہوا تھا وہ کسی سبب اوجھڑی کیمپ ہو گیا، آگ لگنے سے بھک سے پھٹ گیا جیسے ضیاء الحق کا مہربان طیارہ پَٹ گیا تھا..ایسا ہولناک دھما کا ہوا کہ پورا شہر، رات کا وقت تھا، اپنے بستروں سے اوندھا ہو کر گر گیا..ایک زلزلہ آ گیا، بے شمار کہنہ مکان گر گئے..اس حویلی کی دیواریں اور پتھر ہوا میں اُڑ کر پانچ پانچ کوس تک باہر جا پڑے جیسے اوجھڑی کیمپ کی سٹنگر میزائلیں جا پڑی تھیں اور میں اُن میں سے کسی ایک میزائل کا شکار ہوتے ہوتے بچا تھا کہ میں اُن دنوں اسلام آباد میں تھا.. دوسو سے زائد ہلاکتیں ہوئیں..حیرت انگیز طور پر پتھروں والی حویلی کے کچھ حصے محفوظ رہے، اس کی قدامت کے کچھ آثار باقی رہے..

اب تک برقرار ہے اور پھر ان بچے کھچے پتھروں کے آثار کو ڈھانے والے افغان حملہ آور آ گئے.. یہاں اب ایک پلندہ سر اٹھائے گا..

''پچھلے برس تک پتھراں والی حویلی کے بہت سے دروازے، کھڑکیاں، جھروکے اور آرائشیں موجود تھیں..'' آصف بتا رہا تھا..

پتھراں والی حویلی کا جنازہ بھی مُردوں کی گھاٹی سے اتر رہا تھا..

ہم ایک دل کش محراب کے تلے سے گذر کر عجب نیم اندھیاروں میں بھٹکنے لگے..اِن اندھیاروں میں پوشیدہ کارخانے اور گودام تھے..آصف کا کہنا تھا کہ اگر آپ امریکہ یا دوبئی سے کوئی شے ''میڈ اِن چائنا''

لاتے ہیں تو شاید وہ میڈ اِن چائنا ہو.. لیکن لاہور کے جتنے بھی سُپر سٹور اور مارکیٹیں ہیں وہاں پر فروخت کیے جانے والا مال.. اگرچہ ''میڈ اِن چائنا'' کی مُہر رکھتا ہے لیکن دراصل وہ سب کا سب ''میڈ اِن موچی گیٹ'' ہے..

ایک نیم تاریک گودام میں سے مزدور درجنوں سُوٹ کیس اٹھائے انہیں ایک گدھا گاڑی پر سوار کر رہے تھے اور اُن پر ''میڈ اِن چائنا'' ثبت تھا..



''مسجد بوکن خاں..کعبہ ثانی بنا شد ایں مقام 1257 ہجری''

پیر ڈھل..لودھی سلطنت کے زمانوں کا ایک صاحب جذب وسُکر تھا، مجذوبوں کی مانند لاہور کے بازاروں میں پھرا کرتا تھا، اکثر اُس کی نشست اُسی مقام پر تھی جہاں اب اس کا مزار ہے..

ہم اسی بزرگ کے نام کا جو ڈھل محلّہ ہے اس میں کچھ دیر بھٹکے اور نہایت بیزار کہ آخر ہم کس سلسلے میں اِن گندی گلیوں میں جہاں نہ کوئی جھروکا ہے اور نہ اُس میں سے جھانکتی کوئی سیلی سیلی لاہورن یونہی در بدر ہوتے ہیں جب ہم ایک ایسی قدیم مسجد مقفل دروازے کے دیدار میں آ گئے جس کا تذکرہ منشی کنہیالال نے ''تاریخ لاہور'' میں خصوصی طور پر کیا ہے..یہ مسجد بوکن خاں تھی..

ہم نے ایک بوڑھے لاہوری سے، جو کہ ناشتے کے لیے پُوڑیاں اور چنوں کا پلاسٹک کا لفافہ سینے سے لگائے چلا جا رہا تھا، پوچھا کہ مسجد بوکن خاں کا دروازہ بند ہے تو کیوں ہے تو اس نے کہا ''امام مسجد مولوی صاحب.. پھیکے پہلوان کے ہری پائے کھانے گئے ہیں..''

جہاں تک ہو سکتا تھا میں نے مقفل دروازے کی درزوں پر آنکھیں لگا کر جھانکا..مسجد کا احاطہ بہت وسیع تھا اور ایک گُنبد جو دکھائی دیتا تھا، نہایت خوش نظر اور قدیم ساخت والا، ایک منفرد طرز تعمیر کا تھا..مقفل دروازے کی چوکھٹ کے ماتھے پر سنگ مرمر کی ایک تختی نصب تھی جس پر کوئی فارسی عبارت درج تھی، میں ان لاہور آوارگیوں کے دوران اپنے سیل فون کے کیمرے سے یادداشت کو محفوظ کرنے کی خاطر تصویریں اُتارتا ہوں تا کہ جب میں اُن آثار، کھنڈروں، مندروں اور مساجد کا احوال تحریر کروں تو اِن تصویروں کی مدد سے آنکھوں دیکھا حال بیان کر سکوں..مسجد بوکن خاں کے مقفل دروازے کے ماتھے پر نصب سنگ مرمر کی تختی پر درج فارسی عبارت کی جو تصویر میں نے اتاری وہ آؤٹ آف فوکس تھی، پڑھی نہ جا سکتی تھی..اور جب میں نے منشی کنہیالال کی تاریخ میں مسجد بوکن خاں کا تذکرہ پڑھا تو اُس نے لکھا تھا ''دروازہ نہایت خوبصورت بنا ہوا ہے جس پر ایک اینٹ سنگ مرمر کی لگی ہوئی ہے اور اُس میں یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے..اور جب میں نے اپنی کھینچی ہوئی آؤٹ آف فوکس اُس سنگ مرمر کی تختی پر نقش فارسی عبارت کا موازنہ کنہیالال کی درج کردہ عبارت سے کیا تو وہ واضح ہو گئی..

چُوں زبکن خانِ والا منزلت
شد بنا ایں مسجد ذی الاحترام
بہرِ تاریخش زِ ہاتف شد ندا
کعبۂ ثانی بنا شد ایں مقام
1257 ہجری"

ایک عجیب سی سنسنی میرے بدن میں در آئی کہ 1880ء کے لگ بھگ کنہیا لال نے مسجد بوکن کے دروازے پر نصب سنگ مرمر کی تختی پر نقش عبارت کو دیکھ کر اُسے اپنی تاریخ میں نقل کیا تھا میں بھی اُسی نقش کو دیکھ رہا ہوں..

مسجد بوکن خاں

یہ عالی شان مسجد 1257 ہجری میں مسمی بوکن خاں داروغہ اصطبل خاص مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ڈھل محلّہ موچی دروازہ میں تعمیر کی..ایک حصہ میں باغیچہ لگا ہے، طرح طرح کے درخت لگے ہیں..

مقفل دروازے میں سے جھانکنے سے اب بھی اُس کے وسیع صحن میں طرح طرح کے درخت لگے نظر آتے تھے..

اس مسجد کا کیسا جمال ہو گا کہ اسے کعبۂ ثانی کہا گیا..

میں اس مسجد کا مکمل جمال دیکھنے سے قاصر تھا کہ اس کے امام.. پھیکے پہلوان کے سری پائے کھانے کے لیے چلے گئے تھے..

کعبۂ ثانی بنا شد ایں مقام



''تکیہ سادھواں اور مزار گنج شہیداں''

لاہور شہر کی گلیوں اور پُرپیچ کوچوں میں لاہوری کم اور گدھے زیادہ گھومتے ہیں..

سیمنٹ کی بوریوں اور بجری سے لدے یہ گدھے، صابر شاکر، بوجھ اٹھائے اکثر کسی مالک یا ہانکنے والے کے بغیر ایک اداس مُوڈ میں چلے جاتے ہیں اور اُس منزل تک جا پہنچتے ہیں جہاں کسی قدیم حویلی یا پرانے مکان [illegible] وہاں ایک پلازہ تعمیر کیا جا رہا ہوتا ہے..ان تنگ گلیوں میں کسی ٹرک یا ٹرالر کی گنجائش تو نہ تھی، صرف گدھے تھے جو اِن میں داخل ہو سکتے تھے

یہ گدھے نہ ہوتے تو نہ قدیم حویلیاں اور جھروکے مسمار ہوتے، اور نہ اُن کی جگہ پلازے تعمیر کیے جا سکتے..

پر گدھے کیوں نہ ہوتے..

وہ تو ہوتے ہیں..

اور تاریخ میں ان کا ایک مقام ہے..وہ خرِ عیسیٰ ہوئے اور ہمارے رسولؐ نے بھی اُن کی سواری کی تو اُنہوں نے تو ہونا تھا..

یوں بھی..اگر کسی نہ کسی صورت، وہ پائے جاتے ہیں، سیاست، حکومتی اور دفاعی اداروں میں، شعر و ادب اور اخباروں کے کالموں میں تو وہ کیوں لاہور شہر کی تنگ گلیوں میں نہیں ہو سکتے..

وہ تو ہوتے ہیں، اور انہوں نے ہونا ہے..

جب کبھی سیمنٹ اور بجری سے لدے گدھے اِک عالم جذب میں سر ہلاتے کان پھڑکاتے سامنے سے آتے اور ہم اُن کے احترام میں دیواروں سے لگ جاتے تو ہمیشہ ندیم شیخ کہتا ''یہ راستہ نہیں بھولتے، ہم بھول جاتے ہیں..'' مزنگ کا یہ ندیم اگر شیخ نہ ہوتا تو صوفی ہوتا..کہ گدھے راستہ نہیں بھولتے، کسی بھی نگہبان کے بغیر منزل پر پہنچ جاتے ہیں اور ہم انسان راستہ بھول جاتے ہیں، بھٹک جاتے ہیں..

بلھے شاہ نے کہا تھا کہ ؎ کُتے تیتھوں اُتے..

ندیم شیخ کہتا تھا کہ ؎ کھوتے تیتھوں اُتے.

شہر لاہور کی گلیاں بھی دِلّی کی مانند کبھی اوراقِ مصوّر تھے، ان میں در بدر ہونے درد سہنے کے باوجود کہیں پھسلن ہے، کہیں غلاظت اور کُوڑے کے ڈھیر ہیں لیکن اس کے باوجود کہیں کہیں اُن اوراق مصور کے کچھ آثار، کچھ مسمار ہوتی دل کش اور دل رُبا تصویروں کے بجھتے ہوئے نقش دکھائی دیتے ہیں تو دل خوشی سے بھر جاتا ہے، اُن ادھوری اور شکستہ تصویروں کو تصور کا بُرش مکمل کر کے اُن کے ماضی کے شوخ رنگ پھر سے نمایاں کرتا ہے تو دل خوشی سے بھر جاتا ہے..

کئی مقفل دروازے ہیں، منقش اور قدیمی ہیں، جھروکے اور بالکونیاں ہیں، شاندار شاہی مکانوں کی اکھڑی ہوئی چھوٹی اینٹوں کی ڈھیتی ہوئی دیواریں ہیں ایسے طاقچوں کی ویرانی ہے جن میں اُس دھوئیں کی کالک ابھی تک موجود ہے جو کبھی ان میں جلتے چراغوں سے اٹھتے تھے..

دیکھ تو دِل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں کہاں سے اُٹھتا ہے

کبھی دھیان گلی میں سے اٹھ کر عمارتوں کی آخری منزلوں تک جاتا ہے تو وہاں کسی منقش بالکونی اور جھروکے پر ابھی ابھی زرد دھوپ اتر کر اسے یوں روشن کر رہی ہے جیسے وہ بالکونی اور جھروکا خالص پاسے کے سونے سے تراش کر وہاں صرف آپ کی ایک نظر کے لیے ابھی ابھی تعمیر کر دیا گیا ہو..

بہت پرانے مکان اور رہائش گاہیں تھیں جو متروک ہو چکی تھیں اور ان کے در و دیوار میں کیا کیا آرائشیں اور بناوٹیں اینٹوں کی اور پتھروں کی تھیں اور یہ گمنام تھیں.. میں کسی ایسی ہی حویلی کے دروازے کے بند کواڑوں میں سے جھانکتا اور اندر کاٹھ کباڑ کے ڈھیر نظر آتے.. یہ کسی کی رہائش گاہ تھی، اس حویلی میں کون مقیم تھا، اس کا نام کیا تھا تو اکثر جواب آتا، معلوم نہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ اس کے دن بھی تھوڑے ہیں، یہ بھی ٹریڈ مافیا کے زلزلے کی کاروباری منفعت کی شدت سے قائم نہ رہے گی، گرا دی جائے گی اور پھر سیمنٹ، بجری، اینٹوں اور ریت سے لدے گدھوں کی قطاریں آئیں گی اور ایک پلازہ یا کئی منزلہ گودام سر اٹھائے گا..

اور اِن فراموش شدہ گھروں، حویلیوں اور مکانوں کی دیواروں میں ایسے ایسے چراغ دان، طاقچے، محرابی آرائشیں نظر نواز ہوتی تھیں کہ اُن میں سے ہر ایک کسی بھی میوزیم میں محفوظ کر دی جاتی تو دیکھنے والے اسے پہروں دیکھتے..

دنیا کے عظیم ترین کوہ پیما میسنر نے پاکستانی شمال کی بلندیوں کے بارے میں کہا تھا کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اس پورے حیرت انگیز پہاڑوں کی سلطنت کے تخت کو محفوظ کر لیتا.. اسے جوں کا توں رہنے دیتا تا کہ آج سے سو دو سو برس بعد جب یہ زمین آلودگی اور کثافت اور بے تحاشا بڑھ چکی آبادی سے آخری سانس لے رہی ہوگی، تب اگر کوئی بچہ اپنے باپ سے پوچھتا کہ.. ابا کیا یہ وہ دنیا ہے جس کے بارے میں آپ

کہتے ہیں کہ یہ تخلیق کار نے کہا کہ.. کُن فیکون ..اور یہ ہو گئی، تو یہ دنیا ہے..تو اُس بچے کا باپ اُس کی انگلی پکڑ کر پاکستان کے شمال لے جاتا اور کہتا.. بیٹے دنیا یہ ہے جو ہمارے رب نے بنائی تھی..

آج سے ہزار نہیں شاید صرف سو برس بعد کسی نے کسی بچے سے پوچھنا ہے کہ یہ ہے آپ کا لاہور.. جو لاہور ہے..تب اُسے کیا جواب دیا جائے گا..میسنر کی مانند اگر یہ میرے بس میں ہوتا تو میں لاہور کے ان بچے کھچے آثار کو محفوظ کر لیتا..تاجروں، افغانوں اور گدھوں کو بے دخل کر دیتا کہ اصل میں یہ تینوں ایک ہیں تا کہ..لاہور یہ تھا..

ہم تکیہ سادھواں کی جانب کشاں کشاں چلے جاتے تھے..

بھئی یہ کونسا تکیہ سادھو لوگوں کا ہے جو ابھی تک شہر لاہور میں موجود ہے..ہم نے تو صرف ایک پرانا مقولہ سن رکھا تھا کہ..سادھواں نوں، کی سواداں نال..یعنی سادھو لوگوں کو کیا غرض لُطف اور انبساط کے ذائقوں سے..

ہم تنگ گلیوں میں سے گذرتے ایک دھوپ سے روشن ہوتے کھلے مقام پر آ گئے..

بائیں جانب سرخ رنگت کی بالکونیوں اور جھروکوں سے تزئین شدہ ایک عمارت تھی اور یہی جانے کن سادھو لوگوں کی آماجگاہ تھی اور یہ ایک اور سرخ دیدہ زیب قدامت کی سرخی جو غروب کی تھی اُس میں ڈوبی ہوئی دل کش تعمیر تھی..

یہ سادھو کون تھے، جنہوں نے یہاں دھونی رمائی..

اور یہیں کہیں کوئی مسجد تکیہ سادھواں تھی..

سادھوؤں کے محلے میں یہ ایک عالی شان مسجد بنی ہوئی تھی جس کی تعمیر 1266 ہجری میں نور محمد سادھو کے زیرِ لاگت سے ظہور میں آئی، سادھو، ایک مسلمان کشمیری یہاں سکونت پذیر ہوا..یہ سادھو لوگ کشمیری ظاہراً کوئی کسب و پیشہ نہیں کرتے تھے، ہندوستان کے مختلف شہروں میں نکل جاتے تھے، کوئی فقیر سالک، کوئی مجذوب، کوئی شہزادہ، کوئی کچھ بن جاتا تھا، کوئی گدائی بھی کرتا تھا، غرض ہر میلے سے روپیہ پیدا کر لانا اُن کا کام تھا، باہر جا کر یہ اپنے نام بھی بدل ڈالتے تھے، کوئی صوفی شاہ، کوئی شطرنجی شاہ، کوئی مسکین شاہ نام رکھ لیتا تھا.. یہاں سادھوؤں نے اپنی نشست کے لیے تکیہ بنایا..

یہ ہمارے لاہوری بزرگ کیسے کمال کے لوگ تھے..

کوئی شطرنجی شاہ، کوئی صوفی شاہ اور کوئی مسکین شاہ نام رکھ لیتا تھا..روپے پیدا کر لیتا تھا..

ویسے صورت حال میں چنداں تبدیلی نہیں ہوئی، آج بھی سیاست دانوں اور تاجروں میں بہت شطرنجی شاہ، شطرنج کے کھلاڑی موجود ہیں...بہت صوفی شاہ تصوف کے فریب میں مبتلا کرنے والے کثرت سے

پائے جاتے ہیں..اور مسکین شاہوں کی بھی کچھ کمی نہیں اگرچہ ان دنوں وہ ڈبل شاہ کہلاتے ہیں..

یعنی ہم سب سادھو ہیں..

تکیہ سادھواں کے پہلو میں سے جو گلی نکلتی ہے اُس کے آغاز میں آرائشوں سے جھلملاتی ایک زیارت ہے..نہ یہ مزار ہے، نہ کوئی قدیم معبد، اور نہ ہی کوئی تاریخی عمارت..

''دربار گنج شہیداں''

وہاں تکیہ سادھواں کے چوک میں اس محلے کے جتنے بھی مقیم ملے، وہ سب لاعلم تھے کہ یہ ''دربار گنج شہیداں'' ہے کیا، یہ اُن کے نزدیک ایک زیارت تھی..

البتہ کنہیالال ہے جو ہندو ہے اور ہمیں ہماری تاریخ سے آگاہ کرتا ہے..

''مزارِ گنج شہیداں''

یہ مزار پختہ چار دیواری میں محلّہ سادھواں میں، متصل دیوارِ مشرقی حویلی نواب سعد اللہ خاں کے بنا ہوا ہے..اس مقام پر اگرچہ قبر ایک ہے مگر اُس کے نیچے ہزاروں شہداء دفنائے ہوئے ہیں..اس کا واقعہ اس طرح ہر کتاب ''تحفتہ الواصلین'' اور ''حدیقتہ لاولیاء'' میں ہے..راجہ انگ پال، راجہ جے پال کا بیٹا، لاہور پر چڑھ آیا..ہزاروں مسلمان، ہندوؤں نے قتل کر ڈالے، اس محلے میں بھی قتل عام ہوا اور بہ قدر دو ہزار مسلمانوں کی نعشیں اس جگہ دفنائی گئی..''

یعنی جب ہزاروں سکھ ذبح کیے گئے تو اُن کی یاد میں گوردوارہ شہید گنج وجود میں آیا اور جب ہزاروں مسلمان قتل کر ڈالے گئے تو انہیں کسی نے بھی یاد نہ رکھا..یاد تو ہم نے رکھنا تھا اور ہم نے نہ رکھا..

ویسے حساب برابر ہو گیا، ہم نے اُن کو ذبح کیا اور انہوں نے ہمیں قتل کیا، ہم دونوں کے شہید برابر ہو گئے..

ویسے محلّہ سادھواں کے ماحول میں..کچھ تاثیر تھی..ہے ہوا میں شراب کی تاثیر..کہ ہم سب جب وہاں سے نکلے تو کچھ کچھ سادھو ہو گئے..

اور ہم میں کوئی تو شطرنجی شاہ تھا..

کون تھا جو صُوفی شاہ بنا پھرتا تھا..

اور مسکین شاہ صاحب کون تھے..



''مسجد چینیاں والی..نابود!''

اندرونِ شہر کی تاریخی مسجدوں کے نام نرالے تھے..عجب غیر شرعی متوالے نام تھے..

کنجری کی مسجد جو اَب مائی موراں کی مسجد کہلاتی ہے..

مسجد گلی گھنگھر وسازاں..

پٹولیاں والی مسجد..پٹولے جو گڈّوں اور گڑیوں کے پہناوے ہوتے ہیں، اور یہ مسجد لوہاری منڈی میں واقع ہے..

مسجد چہل بیبیاں..مسجد پری محل..پست مسجد یعنی نیویں مسجد اور مسجد چینیاں والی..

یہ مسجد کیوں اس نام سے جانی گئی..کیا یہ چینیوں نے تعمیر کی تھی یا اس کی آرائش میں چینی برتنوں کی صنعت کاری تھی..

بہر طور ہم نہایت اشتیاق سے مسجد چینیاں والی دیکھنے گئے، اس اشتیاق میں گئے کہ وہاں کوئی چینی طرزِ تعمیر کی پگوڈا نما مسجد ہوگی پر اُس مقام پر ایک جدید عمارت نظر آئی اور اُس کی شاندار محراب کی آغوش میں ایک بورڈ آویزاں تھا..

''مدرسہ دارالحدیث، چینیانوالی''

صدر دروازے پر بھی سنگ مرمر کی تختی پر رقم تھا..

''جامع اہلحدیث

مسجد چینیاں والی، کوچہ چابک سواراں، لاہور''

مجبوراً ہم ایک مرتبہ پھر منشی کنہیالال سے رجوع کرتے ہیں..

''مسجد چینیاں والی''

یہ عالی جاہ مسجد زمانۂ سلف کی عمارتوں کی یادگار، اندرونِ حصارِ شہر لاہور، محلّہ چابک سواراں، اندرونِ کوچہ بہ دیوار حویلی نواب سعد اللہ خان المشہور میاں خاں کے واقع ہے..

طرفہ معمارِ خرد تاریخ سال گفت زیبا مسجد از افراز خاں

اس مسجد کے بانی کا نام نواب سرفراز خاں تھا.. ''سکھوں کے وقت بھی یہ مسجد آباد رہی مگر قبضہ مسلمانانِ ملّت وہابیہ کا ہے جو سُنّی اور شیعہ دونوں فرقوں کے مخالف ہیں..''

اور یہ قبضہ اب تک چلا آتا ہے.. ''مدرسہ دارالحدیث چینیانوالی'' اور میرے ایک دور پار کے رشتے دار کوئی غزنوی اس مسجد کے امام بھی رہے ہیں..

ہمیں قدرے مایوسی ہوئی کہ ہم تو چینیوں کی مسجد دیکھنے آئے تھے اور وہاں نہ تو چینی تھے اور نہ ہی اُن کا کوئی زیبائشی طرزِ تعمیر.. کہ اُس قدیم مسجد کو ڈھا کر ایک جدید طرز کا عبادت خانہ تعمیر کر دیا گیا تھا..



''محلّہ تیر اندازاں اور کمانگراں گلی''

ہم اُن محلوں میں آ گئے جہاں تیر چلتے تھے، یہ خلش کہاں سے ہوتی اگر جگر کے پار ہوتے ایسے تیر بنتے تھے، جہاں کڑی کمانیں بنائی جاتی تھیں جن میں سے نکلے ہوئے تیر غنیم کے بدن سے پار ہوتے تھے..اور یہ ''محلّہ تیر اندازاں'' تھا جس کے پہلو میں ''کمانگراں گلی'' تھی..وہ زمانے تاریخ کی دھول میں اٹ گئے، ثقافت، وراثت اور کاریگری سے غفلت کی خاک میں دفن ہو گئے جب لاہور کے لوہار اور کاریگر دنیا بھر میں سب سے موثر اور سجیلے جنگی ہتھیار ساخت کرتے تھے..شاید یہ ان وقتوں میں ایک منافع بخش کاروبار تھا جب اُدھر سنٹرل ایشیا اور افغانستان سے ہندوستان کی سونے کی چڑیا کے پَر حاصل کرنے کی خاطر لٹیرے طالع آزما، سلطان اور شاہ دندناتے چلے آتے تھے..وہ لاہور کو روند کر یہاں کچھ عرصہ اپنی تھکن اتارتے اور لاہوری تلواروں، کمانوں، بھالوں، برچھوں اور تیروں سے مسلح ہو کر دلی پر یلغار کر دیتے، اسی لیے شیر شاہ سوری اور بابر اس شہر کو ملیا میٹ کر دینے کے خواب دیکھتے تھے..

لاہوری تلوار نہ صرف کاٹ دار تھی بلکہ ایک ورک آف آرٹ ہوا کرتی تھی کہ اُس کے دستے پر نہایت پیچیدہ سنہری آرائش کے گل بوٹے اور بیلیں نقش ہوتی تھیں..آج بھی دنیا کے بہت سے عجائب گھروں میں لاہوری کاریگروں کی ہنر مندی، صناعی اور ذوق جمال کے یہ شاہکار نمائش پر ہیں اور ان کے دستوں پر ان کاریگروں کے نام اور لاہور کی مہریں ثبت ہیں..یاد رہے کہ ایک روایت کے مطابق رسول اللہؐ کی شان میں کہے گئے ایک قصیدے میں انہیں ایک ہندی تلوار کی نفاست اور خوبصورتی سے مشابہ قرار دیا گیا تھا اور حضورؐ نے اس تشبیہ میں ترمیم پسند کی..ہندی تلوار، دراصل لاہوری تلوار تھی جو آج سے ڈیڑھ ہزار برس پیشتر بھی کُل زمانوں میں باعث حیرت اور ایک شاعرانہ تخیل تھی..

آج یہ دونوں تاریخی محلے..گندگی، جہالت کے اندھیروں اور بدبودار نالیوں، تجاوزات، تجارتی درندگی اور اپنی ثقافت کی درخشندگی سے بےخبر ایسے ہیں کہ ان میں سے گذرتے ہوئے بھی جی چاہتا ہے کہ بس جلدی سے گذر جائیں..بےشک آپ ماضی کی رومانوی دھند میں گم چلے آئیں پر یہ دھند زیادہ تک ان محلوں کی بوسیدگی اور بدبو کو روپوش کرنے سے قاصر ہو جاتی ہے..تاریخی تصور کا فریب بھی ان محلوں کی زبوں حالی کو

خوش نظر کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے..اور یہ تاریخی تصور کے رومان کا انہدام صرف لاہور میں ہی نہیں دنیا بھر میں ہے..کہ آپ آج کے یونانیوں اور اطالیوں کی ذہنی اور تخلیقی پراگندگی سے اندازہ نہیں کر سکتے کہ..مغرب اور دنیا بھر کی تہذیب کا سرچشمہ، رومی سلطنت کے جاہ وجلال اور حکمرانی اور تخلیق کی بلندیوں کو چھونے والے کیا یہی لوگ تھے..کیا یہی مصری ہیں جن کے فرعونوں کی تہذیب نے اتنے عالی شان مندر..محلات اور اہرام تعمیر کیے..فلسفے، حکمت، کائناتی سوجھ بوجھ، خوراک، لباس اور سائنس میں اُس کمال تک پہنچے جہاں ہم آج بھی نہیں پہنچے..اور نسل انسانی کی تاریخ میں یہ فرعونی تہذیب اور سلطنت تھی جس نے تقریباً ایک ہزار برس تک اس دنیا میں ایک سپر پاور کی صورت راج کیا..اور کیا یہ وہی عراقی ہیں، بابل اور نینوا ایسے شہروں کو بسانے والے، بابل کے معلق باغوں کو تعمیر کرنے والے..اور پھر کیا یہ وہی ہندوستانی ہیں..تو اگر آج یہ سوال ذہن میں ابھرے کہ کیا یہی گلی محلے ہیں، یہی لاہور ہے تو..

چنانچہ ہم آج کے ''محلّہ تیراندازاں'' پر نظر نہیں ڈالتے ''کمانگراں گلی'' کی موجودہ ہیئت کو فراموش کرتے ہیں اور عہد حاضر کے سب سے اہم تاریخ ساز لاہور شناس مجید شیخ سے رجوع کرتے ہیں..

اگر آپ کو لنڈن کے وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم میں جانے کا اتفاق ہو تو آپ وہاں ایک متاثر کرنے والی نہایت نفیس ذوق کی حامل نمائش لاہوری کمانوں اور تیروں کی دیکھیں گے..یہ ہتھیار ہمارے انہی محلوں میں یعنی ''محلّہ تیراندازاں'' اور ''کمانگراں گلی'' میں بنائے گئے تھے..جب کہ کیا ستم ہے کہ لاہور میوزیم ان کے وجود سے بھی آگاہ نہیں..

آخر لاہور کی کمان میں کونسی ایسی خوبی تھی؟

جب امیر تیمور کی زرد روسپاہ کی یلغار نے لاہور پر 1398ء میں حملہ کیا تو تاریخ دانوں کا بیان ہے کہ جب شہری اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے تو تیمور کی سپاہ نے ان کا پیچھا کیا اور اپنی چھوٹے سائز کی کمانوں سے گھوڑوں کو بھگاتے انہیں ہلاک کر ڈالا..(یاد رہے کہ اُن زمانوں میں عام طور پر کمان اتنے بڑے سائز کی ہوتی تھی کہ اُس میں تیر باندھ کر کھینچنا صرف ہرکولیس کی طاقت رکھنے والوں کے بس کی بات ہوتی تھی..یہ کمان گھڑسواروں کے لیے بالکل موزوں نہ تھی، چنانچہ یہ مختصر اور چھوٹی کمان جو گھوڑوں کی پشت پر بیٹھے ہوئے، انہیں بگٹٹ بھگاتے ہوئے آسانی سے کھینچی جا سکتی تھی اور دشمن پر تیر برسائے جا سکتے تھے...ویسے اب کمانوں کا تذکرہ چل نکلا ہے تو مجھے استنبول کے ٹوپ کاپی میوزیم میں محفوظ ایک اور کمان کی یاد آنے لگتی ہے اور کیوں نہ آئے کہ وہ میرے پیغمبر، میرے بابا اور میرے رسولؐ سے منسوب ہے اور یہ بھی ایک مختصر کمان ہے..

میں نے جب اسے دیکھا تو یہ مجھے واضح دکھائی نہ دی کہ میری آنکھوں اور اس کمان کے درمیان ایک آبی جھلملاہٹ لرزتی تھی..محض یہ تصور کہ اس کمان کو کھینچنے والے ہاتھ میرے رسولؐ کے تھے..کیا یہ سودائی کر دینے

کے لیے کافی نہیں ہے...بہرطور یہ بھی ایک مختصر کمان تھی..)

تیمور کے یلغاریوں نے ایک اندازے کے مطابق پونے دو کروڑ انسانوں کو ہلاک کیا جو کُل دنیا کی آبادی کا تب پانچ فیصد حصہ تھے..

تیمور کی سپاہ کی مختصر کمانوں کے موثر پن نے لاہور کے کمانگروں کو سوچنے پر مجبور کیا کہ وہ کیسے تیموری سپاہ کی کمانوں کے مقابلے میں اُن سے بہتر کمان تخلیق کر سکتے ہیں جو ان منگولوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دے، چنانچہ لاہوری کمان وجود میں آئی..

اس کمان کی تخلیق میں تین مختلف قسم کی لکڑی استعمال ہوئی جسے لچک دار لاہوری چمڑے سے جوڑ دیا گیا تھا..

مجید شیخ نے ان گلیوں میں ایک ایسے شخص کو دریافت کیا جو اب بھی اس قدیم کاریگری کا وارث ہے..آج بھی ایک کمانگر ہے اور کچھ لوگ جو تیر اندازی کے شائق ہیں یا قدیم ہتھیاروں کو جمع کرنے کا شوق رکھتے ہیں، وہ اس کمانگر کے گاہک ہیں، اسے کچھ زیادہ کمائی تو نہیں ہوتی لیکن وہ لاہور کے اکلوتے اور آخری کمانگر ہونے پر فخر کرتا ہے..میں نے آصف سے فرمائش کی تھی کہ وہ اس آخری شخص کو تلاش کرے اور وہ ابھی تک نہیں ملا..جب کبھی ملا تو میں اپنے محدود وسائل کے باوجود اُس سے درخواست کروں گا، ایک آخری لاہوری کمان خریدوں گا..اور وہ جب ملا تو اس سے ملاقات کی روداد بیان کروں گا..

چھوڑ آئے ہم وہ گلیاں..گلزار نے کہا تھا..

کچھ ایسے ہی ہم محلّہ تیر اندازاں اور کمانگراں گلی چھوڑ آئے..



''مسجد زیبا نگار، مسجد محمد صالح کمبوہ''

''حاجی صاحب.. یہ سامنے چار چرخڑیوں والا کھوہ ہوا کرتا تھا..اس کنویں کا گھیرا اتنا وسیع تھا کہ اس کی گولائی کے گرد پانی نکالنے کے لیے چار چرخڑیاں ہوا کرتی تھیں..''

''کہاں ہیں'' وہاں سوائے دکانوں اور عمارتوں کی بھیڑ کے سوا کچھ نہ تھا..

''بس یہیں اسی مقام پر ہوا کرتا تھا..''

''تو سرفراز مجھے یہ تو بتاؤ کہ اس کھوہ یا کنویں کے پانی میٹھے تھے یا کھارے تھے..''

''حاجی صاحب.. مجھے کیا پتہ..''

مینوں دَس خاں ایتھے دیاں کھوئیاں
کِنیاں مِٹھیاں تے کِنیاں کھاریاں نیں
جنہاں کھوئیاں توں بھرن معشوق پانی
اوہو مِٹھیاں تے باقی کھاریاں نیں..

میں شاید اپنے آپ کو دوہرا رہا ہوں..تاریخ دوہرانے سے ہی فراموشی سے محفوظ ہو جاتی ہے..

چیمبرلین روڈ کے مکان سے جب میں رنگ محل مشن ہائی سکول کا راستہ اختیار کرتا تو دو آپشن ہوا کرتے تھے..

اگر تو اُس سویر مجھے سکول کے راستے سے لطف اندوز ہونا ہوتا تو میں گوروارجن نگر میں سے گذر کر شاہ عالمی کے بازار میں داخل ہو جاتا اور اگر افراتفری ہوتی، تو میں ''مُردوں کی گھاٹی'' چڑھ کر موچی دروازے کے راستے رنگ محل کا مسافر ہو جاتا اور یہ راستہ ورق کوبوں کی گلی میں سے گذرتا تھا..

تب مجھے کیا معلوم تھا کہ ورق کوٹنے سے جو دھم دھم کی دھمک جنم لیتی ہے اُس دھمک پر میرے پرندوں کے مرشد فریدالدین عطار بھی بے خود ہو کر رقص کرنے لگے تھے اور جب ورق کوب....اپنی دکان سے باہر آ کر ان کے ساتھ رقص کرنے لگا تھا تو اس کے باوجود ورق کوبی کی وہ دھما دھم جاری رہی تھی کہ اب ورق کوب کوئی

اور ہو گیا تھا. تب میں آ گاہ نہ تھا کہ موچی دروازے کے داخلے پر کوئی مسجد، مسجد صالح محمد کمبوہ کے نام کی موجود ہے..

اُس سنگم پر جہاں ایک راستہ لال کھوہ کے راستے چوک نواب صاحب اور مبارک حویلی کی جانب اترتا ہے اور دوسرا راستہ ورق کوبوں کی گلی سے ہوتا ہوا رنگ محل میں جا نکلتا ہے، وہاں یہ عظیم فراموش ہو چکی یادگار.. مسجد صالح محمد کمبوہ ہے..



''مسجد محمد صالح کمبوہ''

یہ عجیب وغریب مسجد موچی دروازے کے اندر ہے، جو کوئی موچی دروازے سے، جو ایک دروازہ لاہور شہر کے دروازوں میں سے ہے، داخل ہوتا ہے تو سامنے اس مسجد کی عالیشان ورنگین عمارت نظر آتی ہے.. اس مسجد کی عمارت 1070 ہجری میں بہ اختتام پہنچی اور منشی محمد صالح دیوان صوبہ پنجاب نے اس کو تعمیر کیا.. بانی اس مسجد کا بڑا عالم وفاضل وشاعر وجیّد منشی شاہ جہان دربار کا ذات کا کمبوہ تھا..

بانی ایں مسجد زیبا نگار
بندۂ آل محمد صالح است..

اگر چہ محمد صالح کمبوہ کی اس شاہ جہانی دور میں تعمیر کردہ مسجد میں کچھ جدید تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں لیکن اُس کے قدامت اور دل کش زیبائشوں والے گنبد اور فارسی زبان کی آرائشوں کے آثار اب بھی اگر چہ کچھ بجھے بجھے، کچھ مٹے ہوئے دکھائی دیتے تھے یہ مسجد موچی دروازے کے گلی کوچوں سے نسبتاً بلند سطح پر واقع ہے۔اس کے صدر دروازے کی محراب کے گرد ایک قوس کی صورت سنگ مرمر کی سلوں پر میرا گمان ہے کہ موجودہ زمانوں کے کسی گمنام خطاط نے خط کُوفی کو سیاہ سنگ مرمر سے تراشا سفید پتھر پر اس کمال سے ثبت کیا.. کہ میں اس کی تصویر دیکھتا ہوں تو بار بار اس خطاط کو داد دیتا ہوں، خطِ کوفی ظاہر ہے قدیم ترین خط ہے اور اسے صرف وہی خطاط ایسی عجوبہ روزگار ہنر مندی سے لکھ سکتا ہے جو خود ایک نابغہ روزگار ہو..یہ ہر کسی خطاط کی گرفت اور قلم کی قید میں آنے والا خط نہیں.قرآنِ پاک کے ابتدائی نسخے اسی خط میں لکھے گئے..

''جامع مسجد محمد صالح کمبوہ'' خط کوفی میں محراب کے گرد محراب ہوتا ہے..جبکہ اس خطاطی کے اوپر جہاں کچھ گنجائش ہے خط نستعلیق میں جامع مسجد محمد صالح کمبوہ کی عبارت بکھری ہوئی ہے۔یقین کیجئے اس خط کوفی کی منفرد اور قدیم ترین لکھائی کے معجزے کے مقابلے میں خط نستعلیق از حد سپاٹ اور بے روح لگتا ہے..

اس محراب کے ایک کونے میں درج ہے..

تعمیر کنندہ مسجدِ ہذا، محمد صالح کمبوہ رحمتہ اللہ..1070ھ، 1659ء

مجھے قلق ہوا کہ خط کوفی لکھنے والے اس خطاط نے اپنا نام درج نہیں کیا ورنہ میں اُس کی انگلیاں تو

نہیں کم از کم قلم چومنے ضرور جاتا..آج جب کہ رنگ تھوپنے والے، فُٹے پرکار سے لکیریں کھینچنے والے، مکمل طور پر مکھی مارنے والے اپنے آپ کو خطاط کے درجے پر فائز کرتے ہیں، خطاطی کی نفیریاں اور ڈھول بجا کر اس کی تقدیس کو پامال کرتے ہیں، مسجد کمبوہ کا خط کوفی کا گرینڈ ماسٹر اپنے آپ کو گمنام رکھتا ہے، ہمیں اپنے نام کی خبر نہیں ہونے دیتا کہ جو لوگ اپنے خونِ دل کی کشید میں قلم ڈبو کر خطاطی کرتے ہیں وہ اسی لیے لالہ فام کی تشہیر نہیں کرتے، گمنام رہتے ہیں..

تب ایک پر انکسار اور پر بہار شخص شفقت نام کا ایک مہربان اور شرمیلے سے فرشتے کی صورت نازل ہو گیا ''تارڑ صاحب..میں آپ کو تب سے جانتا ہوں جب آپ اپنی بیجوں کی دکان کسان اینڈ کمپنی میں بیٹھا کرتے تھے اور میں جب بھی وہاں سے گذرتا تھا تو آپ گاہکوں سے بے خبر سر جھکائے کچھ نہ کچھ لکھ رہے ہوتے تھے..''

شفقت اپنے پہناوے اور سادگی میں موچی دروازے کا کوئی ماہر قلچہ فروش لگتا تھا، دراصل ایک کہنہ مشق صحافی تھا جس نے ''فرنٹیئر پوسٹ'' ایسے تہلکہ مچا دینے والے روشن خیال اور روشن دماغ اخبار میں ملازمت کی تھی..ہم نے اُس کی راہبری کو بصد شوق قبول کیا اور کمبوہ بابا کی تعمیر کردہ مسجد کے وہ حصے دیکھے جو ابھی تک اپنی ابتدائی شکل اور صورت میں موجود ہیں، کیسے کیسے بجھتے، مدھم ہوتے نقش محرابوں میں پژمردہ پھول بوٹے ہوتے تھے، ایک محراب کے دریچے میں ''یا اللہ۔ یا محمد۔ الرحیم'' اندھیارے میں کچھ کچھ دکھائی دیتے تھے..مسجد کا اندرون ابھی تک 1660 عیسوی کے زمانوں میں سانس لیتا تھا..اور یہ سب نقش، آرائشیں، گل بوٹے اور تزئین کے باغ مجھے کیوں کہیں دیکھے ہوئے لگتے تھے، کسی خواب میں کسی سراب میں، کہیں نہ کہیں دیکھے ہوئے لگتے تھے اور یہ عقدہ شفقت نے حل کر دیا'' کہا جاتا ہے کہ مسجد وزیر خان جب مکمل ہو گئی تو اُس کے ہنر مندوں اور نقاشوں نے اُس مسجد کی تعمیر کے بعد جو سامانِ آرائش، رنگ روغن، نیلی اینٹیں اور عمارتی اینٹیں، سرپلس ہو گئیں انہوں نے انہیں کمبوہ کی مسجد کی تعمیر میں استعمال کیا..''

گویا..یہ ایک مسجد وزیر خان ثانی تھی..اس کی سگی بیٹی تھی..اور میں متعدد بار اس گمان کا اظہار کر چکا ہوں کہ لاہور کی مسجد وزیر خان اپنی طرزِ تعمیر میں، چوکور میناروں کی منفرد دل کشی میں، نقاشی، صناعی، تراشی، تصویری داستانوں کے بیان میں کہ ایک تصویر میں ایک درخت سے بال لٹک رہے ہیں، مصوری اور خطاطی میں، دنیا بھر میں جتنی بھی مسجدیں میں نے دیکھی ہیں اور ان میں مسجد قرطبہ، نیلی مسجد اور مسجد امیہ بھی شامل ہیں، وزیر خان کی مسجد ان سب پر کم از کم میرے لیے فوقیت رکھتی ہے، شاید اس لیے بھی کہ وہ میرے شہر لاہور میں ہے..مجھے قرطبہ، استنبول اور دمشق سے کیا لینا دینا..موت، موت ہے اور لاہور، لاہور ہے..

جی ہاں..میں بیان کہیں نہ کہیں کر چکا ہوں کہ جب پہلی عالمی جنگ میں لاہور رجمنٹ کی سپاہ بلجیم

کارزار میں، زہریلی گیس سے اجتماعی طور پر ہلاک ہونے سے پہلے جب دشمن پر یلغار کرتی تھی، لاہوری سکھ، ہندو اور مسلمان سب کے سب اندرونِ شہر کے باسی لاہور یئے تو وہ نعرہ لگاتے تھے کہ موت، موت ہے اور لاہور، لاہور ہے..

لاہور یئے.. موت کے منہ میں جاتے ہوئے بھی لاہور کو یاد کرتے نعرے لگاتے تھے..

ہم شفقت صاحب کی شفقت سے مسجد کے بالائی حصے میں چلے گئے جہاں اس کے ماتھے پر درج آرائشوں اور خطاطی درزبان فارسی عین نظر کے سامنے آجاتی تھی..

محرابوں کے ماتھے پر جہاں پر پیچ اور گنجلک قیمتی پتھروں کی مینا کاری سے تخلیق کردہ نقش تھے، وہاں اُن کے تلے درزبانِ فارسی جو کچھ درج تھا اُسے میں پڑھ نہ سکتا تھا، ''فدوی ال محمد صالح دپال مزار، درجات..''

بے شک اس شہر سنگدل کو جلا دینا چاہیے اور پھر اس کی خاک کو بھی اُڑا دینا چاہیے کہ اس شہر لاہور کی قدر کسی نے نہ کی..

ہم میں سے کتنے ہیں جو اس کمبوہ مسجد کے وجود سے آگاہ ہیں.. اس کی قدیم زیبائش کی گُل کاری اور بیل بوٹوں کی خوبصورتی کے ایک سحر انگیز فریب سے آگاہ ہیں..

''یہاں کبھی کبھار نیشنل کالج آف آرٹس کے کچھ طالب علم آجاتے ہیں، برگر کھاتے، جینوں میں ملبوس وہ اس کے کچھ نقش نقل کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، ایک بار ایک غیر ملکی سفارت کار کھوج کرتا اس مسجد میں آنکلا تو دنگ رہ گیا'' شفقت کا کہنا تھا.. ''میں نے اُس سے التجا کی کہ آپ تو روپے پیسے والے..، ہم تو اس مسجد کو محفوظ نہیں کرنے والے، آپ کچھ کیجیے'' تو اُس نے کہا ''ہماری حکومتیں تو تاریخی عمارتوں کی بحالی اور نو تعمیر کے لیے لاکھوں ڈالر کی مدد کرتی ہیں لیکن.. ہم نہیں جانتے کہ آپ لوگ یہ رقم کہاں صرف کر دیتے ہیں..''

اگرچہ وارث شاہ نے اپنے سید ہونے کے گھمنڈ میں جہاں جاٹوں کے بارے میں ''ہرزہ سرائی'' کی ہے وہاں کمبوہ قوم کو بھی کمیّ کمین اور رذیل قرار دیا ہے.. لیکن.. اگر ایک کمبوہ مسجد وزیر خان کی شان میں اور شانداری والی ایک بیٹی مسجد تعمیر کر دیتا ہے تو کیا وہ وارث شاہ سے برتر نہیں ہو جاتا.. مجھے نہیں معلوم کہ صالح محمد کمبوہ کی تعمیر کردہ اس اداس کر دینے والی جمالیاتی کشش والی مسجد کا بھی جنازہ کب اٹھے گا اور موچی دروازے کی ''مُردوں کی گھاٹی'' سے اتر جائے گا..



''موچی دروازے میں دل ہوابو کاٹا''

دائیں جانب وہ گلیاں تھیں جن میں چلتا میں رنگ محل مشن ہائی سکول تک ورق کوبوں کی دھم دھم میں پہنچ جاتا تھا..اور بائیں جانب.. بائیں جانب کی گلی میں وہ درجنوں دکانیں اور کھوکھے ہوا کرتے تھے جن میں سے بسنت کے سب رنگ جھرنوں کی مانند پھوٹتے تھے..کیسی کیسی پریاں اور پتنگیں، پتنگ بازسجنوں کی نخریلی، سجیلی، سانوری، سب رنگ، انکھیلی اور کنواریاں، خوش رنگ اور جنسی بناوٹ والی پتنگیں، لکھنؤ کاٹ گڈے..گڈیاں..اور اِن سانوریوں اور سجیلی ناریوں کو لاہور کے آسمان پر اڑانے کے لیے تیز دھار ڈوریں، ان دکانوں اور کھوکھوں میں لاہور کے استاد پتنگ ساز تخلیق کرتے اور سجاتے تھے..

میں بن پتنگ اُڑ جاؤں رے..

میری پیاری پتنگ، چلی بادلوں کے سنگ

اور بہت زمانوں کے بعد فریحہ پرویز پکارتی تھی کہ..

دل ہوابو کاٹا..

اور بہت فضول وہ نغمہ بھی کچھ کشش رکھتا تھا کہ..

اڈائی جا، اڈائی جا..میںنوں گڈی وانگ اڈائی جا..

موچی دروازے کے اس بازار میں کبھی بسنت کے سب رنگ جھرنوں کی مانند پھوٹتے تھے..

میں اس لیے جانتا ہوں کہ بسنت رات، پتنگیں اور گڈیاں خریدنے کے لیے اِسی گلی میں آیا کرتا تھا..

بسنت کو نظر لگ گئی..اس کی زردی اور لاہور کے آسمانوں پر جو رنگوں کا پرواز کرتا، اُڑتا، گڈیوں اور پتنگوں کا ہجوم ہوا کرتا تھا اس کو نظر لگ گئی..اب وہاں موچی دروازے کی اُسی گلی میں رنگوں کی بے رونقی ہے..اور ہم شکایت نہیں کر سکتے کہ دھاتی تیز دھار ڈوروں نے بچوں کے گلے کاٹ دیئے..تو ہم گلہ نہیں کر سکتے..

صالح محمد کمبوہ کی مسجد سے جدا ہو کر جب ہم دائیں جانب چلیں تو پہلی دکان خطائیوں کی تھی، خطا کرنے والوں کی نہیں، شہر لاہور کی ایک سوغات کی دکان تھی..

''تارڑ صاحب..'' شفقت نے شاید مجھے مخاطب کیا'' یہ لاہور کا سب سے پرانا خطائی فروش ہے اگرچہ خلیفہ کی خطائیوں کی بہت دھوم ہے، پر وہ کمرشل ہو چکا ہے اور یہ شخص اپنی گمنامی میں خوش ہے..''

''بسم اللہ..'' اس شخص نے کہا'' تارڑ جی، ایک خطائی تو میری چکھ کر دیکھو.. بتاشے کی مانند منہ میں گھل نہ جائے تو میرا نام حمیدا نہیں..''

ذرا آگے گئے ہیں تو سرخ پگڑی میں سٹور سے ایک سردار جی موچی دروازے کی اُس گلی میں ایک یونانی دواخانہ کھولے بیٹھے ہیں..

''سردار جی، یونانی دواخانہ..

سردار سُرجیت نگھ، سردار امر جیت سنگھ

صرف دو دِن، ہفتہ، اتوار..

موٹاپا کا رزلٹ 10 دن میں، شوگر، یرقان، بواسیر، جوڑوں کا اور پٹھوں کا درد..کافور..'' (کیا اُلو کے پٹھوں کا بھی)



''گوروارجن دیو کا لال کھوہ اور میاں میر صاحب کی برفی''

میں بہت بار اِدھر سے گذرا تھا..

بچپن میں بسنت کے موقع پر گڈیاں پتنگیں خریدنے کے لیے اباجی کے ساتھ اور جوانی میں شیخ نوازش سے ملنے کی خاطر جو چوک نواب صاحب کے قریب مبارک حویلی کے سامنے ایک گلی میں رہتا تھا..

میں بہت بار لال کھوہ سے گذرا تھا..

لیکن تب میں اس کی تاریخی وقعت سے قطعی بے خبر تھا..نہ تو وہاں کوئی کنواں تھا جو ایک کمیونسٹ یعنی سُرخا تھا، لال کھوہ تھا البتہ وہاں جو برفی فروخت ہوتی تھی اُس کی دھوم بہت تھی، نہ جانے اُسے بھنگ کی مانند گھوٹا جاتا تھا کہ ایک ڈلی کھانے سے آنکھیں اُس کے سرور سے بند ہونے لگتی تھیں، مجھے کیا خبر تھی کہ یہ گوروگوبند سنگھ کی برفی تھی..

ایک پگوڈا نما یادگار پر مذہبی جذبات کے نعروں کے پہلو میں لکھا تھا ''تاریخی المشہور لال کھوہ، اندرون موچی گیٹ، لاہور..''

ذرا جستجو کی تو ایک بوسیدہ دیوار میں نصب نیلے رنگ کی دو تختیاں نظر آئیں ''گلی لال کھوہ'' اور ''لال کھوہ''..

اور وہاں کہیں کوئی اطلاع درج نہیں تھی کہ آخر یہ ''تاریخی المشہور لال کھوہ'' کیوں ہے..

لاہور کی مصیبت یہ ہے کہ پہلے تو اس کی تنگ اور اکثر غلیظ گلیوں میں آپ خوار ہوں اور آثار تلاش کریں اور پھر لاہور کے بارے میں تحریر کردہ کتابوں اور تحقیقی مقالوں میں سر کھپائیں کہ ان آثار کی تاریخی داستانیں کیا ہیں، مجال ہے کہیں بھی کوئی ایسا اطلاعاتی بورڈ آویزاں ہو جس پر معلومات کی کچھ مہربانیاں درج ہوں..

گلی لال کھوہ کے اندر داخل ہونے پر دائیں جانب ایک زیارت نظر آتی ہے، جس پر اسلامی سجاوٹیں جھلملاتی ہیں جیسے وہاں کوئی درگاہ ہو، کسی پیر فقیر کا مزار ہو..لوگ دیئے جلاتے ہیں اور منتیں مانتے ہیں، فریادیں کرتے ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ وہ ایک سکھ گورو کے عقوبت خانے پر دیئے جلاتے ہیں، اس زیارت کے عقب میں ایک مختصر احاطہ ہے جس میں بیری کا ایک قدیم شجر سر بلندیوں ہوتا ہے کہ لاہور کے آسمان میں اپنے مرجھائے ہوئے پتے اور سوکھی ہوئی ٹہنیاں جیسے کسی سو برس کے بوڑھے کے سوکھے ہوئے ہاتھ ہوں، بکھیرتا،

دھوپ میں گھنے سائے کرتا ہے.. بیری کے اس درخت کے جھریوں بھرے تنے کا گھیرا اتنا وسیع ہے کہ میں نے کم ہی کسی بیری کے درخت کو اتنی قدامت کی گواہی دیتے دیکھا ہے..

وہ بیری اب بھی موجود تھی..

ذرا آگے اسی لال کھوہ گلی میں ایک گھر کے سامنے عورتوں کا ایک ہجوم تھا، ان میں سے کچھ نادار اور ضرورت مند بھی ہوں گی لیکن بیشتر آسودہ حال لگتی تنومند لاہورنیں تھیں جو دوپٹے اوڑھے، پلو منہ میں دبائے ایک قطار میں کھڑی اپنی باری کی منتظر تھیں..

میں نے ایک لاہوری بابے کو روک کر پوچھا، اور یہ بابا جی کچھ مست الست سے تھے کہ بابیو.. یہاں ہنگامہ ہے کیوں برپا.. تو انہوں نے مجھے پہچان کر کچھ آہ و زاری کی کہ ہائے ہائے تارڑ صاحب کیا وہ زمانے تھے جب آپ جیسے نامہ نیم لوگ ٹیلی ویژن پر آتے تھے اور اب تو وہاں بھانڈ اور میراثی مسخرے راج کرتے ہیں.. اگرچہ خصوصی لاہوری زبان میں نامہ نیم کوئی توصیفی کا مپلی منٹ نہیں لیکن لاہوری بابا نے اپنی معصومیت میں مجھے اس مخدوش خطاب سے نواز دیا تھا، ان کی نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا ''تارڑ جی.. وہ اپنے رفیق برفی والے نہیں ہیں جن کے بزرگ لال کھوہ کے قریب برفی بیچتے تھے.. انہیں تو رنگ لگ گئے ہیں، شہر میں جگہ جگہ اُن کے سٹور کھل گئے ہیں، لال کھوہ کی برفی کے نام پر لوگ اٹڈ اٹڈ کر آتے ہیں تو وہ ہر اتوار مستحق اور نادار عورتوں کی مدد کرتے ہیں، دوسو روپے فی عورت خیرات کرتے ہیں..''

میں نے ذرا سرسری اور بے پرواہ انداز میں ان عورتوں کے ہجوم کی اپنے سیل فون سے دو تین تصویریں اتاریں.. فوراً ایک خاتون گوری چٹی اور تنومند.. اس ہجوم سے الگ ہو کر میرے پاس آئی اور ذرا خشمگیں ہو کر کہنے لگی ''آپ وہی ہو جو ٹیلی ویژن پر آتے ہو؟''

''اب تو نہیں آتا، پر کسی زمانے میں آیا کرتا تھا..''

''آپ نے میری تصویر اتاری ہے؟''

''میں نے فوراً کہا کہ نہیں نہیں میں تو..''

''اسے اخبار میں تو نہیں شائع کرو گے..'' اس کے تیور بُرے تھے..

''بی بی میں نے آپ کی ہرگز تصویر نہیں اتاری.. کسی کی بھی تصویر نہیں اتاری..''

''دیکھ لو..'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی بلکہ واپس اُس قطار میں شامل ہو گئی.. دراصل وہ کسی مڈل کلاس گھرانے کی عورت تھی اور مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے کے مصداق دوسو روپے حاصل کرنے کے لیے چلی آئی تھی، اُسے خدشہ ہوا کہ کہیں اخبار وغیرہ میں میری تصویر شائع ہونے سے میرے خاوند اور گھر والوں کو خبر نہ ہو جائے کہ یہ خیرات وصول کرنے کے لیے چلی جاتی ہے..

لال کھوہ گلی کی اُس خیراتی بھیڑ کے دائیں جانب ایک اور گلی نکلتی تھی اور وہ عجیب گلی تھی ''گلی لٹھ ماراں'' کہلاتی تھی..

بے شک لاہور کی گلیاں گندی مندی تھیں لیکن اُن کے نام کیسے سہانے اور دل پر نقش ہو جانے والے تھے..کوچہ تیر اندازاں اور گلی کمانگراں کا تذکرہ ہو چکا، لیکن وہاں ایک گلی گھنگھرو سازاں بھی تھی اور ''محلّہ چڑی ماراں'' کیا تھا، کیا معصوم چڑیوں کو مارنے والوں کا محلّہ..نہیں.. یہاں وہ لوگ آباد تھے جو چڑیوں کو دام میں لاتے تھے، انہیں مارتے نہیں تھے، ان کے پر نوچ کر، انہیں گنجیاں کر کے آزاد کر دیتے تھے اور یہ پر لاہور کے تیر کی نشست میں نصب کر کے انہیں پرواز کے قابل بناتے تھے..وہ انہیں آزاد کر دیتے تھے تا کہ ایک مرتبہ پھر اُن کے بال و پر اُگ آئیں اور وہ انہیں پکڑ کر ایک مرتبہ پھر ان کے پَر تیروں کی پرواز کے لیے تیرگروں کو سپلائی کر دیں..

ایک اور نیلا بورڈ شکستہ دیوار میں پیوست ''گلی لوہاراں'' اور اُس کے نیچے ''کاوش توقیر بابا 2012ء..''

یہ جو کوئی بھی، جانے کون توقیر بابا تھے، اپنے شہر کے دھوپ دروازوں، محلوں اور گلیوں پر ناز کرنے والے تھے..انہوں نے جگہ جگہ اُن تاریخی گلیوں کے ناموں کی تختیاں آویزاں کیں تا کہ خلق خدا جان جائے کہ لاہور، لاہور ہے....

''کوچہ جہان خان، محلّہ پیر گیلانیاں..''

اور یہ میرے ناول ''خس و خاشاک زمانے'' کا وہ بخت جہان نہ تھا جو دراصل میری والدہ کا سگا چچا جہان خان تھا، یہ جہان خان، شاہجہاں کے زمانوں کا سالار تھا..

''کوچہ گئو گھاٹ..10 گھر (گلی بند)

کاوش توقیر بابا، 2011ء''

یہ کوچہ کس مقدس گائے کا گھاٹ تھا، خبر نہیں..

ایسے متعدد کوچے اور گلیاں تھیں جن کے ناموں کے آگے (گلی بند) لکھا ہوتا تھا اور اُس گلی میں واقع کل مکانوں کی تعداد درج ہوتی تھی..

''گلی سائرہ بی بی (بند) 18 گھر''

''کھجور گلی (بند) 15 گھر''

یہ بھی ایک اور عجیب سی گلی تھی ''گلی لٹھ ماراں''..

یعنی یہاں جو لوگ رہائش کرتے تھے وہ سب کے سب اپنے زمانے کے سلطان راہی تھے، گنڈاسے نہیں، لٹھ مارتے تھے..

''کیوں آصف؟''

''ہاں جی حاجی صاحب.. یہ لوگ بات بے بات پر اُلجھنے والے، ڈانگ سوٹا ہو جانے والے، ذرا وحشی نوعیت کے حضرات تھے..''

''گوجر تھے؟''

''ہاں جی.. پتہ نہیں حاجی صاحب..''

''گلی لٹھ مارا ا'' سے ہم واپس لال کھوہ کی اُس درگاہ کو لوٹ آئے جہاں ایک سینکڑوں برس پرانا بیری کا درخت، حق موجود، سچ موجود کی گواہی دیتا تھا..

مغلوں کی خوشنودی کی خاطر ایک ہندو درباری چندو شاہ نے گورو گوبند سنگھ کو اسی بیری والے احاطے میں قید کر کے تشدد کیا اور اُن کا دانہ پانی بند کر دیا تا کہ وہ بھوک کی تاب نہ لا کر ہلاک ہو جائیں.. گورو گوبند سنگھ اگر چہ میرے گورو نہیں ہیں لیکن میں اُن کے علم و فضل، بے جگری اور دلاوری کا مداح ہوں..وہ فارسی زبان کے ایک بے بدل شاعر تھے اور میں نے ان کا موثر کلام پڑھ رکھا ہے..ان کی خصلت میں ایک صوفی مزاج تھا اور وہ میاں میر صاحب کی درویشی کے پیروکار تھے..گورگوبند اور میاں میر صاحب کی بہت یاریاں تھیں، یہاں تک کہ جب وہ قید میں ڈالے گئے تو میاں میر صاحب نے پیشکش کہ جتنا تاوان ہے وہ میں بھرتا ہوں آپ اس درویش کو آزاد کر دو..

''لال کھوہ'' کی سرخی جس طور قدیم تاریخ کی ایک حیرت انگیز داستان بنتی ہے اسے بیان کرنے کی خاطر مجھے کافی حد مجید شیخ کی مریدی اختیار کرنی پڑے گی۔آخر سکھ اس سرخ کنویں کی زیارت کرنے کے لیے دور دور سے کیوں آتے ہیں؟

اس مقام پر لاہور کے میٹھے پانیوں کا ایک کنواں 1975ء تک موجود تھا اور اس شہر کے باسی اس کنویں کے پانیوں کو اپنے دکھوں اور بیماریوں کا امرت دھارا سمجھتے تھے..پھر حسب معمول کچھ مقامی مولانا دھم سے آ کودے کہ یہ شریعت کی خلاف ورزی ہے اور اسے بند کر دیا..حیرت انگیز تاریخ کی یہ گواہی ہے، بلکہ روایت کی گواہی ہے کہ آج سے ہزاروں برس پیشتر شہر لاہور کی فصیل کے باہر ایک ٹیلے پر ایک ایسا کنواں ہوا کرتا تھا جس کے پانی اس لیے پُرتاثیر تھے کہ کسی ہندو دیوی وغیرہ نے اسے اپنی آشیرواد سے نوازا تھا..ویسے ایک مقامی کا کہنا ہے کہ کنواں جب اینٹوں اور مٹی سے بھر دیا گیا تو آس پاس کی مساجد میں نمازیوں کی کمی ہو گئی..اس کا سبب یہی ہوسکتا ہے کہ کنویں سے پانی حاصل کرنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے اور ظاہر ہے وہ مسلمان تھے تو وقت کی نماز وہ انہی مساجد میں ادا کرتے تھے..کنواں بند ہو گیا تو پانی لینے والے بھی بند ہو گئے اور نمازی بھی کم ہو گئے..

سیالکوٹ سے کچھ دور ہندوستانی سرحد کے نزدیک پورن بھگت کا کنواں، تقریباً دو ہزار برس کی

قدامت میں ڈوبا آج بھی موجود ہے..لوگ وہاں اولاد کی خواہش کی تکمیل کے لیے آتے ہیں، مسلمان عورتیں اس کے پانیوں سے غسل کرتی ہیں، برابر میں ایک چھوٹا سا مندر یُونی کا ہے جس کا نقش فرش پر ثبت ہے..میں نے سیالکوٹ کا جو سفر اختیار کیا تو مرکزی کشش پورن دا کھوہ تھی، کچھ عرصہ پہلے شنید ہے کہ سیالکوٹ کی ایک معتنک اور صحت مند سیاست دان نے جو مرکزی وزارت سے بھی لطف اندوز ہو چکی ہیں، اس کنویں کے پانیوں سے غسل کیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ پانی ختم ہو گئے تھے..

پورن کے کنویں کے پانیوں سے نہانے والی اولاد کی خواہش مند عورتیں اپنے ساتھ کپڑوں کا ایک نیا جوڑا لاتی تھیں اور غسل کے بعد بدن کے کپڑے کنویں کے عقب میں نذر آتش کر کے نئے کپڑے زیب تن کر کے گھر واپس جاتی تھیں..اور میں نے مشاہدہ کیا کہ وہاں چند درختوں کی ویران قربت میں چند سلگتے ہوئے پیراہنوں میں سے دھواں اٹھ رہا تھا..

اگر پورن کا کنواں دو ہزار برس سے موجود اور لبریز ہے تو بیچارے لال کھوہ کا کیا قصور ہے..بلکہ کسی حد تک میں مناسب نہیں سمجھتا کہ ہماری مسلمان عورتیں اتنی ضعیف العقیدہ ہو جائیں کہ ایک ہندو بھگت کے کنویں کے پانیوں سے بچوں کی مانند نہائیاں نہائیاں کر کے خوش ہوں یعنی شرک کی مرتکب ہوں..تو لال کھوہ کے پانی تو لوگ پیتے تھے، آرزو کرتے تھے، اس میں ڈبکیاں تو نہیں لگاتے تھے..شاید اس لیے کہ پورن بھگت کے کنویں کے گرد دور دور تک علماء کرام کا فقدان ہے..وہ ابھی تک موجود ہے..

لال کھوہ اس لیے لال کہلایا کہ جو لوگ مرادیں مانگنے آتے تھے، وہ یہاں سرخ دھجیاں باندھتے تھے..

تمام صوفی مرقدوں کی جالیوں میں دھجیاں اور دھاگے بندھے ہوتے ہیں اور ہر دھجی میں ایک ناتمام آرزو اور ہر دھاگے میں ایک خواہش بندھ ہوتی ہے..

مجھے یاد ہے کہ فتح پور سیکری کی عظیم دروازے والی سرخ مسجد کے اندر سلیم چشتی کے مزار پر ایک کائیاں شخص نے میرا ناک میں دم کر دیا کہ مجھ سے یہ دھاگا صرف دس روپے میں خرید لو، چشتی کے مزار کی جالیوں میں باندھ دو گے تو دل کی مراد پاؤ گے..وہ ایک دل آزار اور جونک کی مانند ڈھٹائی سے چمٹ جانے والا منحنی سا ہندوستانی مسلمان تھا اور میں نے بمشکل اُس سے پیچھا چھڑایا..جتنی خواہشیں ناتمام تھیں، اتنے دھاگے اُس کے پاس کہاں تھے..

یہیں کہیں چندو کی حویلی بھی ہوا کرتی تھی، جہانگیر کے عہد کا ایک ساہوکار اور متمول شخص چندو شاہ..

اُس کی بیٹی کی جو شکل معمولی رکھتی تھی، اُس کی شادی نہ ہوتی تھی..اُس نے ایک پروہت سے روحانی امداد طلب کی اور اُس نے کہا کہ اس بیٹی کے لیے سب سے موزوں رشتہ پانچواں سِکھ گوروارجن دیو ہے تو چندو نے قہقہہ لگا کر کہا ''وہ فقیر جو خیرات پر گذر اوقات کرتا ہے..''

گورو تک بھی یہ بات پہنچی تو اس نے کہا "مجھے پیشکش ہو تو مجھے بھی یہ رشتہ منظور نہیں.."

جہانگیر اپریل کے مہینے میں 1616ء میں اپنے ناخلف بیٹے خسرو کا تعاقب کرتا، جس نے کہ اپنے دادا کی خواہش کے مطابق ہندوستان کے تخت پر اپنے حق کا اعلان کر دیا. شہزادہ خسرو بھی گوروارجن کا مداح تھا، وہ اس کی خدمت میں حاضر ہو کر دعاؤں کا طلب گار ہوا، اور گورو نے ایک صوفی بزرگ کی مانند اُسے آشیرواد دی..

چندو شاہ نے فوری طور پر جہانگیر کے کان بھرے.. صرف ان زمانوں کے نہیں، بلکہ ان زمانوں کے شہنشاہوں کے کان بھی خالی ہوتے تھے، نہایت آسانی سے بھرے جا سکتے تھے چنانچہ جہانگیر نے طیش میں آ کر فرمان جاری کیا اور دو لاکھ روپے کا جرمانہ گورو کو ادا کرنے کا حکم دیا، علاوہ ازیں شہنشاہ نے حکم دیا کہ گرنتھ صاحب میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے شاعری اور تقدس کے حوالے درج ہیں انہیں حذف کر دیا جائے..

حضرت میاں میر صاحب کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ ہنس دیئے.. گورو نے نہ صرف جرمانہ ادا کرنے سے انکار کیا کہ میرا کچھ جرم نہیں بلکہ گرنتھ صاحب میں شامل بابا فرید کی شاعری اور ہندو سنت لوگوں کے اقوال حذف کرنے سے انکار کر دیا اور عتابِ شاہی کا شکار ہو گیا..

چندو شاہ کی موج ہو گئی کہ اس فقیر نے میری بیٹی کے رشتے سے انکار کر دیا تھا، اس نے گورو کو موچی دروازے میں واقع اپنی حویلی میں گلیوں میں گھسیٹ کر ایک کوٹھڑی میں ڈال دیا.. اس کوٹھڑی کے قریب ایک کنواں تھا اور بیری کا ایک گھنا شجر تھا.. چندو شاہ نے گورو کو ہلاک کرنے کے لیے اُس کا کھانا پینا بند کر دیا تا کہ وہ بھوک سے مر جائے..

ہر جمعرات پر حضرت میاں میر صاحب لال کھوہ تشریف لاتے اور ایک کوٹھڑی میں محبوس بھوک سے نڈھال گوروارجن کے لیے دعا کرتے اور انہوں نے یہ دعا بھی کہ اس بیری کے بیر سارے موسموں میں، سال بھر ثمر آور رہیں، وہ بیر کوٹھڑی کے صحن میں گرتے رہیں اور ارجن کی بھوک کا مداوا کرتے رہیں اور اس کنویں کے پانی سدا شیریں اور سرد رہیں، میاں میر صاحب اُس گلی میں بیٹھے ہوئے ایک غریب خوانچہ فروش سے برفی خریدتے، اسے ایک دھجی میں لپیٹ کر گوروارجن کی کوٹھڑی کی ایک تنگ کھڑکی میں سے اندر پھینک دیتے..

کہا جاتا ہے کہ جب گوروارجن مسلسل فاقوں کے باوجود ہلاک نہ ہوا تو چندو شاہ نے اُسے آہنی زنجیروں میں باندھ کر لاہور کی گلیوں میں گھسیٹتا قلعہ لاہور تک لے گیا جب کہ اہل شہر اس کی معصومیت کی پکاریں کرتے تھے اور روایت ہے کہ مسلمان کربلا کے مظلوم شہیدوں کی یاد میں ماتم کرتے تھے..

تزک جہانگیری میں درج ہے کہ ارجن پانچ روز مسلسل تشدد کی وجہ سے ہلاک ہو گیا. سکھ تاریخ دان دعویٰ کرتے ہیں کہ اسے زندہ حالت میں ایک بھینس کے چمڑے میں پرو کر راوی میں ڈبو دیا گیا اور کچھ کا کہنا

ہے کہ گوروا شنان کرنا چاہتا تھا اور وہ خود راوی کے پانیوں میں اتر گیا...

مجھے ایک بار مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سنہری گنبدوں والی ایک مسجد دکھائی دیتی سمادھی اور وہاں تعمیر کردہ گوردوارہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا..اور یہ ایک یادگار زیارت تھی، رنجیت سنگھ کے علاوہ جہاں اس کی ایک نہایت شاندار پورٹریٹ آویزاں ہے اور اس میں بھی اس کی ایک آنکھ نیم وا ہے..اگر چہ وہ مصور کو حکم دے سکتا تھا کہ حقیقت کی ترجمانی نہ کرو، دوسری آنکھ کو بھی مکمل شکل میں مصور کرو لیکن اُس نے حکم یہ دیا تھا کہ مجھے جُوں کا تُوں، جیسا میں ہوں، ایک آنکھ کا ہوں، ایسے ہی مصور کرو..وہاں نونہال سنگھ اور کھڑک سنگھ کی سمادھیوں کے قبر نما ابھار بھی تھے لیکن اوقاف کے محکمہ کے ایک اہلکار نے مجھ سے کہا ''تارڑ صاحب..میں آپ کو اُس مقام تک لے جاتا ہوں جہاں سے گوروارجن دیو راوی کے پانیوں میں اتر کر روپوش ہو گئے تھے اور سکھوں کا عقیدہ ہے کہ وہ پھر سے ظاہر ہوں گے..''

وہاں ایک سُرنگ تھی، ایک اترتی گھاٹی تھی، اور نیم تاریکی تھی اور میں اُس کے اندر اترا..کہ یہی وہ سُرنگ یا گھاٹی تھی، سکھ مورخوں کے مطابق جہاں سے اتر کر ارجن دیو راوی کے پانیوں میں روپوش ہو گئے تھے..

اُن زمانوں میں دریائے راوی بادشاہی مسجد کے پہلو میں خاموشی سے بہتا تھا..

چندو شاہ بھی بہت بری موت مرا..اُسے بھی گلیوں میں گھسیٹا گیا اور جیسے اُس نے ارجن دیو کو گرم ریت میں دفن کرنے کی کوشش کی تھی..جہانگیر کے ہی کہنے پر اُسے اس کی ''چندو کی حویلی'' میں سے نکال کر گلیوں میں گھسیٹا گیا جب کہ مسلمان اور سکھ اُس پر لعنت بھیجتے چندو کی چُندیا سہلاتے تھے، ایسے اُسے بھی جلایا گیا..آج بھی سکھ لال کھوہ کی زیارت کے لیے آتے ہیں اور گوروا اور میاں میر کی یاد میں یہاں کی برفی خرید کر غریبوں میں تقسیم کرتے ہیں..اور بیری کے درخت کے پتے مقدس جان کر سینے سے لگا کر لوٹ جاتے ہیں..

حضرت میاں میر اور گوروارجن کی دوستی تصوف اور فراخ دلی کے شجر کے ثمر تھے، ان دونوں کی یاریاں بے مثل تھیں..

میاں میر صاحب نے ہی دربار صاحب امرتسر کے سکھوں کے کلّا کی بنیاد رکھی...بعدازاں وہ برفی جو گوروارجن کی کوٹھڑی کے روزن میں سے حضرت میاں میر صاحب اپنے صوفی بھائی کے لیے پھینکتے تھے، اتنی مشہورِ زمانہ اور من پسند ہوئی کہ اسے فروخت کرنے والے اتنے ثروت مند ہوئے کہ آج ''نادار'' عورتوں میں روپے خیرات کرتے ہیں۔اگر چہ انہیں کچھ خبر نہیں کہ یہ گوروارجن کون تھا اور لال کھوہ کے احاطے میں بیری کا جو درخت ہے اُس کی تاریخ کیا ہے اور وہ بے خبری میں ایک سکھ برفی، ایک سکھ گورو کی برفی فروخت کر کے کروڑوں میں کھیلتے ہیں، اگر چہ اُس برفی کو میاں میر صاحب ایسے بزرگ کی شفقت بھی حاصل تھی..

جیسے غالب سے کسی نے کہا تھا کہ حضرت یہ مٹھائی جو آپ نہایت رغبت سے کھا رہے ہیں ایک ہندو حلوائی کی تیار کردہ ہے تو انہوں نے کہا تھا.. مٹھائی، ہندو یا مسلمان نہیں ہوتی، بس مٹھائی ہوتی ہے.. تو لال کھوہ کی برفی..

لال کھوہ کی پگوڈا نما یادگار پر کچھ بجھے ہوئے چراغ تھے..

وہ جب کبھی سر شام روشن ہوتے ہوں گے تو آج بھی ان کی جھلملاہٹ میں میاں میر صاحب اور گوردارجن کی یاریوں کے چہرے دکھائی تو دیتے ہوں گے..



''بابا چور بادشاہ، معصوم شاہ اور بابا شاہ مراد''

''اچھے دودھ کی پہچان
حاجی صادق کی دکان
اُسامہ گجر..خالص تازہ دودھ
پپو گجر..''

ایک رکشے پر نقش..
پاکستان کا سب سے بڑا اسلامی میوزیم
رسولِ پاک کے جبہ مبارک، عصا مبارک، بال مبارک، نعلین مبارک اور دیگر تبرکات کی زیارت کے لیے تشریف لائیں..
الحاج محمد حسین گوہر، کوٹھی نمبر 235، شاد باغ، لاہور
''مسجد غازی علم دین شہید، مردِ مجاہد
زیر نگرانی حاجی ملک شہاب دین گجر، لاہور''
یہ کوچہ علم دین شہید کا تھا، جس نے ''رنگیلا رسول'' کے لعین ناشر راج پال کو واصل جہنم کیا، جس کی توصیف عطاء اللہ شاہ بخاری اور علامہ اقبال نے کی کہ ایک ان پڑھ ترکھان نے وہ کچھ کر دیا جو ہم نہ کر سکے..
اس غازی کی شاندار حویلی ابھی تک سر بلند تھی..
''کیا یہ شہید اتنا ثروت مند تھا کہ اتنی پرشکوہ حویلی تعمیر کی؟''
''تارڑ صاحب، کیا بات کرتے ہیں، عشق رسول میں جان نچھاور کرنے والوں کے لیے بہت حویلیاں..''
یہ حویلی واقعی بہت ذی شان اور قدامت کے جھروکوں اور منقش کھڑکیوں سے مزین تھی..
دراصل علم دین شہید کی موت بعد کے زمانوں میں قتل کے جواز ایک مذہبی انصاف قرار دیئے گئے..

وہ ایک آغاز تھے..

جہاں بھی خدشہ ہو، اُس خدشے کو قتل کر دینے کی روایت نے جنم لیا..اب یہ جو ایک دن کی لاہور آوارگی ہے تو اس آوارگی میں بھٹکے ایک مزار کے ہر کتبے پر ٹھٹک جاتے ہیں

''حضرت بابا چُور شاہ، غازی سرکار''

شہر لاہور کی قدامت کے خزانوں میں بہت ہیرے جواہر دفن ہیں، ایسے بزرگ اس کی مٹی میں روپوش ہیں کہ ان میں سے ہر ایک یکتائے روزگار اور سرمستی میں بلند درجات پر فائز ہے..

تو کچھ خبر نہیں کہ حضرت بابا چُور کون تھے..

یا تو وہ عشق حقیقی میں چُور چُور تھے اور یا پھر ایک لاہوریے کے مطابق ''تارڑ صاحب..یہ تو ایک چور بابا تھے...چوریاں کرتے تھے، چُور نہیں چور تھے..''

شہر لاہور کے قدم قدم پر مزار اور دفن شدہ لوگ پاؤں تلے آتے تھے..

''بابا معصوم شاہ شہید''

''حضرت بابا شاہ مراد''

اور جب وہ جنسی بیماریوں کا شکار ہو کر بھری جوانی میں مر جاتیں تو اُن کی لاش اِسی بابا معصوم شاہ کے مزار کے سامنے رکھ دی جاتی..لوگ ترس کھا کر اُس کی لاش پر سکّے پھینکتے اور ان سکّوں سے اُس کی تدفین ہوتی، اس کا کفن خریدا جاتا، اسے درگور کیا جاتا..

ہمارے شیعانِ حیدر کرار کے ستھرے اور کشادہ محلے تھے..لاہور کے دیگر حصوں کی مانند تنگ اور کشید شکل والے نہ تھے..مکان کم تھے اور دروازے..امام بارگاہیں زیادہ تھیں..

ہم یونہی بھٹکتے کوچہ پیر گیلانیاں میں چلے آئے..



''کوچہ پیر گیلانیاں اور مسجد میاں گاماں''

کوچہ پیر گیلانیاں کے برابر میں دو بہت پرانے کھڑکی نما جھروکے عجب شکل کے تھے..جن کے دائیں بائیں طاقچوں میں روشن کیے گئے چراغوں کا دھواں سفید دیوار کو چاٹتا تھا اور ان کے تیل کی چکنائی طاقچوں میں بہتی تھی..

''کوچہ پیر گیلانیاں'' کی نیلی تختی کے برابر میں سنگ مرمر کی ایک سل دیوار میں نصب تھی..

''حضرت پیر نظام الدین گیلانی، المعروف پیر بودیانوالا

حضرت پیر جانن امام المعروف جانی شاہ گیلانی

حضرت چن پیر..

رہائش گاہ دفتر چن پیر''

گویا شہر گیلان سے ہندوستان آنے والے پیر حضرات یہاں بہ کثرت پائے جاتے تھے..بلکہ چن پیر کی بیٹی یہاں رہائش پذیر تھی..

امام بری کے سالانہ عرس کے موقع پر پشاور سے پیدل آنے والے ایک پڑھے لکھے چن پیر سے ملاقات ہوگئی تھی جو الٹی چارپائی پر تشریف فرما تھے..خفت مجھے تب ہوئی جب چن پیر کے مریدان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے تھے تو انہوں نے میرے گھٹنوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا..وہ کچھ کچھ میرے مداح تھے، لیکن یہ والے کوچہ گیلانیاں کے چن پیر کوئی اور تھے، چاند کہیں بھی چڑھ سکتا ہے، لہور پشور کہیں بھی چڑھ سکتا ہے..

ان محلوں میں خواجگانِ نارووال کے قدیمی قیام تھے..لاہور کا یہ حصہ اس لیے بھی کشادہ اور ستھرا تھا کہ یہاں امام بارگاہیں تعمیر کی گئیں اور یوں یہاں کے مکانوں کو دولت کے حرص میں فروخت نہ کیا گیا چنانچہ نہ تو تجاوزات نے جنم لیا اور نہ ہی بھدے پلازے اور تہہ خانے تعمیر کیے گئے۔ پاکستان ایئر فورس کے ایک سابقہ سربراہ میر مصحف علی کا بہت دل کش سہ منزلہ مکان بھی انہی گلیوں میں ہے..

سرخ دروازے والی، سرخ کنویں کے قریب ایک ایسی امام بارگاہ بھی ہے جو صرف خواتین کے لیے مخصوص ہے ''امام بارگاہ السید رضا شاہ صفوی'' دروازے کا ایک کواڑ کھلا تھا، ایک پر پیچ آہنی جنگلے کو تھامے

ہوئے ایک سیاہ پوش عورت سوگوار کھڑی تھی..

''مرکزی امام بارگاہ... باب الحوائج (باب المراد) کے آہنی دروازے پر نہایت شوخ جدید مصوری ایسے گُل بوٹے نصب کیے گئے تھے.. یہ تقدس نئے زمانوں کی آرائش سے مطابق رکھتا تھا..''

چونکہ میرے کچھ نہایت قدیم دوست شیعہ مسلک کے ہیں اس لیے میں ان گلیوں میں اکثر آتا رہا ہوں، خصوصی طور پر خواجگانِ نارووال کی امام بارگاہ میں کسی دوست کے کسی عزیز کی وفات کے موقع پر..

یہ محض اتفاق ہے کہ میں ایک سُنّی گھرانے میں پیدا ہو گیا لیکن میرے نام نے بعدازاں میرے لیے کچھ عجیب مسائل نے جنم لیا.. اگرچہ مجھے اس نام سے کچھ آسانیاں بھی حاصل ہوئی ہیں کہ ایران میں ''حسین'' ہونے کے حوالے سے لوگ ذرا فرینڈلی ہو گئے اور ترکی میں ''مستنصر'' ہونے کی وجہ سے سہولت میں رہا.. ویسے ان زمانوں میں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں شیعہ سُنّی میں کچھ زیادہ تفریق نہ تھی اور اگر تھی تو ہم اُس سے بے خبر تھے، اسی لیے ہم تینوں بھائیوں کے ناموں کے ساتھ ''حسین'' ایک خوبصورت پہچان تھا.. اب تو ازحد احتیاط کرنی پڑتی ہے، خاص طور پر شمال کی جانب سفر کرتے ہوئے، کوہستان اور چلاس سے گذرتے ہوئے، یا پھر کوئٹہ کے آس پاس کہ اسی پہچان کی پاداش میں کہیں دھر نہ لیے جائیں، بلکہ وہیں کہیں درّہ بابوسر کی چوٹی پر دھرے کے دھرے نہ رہ جائیں، شناختی کارڈ اگر چیک ہو گیا تو ہم صرف حسین کے نام کی وجہ سے شہید کر دیئے جائیں گے، ویسے اس نام کے سلسلے میں ایک نہایت بصیرت افروز سانحہ بھی ہو گیا.. میرے ایک بچپن کے دوست، وہ بھی خواجگانِ نارووال میں سے تھے اور جیسے میں اتفاقاً سُنّی تھا وہ بھی شیعہ پیدا ہو گئے تھے، اُنہیں اللہ تعالیٰ نے صرف بیٹیوں سے نوازا.. اُس کی اہلیہ جب ایک بار پھر امید سے ہوئیں تو جذباتی ہو کر کہنے لگا.. تم دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھے اولادِ نرینہ سے سرفراز کرے.. اگر بیٹا ہوا تو میں تمہارے نام پر اُسے مستنصر حسین پکاروں گا.. میں کیا اور میری دعا کیا، تب تو نہ میں نے حج کیا تھا اور نہ غارِ حرا میں ایک رات بسر کی تھی، اس کے ہاں بیٹا پیدا ہو گیا اور میں خاص طور اُسے مبارکباد دینے کے اور نومولود کو دیکھنے کے لیے لاہور کے ایک معروف لیڈی ہسپتال میں گیا.. بچے کو دیکھ کر خوش ہوا کہ میں تو کالا شاہ کالا ایک مستنصر حسین تھا، کم از کم یہ والا گورا چٹا ہو گا.. ایک ماہ گذر گیا، اُدھر سے کچھ خبر نہ آئی تو میں نے خود ہی پوچھ لیا کہ نومولود مستنصر کا کیا حال ہے..

میرے دوست نے ایک ناراض شکل بنا کر کہا ''تم تو مجھے مروانے لگے تھے..''

''کیسے؟''

''ہم اپنے بچوں کے نام رکھنے سے پیشتر اپنے کسی مذہبی مفکر سے مشورہ کرتے ہیں اور جب میں نے اُن سے کہا کہ میں اپنے بیٹے کا نام اپنے ایک عزیز دوست کے نام پر مستنصر رکھنا چاہتا ہوں تو ذرا تاؤ میں آ گئے.. تمہارا دماغ خراب ہے.. تم نہیں جانتے کہ خلیفہ مستنصر باللہ نے کتنے شیعانِ حیدر کرار کو شہید کیا..''

نہ مجھے خبر تھی اور نہ میرے ماموں جان کو جنہوں نے عباسی خلفاء کی چاہت میں مجھے یہ نام دیا تھا کہ

موصوف یعنی مستنصر باللہ کے تعلقات شیعہ حضرات سے قدرے کشیدہ تھے اور ان سے قدرے دشمنی رکھتے تھے چنانچہ نومولود کو مذہبی مفکر کا تجویز کردہ ایک مناسب شیعہ نام دیا گیا..

ایک راہ چلتے لاہوری نے کچھ توقف نہ کیا، چلتے چلتے کہنے لگا.. ''تارڑ صاحب یہ دائیں ہائیں پر مسجد میاں گاماں ہے..دیکھتے جائیے..''

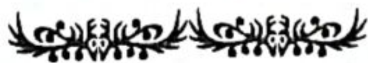
اُس مسجد کی تعمیر نے مجھے بُلایا نہیں، معمولی سی مسجد تھی، میں نے دیکھا اور گذر گیا..بعد ازاں تحقیق کی جستجو کے دوران میں کنہیالال کے برابر کے عظیم محقق خان بہادر سیّد محمد لطیف کی لاہور کے بارے میں اہم ترین تحقیق ''لاہور.. ہسٹری، آرکی ٹیکچرل، ایمنیز اینڈ انٹیکس'' کی ورق گردانی کر رہا تھا اور وہاں اس تاریخی مسجد کا تذکرہ موجود تھا..

''امام غلام محمد گاماں کے علم و فضل کی بہت دھوم تھی..اُس نے فارسی زبان میں ایک طویل نظم تخلیق کی جس کا نام ''گنجِ مخفی'' تھا..وہ ایک مسجد کا امام تھا، 1828ء میں اُس کی وفات ہوئی..''

نثار حویلی کا سبز رنگ میں پوچا ہوا، آہنی کوکوں سے مزین پھاٹک کھلا نہ تھا، یہ سال میں صرف ایک بار کھلتا ہے جب دسویں محرم کے موقع پر یہاں سے دُلال یا ذوالجناح نکلتا ہے..ماتم اور سوگواری میں ڈوبے ماحول میں میرے پرانے سکول مسلم ماڈل کے قریب کربلا گامے شاہ میں گئی رات جا داخل ہوتا ہے..

ہم اس پھاٹک میں نصب ایک ذیلی دروازے میں سے بمشکل سکڑ کر میری توند کہاں تک سُکڑ سکتی تھی، نثار حویلی میں داخل ہوئے..البتہ نسیم اپنی قامت اور چھریرے بدن کی صورت آسانی سے داخل ہو گیا..

نثار حویلی شاید سال بھر سوگ میں رہتی تھی، سرخی میں رنگے در و بام اور قدیم بالکونیاں ویران پڑی تھیں..



"آصف، ایک کٹھور گڈریا اور سنہری مسجد کا سُنہرا پن"

آصف ایک ایسا کٹھور گڈریا تھا جو کچھ خیال نہ کرتا تھا کہ اُس کی بھیڑیں بہت بھوکی ہو چکی ہیں، انہیں ہانکتا چلا جاتا تھا کہ حاجی صاحب ذرا اس گلی میں جھانک لو، یہ کوچہ تاریخ کے اوراق پر درج ہے.. یہ مسجد، یہ جھروکا، یہ حویلی..

بھوک سے نڈھال بھیڑوں نے منمنانا شروع کر دیا، ناشتہ، ناشتہ..

کرنل عامر پکارتا تھا. صرف ایک چائے کی پیالی. صرف ایک پیالی.. ندیم شیخ ہر حلوہ پُوڑی کی دکان پر، فٹ پاتھ پر سجے سری پائے اور چنوں کے دیگچوں اور تندوروں کی گرمائش میں گرم ہوتے قلچوں کی خوشبوئیں سونگھتا، کبھی رُکتا اور کبھی "ہائے ہائے" کرتا فریاد کرتا ممیاتا چلا جاتا تھا..

اور سرفراز ملک، بھی اپنی بادامی آنکھیں جھپکتا، مسکراتا چلا جاتا تھا..

تب گڈریئے کو بھیڑوں کی حالت زار پر رحم آ گیا اور ہم ناشتے کے لیے رک گئے..

"آصف.. کیا یہ خاص مشہور عالم، لاہور کا سب سے اعلیٰ ناشتہ مقام ہے؟"

"حاجی صاحب.. اندرون شہر جہاں کہیں بھی ناشتے کے مقام ہیں وہ سب کے سب بہترین ہوتے ہیں، اگر نہ ہوں تو اُن کا کاروبار ٹھپ ہو جائے، ایک لاہوری کو اگر ناشتہ پسند نہ آئے تو وہ سری پائے کے شوربے والا پیالہ دکاندار کے چہرے کی جانب اچھال دیتا ہے چنانچہ یہاں ناشتے کا ہر مقام بہترین ہے.."

اور واقعی حق سچ تھا..

پُوڑیوں کی خستگی، حلوے کی شیرینی، آلو چنوں کی نمکینی اچار میں گُھلی ہوئی، قیمے کی ٹکیوں، سری پائے کے شوربے میں مغز کی گھلاوٹ، قلچوں کی سوندھی گرماہٹ، گھنی لسّی کے گلاسوں میں دہی کی موٹی بالائی کی تہہ.. اور جب سب کی سب بھیڑیں نہایت شادکام ہو کر کچھ مخموری سی ہو گئیں تو انہیں بیدار کرنے کے لیے کڑک چائے کے "کوپ" آ گئے.. بھیڑیں اپنے گڈریئے آصف سے خوش ہو گئیں.. اور اب وہ بھوک سے نہیں بھر چکے پیٹ کی سرخوشی سے باں باں کرتی تھیں، آصف مجھے سنہری مسجد کی جانب لے گیا..

سنہری مسجد کے سنہرے گنبد لاہور کی سویر میں دھوپ کی پہلی کرنوں سے روشن ہو رہے تھے.. یہ

لاہور کی دیگر مسجدوں کی شانداری، وسعت اور عظمت سے الگ ایک مختصر مسجد ہے..ایک منی ایچر تصویر ہے.. مسجد بوکن خان کی مانند اس کا دروازہ بھی بند تھا..اگرچہ میں بہت بار اسے دیکھ چکا تھا لیکن ایک بار پھر اس نازک اور سنہری نار کو دیکھنے کی چاہت تھی، دروازہ دھکیلنے سے کھُل تو نہ سکا لیکن دونوں کواڑوں کے درمیان دھکیلنے سے جو گنجائش کھلی، اُس میں سے جھانکا..

سنہری مسجد کی وہ جھلک میرے دل پر نقش ہو گئی..

وہ ویران پڑی ہُی پر اپنے سنہری حسن کی دلکشی سے میرے اندر آباد ہو گئی..

''کیوں، آخر کیوں..'' میں نے مسجد کی سیڑھیوں کے برابر میں ''لڈو پیٹھیاں والے'' خوانچہ فروش سے پوچھا ''سنہری مسجد کا دروازہ کیوں مقفل ہے..ایک مسجد کے دروازے تو دن رات کھلے رہنے چاہئیں..''

تو اُس نے کہا ''حاجی صاحب..دروازہ کھلا ہو تو لوگ سب کچھ چرا کر لے جاتے ہیں، ہم بے ایمان لوگ ہیں نہ صرف مسجد کا کلاک، نلکوں کی ٹوٹیاں، لوٹے اور ٹوپیاں چوری ہو جاتے ہیں بلکہ مسجد کا یو پی ایس بھی کوئی اٹھا کر لے گیا..''

تو ہم لوگ چور ہیں..

احتیاط لازم ہے ورنہ کسی روز پوری کی پوری سنہری مسجد بھی چوری ہو جائے گی..

سنہری مسجد کے تین دھوپ دمکتے گنبد قدرے خوفزدہ سے لگتے تھے کہ کہیں ایک ایک کر کے ہم بھی چوری نہ ہو جائیں..

چوری میرا پیشہ ہے اور نماز میرا فرض..

''حویلی مراتب علی شاہ اور حویلی علی سائیں پہلوان کا خواجہ نائک، ہمارے اندر جو بھوک کے ڈھول بجتے تھے وہ تو اُس شاندار نشہ آور، ذائقہ نشیں ناشتے کی رشوت سے لب بستہ ہو گئے لیکن ہم اب ہمارے اندر تھکن کی جو نوبت باجتی تھی اُس کا کیا کریں، سانس نہیں تھکن نقارہ کوچ کا باجت ہے دِن رین..

چنانچہ کوچ کا نقارہ بجا دیا گیا کہ چلو چلو ان گلیوں کی گندگی سے نکلو، کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں اور نالیوں میں تھم تھم کر بہتی غلاظت سے فرار حاصل کر کے شہر کی ستھری اور کھلی بستی میں اپنے گھروں کو لوٹو..اپنے ماڈل ٹاؤنوں، جوہر ٹاؤنوں اور گلبرگوں کو واپس ہو جاؤ.. پر یہ خیال تو دامن تھام لے گا کہ ان بستیوں میں راحت، سہولت اور کشادگی تو ہے پر تم ہی انصاف کرو کہ ان میں کہیں کوئی ایک مسجد صالح محمد کمبوہ، بوکن خان کی مسجد، حویلی پتھراں والی، لال کھوہ یا مسجد چینیاں والی، تکیہ سادھواں، گنج شہیداں یا بابا مراد کا مزار ہے..یہ سب پھیکی اور بے رُوح بستیاں ہیں اگرچہ سہولت والیاں ہیں..ان میں کوئی ایک اینٹ ایسی نہیں جس پر سینکڑوں زمانے گذر چکے ہوں اور ہر اینٹ کی ایک الگ داستان حیرتوں اور عجوبوں کی ہو..وہاں گندگی کے باوجود تاریخ کے مدھم

سانس سُنائی دیتے ہیں اور یہاں تو تاریخ کا ابھی آغاز ہی نہیں ہوا، یہ ابھی تک مُردہ اور بے جان ہیں..

گلیوں میں تانک جھانک کرنا میری آوارگی، صحرانوردی اور آبلہ پائی کی ایک خصلت ہے..میری مجبوری ہے..

؎ کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا..

تانکنے جھانکنے سے ہی آپ کی آنکھوں میں گوہر مراد دمکتے ہیں..گلیوں میں پوشیدہ تاریخ کی قدامت کے معجزے ظاہر ہوتے ہیں..

دل سے شوقِ رُخِ نکو نہ گیا
تانکنا جھانکنا کبھو نہ گیا

میں نے قرطبہ کی ایک شب میں بھی ایک گلی میں جھانکا اور یہ وہ گلی تھی جس میں جھانکتے ہوئے ایک صوفی متشرع بزرگ نے ایک ایسا چہرہ دیکھا کہ وہ اپنی عمر رسیدگی اور پاکیزگی کے باوجود اُس کے عشق میں یوں مبتلا ہوا کہ ہمیشہ کے لیے قرطبہ کو چھوڑ دیا، اگر وہ ٹھہر جاتا تو شہر بھر میں بدنام ہو جاتا..

یہ الگ بات کہ لبنانی ناژلا سعد اُس گلی میں بس وہی چہرہ تھا..بس اسی لیے بدنامی کے ڈر سے میں نے بھی قرطبہ چھوڑ دیا...اگرچہ اس کے باوجود بدنامی میرا مقدر رہوئی..

میں نے ایسی بہت تنگ گلیوں میں جھانکا..کبھی غرناطہ کی خانہ بدوشوں کی گلیوں میں، دمشق کے کوچوں میں، ہرات کی رات میں، شمس تبریز کے شہر میں اور اُس کی ایک تاریک شب میں، کبھی فلارنس اور کبھی یارقند میں، میں نے بہت تانک جھانک کی..تانکنا جھانکنا کبھو نہ گیا..

چنانچہ کوچ کا، واپسی کا نقارہ بج چکا تھا، ہم قدم اٹھاتے نہ تھے، گھسٹتے تھے جب ہمیں حویلی مراتب علی شاہ کے درودیوار نظر آ گئے..اور یہ شاہ اگرچہ ایک قدیم خاندان کی وراثت کے امین ہیں اور نہایت ثروت مند ہمیشہ سے ہیں، عام لوگ اُن سے ''پیکیجز'' کے حوالے سے متعارف ہوئے لیکن میں نے ہمیشہ انہیں اپنی پسندیدگی کے راج سنگھاسن پر اس لیے بٹھایا کہ اُنہوں نے اپنی ثروت مندی کو ذوقِ جمال، شاعری، گلابوں اور ثقافت کے تحفظ کے لیے صرف کیا..آج شائد لوگ فراموش کر چکے ہوں لیکن ان شاہ صاحب لوگوں نے ''پیکیجز'' کے زیرانتظام پاکستان میں پہلی بار دنیا بھر کے گلابوں کی سب سے شوخ اور خوش شکل اقسام درآمد کرکے اُنہیں متعارف کروایا..میرے ابّا جی کہا کرتے تھے کہ اگر ''پیکیجز'' والے شاہ حضرات گلاب کی ان سینکڑوں اقسام کی رنگینیوں کو اس مٹّی میں نہ کاشت کرتے تو ہم اب تک دیسی گلاب سے گُل قند بنا رہے ہوتے..''پیکیجز'' کے کیلنڈر ایسے ہوا کرتے تھے کہ جاپانی کیلنڈر اُن کے سامنے پانی بھرتے شرمندہ ہوتے تھے اور قصّہ مختصر ''پیکیجز'' نے ہی پنجاب کے عظیم صوفی شعرا کی تحقیق اور چھان پھٹک کے لیے صوفی غلام مصطفےٰ

تبسم..اشفاق احمد..ڈاکٹر نذیر احمد..احمد راہی اور محمد سلیم الرحمان ایسے نابغۂ روزگار لوگوں کی معاونت کی اور بلھے شاہ، شاہ حسین، بابا فرید، سلطان باہو وغیرہ کے پرکھ شدہ کلام کونہایت دیدہ زیب صورتوں میں شائع کیا.. ''قصیدہ بُردہ'' کے اردو، فارسی اور پنجابی ترجمے کی اشاعت ایک اور کمالِ عشقِ محمدؐ تھا..

ان شاہوں نے اپنے آبائی شہر کی گلیوں میں اپنی حویلیوں کو بھی آج تک محفوظ کر رکھا ہے، اگرچہ وہ افغانوں اور لاہور ٹریڈرز مافیا کے لالچی شیطانوں کے آگے اُنہیں فروخت کر کے اربوں کی دولت حاصل کر سکتے تھے، صرف اس لیے میں اُن کا احترام کرتا ہوں ورنہ شہر لاہور میں متمول بھی بہت اور سیّد بھی اتنے بہت کہ سرپلس ہوتے جاتے ہیں..

مراتب شاہ کی حویلی کے در و دیوار پر نظر کرتے، ہم تو گذرتے تھے جب میں نے ان کے پہلو میں نکلتی ایک تنگ گلی میں نگاہ کی، وہی تانکنا جھانکنا کبھو نہ گیا. گلی کے آخر میں مجھے ایک ایسی دل کشی نظر آ گئی کہ میرا دل رُکنے کو نہیں آیا، رُک گیا.. آپ بجا طور پر معترض ہو سکتے ہیں کہ اس حاجی تارڑ کا دل تو بے جواز اور اکثر رُکتا ہی رہتا ہے لیکن یقین کیجیے جب بھی رُکتا ہے، بے وجہ نہیں رُکتا، اگر یہ کسی غزال کے حسن پر یا کسی پرانی حویلی، مسجد قرطبہ کی کسی محراب پر، خان گوگ کی سُورج مکھی کی تصویر پر یا ایک سبز گنبد پر ٹھہرتا نہیں، رُک جاتا ہے تو بے وجہ نہیں رُکتا..

گلی کے آخر میں ایک شکستہ صورت مقفل محرابی دروازہ تھا اور اُس کے اوپر ایک مسمار ہونے کو ایسا جھروکا تھا کہ اگر کوئی کالی کلوٹی اور بھدّی عورت اُس کی شکستگی کے آثار میں سے جھانکتی تو وہ حسن میں ہیر ہو جاتی، ایک سوہنی، ایک صاحباں ہو جاتی. صرف اُس جھروکے میں سے جھانکنے سے..

وہ ایک کب کی ڈھے چکی سوگوار صورت حویلی تھی، اُس کا اندرون مسمار ہو چکا تھا، بدن ڈھے چکا تھا، صرف چہرہ ایک آثار تھا.. اُس کا دروازہ دم بخود، بوسیدگی کی آخری سانسوں پر، مقفل نہ تھا، اس لیے کھل نہ سکتا تھا کہ اُس کے پیچھے کھنڈر ہو جانے والی دیواروں اور محرابوں کی اینٹیں ڈھیر تھیں اور وہ بھی دم بخود.. میں نے دروازے کے کواڑوں میں سے جھانکا تو سوائے بربادی اور قدامت کے مسمار پن کے اور کچھ نظر نہ آیا.. اور اُس مسمار پن کے اندر کوئی اجڑ چکا باغ تھا، ہریاول ابھی تک سانس لیتی تھی..

اس حویلی، رہائش گاہ یا ذی شان مکان میں کون تھا..

علی سائیں پہلوان رہتا تھا..

اس کھنڈر جھروکے کے بائیں جانب ایک پرانے مکان میں سے ایک نوجوان، ہمیں شک کی نظر سے دیکھتا باہر آیا.. اُس کا پیراہن جدید ترین اور بانکا تھا..

''بھائی جان.. یہ کھنڈر حویلی کس کی ہے؟''

''آپ کیوں پوچھتے ہیں؟'' اُس نے ناگواری سے کہا..

''یونہی پوچھتے ہیں..''

وہ انگریزی بولنے گا..اگرچہ اٹک اٹک کر بولنے لگا ''اگر تو آپ سنجیدہ لوگ ہیں، تحقیق کرنے والے ہیں تو میں آپ سے ایک مختلف انداز میں گفتگو کروں گا..'' اور جب ہم نے اُسے یقین دلایا کہ ہم سنجیدہ تو ہیں پر تحقیق کرنے والے نہیں، یونہی تانک جھانک کرتے ادھر آ نکلے ہیں تو نوجوان ذرا پگھل گیا ''میں اپنے والد صاحب کو بلاتا ہوں..''

والد صاحب، نہایت وجیہہ اور گورے، ایک عمر رسیدہ خاموش فلموں کے ہیرو لگتے والد صاحب، مجھ سے لپٹ گئے..کچھ مخدوش نوعیت کے شاعروں اور کالم نگاروں کے حوالے دینے لگے اور میں نے بھی دل پر جبر کر کے اُن کے ساتھ دوستی کے فریب زدہ حوالے دیئے..اُن کا نام خواجہ نائک تھا..

''تارڑ صاحب.. یہ حویلی علی سائیں پہلوان کی رہائش گاہ ہوا کرتی تھی..اُستاد جگت سلطان فتح دین پہلوان اُن کے والد تھے..وہ مہاراجہ شیر سنگھ کے اُستاد تھے اُنہیں پہلوانی کے داؤ پیچ سکھاتے تھے..تب صدیقا گُگو رُستمِ ہند اول اور بھونچال سنگھ کے زمانے تھے.. ہندوستان کے شہر اندور میں علی سائیں نے گاما پہلوان کے ساتھ کُشتی لڑی..اگرچہ وہ ہار گئے لیکن زندگی بھر فخر کرتے رہے کہ گاما نے میرا چیلنج قبول کیا اور اگر میں ہار گیا تو رستمِ زماں گاماں سے ہارا..پہلوان رحیم بخش کے ساتھ دھتوراشاہ باغ میں جو کُشتی ہوئی، وہ برابر ہوگئی..'' میں اگرچہ لاہور کے پہلوانوں کی تاریخ سے کچھ تو آگاہ تھا پر میں آج تک اِس علی سائیں پہلوان کے نام سے آشنا نہ ہوا تھا..

اگر علی سائیں پہلوان نے اس پُرشکوہ حویلی کو اپنی رہائش کے لیے تعمیر کیا تھا تو یقیناً کچھ راجگان اور مہاراجے اس کی تعمیر میں معاون ثابت ہوئے ہوں گے اور وہ اپنے زمانوں کا یادگار استاد پہلوان ہوا کرتا تھا.. اگرچہ میں اُس کے نام سے ناواقف رہا تھا..

اور تب میں ایک حسد میں مبتلا ہوا کہ پوری حیات، پون صدی پر محیط یہ زندگی کیسی بیکار گزر گئی، اس سے بہتر تھا کہ پہلوان ہو جاتے، ایک ایسی پُرشکوہ جھروکوں والی حویلی تو نصیب میں آ جاتی، ادب کے اکھاڑے میں ہم بھی اُترے پر اقتدار کے ایوانوں میں سر جھکا کر خصیہ برداروں اور خوشامدیوں میں شامل نہ ہو سکے اور مات کھا گئے، چاروں شانے چت ہو گئے ورنہ ہماری بھی ایک حویلی ہوتی..

خواجہ صاحب نے مستقبل قریب میں ہمیں چائے کے لیے مدعو کرنے کی سرسری پیشکش کی، وہ یقیناً ایک مہمان نواز اور پڑھے لکھے دانا شخص تھے اور مجھے خدشہ تھا کہ ایک تو وہ ہماری تعداد سے ہراساں ہو گئے تھے لیکن غالب امکان یہ تھا کہ وہ حویلی نما مکان اُن کا مکمل ذاتی نہ تھا، شاید کچھ شریک بھی تھے ورنہ وہ ہمیں ضرور اُس دل کش رہائش کی قدامت کی جھلکیاں دکھلاتے..

''خواجہ صاحب، ایک حویلی تو کھنڈر ہو چکی، پہلوان علی سائیں کی دوسری موجود حویلی میں آپ

قیام رکھتے ہیں تو کیا آپ اُن کے خاندان میں سے ہیں؟''

''وہ میرے قریبی عزیز تھے..''

''کتنے قریبی؟''

''علی سائیں میرے سگے دادا تھے، میں اُن کا پوتا ہوں..''

خواجہ صاحب نے کیوں ابھی تک اس راز کو مخفی رکھا تھا اور عین وقتِ رُخصت اسے آشکار کیا، میں اس راز کا بھید نہ جان سکا..



''دِل کے خلوت کدہ کا چراغ.. موسےٰ آہن گر''

ہم بھول چکے تھے کہ ہم کب لاہور شہر کے اندر داخل ہوئے تھے، اس میں بھٹکتے، جھانکتے ہم وقت کی قید سے ماورا ہو کر لمحۂ موجود کو یوں فراموش کر بیٹھے تھے کہ ہم نے اپنی کاریں کہاں پارک کی تھیں، کاروں پر آئے تھے یا گھوڑوں پر سوار ہو کر آئے تھے، اُنہیں کہاں باندھا تھا، بُھول چکے تھے..

''سَر جی..کدھر سے واپس چلنا ہے..گھر کا راستہ کونسا اختیار کرنا ہے؟''نسیم نے اپنی سفید تابوت نما ٹیوٹا کار دریافت کر لی تھی جو شاید ابھی ایک اسپِ سفید تھا اور زمانے گذرے تو وہ ایک سفید کار کے رُوپ میں نما ہو گیا..کار کا انجن البتہ ایک گھوڑے کی مانند خُرخُرایا اور رواں ہو گیا..

''مُردوں کی گھاٹی سے نہ اترنا..کسی بھی اور راستے کو چُن لو..''

اُس نے اکبری منڈی سے نکل کر سرکلر روڈ پار کی..سرفراز کی رام گلی والے پلازے سے گذر کر شہر کے گنجلک وجود میں اتر گیا..

''ہم کہاں جا نکلیں گے نسیم؟''

''میکلوڈ روڈ کے لاہور ہوٹل کے آس پاس اور پھر منٹگمری روڈ اور پھر مالو مال..''

ہم شاہ ابوالمعالی کی درگاہ کے قریب سے گذر رہے تھے جب یکدم مجھ پر ایک ہیجان سا اترا اور میں اُس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر جان نہ سکتا تھا کہ اس کا سبب کیا ہے اور پھر اُس ہیجان کی بھٹی گرم ہونے لگی، ایک آتش رفتہ بھڑکنے لگی، اور اس آتش میں لاہور کی حسین ترین اگرچہ شادی شدہ عورت کے چرخے کا ٹیڑھا ہو چکا تکلا تھا اور آگ سے دہکتا سرخ انگارہ ہو چکا تھا..وہ یہیں کہیں دفن تھا، لاہور ہوٹل کے نواح میں، وہ آہن گر، مُوسےٰ آہن گر..ایک لوہار جس کا تذکرہ ''آئینِ اکبری'' میں آیا ہے..

''وہ ذات کا لوہار، ایک آہن گر تھا جس سے کئی معجزے منصوب ہیں، وہ اکبر اعظم کے دور کے آغاز میں فوت ہوا اور لاہور میں دفن ہوا..''

یہ ابھی دو برس پیشتر کا قصہ ہے کہ میں نے نہ صرف کنہیا لال کی تاریخ لاہور میں بلکہ جج لطیف کی ضخیم تاریخ میں اُسے اتفاقاً دریافت کیا اور اُس کے ایک معجزے نے مجھے اس آہن گر کے سحر میں نہ صرف گرفتار

کیا بلکہ میں جو خواب کم دیکھتا ہوں، مجھے لاہور کی حسین ترین ہندو عورت کے خواب آنے لگے کہ وہ کون تھی، اُس کے چرخے کا ٹیڑھا تکلا اُس آہن گر کی بھٹی میں کیوں تادیر سلگتا رہا اور وہ غافل ہو گیا، اُس عورت کے نین نقش کے جادو ایسے تھے کہ حنوط ہو گیا..

میں نے ایک سویر ماڈل ٹاؤن پارک میں سیر کے دوستوں کو اس قصّے میں شریک کیا اور اگلے روز سیف کہنے لگا، ''تارڑ صاحب.. میں نے مُوسےٰ آہن گر کا مزار دریافت کر لیا ہے..لاہور ہوٹل کے نواح میں ہے.. یہ محض داستان نہیں ہے اس نام کا آہن گر وہاں دفن ہے..اور مجھے بتایا گیا کہ برصغیر کے سب آہن گر خاندان، لوہار اُسے اپنا مُرشد تسلیم کرتے ہیں اور اُس کے عرس کے موقع پر ہندوستان سے کیا ہندو، کیا سکھ، کیا مسلمان سب لوہار آتے ہیں، شریک ہوتے ہیں..''

''نسیم..لاہور ہوٹل کے نواح میں ہم ہیں..مُوسےٰ آہن گر کے مزار پر نہ ہو چلیں..''

جب بہت بھٹک چکے اور مُوسےٰ نہ ملا تو نسیم کے ذہن کے کمپیوٹر پر ایک سِگنل جلنے بُجھنے لگا، سیف کو فون کرو..سیف کو فون کرو..

سیف نے ہراساں ہو کر فون اٹھایا ''خیریت ہے؟''

''مُوسےٰ آہن گر کا مزار کہاں ہے؟''

اُس نے کچھ اول جلول سا راستہ بتایا، بہر طور ہم پہنچ گئے..

لاہور ہوٹل میں ذرا پرے موٹر سائیکلوں کی مارکیٹ کی بھیڑ میں سے دائیں جانب ایک گلی نکلتی ہے..اگرچہ موٹر سائیکلوں کے سپیئر پارٹس اور ٹائروں کی دکانوں کے شٹر ابھی گرے ہوئے تھے لیکن اُن کے درمیان میں ایک سبز ٹھگنے گُنبد تلے وہ نظر آ گیا..

''جامع مسجد حضرت شیخ موسےٰ آہنگر ..اہلسنّت والجماعت حنفی بریلوی'' یعنی..وہ جو درویش لوہار ذات کا تھا، مذہب میں ذات پات پہ یقین نہ رکھتا تھا اُسے بھی مخصوص عقیدے میں قید کر دیا گیا ہے..

اس مسجد کے برابر میں، چند شٹر گری دکانوں میں بھنچے ہوئے بمشکل سانس لیتے محراب نما داخلے کے اوپر سبز رنگت کے ایک تختے پر نہایت اعلیٰ خطاطی کے حروف ایسے تھے جنہوں نے مجھے تو ایک عجیب سرخوشی کے جھرنوں میں بھگو دیا.تو واقعی گئے زمانوں میں کوئی ایسا مُوسےٰ تھا جس کی بھٹی میں ایک کوہ طُور روشن ہوتا تھا..

دراصل ہر پیغمبر، ہر مجذوب اور ہر درویش کی اپنی اپنی آگ ہوتی ہے، ابراہیم خلیل اپنی آگ میں گُل و گلزار ہوتا ہے..عیسےٰ صلیب کی آگ پر مصلوب ہوتا ہے، ہمارے رسولؐ غار حرا میں ایک مقدس روشنی سے آشنا ہوتے ہیں..

اور اگر ہم قدرے بھٹک جائیں تو بلخ کے آتش کدوں میں وہ آگ بھڑکتی تھی جسے سینے سے لگائے

اہل فارس، عرب یلغار کے بعد، ہندوستان چلے آئے، پارسی گھروں میں جلتی آگ میرے زمانوں میں بھی روشن ہوا کرتی تھی، تو یہ موسےٰ بھی اپنے طُور کی بھٹی کو روشن رکھتا تھا..

یہ جو دریافت کے کرشمے ہیں، جو کچھ آپ نے پڑھ رکھا ہوتا ہے جب وہ یکدم آشکار ہوتا ہے تو اس کی ہیجان انگیز کیفیت کو بیان کرنے کا کوئی لفظی سامان نہیں..

جیسے جنت البقیع کے قبرستان سے سبز گنبد پر سے طلوع ہوتا آفتاب..

اور اُسی قبرستان میں مائی حلیمہ کی قبر جس کے دُودھ سے میرے پیغمبر توانا ہوئے..

حضرت ابراہیم کی قبر کے آثار جو رسولؐ کے لاڈلے بیٹے تھے..

کعب بن اشرف کے قلعے کا کھنڈر..

جبل اُحد کی وہ کھوہ جس میں میرے نبیؐ نے پناہ لی تھی..

یا پھر..

مسجد قرطبہ کا پہلا دیدار..

مسجد اُمیّہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی ہڈیاں..

یارقند کی مسجد ابوبکر کے شکستہ گُنبد..

ہرات کی سویر میں ملکہ گوہر شاد کے نیلے مقبرے پر گرتی سنہری کرنوں کے تیر..

غرض کہ یہ قصّے بہت طویل ہیں..

مختصر یہ کہ مجھ پر بھی وہی کیفیت طاری ہوئی جب میں نے سبز رنگت کے اُس تختے کو دیکھا جس پر اعلیٰ خطاطی کا جوہر نقش تھا..

''پیر طریقت، راہبر شریعت
حضرت شیخ موسیٰ آہنگر سہروردی..
آپ کا عرس مبارک ہر سال 17/18 صفر کو منعقد ہوتا ہے
آپ کا وصال 962ھ کو ہوا''

ہم اُس محرابی سفید داخلے کے اندر چلے گئے..

مزار کے دروازے کے بائیں جانب میں ایک حیرت سے دوچار ہوا کہ وہاں ایک طاقچے میں ایک چراغ اب بھی روشن تھا..

مزار، سچل سرمست کے مرقد کی مانند دولہا بنا بیٹھا تھا، سنہری لڑیاں اور رنگ رنگ کے بھڑکیلے ہار سجے تھے اور اُن کے درمیان میں گلاب کی پتیوں سے ڈھکا موسےٰ آہن گر تھا..

سنگ مرمر کے کتبے پر ایک فارسی شعر درج تھا اور بہت غور کرنے سے میں صرف یہ پڑھ سکا..

مزار مبارک

سندالعاشقین، امام اولیاء، پیر طریقت، راہبر شریعت

حضرت شیخ مُوسےٰ آہنگر، سُہروردی

اگرچہ مرقد کی عمارت میں تبدیلی رونما ہو چکی تھی لیکن ذرا آنکھیں اٹھا کر گنبد پر نگاہ کریں تو وہ ابھی تک اپنی اصلی حالت میں موجود تھا..اس کی شکل وہی تھی جو جج لطیف کی کتاب میں نقش تھی..

میں نے اُس آہن گر کے لیے اپنے ہاتھ فاتحہ کے لیے اٹھائے کہ بے شک اُسے نہایت بلند درجات پر فائز کر دیا گیا تھا لیکن ہمارے معاشرتی اور مذہبی پیمانوں کے تول پر وہ تھا تو ایک ہنرمند کاریگر، یعنی ایک ''کمی کمین''..ایک لوہار...

میں نے گئے زمانوں میں پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے ایک پنجابی سیریل ''چانن تے دریا'' لکھا تھا جس میں ایک جاٹ وسیم عباس، ایک لوہار سجاد کشور کی بیٹی شکیلہ قریشی کو دل دے بیٹھتا ہے، اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے اور ڈرامے کے کلائمکس میں وہ لوہار، وسیم عباس کے چوہدری باپ کے سامنے تن کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ میں اپنی بیٹی کا رشتہ نہیں دوں گا..تب مجھے یاد ہے کہ لائل پور سے کسی جاٹ صاحب نے مجھے فون کر کے کہا تھا ''تارڑ صاحب، آپ کیسے جاٹ ہو، ایک لوہار کو چوہدری جاٹ کے مقابل کھڑا کر کے اُس کی بے عزتی کروائی ہے..ذرا مجھے کوئی ایسا لوہار دکھاؤ تو سہی جو ہماری برابری کر سکے..''

ویسے یہ طریقت، شریعت اور مجذوبیت کے ایسے سلسلے ہیں کہ ان میں ''کمی کمین'' ہی برگزیدہ اور معتبر ہوئے، کوئی جاٹ، راجپوت یا سیّد بادشاہ نہ ہوا..کبھی ایک سیاہ فام غلام کو اذن ہوا کہ وہ کعبے کی چھت پر کھڑے ہو کر لوگوں کو فلاح کی جانب پکارے، نہ ابوبکر کو، نہ ہی عمر خطاب، یا علی کو یہ شرف حاصل ہوا..

کبھی ایک معمولی دکاندار، عطر فروش، فریدالدین عطّار ہوا..

ایک زرکوب، مولانا رُوم کا محبوب ہوا..

شاہ حسین ایک جولاہا..کمی کمین..

اور پھر ذات کا آرائیں، سیّد بلھے شاہ کا مُرشد ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے سیّد ہونے کو تیاگ کر ایک کمی کمین آرائیں ہونے کی آرزو کرتا ہے..

''بلّھے نوں سمجھاون آئیاں بہناں تے بھرجائیاں..

چھڈ دے پلّا رائیاں..''

اور بلّھا کہتا ہے..

''جیہڑا اساہنوں سیّد آ کھے، دوزخ ملے سزائیاں
جیہڑا اساہنوں رائیں آ کھے، جنت پینگاں پائیاں''

چنانچہ سب کے سب جو اُس کی نظر میں معتبر ہوئے، ہماری نظر میں ''کمّی کمین'' تھے..

ہم جو جاٹ، راجپوت اور سیّد وغیرہ اپنے تئیں اعلیٰ نسل کے تھے، ہمیں ان جولاہوں، عطر فروشوں اور لوہاروں نے کمّی کمین کر دیا.. یہاں تک کہ ایک تیلی، حسّو تیلی، ہم پر سبقت لے گیا..

''مقبرہ شیخ موسیٰ آہنگر''

بیرونِ شہر لاہور، اکبری دروازے کے باہر، قلعہ گوجر سنگھ سے بہ جانب شمال یہ گنبد دار مقبرہ سبز رنگ کا موجود ہے... مقبرے کے اندر جائیں تو وسط میں ایک چبوترے پر شیخ مُوسےٰ کی قبر ہے اور گنبد کی دیواریں پُختہ چُونہ گچ، سقف قالبوتی اور اوپر سقف مدور گنبد سبز رنگ کا نہایت خوبصورت ہے..

وہ گنبد سبز رنگ کا اب بھی موجود ہے اور اسے ہم دیکھتے تھے..

''یہ بزرگ لودیہ سلطنت کے وقت زندہ تھے، آہنگری کا کام کرتا تھا..''

''تذکرہ قطبیہ'' میں لکھا ہے کہ ایک روز یہ بزرگ اپنی دکان پر آہنگری کا کام کرتا تھا، ایک ہندو عورت...

اور یہی وہ محبت اور عقیدت کی داستانِ حیرت ہے جس نے مجھے سحر گرفت کر لیا تھا..

''ایک ہندو عورت، تکلا آہنی جس سے سُوت کاتا جاتا ہے، بنوانے کے لیے آئی، شیخ نے تکلا تو بھٹی میں ڈالا اور خود اُس کے جال با کمال کی طرف ایسا متوجہ ہوا کہ ایک گھنٹہ گذر گیا، عورت غضب میں آئی اور کہنے لگی، اے شخص، تو کیسا آدمی ہے کہ کام کی طرف خیال نہیں کرتا اور میرے مُنہ کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے..''

تو یہاں ہم کنہیا لال کے بیانئے سے جُدا ہو کر خان بہادر سیّد محمد لطیف سے رجوع کر کے اس قصّے کو آگے بڑھاتے ہیں..

''یہ مقبرہ شیخ مُوسےٰ کا قلعہ گوجر سنگھ کے شمال میں لاہور سے ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے..اس کا گنبد دیدہ زیب اور پُرکشش ہے، سبز رنگ کی چینی ٹائلوں سے مزین ہے..اندرونی دیواریں قرآن پاک کی آیات سے سجاوٹ شدہ ہیں اور طُغرا حروف میں نقش ہیں جو ابھرے ہوئے ہیں اور آج تک اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں..یہ بزرگ افغان سُوری حکمرانوں کے عہد میں دربار کے امراء میں بہت محترم اور پسندیدہ تھے.. شیخ ابوبکر نے اپنی تصنیف ''تذکرۂ قُطب العالم'' میں شیخ مُوسےٰ کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ وہ ایک نہایت پارسا اور پہنچے ہوئے بزرگ تھے اور کل دنیا اُن کی تعظیم کرتی تھی..اُن کا پیشہ آہن گری تھا اور وہ تمام لوگ جو اس

پیشے سے متعلق ہیں اُن کے مرید ہیں اور اُن کا عرس دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ شیخ ابو بکر نے ان سے بہت سے معجزے منصوب کیے ہیں جن میں سے ایک آج بھی زبان زد عام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ہندو عورت جس کے حسن کا بہت چرچا تھا اپنے چرخے کا ٹیڑھا ہو چکا تکلا شیخ کے پاس لے کر آئی کہ اسے سیدھا کر دو۔ (یہاں میں اپنے بچپن میں چلا جاتا ہوں.. میری نانی جان اللہ بخشے ایک نمبردارنی، گاؤں کی سب عورتوں کی مانند چرخہ کاتتی تھیں اور جب میں چرخے پر گھومتی اٹی سے چھیڑ چھاڑ کرتا تھا تو وہ ڈانٹ کر کہتی تھیں "میرا تکلا نہ ٹیڑھا کر دینا" امی جان بھی ترنجن کی راتوں میں اپنی سکھیوں کے ہمراہ پوری پوری رات چرخہ کاتا کرتی تھیں اور وہ بھی مجھے تکلے کو ہاتھ نہ لگانے دیتی تھیں کہ اگر تکلا ٹیڑھا ہو جائے تو نہ صرف چرخہ بیکار بلکہ کاتنے والی بھی بیکار..اور ٹیڑھا ہو چکا تکلا آسانی سے سیدھا نہ ہوتا تھا، کوئی ماہر لوہار ہی اسے بھٹی میں سُرخ کر کے چھوٹی ہتھوڑی کی ہلکی ضربوں سے سیدھا کر سکتا تھا)

چنانچہ..موسےٰ آہن گر نے تکلا اپنی سلگتی بھٹی میں جھونکا لیکن عورت کی شکل نے اُسے اتنا مسخر کر دیا کہ وہ اُس کی آنکھیں اُس کے چہرے سے ہٹتی نہ تھیں یہاں تک کہ وہ بے خبر ہو گیا کہ تکلا بھٹی میں سرخ آگ ہو چکا ہے..عورت نے بہت انتظار کیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اس لوہار کی نیت میں کھوٹ آ گیا ہے تو اُس نے طنزیہ انداز میں کہا.تمہاری بزرگی اور پاک دامنی کے بہت چرچے ہیں تو میری جانب یوں دیکھے چلے جا رہے ہو.." میرے چہرے میں وہ کیا ہے جسے تم دیکھے جا رہے ہو یہاں تک کہ میرا تکلا بھی فراموش کر دیا..موسےٰ آہن گر نے کہا" میں تو تمہیں بنانے والے تخلیق کار کی کاریگری کے دھیان میں گم ہوں..جس نے تم جیسی خوبصورت بناوٹ تراش دی اور اگر میری آنکھوں میں تمہارے لیے کچھ کھوٹ تھا تو میں اس آگ میں دہکتے تکلے کو ان آنکھوں میں پھیرتا ہوں، تاکہ یہ بھسم ہو جائیں.." یہ کہتے ہوئے اُس نے سرخ تکلا جیسے سرمچو سے سرمہ ڈالتے ہیں یوں اپنی آنکھوں میں پھیر لیا.آنکھوں کو کچھ گزند نہ پہنچا بلکہ لوہے کا تکلا سونے کا ہو گیا..وہ ہندو عورت شیخ موسےٰ کے پاؤں پڑ گئی، گھر واپس نہ گئی، پوری زندگی اُن کی خدمت میں گذار دی..اس کی قبر موسےٰ کی قبر کے پہلو میں ہے..

شیخ موسےٰ کا احاطہ بہت وسیع ہے، اُن کے مرقد کے برابر میں ایک مسجد ابھی تک قائم اور زندہ ہے اور اس کے صحن میں ایک بہت قدیم پیپل کا پیڑ ہے جو نمازیوں پر سایہ کرتا ہے، مجھے حیرت ہوئی کہ یہ احاطہ آخر کیسے کاروباری تجاوزات کی زد میں ابھی تک نہیں آیا.سو سُنار کی اور ایک لوہار کی اور وہ بھی شیخ موسےٰ ایسے لوہار کی..شاید وہ لوگ خوفزدہ ہیں کہ اگر ہم نے اس لوہار کی بے حُرمتی کی تو اس کی ایک، ہتھوڑے کے ایک وار کو نہ سہہ سکیں گے..

ویسے یہ عجیب لوہار اتفاق ہے کہ ان زمانوں میں اتفاق کے لوہار، لاہور کے حکمران ہیں..اور مجھے

خدشہ نہیں کامل یقین ہے کہ وہ اِس لوہار کے وجود سے آگاہ نہیں اور اُنہیں ہونا بھی نہیں چاہیے کہ یہ اور لوہار ہیں اور وہ..اور لوہار تھا..شیخ مُوسےٰ کے مرقد کی دیوار پر سنگ مرمر کی ایک تختی نصب تھی..

حضرت میر ہاشم نے روضۂ انور اور آپ کی وصال کی تاریخ کہی

مسافت ایں روضہ را بہ لُطف الہ

بندہ ہاشم کمینہ درگاہ

درزمان جلال الدین اکبر

نقد گنجینہ ہمایوں شاہ

روضہ شیخ مرشدِ کامل

قبلہ مُقبلاں کار آگاہ

شیخ موسےٰ چراغِ خلوتِ دل

رہبر وراہنمائے ہر گر

من کہ تاریخ او خرو جستم

گفت ایں گوشہ ھست ز اھل اللہ

گرز تاریخ افگنی سہ الف

مے شود سال فوت مرشد راہ

(اس روضہ کو خدا کے فضل سے بندہ ہاشم نے

جو درگاہِ اقدس کا ایک کمینہ غلام ہے

سلطان جلال الدین اکبر کے عہد میں جو ہمایوں بادشاہ کے خزانے کی نقدی یعنی فرزند جانشیں ہیں

مُرشدِ کامل حضرت شیخ کا روضہ ہے جو کہ کاروبار طریقت کے رمز شناسوں کے قبلہ وکعبہ تھے

شیخ موسےٰ جو دل کے خلوت کدہ کے چراغ

ہدایات اور ہر گمراہ کے رہبر ور ہنما تھے

میں نے جب عقل سے اس کی تاریخ دریافت کی تو اس نے جواب دیا کہ یہ خدا کے بندوں کا گوشہ ہے۔

اگر تو تاریخ (65....) سے (3) الف گرادے تو مُرشد راہ طریقت کی وفات کا سال بن جائے گا۔

میں نے خاصی عرق ریزی سے نسیم کی کھینچی ہوئی اس تختی کی تصویر میں سے یہ پوری عبارت جو عوام الناس کے لیے شاید دلچسپی کا باعث نہ ہو صرف اس لیے نقل کی ہے کہ امتدادِ زمانہ سے یا کسی حادثے وغیرہ کی صورت میں اگر یہ تاریخی عبارت معدوم ہو جائے تو کہیں نہ کہیں اس کا ریکارڈ محفوظ ہو جائے..

موسےٰ آہن گر کے مرقد کی بائیں دیوار پر محرابوں کے اندر اُن کی حیات کے مختلف پہلو سنگ مرمر کی تختیوں پر نقش ہیں اور یہ میرے لیے ایک عجائب گھر تھے..یہ گویا اُس آہن گر کی زندگی کی مختصر تصویریں تھیں جو خبر کرتی تھیں کہ وہ کون تھا، کہاں تھا، کیا تھا اور جس نے بھی ان تختیوں کو یہاں آویزاں کیا وہ ایک صاحب حال شخص تھا جو حقیقت کی رُوح سے واقف تھا، جس نے جانا کہ ایک قبر تو کلام نہیں کر سکتی کہ میرے اندر کون سے خزینے نایاب اور نادر یافت دفن ہیں تو یہاں حاضری دینے والوں کو خبر تو کرنی چاہیے کہ وہ کون تھا، کہاں تھا اور کیا تھا.. میں نے جتنے بھی ایسے نایاب خزینوں کی آخری آرام گاہوں پر حاضری دی.. سلطان باہو، میاں محمد بخش، شاہ حسین، بابا فرید، بلّھے شاہ، وارث شاہ، سچل سرمست، شاہ بھٹائی، عثمان مروندی شہباز قلندر.. کہیں کہیں اُن کے اشعار تو نقش تھے پر وہاں اُن کی حیات کے بارے میں آگہی کا کوئی حوالہ درج نہ تھا.. چنانچہ موسےٰ آہن گر کے مقبرے کی دیوار پر جس شخص نے بھی ان کی زندگی کی مختصر تصویریں آویزاں کیں وہ یقیناً ایک صاحب حال تھا.. میں اُس کا شکر گزار ہوا. محرابوں میں نصب اُن تختیوں پر درج عبارتیں پڑھیے..

تعمیر روضۂ پاک

مغل اعظم اکبر اور ہمایوں بادشاہ کے وزیر میر ہاشم نے بہت عقیدت مندی کے ساتھ آپ کا روضۂ مبارک تعمیر کروایا..

گویا یہ میر ہاشم جس نے موسےٰ آہن گر کے وصال کی تاریخ منظوم کی، مغل اعظم اکبر اور ہمایوں کا وزیر تھا، کوئی معمولی شخص نہ تھا۔

مُرشد کا تحفہ

آپ کے مرشد حضرت چُوہڑ شاہ بندگی نے یہاں دو بیگھہ زمین آپ کو عطا فرمائی جس پر آپ نے گھر اور آہن گری کی دکان بنائی۔

شخصیت

شریعت کی پابندی، حُب الٰہی، عشق رسولؐ، عبادت، ریاضت اور کسب حلال آپ کی اصل شخصیت ہیں..

اصل نام

آپ کا اصل نام شیخ موسےٰ تھا، ملتان کے ایک قریبی گاؤں میں 841 ہجری، 1437ء میں پیدا ہوئے..

چھوٹا مزار

سامنے والا چھوٹا مزار آپ کی ایک عقیدت مند خاتون ہرو بی بی کا ہے جس کی یہاں تدفین کی اجازت آپ نے دی تھی..

کسب حلال

اُس زمانے میں عام غریب سے لے کر بادشاہ تک آپ کے سینکڑوں عقیدت مند تھے لیکن آپ نے محنت سے کسب حلال پر گذارہ کیا اور لوہاراں کے پیشے کی وجہ سے شیخ موسےٰ آہن گر مشہور ہوئے..

سفر

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں دس سال قیام کرنے کے بعد آپ ملتان واپس نہ گئے بلکہ ٹھٹھہ سندھ، کاٹھیاواڑ، ملتان، کلّر کہار سے ہوتے ہوئے لاہور آ گئے تھے..

درس

آپ نے لاہور کے علماء وفضلاء کو قرآن وحدیث کی روشنی میں سوالوں کے جوابات دینے کا سلسلہ شروع کیا تھا، عام لوگوں کو ایمانداری اور محنت کا درس دیتے تھے۔

بیعت

آپ جب ملتان میں تھے تو شیخ بہاؤالدین زکریا سہروردی کے مزار پاک کے سجادہ نشین شیخ شیر اللہ بن یوسف کے مرید ہوئے..

ان سنگ مرمر کی تختیوں پر درج مُوسےٰ آہن گر کے بارے میں جو کچھ تحریر ہے، وہ اگرچہ صدق دل سے تحریر کیا گیا لیکن میرا دل، من اپنا پُرانا پاپی ہے، یہ پرانا پراپی کچھ شک شبہے میں مبتلا ہوتا ہے کہ ''جہاں سے عقیدت شروع ہوتی ہے وہاں سے جہالت شروع ہوتی ہے'' تو کہیں کہیں تاریخ اور جغرافیے کے کچھ جھول ہیں، عقیدت کی نابینائی کے کچھ کرشمے ہیں، مجھے اختلاف کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، ایک معمولی آہن گر کیسے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ تک چلا گیا، دس برس قیام کیا، ملتان کے راستے میں کلّر کہار کہاں پڑتا ہے..قرآن اور حدیث کا مطالعہ کہاں اتنا عمیق ہو گیا کہ وہ علماء اور فضلاء کے سوالوں کے جواب دیتا تھا..میں کون اور میرا اختلاف کیا..میرے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ایک آہن گر تھا، رزق حلال کماتا تھا، بے شک کہیں آیا نہ گیا، پر اُس کی بھٹی میں ایک خوبصورت عورت کا ٹیڑھا ہو چکا تکلا سرخ ہوتا تھا اور وہ اُس کے حسن کی بناوٹ اور دلکشی کے سحر میں مبتلا ہو گیا تھا، میرے لیے یہی کافی ہے..

اور وہ عورت، شہر لاہور کی سب سے سوہنی شکل والی اُس آہن گر کے پاؤں پڑ گئی، گھر واپس نہ گئی

اور اُس کے پہلو میں دفن ہوگئی تو کیا اُس نے اپنا مذہب تیاگ کر اپنے مرشد کا مذہب اختیار کر لیا اور ہرو لی بی کہلائی..

مُوسے آہن گر کے مقبرے کے قریب، اُس کی قبر سطح زمین پر نہیں ایک تہہ خانے میں ہے.. اس تہہ خانے کے نشیب میں چند سیڑھیاں اترتی ہیں اور وہاں دو قبریں اگرچہ گمنام ہیں لیکن وہ گلاب کی پتیوں سے سراسر ڈھکی ہوئی تھیں، بتایا گیا کہ ایک قبر اُس کی بیٹی کی ہے..

موت کے بعد بھی وہ اپنے محبوب کے پہلو میں نہ سوئی، ایک تہہ خانے میں دفن ہوئی، اُس کے قدموں تلے خوابیدہ ہوئی کہ یہی عشق کی معراج ہے.. میں وہ چند سیڑھیاں اتر کر اُس تہہ خانے کے نیم اندھیارے میں بہت دیر کھڑا رہا، کسی سوہنی، صاحباں یا ہیر نے تو اپنے محبوب سے ایسا عشق نہ کیا تھا کہ اُس کے قدموں میں زندگی گذار کر اُنہی قدموں تلے دفن ہوگئی..

اے عورت، تو کیسی بھاگ بھری اور نصیبوں والی تھی کہ تیرے چرخے کا تکلا ٹیڑھا ہوا تو تیرے زمانوں میں مُوسے آہن گر تھا اور تو نے اُس سے رجوع کر لیا..

اے عورت تُو بتا کہ میں کیا کروں، میری حیات کے چرخے کا تکلا بھی ٹیڑھا ہو چکا ہے اور میری شکل بھی تجھ ایسی من موہنی نہیں ہے تو میں کس آہن گر کے پاس جاؤں جو اسے سیدھا کر دے، سونے کا کر دے....

تہہ خانے کی نیم تاریکی میں، گلاب کی پتّیوں کی مہک تھی..

تیری نیّت اور آنکھوں میں فتور ہے، تیرا تکلا کبھی سیدھا نہ ہوگا، ٹیڑھا ہی رہے گا.. پاؤں پڑ جانے سے ہی تکلے سیدھے ہوتے ہیں..

''کون؟''

''کوئی بھی نہیں..''

''کوئی تو ہوگا..''

''نہیں، کوئی نہیں.. موسے آہن گر کی بھٹّی کب کی سرد ہو چکی..''



''اِک اور دن..لاہور کی گلیوں میں آوارہ دن''

''نو آوارہ چوہے اور سو سانپوں سے کھیلنے والی حسینہ''

چار چوہے گھر سے نکلے کرنے چلے شکار..

ہم نو تھے اور چوہے نہ تھے، اگرچہ ہماری مرغوب غذا وہ پنیر تھا جو ہر ماہ فرزند علی ہمارے لیے اپنی ماہانہ چھٹی کے موقع پر ابوظہبی کے صحراؤں میں سے نکل کر بادِ سموم کے سیاہ ریتلے طوفانوں کو سہتا، صحرا میں سے وہ سیال سونا نکالتا جسے پٹرول کہتے ہیں، صرف ہمارے لیے دنیا بھر کے پنیروں کی اقسام کسی سپر سٹور میں سے خرید کر، پیک کر کے لاتا اور ہم اُسے رغبت سے کھاتے اگرچہ ہم چوہے نہ تھے.. ویسے ہم اُن چوہوں کی نسل سے تھے جو کسی نہ کسی اتوار کے دن گھر سے نہیں ماڈل ٹاؤن پارک سے نکلتے، شہر لاہور کے قدیم محلوں، مکانوں، حویلیوں اور تاریخی مقامات کو نہایت اشتیاق سے کُترتے جاتے..

آج ایک اور دن تھا، ایک اور اتوار تھا..

ہم ملک سرفراز کی سربراہی میں ایک مرتبہ پھر لاہور کی قدامت کے آثار دریافت کرنے، کُترنے کے لیے نکلے تھے..

ٹھیکیدار سلطان کے تعمیر کردہ قلعہ نما، برصغیر کے سب سے شاندار ریلوے سٹیشن کے پہلو میں ایک فٹ پاتھ کے کنارے پر جمع ہو رہے تھے.. ہمارے جو ساتھی پیچھے رہ گئے تھے اُن کی آمد کے منتظر تھے..

یہ ایک دھندلی سی موسم سرما کی لاہوری سویر تھی..

تانگوں کے مریل گھوڑے، کھٹارہ ویگنیں، سٹیشن میں سے برآمد ہوتے مسافر قُلی اور خوانچوں والے سب کے سب ایک دھندلاہٹ میں حرکت کر رہے تھے..

دائیں جانب ایک سرکاری بورڈ اجنبیوں کی راہنمائی کے لیے نصب تھا..

''اندرونِ شہر..

یادگار...

لاری اڈہ..

ریلوے سٹیشن''

اس بورڈ پر درج دو منزلوں نے مجھے متوجہ کیا.. لاری اڈہ پڑھ کر مجھے سجاد علی کا وہ گیت یاد آ گیا کہ ''تیرے گھر میرے کے سامنے ہے لاری اڈہ، لاری اڈہ..'' اور یادگار کی سمت کا اشارہ اس حقیقت کا گواہ تھا کہ جب مینار پاکستان کی ایک بھدّے آئفل ٹاور کی تعمیر ہو رہی تھی تو جملہ صاحبانِ اقتدار اور نہایت سکّہ بند دانشوروں نے اور اُن میں مختار مسعود بھی شامل تھے اسے ''یادگارِ پاکستان'' کا نام دیا.. ایک عرصہ یہی نام مستعمل رہا اور پھر میرے جیسے کسی بے دانش نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ حضور.. یادگار تو کسی مرنے والے کی ہوتی ہے، جو نابود ہو چکا اُس کی یاد میں ہوتی ہے تو پھر نہایت ناگواری اور تأمل سے اسے مینارِ پاکستان کا نام دیا گیا.. پر سرکاری کھاتوں میں تو اتنی آسانی سے تبدیلیاں نہیں ہوتیں وہاں اب تک یہ یادگار ہے.. چنانچہ یادگارِ پاکستان کے لیے ذرا مُڑ کر سیدھے چلے جائیے..

اُس بورڈ سے ذرا اِدھر ایک کھمبے پر ایک ہوش رُبا اشتہار سویر کی دُھند میں سے نمودار ہوتا تھا..

''ناز تھیٹر..

''تیرے عشق نچایا'' (فیملی ڈرامہ)

پاکستان میں پہلی بار 100 سانپوں کے ساتھ

ایک خوبصورت حسینہ پرفارم کرے گی''

ہمارا بس چلتا تو ہم لاہور کے قدیم شہر کی کھوج کو بخوشی ترک کرتے اور یہ ناز تھیٹر جہاں کہیں بھی تھا وہاں پہنچ کر ایک خوبصورت حسینہ کے بدن کے گرد لپٹتے مبلغ سو سانپوں کو دیکھتے اور سانپوں کی قسمت پر رشک کرتے کہ کاش ہم لپٹتے اور کہاں کہاں لپٹتے... ہم تو بابا لوگ تھے نا آسودہ تمناؤں کا اظہار نہ کر سکے لیکن ناراض، رُوٹھا ہوا اگرچہ ایک سیاہ کشش کا حامل تقریباً نوجوان فہد اس اشتہار کو دیکھ کر ذرا جذب میں آ گیا ''تارڑ صاحب.. پروگرام میں ذرا تبدیلی کر لیں، ذرا اُس حسینہ کو پُورے سو سانپوں کے ساتھ پرفارم کرتے ہوئے دیکھ آئیں، پاکستان میں پہلی بار ہو رہا ہے.. ذرا دیکھ آئیں..''

''یہ حسینہ اور سو سانپ تم نے اشتہار پر پرفارمنس کا وقت نہیں دیکھا، آج شام کو پرفارم کریں گے..'' میں نے اُسے ڈانٹا..

''سوری سَر..''

جہاں ہم باقی رفقیوں کے منتظر تھے وہاں میں کار میں بیٹھا بیٹھا تھکنے لگا اور باہر آ گیا.. اور باہر شور تھا، اُس دھندلی سویر میں ٹریفک کا شور تھا..

سب کا اجتماع لاہور ریلوے سٹیشن طے ہوا تھا..

اور یہاں تک آتے آتے سرفراز نے ہمارے کان کھا لئے.. تارڑ صاحب.. اب ہم لاہور ریڈیو

سٹیشن کے سامنے سے گذر رہے ہیں.. بائیں جانب ریلوے ہیڈ کوارٹر کی شاندار کولونیل عمارت ہے..دائیں جانب مجیٹھیہ ہال کی خستگی دکھائی دے رہی ہے..کیا آپ نے نولکھا چرچ کی عمارت دیکھی (میں وہاں ایک ٹی وی ڈرامے کی شوٹنگ کے لیے پچیس برس پیشتر آ چکا تھا اور مجیٹھیہ ہال کی خستگی میں، اس کے بوسیدہ ہو چکے کمروں میں ہمارا بشیر دھوبی رہا کرتا تھا)..ادھر برگنزا ہوٹل ہوا کرتا تھا (فلیٹیز کے علاوہ یہ لاہور کا سب سے قدیم ہوٹل کبھی تھا جہاں صرف گورا لوگ اور اینگلو انڈین قیام کیا کرتے تھے)..ذرا اِدھر میلہ رام کا تالاب تھا، نولکھا گیٹ تھا اور پارسی ڈاکٹر ڈِن شاہ کا کلینک تھا اور اُس کا پوتا میرا دوست ہے، وہ کہیں نہیں گیا، دیگر پارسیوں کی مانند لاہور کو چھوڑ نہیں گیا کہ وہ اس شہر کے بغیر رہ نہیں سکتا..

میں شاید پہلے بھی اس تاریخی حقیقت کی جانب اشارہ کر چکا ہوں کہ ہم سب میں یہ سرفراز تھا جو خالص لاہوری تھا، بقیہ سب کے سب مہاجر تھے جو یہاں آن بسے تھے..ازاں بعد میں کسی حد تک ایک ملاوٹی لاہور تھا کہ میری جم پَل تو شہر لاہور کی تھی لیکن میرے ابا جی تلاش روزگار میں اپنے گاؤں سے نکل کر لاہور آئے تھے اور انہوں نے لاہور میں اپنی پہلی شب کہاں بسر کی تھی، ہم نے اُس مقام کی یاترا کو بھی جانا تھا..

میں کار سے باہر آ گیا اور باہر شور تھا..

بائیں ہاتھ پر ایک عمارت کے برآمدے میں ایک ڈینٹل کلینک دھرا تھا..یعنی وہ ہر سویر یہاں دھر دیا جاتا تھا اور پھر رات ڈھلے سمیٹ لیا جاتا تھا..متعدد بورڈ آویزاں تھے جن پر متعدد بتیسیاں دانت نکال رہی تھیں..دوائیوں کی بوتلیں اور خوش خبریاں تھیں..

''المشہور دندان ساز شفقت محمود ریلوے سٹیشن لاہور..دانتوں کی ایکسپرٹ دانتوں کی صفائی بہت زیادہ احتیاط سے کی جاتی ہے، دانتوں پر سے پان، سگریٹ، نسوار اور بیڑی کے داغ صاف کیے جاتے ہیں..کچا داغ، پانچ روپے، پکا داغ دس روپے..مکمل صفائی ایک سو ساٹھ روپے..مصنوعی دانت اصل کی مانند لگائے جاتے ہیں..

کان اور دانت کی صفائی والا..کان کی صفائی پچاس روپے..کان کی دھلائی ایک سو ساٹھ روپے، شفقت محمود لاہور ریلوے سٹیشن والے..''

تنویر خواجہ کی رگِ ظرافت پھڑکی اور وہ کم کم پھڑکتی تھی پر جب پھڑکتی تھی تو بہت پھڑکتی تھی، کہنے لگا ''تارڑ صاحب..یہ جو نیم ہے جو اپنے آپ کو ڈینٹل سرجن کہتا ہے اب ایک جدید کلینک میں لوگوں کے دانت کھٹے کر کے اُنہیں اکھاڑتا ہے دراصل کسی زمانے میں اسی مقام پر دانتوں کا دھندہ کرتا تھا، اب اُس نے سو روپے دہاڑی پر کسی شخص کو اپنے اڈے پر بٹھا دیا ہے اور اتوار کے اتوار بہ نفسِ نفیس یہاں آ بیٹھتا ہے..جیسے مجرا کرنے والی کوئی طوائف بے شک ڈیفنس میں شفٹ ہو جائے لیکن ہفتے کے ایک روز اپنے آبائی کوٹھے پر

آ بیٹھتی ہے.."

اس دوران نسیم بھی پہنچ گیا اور جب خواجہ نے کہا کہ..اچھا تو اپنے آبائی اڈے پر بیٹھنے کے لیے آ گئے ہو.. میں پہلے ہی کہتا تھا کہ تم فٹ پاتھ پر مجمع لگا کر، سانپ دکھا کر لوگوں کو متوجہ کر کے ان کے دانت نکالتے ہو..

تو نسیم کہنے لگا "آہو جی.."

اُس نے فوراً اس فٹ پاتھ پر سجے ڈینٹل کلینک کے بورڈوں کے پہلو میں بیٹھ کر ایک تصویر اتروائی کہ آہو جی!

سرائے رتن چند کے علاوہ یہ سرائے محمد سلطان ٹھیکیدار تھی جو لاہور کی سب سے شاندار کاروان سرائے تھی جہاں اس شہر میں اترنے والے مسافر اور دلّی کی جانب سفر کرنے والے گھڑ سوار قیام کرتے تھے.. ہم اس سرائے کے کھنڈروں اور باقیات کی جستجو میں ریلوے سٹیشن سے اِدھر آ نکلے تھے..وہاں لوہے کے بیوپاری، کباڑیے، خرادیے اور ٹرانسپورٹر حضرات کی حکمرانی تھی اور سرفراز کے بقول نواز شریف کی پیدائش اسی آہن گر ماحول میں ہوئی تھی جہاں اُس کے والد، یقیناً ایک پُرعزم لوہار کاروبار کرتے تھے..ہمارے دوست اقبال بوسن کا کہنا ہے کہ وہ بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ ادھر آئے تھے اور نواز شریف کے والد صاحب سے کوئی مشین یا موٹر وغیرہ خریدی تھی..سیاست اور تعصب سے اگر بالا ہو کر ہم کھلے دل سے سوچیں تو شریف خاندان بہرطور ایک رزق حلال کمانے والا، ابتدائی ایام میں، ایک مشقت کے پسینے بہانے والا سیلف میڈ خاندان تھا، ابتدائی ایام میں..

سلطان کی سرائے کے آثار تقریباً نابود ہو چکے تھے..

ٹھیکیدار محمد سلطان لاہور کی تاریخ کا ایک داستانوی کردار ہے..

قبرستان میانی صاحب میں مولانا احمد علی، سعادت حسن منٹو اور آغا حشر کاشمیری کی قبروں کی قربت میں اُس کی قبر ہے جہاں میں نے اُس کے لیے دعائے مغفرت کی تھی..اگرچہ وہ مغل حویلیوں، مقبروں اور یہاں تک کہ اینٹوں کے حصول کے لیے مسجدوں کو بھی ڈھا دینے والا مسلمان تھا..



"سرائے محمد سلطان ٹھیکیدار"

بانی اِس سرائے کا سلطان نام عہدِ سِکھّی میں لاہور میں گزرا، دہلی دروازے میں رہتا تھا اور جسون کا کاروبار کرتا تھا، نامور دولت مند نہ تھا، کشتی اور پہلوانی کا بھی اُس کو شوق تھا. سلطنت سِکھّی جاتی رہی اور عہدِ دولتِ سرکار انگریزی آیا تو سرکار کو تعمیر چھاؤنی و کوٹھیات کے لیے جو ضرورت ٹھیکیدار کی تھی تو یہ شخص مقرر ہو گیا.. تھوڑے عرصے میں ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے کی عزت کا آدمی ہو گیا.. محمد سلطان خطاب پایا.. اکثر غریب غرباء جو اُس کے پاس جاتا تھا، خالی نہیں پھرتا تھا..

میرے لیے وہ ایک ہیجان خیز لمحہ تھا جب ہم دلّی دروازے میں داخل ہو کر "شاہی گذرگاہ" کے راستے پر چلے، شاہی حمام کے بحال ہو چکے کھنڈروں کو دیکھا تو جاوید سُریلے نے کہا "تارڑ صاحب.. صرف شاہی قلعے میں ہی ایک شیش محل نہ تھا، ٹھیکیدار سلطان نے اپنی حویلی کی تیسری منزل پر بھی ایک شیش محل بنوایا تھا.. اُس حویلی کے موجودہ مقیم میرے واقف ہیں، جب میں نے آپ کا نام لیا تو وہ راضی ہو گئے ورنہ وہ کسی سیاح یا اجنبی کو وہاں داخل نہیں ہونے دیتے.."

میں اس سلطان کے شیش محل کا تفصیلی تذکرہ یہیں کہیں کر چکا ہوں۔ آہن گروں، ورکشاپوں، لوہے کی دکانوں، ٹرانسپورٹ کے اڈوں وغیرہ کے ناگوار، بہت سرد اور بہت ہی آہنی ماحول کے جمگھٹوں میں کہیں کہیں سلطان کی سرائے کے آثار ہم دریافت کرتے تھے.. سرفراز کا کہنا تھا کہ اس آہنی جھاڑ جھنکار میں دس برس پیشتر تک سلطان کی سرائے کے چار داخلوں یا دروازوں میں سے ایک سب سے شاندار گیٹ موجود تھا جو ڈھے گیا یا ٹریڈر مافیا نے ڈھا دیا.. اور اس گذرگاہ کے آثار کی نشانیاں ہم نے تلاش کر لیں..

کسی بھی لاہوری عمارت کی قدامت کا اندازہ اس کے طرزِ تعمیر کے علاوہ اُن اینٹوں کی ساخت سے ہو جاتا ہے جو اُس کی تعمیر میں استعمال ہوئیں اور وہ چھوٹی اینٹیں ہوتی ہیں جنہیں نانک شاہی کہا جاتا ہے..

سلطان کی سرائے کا وہ دروازہ اپنی بلندی اور شانداری کے آثار سے اپنا نوحہ بیان کرتا تھا جو شاید چاروں دروازوں میں سب سے پُرشکوہ تھا.. چھت کب کی گر چکی تھی پر اُس کے طاقچے موجود تھے جہاں مسافروں کو راہ دکھانے کے لیے چراغ روشن کیے جاتے تھے.. محرابوں کی کمانداریاں ڈھے چکی موجود تھیں اور

ان کی اینٹوں میں سے پیپل کے شجر پھوٹتے تھے..

اور اس داخلے پر جو آہنی دروازہ، ابھی تک حالات، موسموں اور زمانوں کے تھپیڑوں کے باوجود موجود تھا، زنگ آلود لیکن نہایت پُرشکوہ موجود تھا. سرائے سلطان کا صدر دروازہ آہنی کوکوں سے آرائش شدہ، اگرچہ زنگ آلود دیوار کے ساتھ بیکار پڑا تھا..

مجھے خبر نہ ہوئی..! اگرچہ میں ہر جانب نظر رکھتا تھا، فہد کی نوجوان آنکھوں کو اُس مسمار ہو چکے سلطان کی سرائے کے دروازے کے اوپر شکستہ محراب پر درج ایک عبارت کی خبر ہوگئی..اسے اپنی نوٹ بک میں درج کرلو..

"CITY of Lahore along side the high Road between Lahore and Un........ Mohammad Sultan the honourable company, contractor in the of John Wedder burn Enqy.. need subvision 1910 Commissioner."

یہ عبارت پیپل کے ایک شجر کی اوٹ میں تھی تو اسے فہد نے جو کچھ پڑھا تھا اُسے نوٹ بک میں درج کرلیا تاکہ سند رہے..

''سلطان ٹھیکیدار نے بہت عمارات بنائیں مگر پرانی مسجدوں اور عمارتوں عہد شاہانِ سلف کی بھی اُس نے گرائیں اور یہ کام اُس نے اینٹ کی طمع میں کیا..''

سرائے سلطان کا صرف ایک محرابی دروازہ ابھی تک قائم ہے، چھوٹی اینٹوں کا تعمیر شدہ، جس کے گنبد میں ابھی تک ایک زوال پذیر گولائی ہے.جس کے اندر پان سگریٹ کی دکانیں ہیں، سہروردی جنرل سٹور ہے اور یقین کیجیے کہ ان دکانداروں کو کچھ خبر نہیں کہ وہ سرائے سلطان کے آخری دروازے میں گھس کر بیٹھ گئے ہیں..

سلطان ٹھیکیدار نے صرف اینٹ کی طمع کی.. پری محل کو مسمار کر دیا، ایک مسجد نیم بسمل کو اکھاڑ دیا..یہ زمین جہاں سرائے بنی ہوئی ہے پہلے چوک شہزادہ داراشکوہ تھا..شمال کی سمت سرائے کے ایک نیا بازار نو تعمیر، دوطرفہ بنایا.. چونکہ وہ ناک کی سیدھ میں سیدھا نہ تھا، بل کھاتا مختصر بازار تھا اس واسطے اس کا نام ''لُنڈا بازار'' مشہور ہوگیا کیونکہ پنجابی زبان میں لُنڈا دُم بُریدہ کو کہتے ہیں..اردو میں اسے لنڈورا بازار کہا جا سکتا ہے..

یاد رہے کہ مشہور زندہ بس سروس سلطان کی سرائے سے کشمیر کے لیے چلتی تھی..جس پر میرے ابا جی سرینگر کے پھولوں کے فارم جانے کے لیے سوار ہوتے تھے..سلطان ٹھیکے دار نے اور انگریز سرکار چشم پوشی کرتی تھی، بہت سے تاریخی مُغل مقابر، بارہ دریاں اور کچھ ایسی مساجد بھی اینٹوں کے لالچ میں مسمار کر دیں جو زندہ

تھیں، اس نے نواب وزیر خان کا ''پری محل'' خرید کر اسے ڈھا دیا.. کہا جاتا ہے کہ مغل عمارتوں کی بنیادیں اتنی ہی گہری ہوتی تھیں جتنی وہ بلند ہوتی تھیں چنانچہ انہیں کھودنے سے اینٹوں کے انبار برآمد ہوتے تھے.. سلطان ٹھیکیدار نے چوک شہزادہ دارا شکوہ کو غارت کر کے اُس کی اینٹوں سے اپنی سرائے تعمیر کی.. اس سرائے کے شاہانہ پن کو منشی کنہیالال نے ''تاریخ لاہور'' میں بے حد تفصیل سے بیان کیا ہے.. باغ، باغیچے اور متعدد کنویں جن کا پانی گرمیوں میں سرد ہوتا تھا جیسے برف کا بنا ہوا اور اہل لاہور ان کنوؤں کی چرخڑیاں گھما کر ان میں سے پانی نکال کر ''ہزاروں سبوچوں'' میں بھر کر اپنی کوٹھیوں اور گھروں میں لے جاتے اور سلطان کو دعائیں دیتے.. عام مسافروں کے لیے کوٹھڑیاں تعمیر کی گئی تھیں لیکن صاحبان انگریز اور ذی عزت مسافروں کے لیے مکلّف مکان بنائے گے.. اس کا شمالی دروازہ جو لنڈا بازار میں کھلتا تھا وہاں اُس زمانے میں کسبیوں کے ڈیرے ہوتے تھے.. طوائفوں اور دل پر چانے والی عورتیں بعد ازاں وہاں سے اٹھ کر لوہاری دروازے کے اندر چوک چکلا میں جا آباد ہوئیں اور پھر وہاں سے کُوچ کر کے آج کی ہیرامنڈی کے علاقے میں بسیرا کر لیا.. اور جب مُفتیانِ دین نے لاہور کو متشرع کرنے کے مقدس عمل کے تحت انہیں وہاں سے بھی اٹھا دیا تو وہ پورے شہر میں پھیل گئیں، جگہ جگہ اُن کے فرنچائزڈ سپر سٹور کھل گئے، اخیر عمر میں سلطان ٹھیکیدار کی دولت زوال پذیر ہوگئی، خرچ وہی امیرانہ رہا، چھ سات لاکھ قرضہ سر پر چڑھ گیا، اُس نے مہاراجہ جموں سے روپیہ حاصل کر کے قرض داروں کو ادا کیا جس کے عوض اپنی تمام جائیداد، کوٹھیاں، لنڈا بازار اور پری محل کی دکانیں مہاراجہ کے پاس رہن کر دیں، دو تین برس جیا اور پھر عسرت میں مر گیا.. اُس کا کوئی بیٹا نہ تھا..

جب ہم سلطان ٹھیکیدار کی سہ منزلہ حویلی کی آخری منزل پر اُس کے بجھتے ہوئے شیش محل کو دیکھنے گئے تو حویلی کے ایک مکین نے بتایا کہ سلطان ٹھیکیدار کے وارثوں میں صرف تین عورتیں تھیں جو حیدر آباد منتقل ہو گئیں، ہمارے بزرگوں نے یہ حویلی اُن سے اونے پونے داموں میں خریدی تھی..

جیسے میرا ارادہ ہے کہ اگر دو چار برس مزید مرحمت فرما دیئے گئے تو میں نت کلاں کے ہزارہ سنگھ کے بارے میں ایک ناولٹ لکھوں گا تو ایک خواہش لاہور کے اس داستانوی کردار سلطان ٹھیکیدار کے عروج و زوال کی حیرت انگیز حیرت پر بھی ایک ناول تحریر کرنے کی ہے اور اُس ناول کی بنیادوں میں مغل سلطنت کے مقابر اور مساجد کی پرانی اینٹیں ہوں گی..

''انجمن تاجرانِ سرائے سلطان، لوہا مارکیٹ لاہور''

بسلسلہ عرس مبارک حضرت داتا گنج بخشؒ بروز جمعرات مارکیٹ بند رہے گی..

''شہر لاہور جو کہ ایک شاہراہ کے کناروں پر آباد ہے.. محمد سلطان آنر ایبل ٹھیکیدار، جان وِیڈر برن اسکوائر کی سپر ویژن میں.. کمیشن کیا گیا، لاہور..''

ویسے میں سلطان ٹھیکیدار کا احسان مند ہوں کہ اگر وہ لنڈا بازار تعمیر نہ کرتا تو تقریباً 1925ء کے لگ بھگ، نوے برس پیشتر جب میرے ابا جی اپنے علاقے کے واحد میٹرک پاس نوجوان کی حیثیت سے رزق روزگار کی تلاش میں لاہور سٹیشن پر اترے تھے تو وہ اس اجنبی اور بے رحم شہر میں اپنی پہلی رات کہاں بسر کرتے..



''لُنڈا بازار.. بابو ہوٹل.. جہاں میرے ابّا جی نے لاہور میں اپنی پہلی شب گذاری''

اتوار کے باوجود دُم کٹا، لنڈورا، لُنڈا بازار رونق اور پُرہجوم ہوا جاتا تھا.. استعمال شدہ ملبوسات، جوتوں، جرابوں، جوگرز، عینکوں، پاجاموں اور جانگیوں، خواتین کی انگیوں، دستانوں، جیکٹوں، کوٹوں، مفلروں، سویٹروں، اونی ٹوپیوں، کمبلوں وغیرہ کی غالباً دنیا بھر میں یہ سب سے بڑی مارکیٹ تھی.. یہ نہ صرف غریبوں کے تن ڈھکتا تھا بلکہ امراء بھی اس کی گلیوں میں خوش لباس ہونے کے لیے چلے آتے تھے.. مجھے یاد ہے جب 1955ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کی کوہ پیمائی کی کلب کی جانب سے ''کشن گنگا مُہم'' کا اعلان ہوا.. رتی گلی کی برفانی چوٹی کو سر کرنے کی منصوبہ بندی ہوئی تو ہمیں کوہ نوردی کا سامان اِسی لنڈا بازار سے حاصل ہوا.. دوسری جنگ عظیم کے فوجیوں کے سویٹر، رُک سیک اور اُونی جرابیں، گرم پاجامے جو کہیں اور میسر نہ تھے، یہیں سے خریدے گئے.. مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں نے کوہ پیمائی کے لیے کسی برطانوی گورے سپاہی کے جو بوٹ خریدے تھے وہ کسی ایک سپاہی کے نہ تھے، ایک بوٹ نونمبر کا تھا اور دوسرا دس نمبر کا تھا یعنی دو سپاہیوں کے مختلف پاؤں کے بوٹ تھے چنانچہ میں اس کوہ نوردی کے دوران مسلسل لارڈ بائرن کی مانند لنگڑا کر چلتا رہا..

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر اس جنگ میں استعمال شدہ جتنا بھی متروک شدہ مال تھا وہ لنڈا بازار میں سج گیا اور مجھے یہ تو بہت یاد ہے کہ اُن زمانوں میں یہاں ''کلیاں'' فروخت ہوتی تھیں.. ''کلیاں'' دراصل اتحادی ہوا بازاری کے پیراشوٹ تھے جو خالص سِلک سے بنے ہوتے تھے، لاہور کی فیشن ایبل اور جدید خواتین جن میں میری چھوٹی خالہ جان بھی شامل تھیں، اِن ''کلیوں'' کے ٹانکے ادھیڑ کر خالص سِلک سے اپنے پیراہن سِلواتیں اور یہ تب لاہور کی سب سے بڑی فیشن سٹیٹ منٹ تھی کہ فلاں لڑکی نے کلیوں کی قمیص شلوار پہن رکھی تھی.. ان پیراشوٹوں کو کلیاں غالباً اس لیے کہا جاتا تھا کہ ان کا رنگ موتیے کے پھولوں ایسا ہوتا تھا تو یہ موتیے کی کلیاں تھیں..

نہ صرف اندرون شہر بلکہ لنڈا بازار میں بھی افغانوں کا غلبہ ہو چکا ہے.. لاہور شہر کے اندر بازاروں

میں پنجابی کم اور پشتو زیادہ سنائی دیتی ہے کہ یہ سب ثمرات مُردہ مینڈک آنکھوں والے مردِ مومن ضیاء الحق کی جانب سے ہم پر نازل کیے گئے..

وہاں جگہ جگہ نسوار کوٹی جا رہی تھی..

ویسے میں مشورہ دے سکتا ہوں کہ اگر آپ لاہور میں ایک یادگار اور ناقابل فراموش دن گذارنا چاہتے ہیں تو لُنڈے بازار میں چلے آئیے.. یہ بازار، مصر سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز ہے.. آزمائش شرط ہے..

ہم ابھی تک سرائے سلطان کے مسمار ہو چکے داخلوں اور کسی ایک دروازے کے پہلو میں ابھی تک موجود اس طاقچے میں گم تھے جہاں گئے زمانوں میں لاہور میں داخل ہونے والے تاجروں، شہزادوں، لٹیروں، شاعروں، صوفیوں، داستان گوؤں، مجذوبوں اور طالع آزماؤں کو سرائے کی راہ دکھانے کی خاطر چراغ جلتے تھے جب لُنڈا بازار کی دُھندلاتی صبح میں ''بابو ہوٹل'' کا بورڈ نظر آ گیا..

نوّے برس پیشتر جب میرے ابا جی لاہور سٹیشن پر اترے تھے، ایک ڈرا ڈرا سا دیہاتی نوجوان جس کے پلّے میں کچھ تعلیم اور عزم اور ارادے کے سوا کچھ نہ تھا تو انہوں نے لاہور میں اپنی پہلی شب ''بابو ہوٹل'' میں بسر کی تھی..

وہ اکثر اپنی پہلی رات کا قصہ بیان کرتے رہتے..

''میں سردیوں کی رُتوں میں بابو ہوٹل کے تندور کے باہر لنڈا بازار میں کھڑا رہتا، اکثر بھوک سے نڈھال کہ اس شہر نے ایک دیہاتی نوجوان کو کہاں قبول کرنا تھا، رزق روزگار کا کوئی وسیلہ نہ تھا اور میں انتظار کرتا رہتا کہ کب تندور کے گرد بیٹھے مسافر رخصت ہو جائیں گے اور میں تندور کے گرد جو مٹی کا فرش ہے جو ابھی تک گرم ہو گا، اُس پر لیٹ کر سردی کے قہر کو برداشت کر کے سو جاؤں گا..''

ابا جی، چوہدری رحمت خان تارڑ، فن زراعت اور کاشتکاری کے بارے میں اردو میں لکھی جانے والی کتابوں کے پہلے مصنف تھے جنہوں نے زراعت کے حوالے سے اردو میں پہلے جریدے ''کاشتکار جدید'' کا آغاز کیا اور تیس برس تک اپنے پلّے سے رقم خرچ کر کے اس کی آبیاری کی.. کہ وہ.. اگر مٹی کا کوئی پیغمبر ہوتا تو وہ ہوتے.. ابا جی نے کم از کم اپنی تصنیف کردہ دو کتابوں کا انتساب ''بابو ہوٹل'' کے نام کیا.. مجھے بابو ہوٹل نظر آیا تو گویا ایک قبلہ اور کعبہ نظر آیا..

میں پچھلے برسوں بھی ادھر آ نکلا تھا ''بابو ہوٹل'' اب ماڈرن ہو چکا تھا.. میں نے اس کے مالک کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ہوٹل کے پچھلے حصے میں مقیم ہیں اور کسی سے نہیں ملتے.. شاید وہ اس ہوٹل کے مالک کے بیٹے تھے کہ بعد ازاں وہ میرے ابا جی کے بہت قریبی دوست ہو گئے تھے..

میں نے نہ صرف ''سورج کے ساتھ ساتھ'' ٹیلی ویژن سیریل میں بلکہ اپنے ناول ''خس وخاشاک

زمانے" میں اسی بابو ہوٹل کی قدیم تصویر کشی کی ہے اور اُس ناول کے کردار امیر بخش میں میرے ابا جی کی دشوار اور مشقت بھری حیات کی جھلکیاں بھی نمایاں ہوتی ہیں..

میرے رفیق تو آگاہ نہ تھے کہ "بابو ہوٹل" کو جب میں نے اپنے سامنے دیکھا تو مجھ پر کیا گذری..

سب کچھ بدل گیا تھا لیکن "بابو ہوٹل" کا تندور ابھی تک موجود تھا..ایک جدید حالت میں بہر طور موجود تھا..اس تندور کے ارد گرد کچی مٹی کا فرش نہ تھا، سنگ مرمر کا فرش تھا..

کیا اُس سنگ مرمر کے فرش کے اندر تندور کی حدت سرایت کرتی تھی..نوّے برس پیشتر اسی تندور کی آگ سے گرم ہوتی کچی مٹی تو نہ تھی اور اس کے باوجود..میرا جی چاہا کہ میں اس تندور کے آس پاس جو فرش کچا نہ تھا، اُس پر لیٹ جاؤں..

شب تو نہ بسر کروں لیکن..شاید مجھے بابو ہوٹل کے تندور کی حدّت میں مجھے اپنے ابا جی کے بدن کی مہک آ جاوے..

پر مہک کہاں نوّے برس تک ٹھہرتی ہے..

"بابو ہوٹل" کو جب میں نے اپنے سامنے دیکھا تو مجھ پر یہی گذری..



''گوردوارہ شہید گنج، جہاں چھ ہزار سِکھ ذبح کیے گئے''

مجھ سمیت، ملک سرفراز، خواجہ تنویر، ڈاکٹر نسیم، فرزند علی، فہد، شیخ ندیم، سعید بٹ اور کرنل عامر لُنڈا بازار میں آوارہ لُنڈ یرے پھرتے تھے جب مشتاق شفائی سے ملاقات ہوگئی.. وہ موسموں کا مارا ہوا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا.. ''تارڑ صاحب.. میں کسی زمانے میں ٹیلی ویژن کے لیے گیت لکھا کرتا تھا، قتیل شفائی کا شاگرد تھا اس لیے شفائی ہو گیا.. مجھے دو بار بہترین گیت نگار کا ٹیلی ویژن ایوارڈ مل چکا ہے..''

وہ ایک مضمحل اور تھکا ہوا شخص تھا، بال جتنے بھی تھے پریشان، داڑھی بڑھی ہوئی اور وہ مجھے دیکھ کر اپنے درخشاں ماضی میں اتر گیا تھا، جذباتی ہو کر ٹیلی ویژن کے مختلف پروڈیوسروں کے حوالے دے رہا تھا، اُن مشہور گلوکاروں کو یاد کر رہا تھا جنہوں نے اُس کے لکھے ہوئے نغمے گائے.. میرا وہ گیت ''وے توُں آناسی۔تو نہیں آیا۔ سجناں تیرا راہ تک تک میں ہاری آں'' بہت ہِٹ ہوا تھا.. آپ نے سُنا ہوگا؟ میں نے نہیں سُنا تھا پھر بھی میں نے پُرجوش ہو کر کہا کہ واہ جی واہ وہ آپ کا لکھا ہوا تھا.. اور وہ خوش ہو گیا..

''اب کیا کرتے ہیں شفائی صاحب؟''

''ماشاءاللہ لنڈے میں دکان ہے میری.. آجائیں میں آپ کی خدمت میں کوئی ''پیِس'' پیش کرنا چاہتا ہوں.. ایسا کہ امریکہ، انگلینڈ میں بھی کم ہی ملتا ہوگا.. چائے شائے پیش کروں..''

اُس نے بہت اصرار کیا لیکن میں نے کبھی نہ کبھی کم از کم وہ ''پیِس'' حاصل کرنے کے لیے ہی وعدہ کر لیا کہ میں آؤں گا.. اور وہ حسرت سے مجھے دیکھتا تھا..

''ہاں جی، گوجر جی.. اب کدھر؟''

''اب جنابِ عالی گوردوارہ شہید گنج دیکھیں گے..'' سرفراز کی بلوری آنکھوں میں ایک عجیب چمک تھی کہ وہ اپنے آبائی شہر کا شیدائی تھا اور جب سے اُسے بھنک پڑی تھی کہ شاید میں لاہور کے بارے میں ایک تاثراتی کتاب لکھنے کی جانب مائل ہوں وہ میرا مزید شیدائی ہو چکا تھا.. مجھے اپنے گمشدہ شہر کی عظمتوں کے سب وہ چراغ دکھانا چاہتا تھا جو بجھ رہے ہیں، بجھ چکے ہیں..

مسجد شہید گنج کی تحریک.. برصغیر کے مسلمان جب اُسی ایک لمحے کے اشتعال میں آ گئے تھے اور انہوں نے درجنوں کی تعداد میں اس تحریک کے لیے اپنی جانیں نثار کر دیں، میرے ابا جی سرما کی اُن شبوں میں جب ہم رضائیوں میں دبک کر اُن سے کہانیاں سنا کرتے تھے، اکثر نہایت جذباتی ہو کر اس تحریک کا تذکرہ کرتے.. خاص طور پر عطا اللہ شاہ بخاری کی جادوگر شعلہ بیانی کا کہ وہ موچی دروازے میں ہزاروں کے ہجوم کو مخاطب کرتے، شہید گنج کی مسجد کی وکالت کرتے، تقریر کرتے تو لوگوں پر ایک سحر طاری کر دیتے، وہ ان کی قادر الکلامی میں یوں بندھ جاتے کہ سانس بھی نہ لیتے کہ کہیں شاہ صاحب کا کوئی ایک معجزہ گر بیان زائل نہ ہو جائے.. وہ لوگوں کو ناموسِ مصطفےٰؐ کے نام پر شہید گنج کی مسمار شدہ مسجد کی بحالی کے لیے ابھارتے.. یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو جاتی.. ابا جی اُس جلسے میں موجود تھے جب شاہ صاحب کے کلام کی قدرت امراؤ القیس اور ابونواس کی شاعری کی ہمسری کرتی تھی، فجر کا وقت ہو گیا تو انہوں نے تقریر کے اختتام پر جذبات میں مدہوش ہو کر کہا ''دیکھو، ہندوستان کے مسلمانو، ذرا پیچھے مُڑ کر دیکھو.. نبیؐ کی لاڈلی بیٹی فاطمہؓ چلی آ رہی ہے، فریاد کرتی چلی آ رہی ہے کہ میرے بابا کے ناموس کی حفاظت کرو.. اور اُس کے سر پر دوپٹہ بھی نہیں ہے..'' اور سب لوگوں نے شاہ صاحب کی سحر بیانی میں جکڑے ہوئے مُڑ کر دیکھا اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے..

برصغیر کے مسلمانوں کی یہ تحریک بھی ایک لمحے کا اشتعال ثابت ہوئی.. پاکستان وجود میں آنے کے بعد مسجد شہید گنج کو بحال ہونا چاہیے تھا کہ اب تو اپنی حکمرانی تھی پر وہ نہ ہوئی کہ لمحے کا اشتعال گذر چکا تھا..

ہمیں دُور سے لُنڈا بازار کی بے ترتیب اور بے رُوح آبادی کے فلک پر شہید گنج کا گوردوارہ نظر آنے لگا تھا..

ایک بہت بڑا پھاٹک ہماری درخواست پر کھول دیا گیا اور جب ہم اندر داخل ہوئے تو یکدم ایک حیرت اور شرمندگی سے دوچار ہوئے..

حیرت کا جھرنا اس لیے پھوٹا کہ ہمارے گمان میں بھی نہ تھا کہ شہر لاہور کے لُنڈے بازار میں ابھی تک ایک شاندار اور نہایت عظمت والا شہید گنج کا گوردوارہ ابھی تک قائم اور موجود ہے اور شرمندگی اس لیے کہ ہم کیسے بے خبر اور لاعلم لوگ تھے کہ ہم اس تاریخی عمارت کے وجود سے بے خبر اور لاعلم لوگ تھے..

یہ گوردوارہ محکمہ اوقات کی نگہداشت میں ہے اور اوقاف کا ایک اہلکار عظیم حسین ہمارا راہبر ہو گیا..

یہ ایک شاندار اور پُرشکوہ عمارت تھی جس کی بہت دیکھ بھال کی گئی تھی کہ ہم سکھوں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں اگرچہ مسلمانوں پر ظلم اُن کے زیادہ ہوئے اور ہندوؤں کو اپنا ازلی دشمن ٹھہراتے ہیں جنہوں نے اُن کی نسبت تو بہت کم ظلم کیے..

گوردوارے کا داخلی دروازہ مقفل تھا اور وہ کھولا جا سکتا تھا لیکن.. اُس کے اندر جانے سے کچھ

حاصل نہ ہونا تھا، ہم سے کہیں بڑھ کر توحید کے پرستار سکھ..صرف گرنتھ صاحب کے سامنے جھکتے ہیں، نہ بابا گورونانک اور اپنے گروحضرات کے سامنے سر جھکاتے ہیں..صرف گرنتھ صاحب کو اللہ تعالیٰ کا زندہ کلام مان کر اُس کے آگے متھا ٹیکتے ہیں..گرنتھ صاحب کی آسائش کا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ گرنتھ کی رہائش گاہ میں گرمیوں میں ایئرکنڈیشنر کی ٹھنڈک ہوتی ہے اور سردیوں میں بجلی کے ہیٹر جلائے جاتے ہیں تاکہ اس مقدس کتاب کو گرمی نہ لگے، سردی سے ٹھٹھرنے نہ لگے اور ان کی توجیہہ سے انکار کرنا ذرا دشوار ہے..اُن کا کہنا ہے کہ اللہ کا، رب کا، خدا کا کلام، اس خالق کی گفتگو مردہ تو نہیں ہوتی، زندہ ہوتی ہے تو اسی لیے اس پر موسم اثر کرتے ہیں..

گوردوارے کے اندر جانے سے کچھ حاصل حصول اس لیے نہ تھا کہ ہر گوردوارے کے اندر نہ کوئی دیوی دیوتا ہوتے ہیں اور نہ کوئی خداؤں کے مجسمے..ایک چبوترے پر ریشمی جھالروں اور پردوں تلے گرنتھ صاحب کی کتاب کھلی ہوتی ہے...اور اسے گرنتھی حضرات مورچھل جھل رہے ہوتے ہیں..چنانچہ دنیا بھر کے گوردواروں میں وحدانیت میں یکسانیت پائی جاتی ہے تو اگر ایک گوردوارے کا اندرون دیکھ لیں تو سب کا دیکھ لیں..

''سر جی..یہ موٹی آنکھوں والی لڑکی ہندو ہے یا مسلمان؟''

میں اس گوردوارے کی تاریخ میں غوطہ زن ہو رہا تھا جب فہد اس گوردوارے میں قیام کرنے والے ایک ہندو خاندان کی لڑکی کو دیکھ کر ڈوبتا جاتا تھا..

عظیم حسین کا کہنا تھا کہ سندھ کے ہندو جب کبھی ہندوستان کی کسی یاترا سے لوٹتے ہیں تو اسی گوردوارے کے مہمان خانے میں قیام کرتے ہیں..

میں نے کچھ نہیں کہا، کرنل عامر کہنے لگے ''آپ جانتے ہیں کہ اگر زمین کے وجود کی تاریخ کا حساب کیا جائے تو اگر یہ زمین مثلاً ایک ہزار برس کی ہے تو حضرت انسان صرف پانچ منٹ پہلے آدم کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے تھے تو یہ لڑکی صرف پانچ منٹ پہلے کی ہے تو کیا پتہ کون ہے..''

ہم اکثر کرنل صاحب کے ارشاداتِ عالیہ سے متاثر ہو کر دنگ رہ جاتے تھے پر فہد کی تشفی نہ ہوئی

''تارڑ صاحب، ذرا دیکھئے اس لڑکی کی آنکھیں کتنی موٹی موٹی ہیں..''

''شٹ اپ فہد..''

''جی سر..''

گوردوارے کے پہلو میں واقع عظیم حسین ہمیں اُس قدیم تاریخی کنویں تک لے گیا جس کی تہہ میں کبھی پانی نہ تھے، چھ ہزار سکھوں کی گردنوں کا خون تھا..

ایک شہید گنج بقول کنہیا لال وہ تھا جہاں ہندوؤں اور سکھوں نے سینکڑوں مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا..

اور ایک شہید گنج یہ تھا.. جہاں ہزاروں سکھوں کو ذبح کیا گیا..

مغلوں اور سکھوں کے درمیان مخاصمت مذہب کی نہ تھی، اقتدار اور بادشاہی کی تھی.. سکھ مغل حکمران کے لیے ایک خطرہ تھے کہ وہ بہت بے جگر اور حماقت کی حد تک بہادر تھے، چنانچہ نہ صرف انہیں بلکہ ان کے گورو حضرات کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا..

اور ان میں گورو گوبند سنگھ ایسا صوفی اور بے مثال شاعر بھی تھا، گوبند سنگھ، رنجیت سنگھ کی سرکاری زبان فارسی میں شعر کہتا تھا اور اُس کے فارسی کلام کا مجموعہ ایسا ہے کہ اہلِ فارس بھی اُس کی داد دیتے ہیں.. تب مغل حکمرانوں نے اعلان کیا کہ جو کوئی بھی سلطنت کے باغی سکھوں کو پکڑ کر لائے گا.. ہر سکھ کے عوض مبلغ دس روپے کا انعام دیا جائے گا.. جیسے امریکیوں نے اعلان کیا تھا کہ جو کوئی بھی کسی طالبان کی نشاندہی کرے گا، ڈالروں سے نوازا جائے گا..

اور بہت بے گناہ لوگ ابھی تک کیوبا کے جزیرے میں گوانتانا موبے کے عقوبت خانے میں امریکی عذاب سہتے ہیں..

چنانچہ چھ ہزار کے لگ بھگ سلطنت کے باغی سکھ سرداروں کو جانوروں کی مانند ہانک کر تختِ لاہور کی خدمت میں پیش کر دیا گیا.. لاہور کی "قصابوں والی گلی" میں مقیم قصابوں کو ان سکھوں کو ذبح کرنے کے لیے مامور کیا گیا اور وہ تین روز تک ان ہاتھ پاؤں سے بندھے ہوئے سکھوں کو ذبح کرتے رہے..

اور یہ وہی مقام تھا..

اور جب شامت اعمال سے ایک مرتبہ پھر سکھ لاہور کے حکمران ہوئے تو انہوں نے لاہور کے سب قصابوں کو ہلاک کرنے کا حکم جاری کر دیا.. اور تب لاہور کے سکھ سلطنت کی جانب سے مقرر کردہ ایک مسلمان گورنر نے ایک تدبیر کی.. اس نے قصابوں سے کہا.. تم سب ہلاک کر دیئے جاؤ گے، میرا مشورہ ہے کہ تم مجھے دس پندرہ لوگ دے دو.. میں کوئی تدبیر کروں گا..

اُس مسلمان گورنر نے ان دس پندرہ لوگوں کے کان اور ناک کٹوا دیئے اور انہیں دلی دروازے کے اندر شاہی گذرگاہ کے کناروں پر کھڑا کر دیا اور جب سکھ حکمران کی سواری داخل ہوئی تو اُس نے کہا کہ.. حضور.. دیکھئے.. لاہور کے قصاب سکھوں کو ذبح کرنے کے عمل سے اتنے شرمندہ ہیں کہ انہوں نے اپنی ناکیں اور کان کٹوا دیئے ہیں، لہولہان ہو کر آپ سے معافی کے خواستگار ہوتے ہیں، ان پر رحم کر دیجئے.. سکھ ہونے کے باوجود وہ حکمران اتنا رحم دل تھا کہ اس نے لاہور کے ان مسلمان قصابوں کو معاف کر دیا جنہوں نے پورے تین دن تک سکھوں کو ذبح کیا تھا..

ہم نے اُس قدیم کنویں میں جھانکا جو میری توقع سے برعکس بہت گہرا تھا، اس کے پانی نشیب میں اتنے تھے کہ جھانکنے سے بھی کسی کائنات کے پرے موہوم سے بمشکل نظر آتے تھے، اتنی گہرائی میں تھے، کنویں کی وسیع گولائی میں نصب سرخ اینٹوں میں سے پیپل کے پودے پُھوٹتے تھے.. ذبح شدہ سِکھوں میں سے بیشتر کو اسی کنویں میں پھینک دیا گیا..

اگر حکمرانی کا کوئی مذہب ہوتا تو اورنگزیب اپنے دیگر بھائیوں کی مانند دارا شکوہ کو کیوں ہلاک کر دیتا، سرمد منصور کو سُولی پر کیوں چڑھاتا.. اور مغل اعظم مسلمان دُلّا بھٹی کا کیوں بیری ہو جاتا.. شاہ حسین اور دُلّا بھٹی ایک ہی زنداں میں کیوں ڈالے جاتے..

اقتدار کے حصول کی دیوی اندھی ہوتی ہے.. اُسے کوئی مذہب نہیں، صرف ایک تخت دکھائی دیتا ہے..

''سر جی.. وہ لڑکی ابھی تک دُھوپ میں کھڑی آنکھیں جھپک رہی ہے.. یہ ہندو ہے یا مسلمان..''

فہد ابھی تک نوجوانی کے خمار میں بے خود ہوا جاتا تھا..

اُس کنویں کے پاتال میں ابھی تک پانیوں کی جھلملاہٹ نظر آتی تھی پر بمشکل نظر آتی تھی... البتہ خون کی سرخی ابھی تک اُس کے پانیوں میں گھلتی تھی..



''کاکو چشتی، تارو سنگھ اور مسجد شہید گنج کے کھنڈر''

ہم تو آگاہ نہ تھے کہ اس عظیم الشان گوردوارہ شہید گنج کے علاوہ بھی کوئی اور ایسا مقام ہے جو تاریخ میں ثبت ہے.. عظیم حسین میرے تجسس اور شوق سے متاثر ہوا اور کہنے لگا ''تارڑ صاحب..آپ چلے آئیے، میں آپ کو اُس مسجد کی زیارت کرواتا ہوں جو مسجد شہید گنج کے حوالے سے تاریخ میں درج ہوئی، اُس کے کچھ آثار باقی ہیں..''

ہم گوردوارے سے باہر آ کر لنڈا بازار میں آ گئے اور اس کے ہجوم میں راہ تلاش کرتے ایک سبز رنگ کے دروازے تک آ گئے جس کے ماتھے پر سرخ اور سبز روشنائی سے لکھا ہوا تھا ''حضرت شاہ کاکوی چشتی مسجد و مدرسہ''

''عظیم، یہ شاہ کاکو کون ہیں؟''

''کوئی بھی نہیں۔''

''کیوں، کوئی بھی نہیں؟''

''اس لیے کہ کوئی بھی نہیں۔''

''اگر کوئی نہیں تو کیوں کوئی نہیں؟''

''کوئی نہیں۔''

لنڈا بازار کے شور شرابے اور ہجوم میں یہ تو گمان نہ ہوتا تھا کہ ایک سبز رنگ کے دروازے کے اندر ایک احاطہ ہے، ایک سکھ یادگار ہے، کسی مبینہ شاہ کاکو کا مزار ہے جسے زبردستی وہاں دبا دیا گیا ہے اور شہید گنج کی مسمار شدہ مسجد کے وہ کھنڈر ہیں جن کی بحالی کے لیے بہت لوگ نثار ہو گئے..

ایک ویران میدان ہے جس میں بیری کے کچھ درخت ویران ہیں..آپ اس عمارت میں کوئی ردو بدل نہیں کر سکتے، کسی ایک اینٹ کو اٹھا کر کسی دیوار میں لگا نہیں سکتے کہ..محکمہ اوقاف کا یہی حکم ہے جو قابل دست اندازی پولیس ہے..

وہاں ایک سبز رنگت کا پوسٹر نصب تھا، جو کسی سہیل بٹ عطاری کی جانب سے ثواب کے حصول کے

لیے یا ان زمینوں پر قبضہ کرنے کے لیے آویزاں تھا.. اور یہ سہیل بٹ بے حد تاریخی بصیرت رکھتے تھے..

''حضرت میاں میر سرکار اور حضرت مادھو لال سرکار 16 سال تک مدرسہ شاہ کاکو میں تعلیم حاصل کرتے رہے.. حضرت اسحاق شاہ کاکو چشتی، شیخ سعد اللہ بنی اسرائیل، مفتی عبدالسلام لاہوری کے مزارات مدرسہ شاہ کاکو میں ہیں.. کالے جادو کے ماہر جے پال جوگی (ہری ناتھ) نے ہندوستان کے بادشاہ بہلول لودھی کو بھرے دربار میں چیلنج کیا تو بادشاہ نے اپنے وزیر دولت خان کو حضرت شاہ کاکو چشتی کے پاس مدد کے لیے لاہور مدرسہ شاہ کاکو میں بھیجا کہ آپ ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائیں..''

دعا گو.. حاجی طارق شیخ (مرحوم)

احاطے میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب کاکو چشتی کے پھریرے لہرا رہے ہیں.. ''حضرت اسحاق شاہ کاکو چشتی شیخ سعد اللہ بنی اسرائیل اور مفتی عبدالسلام لاہوری، اسی مدرسہ کاکو میں آرام فرما رہے ہیں۔ اس مدرسہ شاہ کاکو چشتی میں حضرت میاں میر سرکار قادری اور حضرت شاہ حسین (مادھولال) 16 سال تعلیم و روحانی فیض حاصل کرتے رہے..''

ہم جیسے بے بصیرت اور شک شبہ میں مبتلا لوگوں کو ہرگز حیران اور پریشان ہونے کی اجازت نہیں کہ بہلول لودھی، مفتی عبدالسلام لاہوری، میاں میر سرکار اور شاہ حسین کیسے ان بزرگ کاکو صاحب کے عہد میں بیک وقت پیدا ہو گئے.. یہ ایمان کی کمزوری کی علامت ہے.. جس بارہ دری نما عمارت کے اندر کاکو چشتی دفن بتائے جاتے ہیں اس کی تعمیر سراسر سکھ عہد کی عمارتوں سے مشابہ ہے بلکہ یہ ہے ہی ایک سکھ عمارت.. اس لیے بھی کہ اس کی چھت تک جو سیڑھیاں جاتی ہیں وہ باہر سے نہیں اس کے اندرون سے اوپر اٹھتی ہیں.. بہر طور کچھ بدطینت لوگوں کا کہنا ہے کہ کاکو صاحب کو اس عمارت اور اس کے گرد کی زمین پر قبضہ کرنے کے لیے اعزازی طور پر دفنایا گیا ہے.. کاکو چشتی اگر کوئی صاحب کرامت بزرگ تھے تو انہیں بے خبری میں یہاں دفنایا گیا ہے.. اگر تھے.. اگر نہیں تھے تو بھی دفنا دیئے گئے.. یوں بہتوں کا بھلا ہو گیا ہو گا..

ان بزرگ کے مرقد کے عین سامنے زرد رنگت کی سادہ برج دار، کلس والی ایک عمارت ہے جو گوردوارہ شہید گنج کے علاقے کا ایک حصہ ہوا کرتی تھی، یہ بھائی تارہ سنگھ کی قتل گاہ ہے. جس کے نیم وا دروازے کے برابر میں ایک اطلاعاتی نیلا بورڈ گورمکھی اور اردو میں نصب ہے..

(گوردوارہ شہید گنج بھائی تارو سنگھ جی)

اس مقدس جگہ پر سکھ قوم کے عظیم شہید بھائی تارو سنگھ جی کو 1745ء میں کھوپڑی اتار کر شہید کیا گیا، انہوں نے اپنی جان تو قربان کر دی مگر سکھی اصولوں کو نہیں چھوڑا۔

یعنی انہوں نے اپنی کھوپڑی دے دی پر ظالم حکمرانوں سے دست پنجہ نہ لیا، اس قتل گاہ کے نیم

اندھیارے ماحول میں بھائی تارو سنگھ بے بسی کے عالم میں صرف ایک مختصر لنگوٹ میں ملبوس فرش پر بیٹھے ہیں اور ایک سیاہ تہبند والا خونخوار گنجا جلّاد اُنہیں خشمگیں نگاہوں سے گھور رہا ہے کہ اس باغی کی کھوپڑی کس زاویئے سے اتاری جائے، اُس کے برابر میں جنگی لباس میں، خود پہنے ایک نیزہ بردار کھڑا ہے جو شکل سے مغل سپاہ کا ایک فرد لگتا ہے..

یہاں جو واقف حال ملے، اوقاف اور سکیورٹی کے جو اہلکار یہاں متعین تھے یہ اُنہی کا کہنا تھا کہ ادھر کا کو چشتی وغیرہ دفن نہیں ہیں.. بلکہ ایک سکھ محقق نے پیشکش کی تھی کہ آپ اگر اس مقام کو کھود یں اور اُس میں سے کسی انسان کیا کسی بھی نوعیت کا ڈھانچہ دریافت ہو جائے تو ہم سکھ یہاں اپنے ہاتھوں سے ایک مسجد تعمیر کر دیں گے..

ایک اور صاحب تو اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی توہّم پرست ہو گئے اور کہنے لگے ”تارڑ صاحب.. یقین کریں کہ ان کا کو چشتی کے مزار کی دیواروں پر جب سبز رنگ کیا گیا تو راتوں رات اس کی بنیادوں میں سے سرسوں کا زرد رنگ پھوٹنے لگا کہ یہ ایک سکھ عمارت ہے اور رب تو سب کا سانجھا ہوتا ہے..“

اگر چہ وہ صاحب اس ماحول میں دن رات کرتے تو توہّم پرست ہو گئے تھے، اگر چہ مسلمان تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ کا کو چشتی کے مرقد کی ایک دیوار پر کچھ نمبر پینٹ تھا جو ادھورا رہ گیا تھا..اور بنیادوں کے قریب کچھ زردی تھی..اس سکھ شہید تارو سنگھ کے مقتل کے دائیں جانب ایک پرانی دیوار میں شگاف تھا اور اُس کے اندر ایک وسیع اجاڑ پن کے آثار تھے جہاں بیری کے چند بہت قدیم شجر پژمردہ اور فراموش شدہ حالت میں تب سے کھڑے تھے جب یہاں تارو سنگھ کو تہہ تیغ کیا گیا تھا..کہا جاتا ہے کہ اُن زمانوں میں یہاں بیری کے درختوں کا ایک مختصر جنگل ہو کرتا تھا. محکمہ اوقاف نے اسے ابھی تک لینڈ مافیا سے بچایا ہوا ہے اور محفوظ کر رکھا ہے..

تارو سنگھ کی قتل گاہ کے عقب میں اُس تاریخی مسجد کا کھنڈر ہے جسے غیر قانونی قرار دے کر انگریزوں نے مسمار کر دیا اور اس کی بحالی کے لیے مسجد شہید گنج کی جذباتی اور لمحاتی تحریک نے جنم لیا..

اس کھنڈر ہو چکی مسجد کی زرد رنگت کی تعمیر کی پیشانی پر کلمہ طیبہ نقش ہے اور دائیں جانب اللہ عزو جل اور بائیں جانب یارسول اللہؐ سیاہ روشنائی سے لکھا ہوا ہے.. مسجد کے مقفل نیلے دروازے کے برابر میں چھ گھڑیاں مختلف نمازوں کے اوقات پر ساکت پڑی ہیں..

میں نے اس کھنڈر کے اندر جھانکا تو فرش پر اینٹوں کا ملبہ ڈھیر تھا، ایک شہتیر گرا ہوا تھا اور اوپر کھلا آسمان تھا، ایک نیم وا بوسیدہ کواڑ کھل نہ سکتا تھا کہ کواڑوں کے پاؤں میں بوسیدہ اینٹیں حائل تھیں..

”اِسے نہ دھکیلئے تارڑ صاحب..“ عظیم حسین پر تشویش ہو کر بولا ”اندر نہ جائیے.. عمارت بہت مخدوش حالت میں ہے، گر بھی سکتی ہے..“

لیکن مجھے ملبے کے ڈھیر کے آگے جو ایک دیوار تھی اُس میں ایک محراب کے آثار نظر آ رہے تھے، میں نے کواڑوں کو دھکیلا نہیں، اپنے بھدے سراپے کو ذرا اسکیڑ کر، سانس روک کر دروازے کے اندر چلا گیا..

چھوٹی نانک شاہی اینٹوں کی چُنائی شکستہ ہو رہی تھی، اینٹیں ایک لاغر کی پسلیوں کی مانند نمایاں ہو رہی تھیں اور وہاں ایک محراب کے آثار تھے، جس دیوار میں محراب تھی اُس کے گرد بھی زرد دیواریں اور متعدد برجیوں اور آرائشوں کے آثار تھے..تو یہ وہ تاریخی شہید گنج کی مسجد تھی جس کی بحالی کے لیے سینکڑوں مسلمان نثار ہو گئے..

مجھے اس سے کچھ غرض نہ تھی کہ مسلمانوں نے کیوں اس گوردوارے کے احاطے میں یہ مسجد تعمیر کی، یہ قانونی تھی یا غیر قانونی، بہرطور یہ اللہ کا گھر تو تھا اور یہاں میں ایک مرتبہ پھر اپنے ناول ''راکھ'' کے حوالے سے ہندوستان کے مسلمانوں کے حوالے سے ان کے تاریخی اور نفسیاتی کردار کی پرکھ جو میں نے کی ہے، اُس کے حوالے سے میں جس نتیجے پر پہنچا اُس کو پھر عرض کرتا ہوں کہ ہم ہمیشہ ''لمحے کے اشتعال'' میں مبتلا ہو کر جذباتی ہو کر اپنی جانیں نچھاور کر دیتے ہیں اور جب وہ لمحہ گذر جاتا ہے تو پھر کنول کے پھولوں کے افیونی جزیرے میں اتر کر اُس لمحے کو فراموش کر دیتے ہیں، اگر ہمارا دعویٰ حق سچ تھا تو پھر پاکستان کے وجود میں آنے پر جب کہ ہم مختار ہو گئے، ہم نے کیوں شہید گنج کی مسجد کو بحال نہ کیا، صرف اس لیے کہ لمحے کا اشتعال گذر چکا تھا..



''رام گلیاں، برکت علی محمڈن ہال اور مُردوں کی گھاٹی''

برانڈ رتھ روڈ المعروف کیلیاں والی سڑک کہ یہاں کسی زمانے میں کیلے کے شجر کثرت میں ہوا کرتے تھے اور اب یہ لوہے کی صنعت کا ایک مقدس معبد ہے اور اس معبد میں بیشتر جاہل اور ملاوٹی پروہت راج کرتے تھے، پاکستان بھر میں کوئی ایسی سڑک نہیں ہے جس کے شوروم یا دکانوں سے نہیں، چھوٹے چھوٹے کھوکھوں سے بھی دولت کے انبار اُبلتے ہوں.. ''حاجی صاحب..'' سرفراز مجھ سے مخاطب ہوا..

اور سرفراز میرے دُودھ والے کے سوا وہ واحد شخص تھا جو مجھے حاجی صاحب کہتا تھا..

''یہ دائیں جانب رام گلی کی درجنوں گلیاں ہیں، میری گلیاں ہیں..اور اِن میں وہ احمدیہ بلڈنگ ہے جہاں مرزا غلام احمد فوت ہوا تھا..وہاں ایک احمدیہ مسجد کے کھنڈر بھی ہیں، اُدھر چلیں..''

''نہیں بابا..میں پہلے سے ہی اپنے ناول ''راکھ'' کے ایک احمدی کردار اور ربوہ جانے کی سزا بھگت رہا ہوں..ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں..اگر میں اب محض تجسس اور تاریخی جستجو کی خاطر اُس مقام پہ چلا گیا جہاں مرزا صاحب مرے تھے تو پھر میرا تو خدا ہی حافظ..اُدھر ہرگز نہ جانا..''

ہم کچھ دیر کے لیے موچی دروازے کے سامنے ویران اور فراموش شدہ ''برکت علی محمڈن ہال'' کی ابھی تک خوش نظر، لکڑی کی بوسیدہ ہوتی گیلریوں اور محراب دار مقفل دروازوں والی اجڑی ہوئی عمارت کے سامنے رُکے کوئی ویرانی سی ویرانی تھی..اس ہال میں برصغیر کے کیسے کیسے تاریخ ساز راہنما اور درخشاں لوگ تھے، اُن کا شمار ممکن نہیں..قائداعظم سے لے کر احرار، کانگریس اور مسلم لیگ کے کونسے لیڈر تھے جنہوں نے یہاں اہل لاہور سے خطاب نہ کیا..اور یہ تاریخی عمارت بھی زوال پذیر ہو چکی ہے..

ہم ہولناک، شہر کا چہرہ بگاڑنے والی شاہراہوں، سیمنٹ کے انباروں اور اورنج ٹرینوں کی تعمیر میں مشغول ہیں اور اپنے تاریخی ورثے کو بھول گئے ہیں....یہ جو تاریخ کی وراثت اور اس کے آثار کو محفوظ رکھنے کے باؤلے پن میں مبتلا ہیں، یہ باؤلے لوگ ہیں اور یہ جو چوبرجی، لاہور پوسٹ آفس، شالیمار باغ اور تاریخی کلیساؤں کی بنیادوں کو ذرا سا لرزا دینے پر غوغا کرتے ہیں تو یہ نہیں جانتے کہ وہ

ترقی کی راہ میں روڑے اٹکاتے بھٹکے ہوئے باؤلے ہیں اور ہاں یہ برکت علی محمڈن ہال کہاں ہے.. ابھی تک ہے تو کیوں ہے..

برکت علی محمڈن ہال سے ذرا آگے گئے تو بائیں جانب ایک نیلے بورڈ پر ایک ایسا نام لکھا تھا کہ میرا دِل رُک گیا اور میں نے ''رُکو رُکو'' ایک رُندھی ہوئی آواز میں یوں کہا کہ سب رُک گئے..

بورڈ ایک گھاٹی کی جانب اشارہ کر رہا تھا کہ اُس پر سفید حروف میں نقش تھا ''چیمبرلین روڈ'' اردو اور انگریزی میں..

''کیوں حاجی صاحب..'' سرفراز متعجب ہوا ''ادھر تو کوئی آثار نہیں ہیں..''

''میری حیات کے بچپنے، جوانی اور پھر ادھیڑ عمر کے سب آثار اسی چیمبرلین روڈ میں کہیں دفن ہیں، ایک پل کے لیے مجھے سوگوار ہو جانے دیجئے..''

چیمبرلین روڈ کی گھاٹی اتر کر چمڑہ منڈی کی دکانوں کی بُو ہوتی تھی، گوروار جن نگر کی گلیاں تھیں جہاں ریشم کے کیڑے اُبال کران میں سے تاریں کھینچے جاتے تھے جیسے چرخے کے تکلے پر گھومتی پُونی میں سے کاتنے والی سُوت کا ایک تار نکالتی تھی..

دائیں جانب میری حیات کا دوسرا گھر، خوش نظر بالکونیاں والا، احاطہ قادر بخش کے محرابی دروازے کے اوپر ایک قدیم تصویر کی مانند نقش ہوتا تھا، ذرا آگے مسجد تاجے شاہ تھی جہاں مجھے نہایت کم سنی میں امامِ مسجد کے سپرد کر دیا گیا اور پھر چند قدم کے فاصلے پر ہماری بیجوں کی دکان ''کسان اینڈ کمپنی'' ہوا کرتی تھی جو برصغیر کے چند بڑے سیڈ سٹورز میں شمار ہوتی تھی.. جہاں میرے اباجی کے تمام نقش ابھی تک ٹھہرے ہوئے ہیں، جہاں بیٹھ کر میں نے گوالمنڈی کے شوروغل میں اپنے اولین سفرنامے تحریر کیے.. میرا ارادہ ہے کہ میں ''کسان اینڈ کمپنی'' کے حوالے سے ایک الگ مضمون لکھوں کہ یہ بھی لاہور کا ایک اہم لینڈ مارک ہے..

''میں اس گھاٹی سے چڑھ کر رنگ محل مشن ہائی سکول جایا کرتا تھا..''

''حاجی صاحب، اسے مُردوں کی گھاٹی کہتے ہیں..''

''کیوں؟''

''اندرونِ شہر سے جتنے بھی جنازے نکلتے تھے، وہ اسی گھاٹی سے اتر کر میانی صاحب کی جانب لے جائے جاتے تھے اس لیے اس کا نام مُردوں کی گھاٹی پڑ گیا..

میرے لیے یہ ایک حیرت انگیز انکشاف تھا اور تب مجھے گذر چکے زمانے یاد آتے گئے.. واقعی ہماری دکان کے سامنے سے روزانہ درجنوں جنازے گذرتے تھے.. اور ان جنازوں کے احترام میں مسلسل ہماری

اٹھک بیٹھک ہوا کرتی تھی.. چنانچہ یہ مُردوں کی گھاٹی تھی..

بائیں جانب شاہ عالمی کے آغاز پر وہ سنہری کلس والا موتی لعل مندر ہوا کرتا تھا جس کا کلس پورے لاہور میں چودھویں کے چاند کی مانند دمکتا تھا اور پھر بابری مسجد کے اشتعال میں اُسے بھی، باقاعدہ سرکاری سرپرستی میں، لاہور کارپوریشن کے بُل ڈوزروں سے ڈھا دیا گیا... ''راکھ'' میں اسی مندر کے منہدم ہونے کا قصہ بیان کیا گیا ہے...

اور اس مسمار ہو چکی سنہری عبادت گاہ سے ذرا اِدھر وہ خوش نظر سنگ مرمر سے تعمیر کردہ مسجد ہے جو ایمان کی حرارت والوں نے شب بھر میں بنا دی تھی۔ اگرچہ من اپنا پرانا پاپی تھا برسوں میں نمازی بن نہ سکا..



''لوہاری بھائی بھئی، سیتلا مندر بھئی''

ہماری منزل سیتلا مندر تھی..

''لوہاری بھائی بھئی، سیتلا مندر بھئی'' سٹیشن سے چلتے ہوئے ٹانگے والے مسافروں کو متوجہ کیا کرتے تھے، یہ صدا مجھے اب بھی یاد ہے..

ہم سیتلا مندر کو نہ دیکھتے تو ماضی کے خواب ریزہ ریزہ نہ ہوتے..ہم انہی زمانوں کے سراب میں رہتے جب..

''استھان سیتلا ماتا''

''یہ متبرک مکان شاہ عالمی ولوہاری دروازے کے وسط میں شہر سے باہر واقع ہے..جس کو ''سیتلا دیوی کا استھان'' کہتے ہیں..اگرچہ شب و روز مُعتقدانِ ہنود اس دیوی کی پرستش بہ کمال ارادت مندی سے کرتے ہیں مگر خاص پرستش اس حالت میں ہوتی ہے جب چیچک کی بیماری کا زور ہوتا ہے..یہ مندر ہندو، مسلمانوں دونوں قوموں کا مرجع ہے..ہندوؤں کے بغیر اہل اسلام بھی بعد شفا پانے عارضۂ چیچک کے اپنے بچوں کو یہاں لا کر نذرانہ چڑھاتے ہیں..''

سیتلا مندر کا وجود بھی نابود کر دیا گیا، بابری مسجد کے انہدام کے انتقام میں..

بہت قدامت والا، محرابوں کی شکستگی اور موسموں کا مارا ہوا سیتلا مندر کا مرکزی دروازہ، منہدم ہونے سے انکاری ہو گیا اور وہ اب بھی موجود ہے..

اور اس کے اندر، مندر کے اندر، پناہ گزین ہیں، کوٹھڑی در کوٹھڑی لوگ مکوڑوں کی مانند رینگتے ہیں..

ایک حواس گم بوڑھا ہمیں اس شجر کی جانب لے گیا جو منہدم نہ ہو سکا، اور اس شجر کے تنے کی بنیادوں میں کچھ بجھ چکے چراغ تھے..

کچھ محرابیں، جالیاں، شکستہ دیواریں، نیلے رنگ سے رنگی ہوئی ایک محراب تھی..

اور یہ صرف ہماری جستجو کرنے والی آنکھیں تھیں جوان بچے کھچے آثار کی کھوج کرتی تھیں ورنہ آج

کا سیتلا مندر گنجلک تاریک کوٹھڑیوں، گندی گلیوں اور نیم اندھیاری رہائش گاہوں کا ایک ملغوبہ ہے..

ہم اس برباد شدہ مندر میں آباد شدہ محلوں اور گلیوں کے گنجلک پن سے نکلے تو سیتلا مندر کے ابھی تک موجود ایک محرابی دروازے میں سے نکلے..اس دروازے کا پھاٹک محراب دار گذرگاہ کی شکستہ دیوار کے ساتھ اب بھی اپنی سیتلا دیوی کے معبد کے مسمار ہونے پر، اگر غور کریں تو شاید اس پھاٹک کی سالخوردہ لکڑی میں پیوست جو آہنی پھولدار کوکے تھے، اُن میں سے کچھ پھولوں کی آنکھوں میں آنسو ہوں..

''میں بھی اپنے ہندو دوستوں پرکاش، سدرشن اور لالی کے ساتھ سیتلا مندر میں چلا جاتا تھا، سنگ مرمر کے بنے ہوئے سیتلا مندر کی طرف آنے والے راستوں پر ہندو عورتیں، مرد اور بچوں کی قطاریں ختم نہ ہوتی تھیں..سیتلا مندر میں آنے والے ننگے پیر آتے تھے..

میں سیتلا مندر میں دُرگا دیوی کا بت بڑے غور سے دیکھا کرتا تھا، حسن، رحم اور محبت کے نین نقش والی درگاہ دیوی کا بُت سونے چاندی کے زیورات سے سجا ہوتا تھا..''

''میرا شہر لاہور.. یونس ادیب''



''رنگ محل اور ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز کے ایاز کا مقبرہ''

سیتلا مندر میں آویزاں وہ حسن، رحم اور محبت کے نین نقش والی دُرگا دیوی کا سونے چاندی کے زیورات سے سجا بُت جانے کس بت شکن نے مسمار ایسا کیا کہ اب تو اس کی پرچھائیاں بھی نہ تھیں..

ہم واپس ہوئے اور شاہ عالمی میں داخل ہو گئے..

میں احاطہ قادر بخش کے مکان سے لے کر رنگ محل مشن ہائی سکول جانے کے لیے دو راستے اختیار کرتا.. اگر تو وقت کم ہوتا تو میں شتابی سے چلتا، مُردوں والی گھاٹی کے راستے موچی دروازے میں داخل ہو کر ورق کوبوں کی دھم دھم موسیقی پر سر ہلاتا سکول جا پہنچتا.. اور اگر ذرا سویرے گھر سے نکلتا تو گوروار جن نگر میں داخل ہو کر سرکلر روڈ پر نکلتا اور شاہ عالمی کے بازار کا راستہ اختیار کرتا.. دائیں بائیں سونے کے زیورات کی دمک، ہندو سنیاروں کی دکانیں، موٹی موٹی ہندنیاں صبح سویرے گہنے خریدنے کے لیے سُنیاروں کی خوشامدی گفتگو سے لطف اندوز ہو رہی ہوتیں، اور میں جب شاہ عالمی جلایا جا چکا، اس کے اندر کی شاندار حویلیاں بیشتر اپنے مکینوں کے ساتھ راکھ ہو گئیں، پاکستان کے قیام کے اولین برسوں میں شاہ عالمی کے کھنڈروں میں چلتا رنگ محل مشن ہائی سکول پہنچتا..

رنگ محل مشن ہائی سکول کی عمارت اپنی زوال پذیر دل نشینی میں سوگوار اب بھی موجود تھی، اگرچہ اُس کے سراپے کو تجاوزات اور کھوکھوں نے مسخ کر دیا تھا، میں نے اُس وکٹورین طرز کی بوسیدہ کھڑکی کی نشاندہی آسانی سے کر لی جس کے اندر وہ کلاس روم تھا جہاں نہایت کالی کلوٹی عیسائی ٹیچرز اور ایک دو گوریاں برطانوی ہمیں پڑھاتی تھیں، ہمیں انعام کے طور پر رنگ رنگ کے چاک دیتی تھیں اور ہم ان چاکوں سے اپنے گھروں کی دیواروں کو رنگین کرتے تھے اور امی جان سے جھڑکیاں کھاتے تھے تب میں آگاہ نہ تھا کہ رنگ محل مشن ہائی سکول کے عین سامنے محمود غزنوی کے غلام اور محبوب ایاز کا مزار ہے.. ایک ہی صف میں کھڑے ہونے والے ایاز کا مرقد ہے.. جس نے سلطان محمود غزنوی کے دربار میں سب سے سربلند مقام حاصل کیا، اُس کا چہیتا ہوا اور

وہ پھر بھی اپنی اوقات یاد رکھنے کی خاطر ہر شب وہ صندوق کھول کر دیکھتا تھا جس میں اُس کے غلامی اور گڈریا پن کے کُھر درے، پیوند زدہ لبادے محفوظ تھے..

''جامع مسجد حضرت احمد ایاز''

ایاز ایک مرتبہ پھر غلام ہو چکا تھا، وہ ایک شش جہات مختصر عمارت میں قید ہو چکا تھا اور اُس کا دروازہ مقفل تھا..

مقبرے کے داخلے پر سنگ مرمر میں نقش ایاز کی حیات اور کارناموں کے قصے ہیں جو بہت طویل ہیں..

''مقبرہ ایاز کس جگہ ہے؟''

لاہور میں رنگ محل چوک کے قریب جو مزار اور مقبرہ ہے، یہ مزار اور مقبرہ محمود غزنوی کے ایاز کا نہیں ہے لیکن یہ بات درست نہ ہے کیونکہ ایاز کے مزار اور مقبرہ کے گرد و پیش اور جگہ کی نشاندہی کرتے ہوئے مورخین لکھتے ہیں..کہ

(الف) سلطان محمود کے ایاز کا مقبرہ لاہور میں ہے اور مزار کے گرد و پیش گلی ''ھنکناں'' اور کوچہ ''ڈھونا'' ہے..

(ب) ایاز کے مقبرہ کے ساتھ ایک وسیع باغ تھا جس کا کچھ وجود ''سہ حاکمانِ لاہور'' کے زمانہ میں بھی تھا لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جب وہاں سکّے مضروب کرنے کی چند عمارتیں تعمیر کرائیں تو باغ مٹ گیا.. ایاز کی قبر کے قریب نواب سعد اللہ خان نے ''رنگ محل'' تعمیر کیا جو بعد میں مشن ہائی سکول بن گیا..

(یہ معلومات ''نقوش'' کے لاہور نمبر سے اخذ شدہ ہیں..)

سب کے سب غیر ملکی حملہ آوروں نے شہر لاہور کو سخت ناپسند کیا.. بابر اور شیر شاہ سُوری تو اس کے کٹر دشمن تھے کہ دلّی کے تخت پر حملہ آور ہونے کے لیے جو بھی ہندوستان میں داخل ہوتا ہے..وہ لاہور میں قیام کر کے نہ صرف تازہ دم ہوتا ہے بلکہ اس کی گلیوں میں صنعت کردہ دنیا کی بہترین تلواریں، نیزے، تیر اور کمانیں حاصل کر کے اپنے آپ کو مسلح کر کے دلّی پر یلغار کر دیتا ہے..شیر شاہ سُوری نے تو مرتے ہوئے کہا تھا کہ..کاش میں لاہور کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دیتا..محمود غزنوی بھی شدید لاہور شکن تھا..اس نے پورے شہر کی بیشتر آبادی کو نہ صرف قتل کر دیا بلکہ پورے شہر کو ملیامیٹ کر دیا..جاتے ہوئے اُس نے ایاز کو اس شہر کے کھنڈروں پر حاکم کر دیا، اسے لاہور کا گورنر بنا دیا..شاید وہ خود ایک غلام ہونے کے کرب اور اذیت سے آگاہ تھا اس لیے اُس نے ایک غلام کر دیئے گئے شہر کو اپنے دل کے قریب کر لیا اور اس کی از سرِ نو تعمیر نہایت شانداری سے آغاز کر

دیا یہاں تک کہ لاہور ایک مرتبہ پھر برصغیر کے شہروں میں ایک نگینہ ہو گیا، لاہور پھر سے لاہور ہو گیا..

ویسے تاریخ عجب گواہیاں دیتی ہے، لاہور کی تاریخ گواہ ہے کہ اس شہر کو ہمیشہ برباد اور تاراج افغانوں نے کیا.. وہ غزنوی ہوں یا ابدالی.. انہوں نے ہمیشہ اس کی قدامت کو مسمار کیا.. جدید زمانوں میں بھی افغانوں نے ہمیشہ ہندوستان کو گلے لگائے رکھا.. ہم پاکستانی، افغانستان میں ہمیشہ شُودھر ہی رہے.. یہاں تک کہ ہم پاکستانیوں کے لیے دریائے کابل کے پار صرف دو ہوٹل مخصوص کر دیئے گئے اور ارد گرد کہیں اور قیام کرتے تو گرفتار کر کے پُل چرخی کے عقوبت خانے میں ڈال دیئے جاتے.. میں نے ''خانہ بدوش'' میں قندھار کی اُس شب کو بیان کیا ہے جب ایک افغان جاسوس نے میرا پیچھا کیا اور اُس شب میں گرفتار ہو جاتا اگر میں ایک داستان گو نہ ہوتا اور ہم ہمیشہ افغانیوں پر نچھاور ہوتے آئے ہیں، یہاں تک کہ اُن کے امریکی جہاد میں شامل ہو کر ابھی تک اس کی ثمرات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں.. کلاشنکوف کلچر، ہیروئن، دہشت گردی اور سینکڑوں بچوں کے قتل.. ماشاءاللہ.. امیر المومنین کے حکم کے تابع، اور ہم اُس ایک آنکھ والے شخص کی موت پر آنسو بہاتے تھے اُس کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کرتے ہیں..

افغانیوں کا کردار اب بھی نہیں بدلا.. وہ شہر لاہور پر قابض ہو چکے ہیں.. اس کے کوچہ و بازار میں پنجابی کم اور پشتو زیادہ سنائی دیتی ہے، ہم آخر مُردہ مینڈک ایسی آنکھوں والے مردِ حق کو کتنی دعائیں دے سکتے ہیں.. بہر طور ایاز ایک ایسا افغان یا ترک تھا جس نے شہر لاہور سے الفت کی اور شاندار در و دیوار، حویلیاں اور قصر تعمیر کیے..

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز..



''بلاقی شاہ کی حویلی، آدھا لاہور اُس کا مقروض تھا''

سُوہا بازار.. سُرخ بازار..
شاہ حسین کے سرخ لبادے..
پانی والا تالاب.. گمٹی بازار..

اور پھر.. ایک گلی کی بھیڑ بھاڑ میں بمشکل راہ بناتے ہیں تو وہاں بلاقی شاہ براجمان ہے..

جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نصف شہر لاہور اُس کے رہن میں تھا، اُس کے قرضوں میں جکڑا ہوا تھا، اور یہ بلاقی شاہ تھا جس نے 1947ء میں چیلنج کیا تھا کہ اگر کوئی شخص شاہ عالمی کے حصار میں داخل ہو کر ہندوؤں کے اس قلعے میں آگ لگا دے تو وہ اُس شخص کے ساتھ اپنی بیٹی بیاہ دے گا... کوئی بھی شخص اور وہ بھی بلاقی شاہ ایسا بلا کا ثروت مند اور زیرک شخص اپنی بیٹی کو یوں داؤ پر نہیں لگا دیتا جب تک کہ اُسے سو فیصد یقین نہ ہو کہ یہ شرط کوئی نہیں پوری کر سکتا.. لاہور شہر کے درمیان میں شاہ عالمی ایک ایسے قلعے کی مانند موجود تھا جسے تسخیر کرنا ممکن نہ تھا.. چاروں اور رکاوٹیں، مقفل آہنی پھاٹک اور مضبوط سلاخوں والے دروازے جن کے اندر لاہور کے متمول ترین ہندو اپنی حویلیوں اور شاندار رہائش گاہوں میں اپنے تئیں محفوظ تھے، انہیں یقین تھا کہ لاہور میں ہندوؤں اور سکھوں کی کثرت ہے اس لیے یہ ہندوستان کا حصہ بنے گا.. کہا جاتا ہے کہ لاہور کو اس کی شہری آبادی کی بنیاد پر نہیں ضلعی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے پاکستان میں اس لیے بھی شامل کیا گیا کہ اس نوزائیدہ مملکت کے پاس کوئی تو کام کا شہر ہو.. کوئی تو ایسا بڑا شہر ہو جو اس ملک کی پہچان بن سکے.. کوئٹہ، حیدرآباد، پشاور وغیرہ اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے، کراچی محض ایک ساحلی بستی تھی، مچھیروں اور پارسیوں کی مختصر آبادی تھی.. ہم تو گورداس پور وغیرہ کو روتے ہیں لیکن وہ لوگ تو لاہور کی یاد میں بین کرتے ہیں..

چند نوجوان لاہور کے گرد مغلوں کے دور میں تعمیر کردہ گندے نالے یا بدرو کی ایک نالی یا سوراخ کے راستے شاہ عالمی میں داخل ہوئے اور اُسے آگ لگا دی.. مجھے نہیں معلوم کہ اُن مسلمان نوجوانوں میں سے کسی ایک نے اس ''کارنامے'' پر بلاقی شاہ کی بیٹی کو انعام کے طور پر طلب کیا یا نہیں..

بلاقی شاہ کا شاندار مینشن، حویلی یا شاہانہ گھر ایک مرصع شاہکار تھا جسے سیمنٹ کے بیل بوٹوں، گُل دستوں، محراب دار بالکونیوں، آہنی جنگلوں کی خوشنمائی سے سجایا گیا تھا.. اُس کی بالکونیوں کو سہارا دیتے ستون نزاکت اور حسن کی بانہیں تھے.. داخلے کے دروازے کی آرائش تو دل میں اتر اتر جاتی تھی..

بلاقی شاہ جو بھی تھا، جیسا بھی تھا اس کے ذوق جمال اور نفاست کی داد نہ دینے والے محض بیوقوف ہو سکتے ہیں، اور وہاں آسانی سے موازنہ ہو سکتا تھا، بلاقی شاہ کے مینشن کے عین پہلو میں ایک بھدا اور بدہیئت سیمنٹ اور اینٹوں کا انبار ایک پلازہ زیر تعمیر تھا.. فرق صاف ظاہر تھا..

صدر دروازے کا آہنی گیٹ مقفل تھا، اس میں دخل انداز مکین کوئی اور راستہ استعمال کرتے تھے اور دروازے کے گرد آرائشوں کے جو جمگھٹے ابھی تک نظر نواز ہوتے تھے، ان میں ابھرے ہوئے حروف میں اس مینشن کی تعمیر کی تاریخ درج تھی..

17 APRIL 1929

صدر دروازے سے اوپر بالکونیوں کے جھرمٹ کی پیشانی پر ''بلاقی مَل.. بینکرز..'' بمشکل پڑھا جاتا تھا..



''ہیرا منڈی کا بابا مجنوں اور نوگزے کی قبر کا نمک''

تنویر خواجہ کو بھنک پڑی تھی کہ اس بازار میں لاہور کی بہترین باقر خانیاں تیار کی جاتی ہیں اور وہ بلاقی شاہ سے بے نیاز باقر خانی شاہ ہو گیا، ان کی تلاش میں چلا گیا، بٹ جو کسی بلّی سے لاڈ کر رہا تھا وہ بھی خوراک کی شہوت میں اس کے ہمراہ ہو گیا، دونوں واپس آئے تو باقر خانیوں سے لدے پھندے تھے.. سعید بٹ باقر خانیوں پر ایک بھوکے اونٹ کی مانند منہ مار رہا تھا اور بار بار ایک اونٹ کی مانند ہی اپنا پورا جبڑا کھول کر یوں دانت نکالتا تھا کہ باقر خانیاں ایک ملغوبے کی صورت اُس کے دہن میں گھلتی حلق میں اترتی جاتی تھیں..اور ان کے کچھ بھرے بھرے ذرّے جب وہ بات کرتا تو پُھو پُھو اُس کے منہ سے نکل کر مخاطب کے چہرے پر چھروں کی طرح برستے.تب ہم سب یکدم سعید بٹ کو دیکھ کر اپنی بھوک سے آگاہ ہو گئے کہ ہم تو سویر سے بھوکے پیٹ لاہور شہر کے آثار اور باقیات کا بلاقی شاہ کا مشاہدہ کرنے میں اتنے مگن تھے کہ یہ دھیان نہ کر سکے کہ.. پیٹ نہ پیّاں روٹیاں تے سبھے گلّاں کھوٹیاں..یعنی اگر پیٹ میں روٹیاں نہ جائیں تو سبھی باتیں کھوٹی لگتی ہیں چنانچہ ہم کھوٹی باتوں کے سکّے کھرے کرنے کے لیے روٹیوں یعنی حلوہ پُوڑی ناشتے کے لیے لپکے اور کہاں لپک لپک گئے.. ہیرا منڈی کی ایک دودھ دہی کی پرانی دکان پر جا براجمان ہوئے.. بالائی والی دہی کا گلاس دہن میں اترا تو ہر شے کھری نظر آنے لگی..

اور وہاں ایک قدیم چرچ کی سرخ دیوار کے قریب بابا مجنوں سے ملاقات ہو گئی..اوئے تارڑ صاحب.. ستّے خیراں، بسم اللہ..آپ کدھر اس گناہوں کی بستی میں آ گئے ہو..

بابا مجنوں کی جھاڑ جھنکار سفید داڑھی اور سر کے سادھو بال اپنی جگہ لیکن اُس کے سر میں سے لٹکتے ہوئے جو بھورے بٹے ہوئے رسّے تھے جو تقریباً اس کے پاؤں تک بھورے سانپوں کی مانند آتے تھے وہ اصلی تو نہ ہو سکتے تھے، بابا مجنوں لوگوں کو فریب دینے کے لیے وِگ نما کوئی لٹیں اپنے سر کے بالوں میں باندھ کر لٹکائے ہوئے تھا..

جب میں نے اُس کی جٹا دھاری کے بارے میں شک کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگا ''بادشاہ جی..ذرا اس لٹ کو پکڑ کر کھینچو..''

اور یہ وہ لٹ نہ تھی کہ لٹ اُلجھی، سلجھا جا رہے بالم.. بلکہ بالا مجنوں کی رسی نما لٹ تھی، میں نے اُس کی متعدد دلٹوں میں سے ایک کو گرفت میں لے کر ذرا احتیاط سے کھینچا تو واقعی وہ ایک وِگ نہ تھی، بابا مجنوں کے سر کے سفید بالوں میں سے جنم لینے والی جینوئن لٹ تھی..

نیلے چوغے میں ملبوس، گلے میں عجب کیٹھوں کے تعویذ لٹکائے بابا مجنوں ایک ایسا پیار کرنے کے لائق کردار تھا جو صرف لاہور میں بلکہ صرف لاہور کی ہیرا منڈی میں ہی دستیاب ہو سکتا تھا..وہ مجھے اس لیے بھی بہت بھلا لگا کہ اُس نے اپنی درویشی کا کچھ پرچار نہ کیا، مجھے متاثر کرنے کی خاطر مست ملنگ ہونے کا ڈھونگ نہ رچایا ''حق حق'' کا کوئی نعرہ نہ لگایا..

میں نے اُس مجنوں سے پوچھا بھی کہ بابا آپ درویش کیوں ہو گئے، یہ ملنگ روپ کیوں دھار لیا تو اُس نے کہا ''تارڑ..سوہنے جی..بس میں اسی روپ میں زندگی گذارنا چاہتا ہوں..درویشی اور ملنگی کے لائق میں کہاں..کچھ چائے شائے پیش کروں آپ میرے علاقے میں آئے ہو..''

اس دوران نسیم نے مجنوں کی کچھ تصویریں اتاریں اور اسے ایک نوٹ کا نذرانہ پیش کیا تو وہ مسکرانے لگا ''نہیں جی،لوگ کیا کہیں گے مجنوں پیسے لے کر تصویریں اترواتا ہے..''

اس پر نسیم نے کہا کہ لوگوں کی ماں بہن کی ایسی تیسی..

تو مجنوں نے خوش ہو کر کہا ''پھر ٹھیک ہے،اور نوٹ قبول کر لیا..''

نوگزے کی قبر کے باہر ایک پیالے میں نمک کی سفید ی ڈھیر تھی..

راہگذر گذرتے، نمک کی ایک چٹکی بھر کر چکھتے اور اپنی راہ پر چل دیتے کہ اس نمک میں کچھ ایسی تاثیر بتائی جاتی ہے کہ جو کوئی اسے چکھتا ہے،دل کی مراد پاتا ہے..

میں نے اسے نہ چکھا..کہ میرے دل میں کوئی مراد،کوئی خواہش نہ تھی کہ سب مرادیں اور خواہشیں اللہ تعالیٰ نے میری اوقات سے بڑھ کر پوری کر دی تھیں..

ہاں اگر عمر کی نقدی ختم ہونے کو نہ ہوتی، کچھ گنجائش کچھ برسوں کی ہوتی تو شاید میں بامراد ہونے کی خاطر اس نمک کو چکھ لیتا، پر اب بہت دیر ہو گئی تھی..

ے نمک عشق کا، تیرے عشق کا..



''جہاں گورنمنٹ کالج قائم ہوا..حویلی دھیان سنگھ، آؤٹ ہے''

''انڈسٹریل ہوم، حویلی دھیان سنگھ، سید مٹھا بازار، لاہور''

ایک تو شیرانوالہ گیٹ کے اندر وہ پرشکوہ، وسیع اور پرتمکنت دروازوں اور گذرگاہوں، حماموں اور کرشنا اور اُس کی گوپیوں کی نیلی تصویروں والی لاہور کی سب سے وسیع اور سکھ عہد کی شان وشوکت والی حویلی تھی جہاں کبھی بسنت کے ہنگامے ہوتے تھے اور جہاں اب ایک گرلز کالج قائم ہو چکا تھا اور میں اس حویلی دھیان نگھ میں کبھی ایک گیسٹ آف آنر ہو چکا تھا..لیکن مجھے کچھ علم نہ تھا کہ اس کے سوا بھی دھیان سنگھ نے لاہور کے اندرون میں ایک اور حویلی تعمیر کی تھی..سرفراز نے مجھے آگاہ کیا..

اس حویلی کا صدر دروازہ چھوٹی اینٹوں سے تعمیر کردہ محراب دار دروازہ جس کی چھت کی کڑیاں زمانوں کی گذران سے سیاہ ہو رہی ہیں تو دروازے میں داخل ہوں تو ایک قدیم ویرانی کا منظر آپ کو گئے زمانوں کے ایک ہول میں لے جاتا ہے..

آپ کیسے تصور کر سکتے ہیں کہ شہر لاہور کے اندرون میں، آپ ابھی ابھی پچھلے لمحے، بھیڑ بھاڑ میں گلیوں میں چنگھاڑتے موٹرسائیکلوں سے بمشکل بچتے ایک شور میں تھے اور ابھی اگلے لمحے، ایک صحن اجاڑ ہے، خاموشی ہے جس میں کسی قدیم پیپل کے پتے گرتے ہیں، فرش پر سرسراتے ہیں، دائیں جانب ایک زرد رنگت کی شکستگی سے دوچار عمارت ہے اور جب اُس عمارت کی بوسیدگی میں جانے کب سے پیوستہ ایک مقفل دروازے کی درزوں پر آنکھ رکھ کر اندر دیکھتے ہیں تو اندر حویلی دھیان سنگھ کے مسمار ہوتے محرابی دروازے اور دالان ہیں..اور اُن محرابوں، دالانوں اور راہداریوں میں شکستہ اینٹیں اور کچھ پھول اور بوٹے جو محرابوں سے گر پڑے ہیں، دکھائی دیتے ہیں..اسی حویلی دھیان سنگھ میں گورنمنٹ کالج کا پہلا قیام ہوا تھا..

لاہور کے سب تعلیمی اداروں کے قیام سوائے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے، سب کے سب سکھوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کی مہربانیوں سے ہیں..گورنمنٹ کالج، ایف سی کالج، ایچی سن کالج، سینٹ انتھونی، کیتھڈرل سکول، سینٹ میری، کنیئرڈ کالج، دیال سنگھ کالج، کوئین میری سکول....سکول..اور یہ فہرست بہت طویل ہے، کنگ ایڈورڈ کالج پر بھی اختتام کو کہاں پہنچتی ہے، ویسے برسبیل تذکرہ..صرف تعلیمی نہیں سب

کے سب طبی ادارے بھی لاہور کے سب کے سب غیر مسلموں کی عنایت ہیں.. میو ہسپتال جو اُن زمانوں میں برصغیر کا سب سے وسیع اور کولونیئل عہد کے طرزِ تعمیر کا نمائندہ شاہکار گردانا گیا، لیڈی ویلنگڈن ہسپتال، گلاب دیوی ہسپتال، گنگارام ہسپتال.. وغیرہ

چونکہ میں بھی ایک مختصر مدت کے لیے گورنمنٹ کالج میں علم کا طالب رہا تھا اس لیے میں نے اُس اجاڑ دھیان سنگھ کی حویلی میں اپنی مادرِ علمی کی آغوش کی کچھ حدت محسوس کی..

''آؤٹ ہے..'' ایک بچہ چلایا..

حویلی کے سامنے جو صحن ویران تھا اُس میں کچھ بچے کرکٹ کھیل رہے تھے..

حویلی دھیان سنگھ بہر طور ''آؤٹ'' ہے..



''سیّد مِٹھا، خوارزم کا شیریں زبان ولی اللہ''

سید مٹھا بازار..

یہ کون سید تھا جو بہت میٹھا ہوا کرتا تھا؟

حویلی دھیان سنگھ کے اجاڑ پن سے ہم نکلے تو سیدھے سید مِٹھا بازار میں آ نکلے..

میں نے ایک ناول ''ڈاکیا اور جولاہا'' میں ایک ایسے، جو کبھی کمیونسٹ تھا اور اب ایک درگاہ کا پیر بن بیٹھا ہے، کردار کو تخلیق کیا ہے جو اپنے مُریدوں سے صرف مٹھائی کا تقاضا کرتا ہے اور تب میرے ذہن میں یہی سید مٹھا بزرگ اور اُس کے نام کا لاہوری بازار تھا..

''یہ مزار، مزاراتِ اندرونی شہر لاہور میں بہت مشہور ہے.. یہ مزار سرِ بازار ایک مسقّف حجرے کے اندر واقع ہے جو قدیم زمانوں کا ہے، مختصر حال اس بزرگ کا کتابِ ''حدیقۃ الاولیا'' میں اس طرح لکھا ہوا ہے:

''سیّد جمال الدین، اُن کا باپ خاص خوارزم کا رہنے والا تھا.. جب چنگیز خاں کے تاتاری مغلوں نے خوارزم ختم کیا، لاکھوں مسلمان قتل ہوئے، اور شہر تاراج ہو گئے تو جمال الدین وہاں سے نکل کر غزنی میں آ گیا، اور پھر ہند کو آ گیا، اس وقت اُس کا بیٹا سید مِٹھا جس کا اصل نام معین الدین تھا، باپ کے ہمراہ تھا۔ اُس نے اپنی شیریں کلامی سے سید مِٹھا خطاب پایا کیونکہ مِٹھا پنجابی زبان میں شیریں کو کہتے ہیں.. 661 ہجری میں وہ مر گیا اور اسی جگہ دفن ہوا جہاں اُس کا مزار ہے..''

میں نے سید مٹھا کے مزار کے اندر جھانکا.. کہ خوارزم سے آنے والا، لاہور میں قیام کرنے والا یہ جمال الدین کا بیٹا معین الدین آخر کون تھا..

''کر بھلا سو ہو بھلا..''

سیدِ مٹھا ولی باصفا آنکہ شیریں بود نزد خاص و عام
ہست سالِ ارتحال آنجناب صاحب نعمت دگر شیریں کلام..

یہ ایک اور دن تھا..

محض ایک دن تھا..

پر ہم نے کیا کیا نہ دیکھا..اور جو دیکھا اُسے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے..

ٹھیکیدار سلطان کی سرائے کے شکستہ آثار

City A Lahore, along side His high Road....

Mohammad Sultan the honourable company,

contractor..

گوردوارہ شہید گنج..

بابو ہوٹل..میرے ابا جی کا لاہور میں پہلا ٹھکانہ..

مُردوں کی گھاٹی..

سیتلا مندر..جہاں دُرگا دیوی کے درشن نہ ہوئے..

بلاقی شاہ کے شاہکار گھر کے ماتھے پر درج تھا..

''بلاقی مَل اینڈ سنز، بینکرز، لاہور''

نوگزے کی قبر..اگرچہ وہ قبر صرف پانچ گز سے بھی کم تھی اگرچہ وہاں نمک عشق کا تھا..

ہم نے کیا کیا نہ دیکھا..کیا کیا اپنے لاہور کا نمک نہ چکھا..

یہ ایک اور دن تھا..

محض ایک دن تھا..

میرے ہونٹوں پر سید مٹھا کی شیرینی کی مٹھاس بھی تھی اور نوگزے کی قبر کے نمک عشق کی نمکینی بھی تھی..

یہ کرشمے شہر لاہور کے ہیں..

شیرینی اور نمکینی..

یہ ایک اور دن تھا..

محض ایک دن تھا..

اِک دن رہیں لاہور میں..



''اِک دن رہیں لاہور میں''

''چوک چکلا، جہاں امراؤ جان ادائیں بیٹھتی تھیں''

میں لاہور کی اُس دھندلی دسمبر کی سویر میں اپنا شکار آپ کرتا تھا، خود ہی شکاری تھا اور خود ہی شکار تھا، مرزا بھی آپ تھا اور صاحباں بھی آپ تھا کہ میں اپنے ناول ''راکھ'' کے آغاز میں سانس لیتا تھا..

''چار چیزیں ہیں جو ہر دسمبر میں مجھے بلاتی ہیں..ان میں سے ایک شکار ہے، قادر آباد کے آس پاس اور وادیٔ سوات کا ایک سلیٹی منظر ہے، اور کامران کی بارہ دری سے لگ کر بہتا ہوا دریائے راوی ہے..اور چوک چکلہ ہے..''

اور یہ مہینہ بھی دسمبر کا تھا جب بڑھتی جاتی دھند تھی اور اُس کے پیچھے ایک شہر تھا. شہر لاہور تھا..

میں لوہاری دروازے کے بلند در و بام پر گیا، وہاں سے اندرون شہر کا نظارہ کیا اور پھر بہت سنبھلتا ہوا وہاں سے اترا تو..اُس سویر کی دھندلاہٹ میں، جب کہ آس پاس لاہور کے باسی جاگتے تھے اور کیسے کیسے پکوان اُن کے ناشتے کے لیے گرم مہک ہوتے تھے جب میں چوک چکلا میں آ گیا، بے شک یہ نام شرعی طبع نازک کو ناگوار لگتا ہے اور اسے کوئی شرعی نام عطا کر دیا گیا ہے اور اس کے باوجود آپ تاریخ کو مسخ تو کر سکتے ہیں، تبدیل نہیں کر سکتے..تو یہ چوک چکلا ہی رہے گا..

جیسے آپ لاہور کے کرشن نگر کو اسلام پورہ کر دیں..لائل پور کو فیصل آباد بنا دیں..چوہڑکانہ کو فاروق آباد کا نام عطا کر دیں، لاہور کی سڑکوں اور شاہراہوں کے نام کچھ بھی کر دیں، شاہراہ عبدالمجید بن بادس یا شاہراہ قائداعظم کر دیں، کچھ بھی کر دیں آپ تاریخ کو بدل نہیں سکتے..آپ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی چہیتی داشتہ مسلمان موراں کی تعمیر کردہ مسجد کو ''کنجری دی مسجد'' کی بجائے ''مائی موراں کی مسجد'' کہہ دیجیے تو بھی تاریخ اپنا راستہ نہیں بدلے گی..

چوک چکلہ..چوک چکلہ ہی رہے گا..

جہاں کسی زمانے میں ہمارے ہاں کی امراؤ جان ادائیں کوٹھوں پر بیٹھتی تھیں..لوہاری دروازے

کے اندرون میں.. حلوہ پوڑی، مٹھائیوں اور دودھ دہی کی دکانوں کے عین اوپر ایک جھروکا، نہایت بدزیب سیمنٹ کی عمارتوں میں گھرا ہوا، اب بھی دکھائی دیتا ہے اور اس شکل کے دو تین اور جھروکے بھی بازار میں جھانکتے ہیں جہاں.. اُن زمانوں میں خوش رُو امراؤ جان ادائیں، بن سنور کر بیٹھتی تھیں.. ایسی بنی سنوری کہ علامہ اقبال بھی بھاٹی گیٹ کے اپنے مکان یا حجرے میں سے نکلتے تو اُنہیں دیکھ کر ٹھٹک جاتے..

ویسے وہ زمانے کیسے ہوں گے..

منشی کنہیالال، اردو، عربی اور فارسی کا جیّد عالم، جس نے قصہ ہیر رانجھا فارسی میں منظوم کیا.. شہر لاہور کی کُنجی ہے.. اُس کا معجزہ آثار تحقیقی اور تاریخی کام ہر اُس دروازے پر کھلتا ہے جس میں پوشیدہ جہان لاہور کے دروازے، مدارس، چھاپہ خانے، خاندان، شعراء، اطباء، طوائفیں، محلے، حویلیاں، مساجد، مزار، باغ، شوالے.. اِن سب پر کھلتے چلے جاتے ہیں.. سر گنگا رام کے بعد اگر لاہور کا کوئی محسن ہے تو وہ منشی کنہیالال ہے جس نے نہایت عقیدت سے نعتیں بھی شعر کیں تو وہ لاہور کی طوائفوں کے بارے میں رقم کرتا ہے..

''سکھوں کے راج میں کیسی طوائف لوگوں کی لاہور میں وہ کثرت تھی کہ اور کسی شہر میں ایسی کثرت نہ تھی، کشمیر و پہاڑی علاقوں سے بردہ فروش خوبصورت لڑکیاں لاکر کسبیوں کے پاس فروخت کر ڈالتے اور وہ انہیں گانا ناچنا بھی سکھاتے اور پیشہ بھی کرواتے تھے..''

وہ رنجیت سنگھ کی سب سے دل پسند طوائف موراں کے بارے میں یوں بیان کرتا ہے..

''بڑا خاندان موراں طوائف کا مشہور تھا کہ ان پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی کمال مہربانی تھی.. روپے پیسے پر بھی اُس کی ضرب لگتی تھی.. موراں شاہی پیسے اور روپے اب تک موجود ہیں..''

موراں غالباً برصغیر کی وہ واحد عورت تھی جس کے نام کے سکّے، پیسے اور روپے لاہور ٹکسال میں ڈھالے گئے..

موراں مرگئی تو رنجیت سنگھ نے طوائف گُل بیگم پر مہربانی کی، باقاعدہ شادی کی اور ہندوؤں کے رواج کے مطابق پھیرے لیے.. بارات بڑے تزک واحتشام کے ساتھ لاہور سے امرتسر گئی اور گُل بیگم مہاراجہ کی رانی بن کر شاہی محل میں داخل ہوئی..

وہ زمانے ایسے تھے..



"کیا وہاں مہدی حسن کی ساس رقص کرتی تھی؟"

یہ ایک اور دن تھا..

اِک دن رہیں بسنت میں..

اِک دن رہیں لاہور میں..

اور دِن بھی دسمبر کے..

جن دنوں چار مُرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا..

میں ایک مرتبہ پھر ایک اتوار کی دُھندلی سویر میں ماڈل ٹاؤن پارک کے صبح کی سیر کے ساتھیوں کو ورغلا کر اندرونِ شہر کی سیر پر آمادہ کر کے لے آیا تھا.. اگرچہ اُنہیں بھی اپنے وطن اور شہر کی قدامت اور ثقافت کی افیون لگ چکی تھی اور میں انہیں کہاں، وہ مجھے ورغلاتے تھے کہ تارڑ صاحب.. آئے موسم رنگیلے سردیلے.. ہمیں کہیں لے چلیں...

ہماری کاریں اُس دھندلی صبح میں لوہاری دروازے کے باہر پھول والوں کی قربت میں پارک ہونے لگیں اور وہاں سُریلا جاوید، ٹور ازم شعبے میں ایک باقاعدہ افسر، ہماری راہنمائی کے لیے جانے کب سے موجود تھا اور ٹھٹھرتا تھا کہ ان حضرات کو سردی بھی تو بہت لگتی ہے..

اگر نہ کرنی ہو تو دندان ساز اگر عزت کرنی ہو تو عزت مآب ڈینٹل سرجن صاحب خوش مُکھ اور ہنس مکھ ڈاکٹر نسیم..

کلف زدہ شلوار قمیص میں اکڑا، بلوری آنکھوں والا شریف گُجر ملک سرفراز.. فلسفی قاضی جاوید، کرنل عامر، سعید بٹ، خواجہ تنویر، فہد آف راکاپوشی اور حیرت ناک طور پر عادل جس کا کہنا تھا کہ اگر انسان کو کاریں، لینڈ کروزرز وغیرہ کی سہولت میسر ہو تو وہ پاگل ہوگا اگر پیدل چلے، اُس کی زندگی جہازوں اور مرسیڈس کاروں میں گذرتی ہے اور وہ اُن سے باہر آکر چلنا ایک گناہ کبیرہ سمجھتا ہے..

کاروں سے اترے ہیں تو لوہاری کے باہر جو فٹ پاتھ ہیں اُن پر ناشتے کے ساز و سامان اتنے سجے تھے کہ تنویر خواجہ بغاوت پر آمادہ ہو گیا "تارڑ صاحب، کیا خیال ہے کچھ پیٹ پُوجا نہ کر لی جائے، بھوکے پیٹ

ثقافت اور تاریخ ہضم نہیں ہو سکتی، ذرا ملاحظہ تو کیجیے، سری پائے اور بونگ اور نہاری اپنی جگہ لیکن اوجھڑی کے شوربے کا اور مغز شوربے کا اپنا مقام ہے تو کیا خیال ہے..''

''تنویر، اگر ہم یہاں ناشتہ کرنے کے لیے فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے تو بیٹھ گئے..ہم ناشتہ کریں گے پر شہر لاہور اندر کچھ کھڑکیوں، دروازوں، کڑیوں، حویلیوں اور مندروں وغیرہ کو دیکھ کر، ملک سرفراز ہم ناشتہ کہاں کریں گے..''

''ہیرا منڈی کی گندی گلی جسے ٹبی گلی بھی کہتے ہیں جہاں اب بھی پیشہ ہوتا ہے وہاں سے نکل کر شہابے پوڑی والے کی دکان پر..''

''سر جی اس گندی گلی میں کیا ہوتا ہے؟'' فہد نے سوال کیا..

''وہاں گندے بچے نہیں جاتے، ہم جیسے شریف بزرگ اگرچہ جاتے ہیں..''

چوک چکلہ ایک دوراہا تھا..دائیں جانب چلتے جائیے تو اُس سرخ حویلی کے آثار اب تک موجود ہیں جہاں میرے ناول ''راکھ'' کی ایک موراں جوتوں میں ایڑھیاں پیوست کر کے شب و روز کا پیٹ بھرتی تھی لیکن ہمیں بائیں جانب جانا تھا..

بہت مدت ہوئی جب میں ایک قدیم مکان کی سیڑھیاں چڑھتا ایک ایسے کمرے میں داخل ہوا تھا جہاں کاریگر حضرات جوتوں کو سریش لگا کر جوڑتے تھے اور مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ وہ کوٹھا ہے جہاں مہدی حسن کی ماں مجرا کیا کرتی تھی..

ہم حاجی نہاری والے کی تاریخی دکان سے ذرا آگے گئے اور ایک مسمار ہوتے دروازے کی چوکھٹ کے پار گئے تو جاوید کہنے لگا ''سر..یہاں مہدی حسن کی ساس رقص کیا کرتی تھی..''

''جاوید..میری سمجھ سے باہر ہے کہ آخر مہدی حسن کی والدہ یا ساس راجستھان سے یہاں لاہور میں کیسے آ گئیں..''

''سر جی، روایت تو یہی ہے..''

روایتوں پر دھیان دینا دانش مندی نہیں ہے کہ جب کوئی ایک شخص، چاہے وہ شاعر ہو یا گلوکار کُل جہان میں شہرت پا جاتا ہے تو لوگ اُس کی نسبت طرح طرح کے قصوں سے جوڑنے لگتے ہیں..اگرچہ کہیں نہ کہیں کوئی حقیقت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے، کوئی نہ کوئی پردہ پرداری ہوتی ہے تو اُس پردے کے پیچھے کیا ہے، روایت ہے، حقیقت ہے، کیا ہے، مہدی حسن کی ماں ہے یا ساس ہے، کیا ہے؟

ویسے ہم سب بنیادی طور پر غیر ملکی تھے، یہ صرف ملک سرفراز تھا جو جدی پُشتی ایک خالص لاہوریا تھا، یا پھر ہمارے گروپ میں شامل ہونے والا کرنل عامر تھا جس کا دعویٰ تھا کہ اندرون شہر اُس کے بزرگوں کی

ایک شاندار حویلی ہوا کرتی تھی اور آج وہ اس خواہش میں ہمارے ساتھ آیا تھا کہ شاید اُس حویلی کے کچھ آثار ابھی تک موجود ہوں..

ملک سرفراز اپنی کلف بشدہ شلوار قمیص میں اکڑا چلا جاتا تھا..

قریشی صاحب ایک نپولین کی مانند چلتے جاتے تھے..

"مندر ٹھاکردوارہ نہال چند کی چوکھٹ کے پار"

جاوید ایک پروفیشنل گائڈ کی مانند مسلسل خوش زبانی کرتا، ہمیں کسی حد تک بے وقوف سمجھتا، باتیں کرتا، ہمیں تاریخ اور ثقافت سے آگاہ کرتا چلا جاتا تھا، اور ہم اُس پر مکمل اعتبار تو نہ کرتے تھے..

اور تب لوہاری بازار میں چلتے ہوئے جاوید نے کہا" تارڑ صاحب.. اگر آپ کن اکھیوں سے دائیں جانب دیکھیں تو وہاں ایک بوسیدہ ہو چکا دروازہ ہے اور اس کے اندر نہال چند کا مندر ہے.. میں بھی آج تک اس کے اندر نہیں گیا کہ اس پر قابض لوگ راستہ روک لیتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ یہ کسی زمانہ میں لاہور کا بلند ترین مندر ہوا کرتا تھا.." اُس دروازے کے برابر میں چاول کا آٹا فروخت کرنے والے ایک دکاندار سفید سفوف نما آٹے کی بوریوں کے سامنے بیٹھے تھے، بہت خوش شکل تھے.. انہوں نے ہمارے گروہ کو دیکھ کر ناگواری اپنے سفید چہرے پر سجالی اور پھر یکدم وہ کھل اٹھے، مسکرانے لگے "بسم اللہ.. بسم اللہ.. تارڑ صاحب، آپ تو بوڑھے ہو گئے ہیں، آپ یہاں کہاں.. ناشتہ کر لیا ہے کہ نہیں.. کم از کم چائے تو پی لیجئے.."

رسمی دست پنجہ لینے کے بعد، کچھ مسکراہٹوں کے تبادلے کے بعد میں نے کہا "شنید ہے کہ اس دروازے کے اندر کوئی مندر ہے.. نہال چند مندر کے نام کا.."

وہ چالوں کے سفید آٹے سے اٹے خوش رو حضرت کہنے لگے "تارڑ صاحب، نہال چند، منشی کنہیا لال کا ایک ٹھیکیدار ہوا کرتا تھا، اس نے نہ صرف ایک مندر تعمیر کیا بلکہ اس کے قریب ایک مسجد بھی بنوائی.. کہتے ہیں کہ تقسیم کے موقع پر ہندو لوگ اِس مندر کو سجا سجایا چھوڑ گئے، اپنے ساتھ کچھ نہ لے کر گئے کہ انہیں یقین تھا کہ یہ چار دن کی جدائی تو کوئی بات نہیں، وہ پھر واپس آ جائیں گے.."

"ہم اندر جا سکتے ہیں؟"

"آپ تو سرمایہ ہو تارڑ صاحب.. بسم اللہ.. بسم اللہ.."

وہ چوبی بھاری دروازہ، بہت زمانوں کے بوجھ تلے دبا کراہ رہا تھا کہ جب ہم نے اُس کے کواڑ دھکیلے تو وہ چرچرائے جیسے سسکتے ہوں، فریاد کرتے ہوں.. چوکھٹ ہمیشہ اُس کے اندر جو عمارت پوشیدہ ہوتی ہے

اُس کی قدامت کی گواہی دیتی ہے، صدیوں سے جو لوگ ہزاروں نہیں لاکھوں لوگ اُس کے پار گئے تو اُن کے پاؤں چوکھٹ پر جم کر پھر دوسری جانب اترتے ہیں اور یوں جیسے کسی پتھر پر بہت مدت تک ایک ایک بوند پانی کی گرتی رہے تو اُس سنگ کے سینے میں ایک چھید کر دیتی ہے ایسے ایک چوکھٹ پر بھی جتنے پاؤں پڑتے جائیں وہ بھی ہولے ہولے اُن کی زد میں آ کر گھستی جاتی ہے.. حویلی دینا ناتھ کی ایک چوکھٹ دائیں بائیں اور اوپر سراسر سلامت تھی لیکن نیچے اُس کا جو شہتیر قدموں تلے آتا ہے وہ درمیان میں سے گھِس گھِس کر تقریباً دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور فرش نظر آتا تھا، وہاں سے اتنے لوگ گذر چکے تھے..

مندر ٹھاکر دوارہ لالہ نہال چند کی چوکھٹ بھی درمیان میں سے گھس گئی تھی، جانے کتنے لاکھوں یاتری اس پر پاؤں رکھ کر اِس مندر کے اندر گئے تھے..

اندر ایک کھلی راہداری تھی کاٹھ کباڑ اور بوریوں سے اٹی، اکھڑی ہوئی اینٹیں اور سوکھے ہوئے بے شمار پتے جو جانے کس شجر سے ٹوٹ کر اس مندر کے ماتم میں خزاں رسیدہ ہو کر اڑتے ہوئے یہاں آ کر بچھ گئے، اس سویر کی زرد دھوپ میں ظاہر ہوتی راہداری کے بائیں جانب تو مندر کی قدیم دیوار تھی اور دائیں جانب حیرت انگیز طور پر نشیب میں ایک اجاڑ صحن تھا جس کے شکستہ فرش پر بھی زرد پتے سرسراتے اُسے ڈھانپتے تھے اور سامنے اُس کے ماتھے پر ایک ایسی عمارت کے آثار تھے جو یقیناً اسی مندر کا ایک حصہ تھی اور وہاں نیم سیاہ رنگ کا ایک محرابی دروازہ مقفل تھا اور اُس کی شانداری اور قدیم خوبصورتی لاجواب تھی..دروازے کے دونوں جانب جو ستون نما سہارے تھے اُن پر چُونے کا جو لیپ کیا گیا تھا، وہ امتدادِ زمانہ سے جھڑتا جا رہا تھا اور کسی لاغر بھوک کے مارے.. شخص کی پسلیوں کی مانند چونے کے اترنے سے اُس کے نیچے جو نانک شاہی چھوٹی اینٹیں تعمیر میں استعمال ہوئی تھیں، عیاں ہو رہی تھیں، عمارت کے بدن سے نکلنے والی پسلیاں تھیں..

راہداری کے بائیں جانب جب بغلی دیوار تمام ہوئی، اور وہ دیوار دسمبر کی پہلی دھوپ کی زردی میں تھی تو اُس کے آخر میں ایک محراب نما گھاؤ تھا اور وہ ایک تاریک اندھیرا گھاؤ تھا..ہم اُس کے اندر احتیاط سے گئے..کسی نے میرا بازو تھام لیا..کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، اندر ایک ایسی نابینا تاریکی تھی جو برسوں سے روشن نہ ہوئی تھی، مدتوں ٹھہری رہتی تھی اور گھنی ہوتی گئی تھی اتنی کہ اُس میں دیکھنا تو کجا آگے قدم رکھنا ممکن نہ لگتا تھا، قدم اٹھاتے تو تاریکی سے ٹھوکر لگتی..عاتف نے اپنے کیمرے کی فلیش لائٹ آن کر دی پر وہ بھی تاریکی کے اس پردے کو مکمل طور پر چاک نہ کر سکی..جہاں تک لائٹ سفر کرتی وہاں یا تو کوئی طاقچہ نظر آتا جس میں ایک مدت سے عقیدت کا کوئی دِیا نہ جلا تھا اور یا پھر کچھ نقش و نگار مدھم ہوتے ظاہر ہو کر بجھ جاتے..یہ غالباً مندر کا مرکزی ہال تھا جس کی چھت اور اُس پر نقش خوش نمایاں دھویں سے سیاہ ہو چکی تھیں، شاید اسے جلانے کی کوشش کی گئی تھی، تب ہمیں احساس ہوا کہ چاولوں کے آٹے کی بوریوں، فرش پر بکھری اینٹوں، گندے کپڑوں اور شکستگی

سے دوچار ہوتی چوبی بناوٹوں کے درمیان دو تین لوگ، رضائیوں میں لپٹے سو رہے ہیں..

ہماری آمد پر، قدموں کے کھڑاک سے شاید وہ جاگ گئے..

وہ دکھائی تو نہ دیتے تھے، پر وہ وہاں تھے اور اُن کے بدنوں کی بُو تاریکی میں گھل رہی تھی..

''سوری بھائی جان..'' شاید سرفراز نے کہا ''آپ سو جاؤ.. سو جاؤ.. ہم بس ایک نظر ڈال کر چلے جائیں گے..''

اُن میں سے ایک بڑبڑایا ''کون ہو؟''

''ہم اجازت لے کر آئے ہیں بھائی جان..'' سعید بٹ نے التجا کی ''ویسے اس مندر کو آگ لگادی گئی تھی کہ اس کے در و دیوار سیاہ ہو چکے ہیں..''

''اسے کس نے آگ لگائی ہے.. یہاں تو ہم بھٹیاں جلاتے آگ روشن کرتے ہیں، اُس کا دھواں ہے..''

''سوتے رہیے.. سوری بھائی جان..''

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں تھا..

اس ہال نما عمارت کے ایک کونے میں سے کچھ روشنی اترتی تھی اور وہاں کچھ ٹوٹ پھوٹ کا شکار سیڑھیاں تھیں، فہد پر تجسس ہو کر انہیں پھلانگتا ہوا اوپر چلا گیا..

میرا خیال تھا کہ بس یہی نہال چند کے مندر کے آثار ہیں..

اور جب ہمیں اُس گھپ اندھیرے کی عادت ہوتی گئی، کچھ موہوم سا دکھائی دینے لگا تو اُس اُجڑے ہوئے دیار میں سے ایک اور محرابی شکل نمایاں ہونے لگی اور ہم ٹٹولتے ہوئے احتیاط سے اُس کے اندر یوں داخل ہوئے جیسے اصحاب کہف اپنی غار میں داخل ہوتے ہیں، اور یہاں.. جانے ہم کہاں تھے.. تاریکی مزید گہری ہو گئی تھی، یہ دراصل مندر کا اصل تھا.. وہ بلند گنبد والا مقدس استھان تھا جو کہ اس عبادت گاہ کا مرکز تھا.. ایک کعبہ تھا.. یہاں کا فرش بھی اتنا تاریک تھا کہ تاریکی ایک دبیز چادر کی مانند پاؤں کو الجھاتی تھی.. سیل فونوں کی روشنیوں میں کہیں کہیں نظر آیا کہ گند بلا اور کباڑ کے نیچے کسی دیدہ زیب فرش کی جھلکیاں جھلکتی ہیں، برابر میں شاید چاولوں کا آٹا پیسنے کی ایک چکی تھی اور بوریاں اوندھی پڑی تھیں، تین چار سیل فونوں کے سوراخوں میں سے برآمد ہوتی روشنیاں مدھم اور بجھتے ہوئے چراغ تھیں.. کسی ایک مدھم لَو کی زد میں فرش کے ایک کونہ میں پڑا دھول آلود ایک پالنا یا شکستہ ہو چکا جھولا سا نظر آیا جس کے بریدہ چوبی بدن پر کچھ پھول بوٹے ابھرے ہوئے تھے..

ہر عقیدے کی پرستش گاہ کے اندر اُس کی عمارت چاہے کتنی ہی وسیع اور پھیلی ہوئی ہو اُس کے اندر

ایک مقام ایسا ہوتا ہے جو سب سے مقدس اور پوتر ہوتا ہے جیسے ہمارے ہاں منبر مرکزی سجدے کی آنکھ ہوتا ہے..ایسے ہندوؤں کے مندروں کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہاں آپ مندر در مندر چلے جائیں، آس پاس مختلف دیوتاؤں اور دیویوں کے چھوٹے چھوٹے مندر ہوں گے لیکن بالآخر وہاں صرف ایک اللہ، ایک روح اور ایک رَب رہ جائے گا کہ سب عقیدوں کا انت وحدانیت پر ہوتا ہے..تو بھلا ایسے مقام پر یہ خستہ ہو چکا، دھول سے اٹا، ایک جھولنا کہاں سے آ گیا..اس میں کون جھولتا ہوگا..اور اسے جھلاتا کون ہوگا..عقیدت کے باغوں میں اگر پڑے جھولے تو ان میں کون جھولتا ہوگا، کیا ایک کرشن، شومہاراج یا سونڈھ والا گنیش مہاراج..

تاریکی میں پڑے اس جھولے کی بناوٹ بہت خوب تھی اور اُس کے برابر میں اس مندر کے کسی دروازے کے کواڑ دھول اور کاٹھ کباڑ میں دفن ہو رہے تھے..سعید بٹ نے سرگوشی کی "سر..اگر آپ ہمت کریں تو یہ حاصل کیے جا سکتے ہیں، یہاں بیکار پڑے ہیں، ان پر بہت کشش والے نقش دکھائی دے رہے ہیں.."

میں نے اس اِمکان پر سنجیدگی سے غور کیا کہ اگر یہ حاصل ہو جائیں تو ان کا مصرف کیا ہوگا..کیا میں ان کی مرمت کر کے، انہیں پالش کروانے کے بعد ڈیفنس میں اپنے نئے گھر کے ماتھے پر نصب کر سکوں گا، متجسس حضرات کے سامنے اقرار کر سکوں گا کہ یہ کواڑ تقریباً ایک سو چالیس سال پرانے نہال چند کے عظیم الشان مندر کے ہیں..

میرے اُس مندر میں کون آئے گا!



''ایک شیش محل گُنبد جھولا جھولتی ناری''

اور تب، جب ہم اس اندھیارے پن سے باہر آنے کو تھے، تب میری نگاہ، ایک نگاہِ بلند ہوئی، مدھم روشنیائیوں میں، میری بجھتی آنکھوں میں، ایک فراموش شدہ گنبد کی گولائی میں دمکتا ایک شیش محل دمکتا نظر آ گیا.. جیسے وہاں شیشہ گری کی آئینہ سازی نہ ہو، ہزاروں جگنو ٹمٹماتے ہوں.. میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ شاید کسی نے بھی نہ دیکھا ہوگا.. شیش محل کے عکس در عکس آئینوں کے تلے، نیلے رنگ کے ایک شجر کی ڈال سے لٹکے جھولے پر ایک بنی سنوری سرخ آرائشوں کے لباسوں میں سجی ایک گوری، شاید کرشن کی کوئی گوپی، شاید میری کوئی ہیر، صاحباں، سسّی یا سوہنی، جھولتی تھی..

جھولا کس نے ڈالا رے..

ہولے ہولے جھلائے میرا سیاں..

حیرت انگیز طور پر گنبد کا یہ شیش محل اور نیلے شجر سے جھولتی گوری ابھی تک محفوظ اور مکمل تھی، اُس جھولتی لڑکی کے سامنے ایک بجھا ہوا سا نقش تھا، ایک چہرہ نیلاہٹ میں ڈوبا ہوا جو شاید اُس گوپی کو جھلاتا تھا کہ کرشن کو اکثر نیلے رنگ میں رنگتے ہیں..

یہ باریش عاتف کا کمال تھا کہ اُس نے میرے دوہائی دینے پر کہ.. عاتف.. کُچھ کرو.. ان شیشہ گری کے معجزوں اور میورلز کو اپنے کیمرے میں تصویر کرلو.. یہ مجھے مدھم مدھم دکھائی دیتے ہیں، تم اپنے طاقتور لینز سے ان کے قریب جاسکتے ہو، انہیں تصویر کر سکتے ہو..

تو یہ عاتف کے نقش ہیں جنہیں دیکھ دیکھ کر میں اُس شیش محل کی آرائش اور گوری کے جھولے کو بیان کرتا ہوں..

جھولے میں بلند ہوتی سرخ پیراہن والی گوپی کے عین اوپر جو نقش تھے، بناوٹیں، آرائشیں محرابیں، پھول بُوٹے رنگ رنگ کے قیمتی پتھروں سے تراشے اور نصب کیے گئے، وہ اتنے شوخ اور تازہ تھے جیسے ابھی ابھی لاہور کے بے مثال شیشہ گر اور گراں بہا پتھروں کو تراش کر گُل بُوٹے سنگ مرمر میں نصب کرنے والے ابھی ابھی رخصت ہوئے ہیں.. لیکن اس کاریگری کی شیشہ گری اور رنگ سازی اور آئینوں کی جھلکیوں کے سوا،

ایک اور بے مثال حیرت تھی جو منتظر تھی کہ کب مجھ پر نگاہ اٹھتی ہے..یہ اس اجڑ چکے آستانے کا گنبد تھا اور جب مجھے وہ نظر آیا تو میں پکار اٹھا کہ..دیکھو، اوپر دیکھو..

اور وہاں نقاشی، کاریگری، کمالِ فن کا ایک اور معجزہ ناکافی روشنی میں جھلملاتا تھا..

وہ گنبد، اصفہان اور استنبول کی مساجد کے گنبدوں کی ہمسری کرتا تھا..سیل فونوں کی ناکافی روشنیاں اُس گنبد پر بھٹکتی تھیں، کبھی کچھ آرائشیں اتنی شوخ اور تازہ جیسے ابھی ابھی وہ نقش و نگار تخلیق کرنے والے ہنرمند گنبد کی اُس مچان سے اترے ہیں جہاں وہ گنبد کو اپنے قریب لا کر اُس پر ایسے عجب آسمانی اور ملکوتی گل و گلزار پینٹ کرتے تھے جس کی مثال شاید تلاش کرنے پر بھی کہیں نہ ملے..وہ اتنے تازہ اور گیلے رنگوں کے لگتے تھے، جیسے اگر انہیں چھو لیا جائے تو ان کے رنگوں سے آپ کی انگلیاں لتھڑ جائیں اور گُل بوٹے اپنی کاملیت کھو کر اِک دوجے کے رنگوں میں رنگے جائیں، اگر انہیں چھو لیا جائے..اور پھر یکدم وہ فن مصوری کا شاہکار گنبد تاریکی میں گم ہو جاتا کہ سیل فون کی وہ لائٹ جو اسے ظاہر کرتی تھی، بھٹک کر کسی اور جانب نکل جاتی اور میں حواس باختہ سا ہو گیا تھا اور میں ڈانٹ کر کہتا ''ٹھہرو..ٹھہرو..لائٹ گنبد پر ہی مرکوز رہنے دو..''

بے شک ایک داستان گو کی مبالغے کی مٹھی بھر خصلت مجھ میں بھی ہے لیکن پلیز مجھ پر اعتبار کر لیجئے گا جب میں یہ بیان دوں گا کہ نہال چند مندر کا یہ گنبد ناقابل بیان ہے..اُس کے حسن کی کوئی مثال نہیں..اُس کے مرکز میں ایک منقش دائرے کے اندر نیلے رنگ کے پتھر جڑے ہیں اور وہاں سے پھول، بوٹے جیومیٹری کی اشکال میں خوش نظر ہوتے، تمہارے دل کو مٹھی میں لیتے ایک گولائی میں پھیلتے چلے جاتے ہیں، اور پھولوں اور آرائشوں کی دل کشی کا کچھ جواب نہیں..آج سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پیشتر جب اس مندر کی بنیاد رکھی گئی تو وہ کونسے مصور اور ہنرمند تھے جنہوں نے اس گنبد کو اپنے معجزہ ہاتھوں سے مصور کیا، وہ کسی نہ کسی حوالے سے مائیکل انجلو کے فن کے وارث تھے جس نے روم کے کلیسا سینٹ پیٹرز کا عظیم الشان گنبد مصور کیا..خالق ایک نہایت کسرتی بدن کا بارعب باریش بوڑھا جو آدم کی جانب اپنی انگلی بڑھا رہا ہے..انسان کی تخلیق کا پہلا لمحہ..

بے شک آپ تذبذب میں ہوں گے لیکن کاش آپ عاتف کی کھینچی ہوئی، زوم لینز سے ظاہر ہونے والی وہ تصویر دیکھ لیتے جو میرے سامنے ہے تو آپ بھی ایمان لے آتے عجب گنجلک اور باریک اور نفیس نقش در نقش ہیں جو رنگوں کی لہروں کی صورت پھیلتے چلے جاتے ہیں..اس گنبد کی یکتائی میں کچھ شک نہیں..

میں دعویٰ نہیں کرتا لیکن عین ممکن ہے کہ ہماری آنکھیں وہ پہلی آنکھیں تھیں، بہت برسوں کے بعد جو اس گنبد کی سحر انگیزی کا مشاہدہ کر رہی تھیں اور یہ طے ہے کہ اسے آج تک کبھی تصویر نہیں کیا گیا..

فرش پر چاول کے آٹے کے تھیلے، بوریاں، شکستہ اینٹیں، ایک جھولنا اور گرد بے شمار گرد، گھپ اندھیرے میں اور اُس کے اوپر وہ گنبد جس کے نقش و نگار تاج محل کے سنگِ مرمر میں کھلائے گئے گُل بوٹوں کی

کے نصیب میں.........چاول کے آٹے کی دکانوں کے عقب میں ایک ہمہ وقت کے اندھیرے میں دفن ہو جاتا تھا.. جہاں کاٹھ کباڑ سے اٹے ایک ایسے کمرے میں جس کے طاقچوں کے چراغ کب کے گل ہو چکے، جہاں کبھی مختصر مندر مختلف دیویوں اور دیوتاؤں کے نصب ہوا کرتے تھے، ابھی کچھ آثار باقی تھے..اور جہاں غلیظ رضائیوں میں لپٹے چند مزدور اپنے بدنوں کی بو اور خراٹوں سے اس شاندار معبد کو آلودہ کرتے تھے..

مجھے یقین ہے کہ نہ کبھی ان مزدوروں نے اور نہ اس عمارت پر قابض لوگوں نے اس گنبد کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھا ہوگا..

اگر نہال چند مندر کے بچے کھچے آثار کو بحال کیا جائے تو یہ ہماری ثقافت کے دیدہ زیب دُکھڑے بیان کر سکتا ہے..

میں اس حق میں نہیں ہوں کہ قابض لوگوں کو یہاں سے بے دخل کر دیا جائے کہ تقسیم کے بعد اجڑ جانے والے لوگوں کو جہاں پناہ ملی وہاں مقیم ہو گئے، سرحد پار برباد ہو چکی مسجدوں میں اور اِدھر مندروں اور گوددواروں میں وہ پناہ گزین ہو گئے..بہر طور انہیں مناسب ادائیگی کر کے انہیں مائل تو کیا جا سکتا ہے کہ وہ کہیں اور منتقل ہو جائیں اور پھر یہ پرانی ذی شان نشانیاں بحال کر دی جائیں..لیکن فی الحال یہ توقع عبث ہے..ان زمانوں میں ٹریڈر مافیا راج کرتا ہے..وہ لکشمی مینشن میں سعادت حسن منٹو کے گھر کے باہر آویزاں تختی اکھاڑ پھینکتے ہیں، اس مینشن کی تاریخ کو ادھیڑ کر اس کے اندر ہولناک پلازے تعمیر کر دیتے ہیں، لاہور کی شکل مسخ کر دیتے ہیں یہاں تک کہ کوئی اورنج ٹرین چلانے کے لیے چوبرجی، جی پی او، لکشمی بلڈنگ، مختلف چرچ اور شالیمار باغ کی بنیادیں ہلا دیتے ہیں تو وہ کہاں ایک گمنام مندر کو بحال کریں گے، افواہیں گردش میں تھیں کہ اسے مکمل طور پر مسمار کر کے یہاں دکانیں تعمیر کی جائیں گی لیکن مجھے خبر کی گئی کہ یہ مندر محکمہ اوقاف کی نظر میں ہے اور اسے اگر بحال نہ بھی کیا گیا تو اسے ڈھایا نہیں جائے گا..

"مندر ٹھاکر دوارہ لالہ نہال چند"

یہ شخص لاہور کے مالدار ساہوکاروں میں نامی گرامی آدمی ہے، ٹھیکیدار کا کام کرتا ہے، سنٹرل جیل میں ہر ایک چیز کا ٹھیکہ اُس کے متعلق ہے۔اسی شخص نے اس عالی شان مندر کی تعمیر کی بنیاد رکھی ہے..غرب کی سمت میں بہ فاصلہ بازار مہاراجہ کھڑک سنگھ کی حویلی کی نہایت عمدہ اور عالی شان عمارت بنی ہوئی ہے، مہاراجہ کی سواری کے ہاتھی، گھوڑے اس جگہ کھڑے ہوا کرتے تھے..یہ ایک مندر نہیں بلکہ پانچ مندر ہیں اور چار گوشوں پر چار مندر شیو جی و دیوی جی و سورج جی و گنیش جی کے..نیم تیار ہیں، بڑا مندر ابھی بن رہا ہے جس کی

منزلیں مع کلس کے سات ہوں گی..غرض کہ جب یہ مندر بن کر تیار ہوگا تو اس کا ثانی بلندی میں اور کوئی مندر نہ ہوگا..

(تاریخ لاہور..کنہیا لال)

میں اُس گنبد کی قیامت گُل رنگ، عجوبہ،شکل انگیزی کے رنگین معجزے سے الگ ہوا..جسے کسی اور نے کب دیکھا تھا اُس سے جدا ہوا، یوں ہوا جیسے الحمرا کے کسی منقش ایوان سے، ہرات کے ملکہ گوہر شاد کے نیلے مقبرے سے، یا رقند کی مسجد ابو بکر کے گنبدوں سے اور مسجد قرطبہ کے ہجوم نخیل ستونوں سے، مجھے اتنا ہی رنج ہوا..ہم رخصت ہونے کو تھے، اور میرے پیراہن کے ساتھ کچھ جالے چمٹے ہوئے تھے، جو گرز پر دھول تھی اور آنکھوں میں اُس گنبد کی پرچھائیاں تھیں جب فہد نے کہا ''سر جی، ذرا ہمت کیجیے، بے شک سیڑھیاں شکستہ ہیں پر میں آپ کا ہاتھ تھام لوں گا، اوپر چھت پر چلے آئیے، مندر کی اصل عمارت تو وہاں سے بلند ہوتی ہے..''

میں فہد کے سہارے تاریکی میں سے نمودار ہو کر سنہری دھوپ میں ظاہر ہو گیا..

اور وہاں نیلے آسمان کے پس منظر میں شہر کی عمارتوں پر بلند ہوتا ایک پرشکوہ ابھی تک قائم مندر نظر نواز ہوتا تھا..اور واقعی کنہیا لال کے بقول یہ ان زمانوں میں لاہور کا بلند ترین مندر مینار ہو گا..اس کے چاروں کونوں میں معبد تھے، ایک دو موجود باقی ڈھے چکے ناموجود..اس کے چاروں اور محرابی چوکھٹوں میں نقش ہندو دیو مالا کی تصویریں تھیں پر بہت مدھم..کہ انہیں بھی بابری مسجد کے انہدام کے طیش میں کھرچ دیا گیا تھا..

میں نے اور میرے ساتھیوں نے پچھلے برس اور اس موسم سرما میں اپنی تاریخی جستجو کی پیاس بجھانے کے لیے جو ایک دن کے، صرف ایک دن کے سفر کیے تھے، اُن میں ہم نے بہت عجائبات دیکھے لیکن..ملکہ ہانس کا پرنامی مندر اور آج لاہور کا یہ نہال چند مندر کا گنبد تا حیات ہمارے خوابوں میں تصویر ہوتا رہے گا، اس لیے بھی کہ جو ہم نے دیکھا اور شاید کسی اور نے نہ دیکھا..ہم ہمیشہ اسی مخمصے میں مبتلا رہیں گے کہ کیا یہ ایک خواب تھا جس میں پرنامی مندر کی گیلری میں آویزاں سات یونانی دیویاں ڈھلتی دھوپ میں زرد زرد ہوتی ہیں، نہال چند مندر کا وہ گنبد جو ہمسری کرتا تھا، اصفہان اور استنبول کی مسجدوں کے گنبدوں کی تو کیا یہ ایک سراب تھا، واہمہ تھا یا خیال تھا..

اُس گنبد کی ایک محراب میں جھولا جھولتی سرخ پیراہن والی ناری جب جھولتی تھی تو گویا میرے دل کے پژمردہ شجر کی ایک ٹہنی پر جھولتی میرے دل میں اترتی تھی..



''محمد رفیع کی گلی میں، سُہانی رات ڈھل چکی''

ہم نہال چند کے مندر کے باہر کھلے لاہوری بازار میں آتے ہیں اور ابھی تک اُس ناری کے جھولے میں جھول رہے ہیں جب جاوید یکدم چہکنے لگا ''تارڑ صاحب..اب ہم برصغیر کے سب سے نامور گلوکار محمد رفیع کی اُس دکان کی جانب چلتے ہیں جہاں اُن کے بزرگ لوگوں کی حجامتیں کرتے، اُن کے بال تراشتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ رفیع صاحب بھی اس پیشے سے منسلک تھے اور حجامت کرتے ہوئے گاہکوں کو گیت سنایا کرتے تھے..''

محمد رفیع جہانِ موسیقی میں شاید سب گلوکاروں کی نسبت ایک درویش طبیعت اور سادہ مزاج مذہبی شخص تھا، اُس نے پوری زندگی موسیقی کی دنیا پر اپنی آواز کے رچاؤ اور سُریلی بلند ترین تانوں کے بل بوتے پر راج کیا اور اس کے باوجود اُس میں تکبر نام کو نہیں تھا، اس نے کبھی بڑا بول نہ بولا حالانکہ وہ سب سے بلند آہنگ رس بھرا بول تھا..وہ ہمیشہ اپنے پروردگار کے سامنے جھکا رہا کہ اُس کے کرم نے اسے ایک حجام کی دکان کے فرش سے عرش پر پہنچا دیا، وہ ایک روایت کے مطابق لاہور کی گلیوں میں ایک مجذوب کی مانند گاتا پھرتا تھا، دراصل موسیقی بھی یہ نہیں پوچھتی کہ تمہارا دھرم کیا ہے، تمہاری ذات کیا ہے، اس نے کسی ایک شخص کا چناؤ کرنا ہوتا ہے اور وہ اس پر ایک آسمانی صحیفے کی مانند اتر جاتی ہے، یہاں نہ اتنی گنجائش ہے اور نہ میرے پاس موسیقی کا کامل علم کہ میں آج تک جتنے بھی گلوکار گزرے ہیں ان سب میں قبول عام اور پسندیدگی کی سند پانے والے محمد رفیع کے ساتھ انصاف کر سکوں..اُسے گزرے ہوئے زمانے ہو چکے لیکن اُس کی آواز کے زمانے ابھی تک ہمارے آس پاس گونجتے ہیں، محمد رفیع جیسا گلوکار نہ کبھی ہوا اور نہ کبھی ہوگا..وہی اول تھا اور ابھی تک وہی آخر ہے..نور جہاں کے ہمراہ ''یہاں بدلا وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے، محبت کر کے بھی دیکھا، محبت میں بھی دھوکا ہے..'' سفر کا آغاز ہوا اور اُس کے بعد اُس کی آواز کی کہکشاں نے ہر دھڑکنے والے دل میں سریلے ستارے بھر دیئے..سہانی رات ڈھل چکی نہ جانے تم کب آؤ گے..او دنیا کے رکھوالے سن درد بھرے میرے نالے..من تڑپت ہری درشن کو آج..بہارو پھول برساؤ مرا محبوب آیا ہے..مجھے دنیا والو شرابی نہ سمجھو..چھلکائے جام آپ کی نظروں کے نام..یہ جو چلمن ہے دشمن ہے ہماری...یہاں تک کہ چاہے مجھے کوئی جنگلی کہے..اور یہ

فہرست بے حد طویل ہے۔ کوئی بھی کن رس رکھنے والا، مدھ بن میں رادھیکا ناچے رے کیسے بھول سکتا ہے۔ بگرا گیا تم سے دل ہی تو ہے۔ آواز اور سُر کی بلندی میں نور جہاں کے علاوہ یہ صرف محمد رفیع ہے جو موسیقی کی بلندیوں پر پہنچا، اُس جیسا کبھی نہ ہوگا۔ میں اگرچہ عمر عیار تو نہیں ہوں لیکن میری زنبیل میں محمد رفیع کے بچپن کی ایک داستان محفوظ ہے جو آج تک کبھی بیان نہ ہوئی، میمونہ میری بیگم کے سب سے بڑے بھائی انور نام کے تھے، ان کی شکل دل کو موہ لینے والی تھی اور بہت خواتین موہی گئیں، ایک سیماب صفت شخص، معاشرے سے بغاوت پر آمادہ۔ اگرچہ ان کے والد اور میرے سسر، مولانا احمد علی کے خلیفہ تھے لیکن انور بھائی جان کی دوستیاں، بڑے غلام علی خان، استاد دامن اور محمد رفیع سے تھیں، میمونہ کا کہنا ہے کہ رفیع کے بڑے بھائی کی سائیکلوں کو پنکچر لگانے کی دکان اندرون شہر تھی جہاں سے انور بھائی جان اپنے سائیکل کے ٹائروں کو گھس ہو جانے کے بعد ان سے پنکچر لگواتے تھے اور یوں محمد رفیع ان کا یار ہو گیا۔ ایک بار وہ جانے کونسی ایکٹرس شاید کانن دیوی کے عشق میں مبتلا ہو کر اُس سے ملنے کے لیے گھر اور سکول سے فرار ہوئے اور بائیسکلوں پر سوار کلکتے کے سفر کے لیے کمربستہ ہو گئے اور وہ دونوں نادان ٹین ایجر تھے، بہر طور سائیکلوں پر دلّی جا پہنچے جہاں ان کا زادِ راہ ختم ہو گیا اور وہ بھوکے قریبی دوست کے پاس جا پہنچے جو چوہدری عبدالرحمٰن خان کے کراؤن پرنس کو اپنے سامنے پا کر حیران ہوئے اور پوچھا۔

''انور۔ تم یہاں کہاں۔ کیسے آئے ہو؟''

''بائیسکل پر۔'' انور نے مؤدب ہو کر کہا۔

''اور یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟''

''یہ میرا یار ہے محمد رفیع۔ بڑا اچھا گاتا ہے۔''

''اور جا کہاں رہے ہو؟''

''کلکتے، کانن بالا سے ملنے۔''

والد صاحب کے دوست نے ان دونوں کی گوشمالی کی، کھانا کھلایا اور کان سے پکڑ کر بہ نفس نفیس واپس لاہور لے آئے۔

ہم اُس گلی میں پہنچے۔

جس گلی میں محمد رفیع ایک حجام کی دکان میں گایا کرتا تھا۔

آج اتوار تھا اور وہ دکان بند تھی، شٹر گرا ہوا تھا۔

میں نے جھک کر اُس شٹر کو احترام سے چھوا جیسے ایک صوفی کی قبر کو چھوتے ہیں۔ بڑا شکریہ بڑی مہربانی مری محفل میں حضور آپ آئے۔ تو گنگا کی موج تو میں ہوں جمنا کا دھارا۔ دکان کے بند شٹر کے پہلو میں

ایک بورڈ آویزاں تھا..

''چشتی ہیئر بیوٹی سیلون

لیڈیز اینڈ جینٹس سپیشلسٹ''

اے شہرِ لاہور تیرے پانیوں میں کیا تاثیر ہے، تیری ہواؤں میں کونسی مدھ بھری مہک ہے کہ جو بھی تیری مٹی سے اٹھا وہ عالم میں بے مثال ہوا. سُر تال اور آواز میں، اداکاری، شاعری، ہدایت کاری، اکھاڑے میں اور سیاست میں.. بڑے غلام علی خان..امانت علی خان..فتح علی خاں، استاد شگن، حسین بخش گلّو، محمد رفیع، پران، دیو آنند، کامنی کوشل، اوم پرکاش، ایم اسماعیل... میں تفصیل میں اتر گیا تو پھر واپس آنے جوگا نہیں رہوں گا. تو آخر میں گاما پہلوان..اور اگر لاہور کی مہر جن پر لگی اور وہ اسی شہر کی نسبت مشہور عالم ہوئے تو ان کا تذکرہ بھی طولانی ہو جائے گا، صرف نور جہاں، فریدہ خانم، مہدی حسن، خواجہ خورشید انور، علامہ اقبال، فیض احمد فیض اور منیر نیازی تک ہی محدود رہنے میں عافیت ہے..

آخر ہم سب خصوصی طور پر محمد رفیع کے کوچے میں ہی کیوں جا نکلے، اُس دکان کی نشاندہی کی خواہش کیوں کی کہ جہاں وہ حجامت تو کیا کرتا تھا، گاہکوں کو گیت سناتا تھا صرف اس لیے کہ اس بار ہم سب کی خواہشیں تھیں کہ شہر لاہور اور خصوصی طور پر ہیرا منڈی میں جو اجڑ چکے کوٹھے، بیٹھکیں اور تکیے اور نشستیں تھیں جہاں برصغیر کے نامور گلوکار اور گلوکارائیں بیٹھتے تھے، سُر کے گُلوں میں رنگ بھرتے تھے، موسیقی کے گلشن کا کاروبار چلاتے تھے..تو ان اجڑے ہوئے مقامات کی محض نشاندہی ہمارے لیے ایک سنسنی خیز تجربہ ہوگی.. میں نے جاوید سُریلے سے فرمائش کر دی تھی کہ ذرا ان کوٹھوں اور بیٹھکوں کی کھوج کرو جہاں سنگیت کے راج سنگھاسن پر یہ لوگ براجمان ہوتے پورے برصغیر کی شریانوں میں راگ رنگ کے چراغ روشن کر کے ان میں بہتے چلے جاتے تھے..

تو محمد رفیع پہلا چراغ تھا، ہم اُس کی گلی میں گئے تو سوچا کہ آئے ہیں اس گلی میں تو اُس مقام کی زیارت ہی کر لیں جہاں کبھی رفیع کی گائیکی کی عشق آتش بھڑکی تھی جس نے پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا..

سُہانی رات ڈھل چکی نہ جانے تم کب آؤ گے

...نین لڑ جائیے رے

...انصاف کا مندر ہے یہ بھگوان کا گھر ہے

..ہوئے ہم جن کے لیے برباد



''لاہور کے آخری کوہلو کا بیل چھٹی پر تھا''

عادل نڈھال ہو رہا تھا.. وہ محض میرے احترام میں اور دوستوں کا دل رکھنے کی خاطر ہمارے ساتھ چلا آیا تھا، اسے شہر لاہور کی قدامت اور ثقافت میں کوئی دلچسپی نہ تھی'' تارڑ صاحب، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر آپ کو شہر لاہور کی گندگی، غلاظت بھری نالیوں، تاریک کوٹھڑیوں میں زندگی کرتے لوگوں وغیرہ سے کیوں دلچسپی ہے.. یہ لوگ گندگی، غلاظت اور تاریکی میں زندگی گذارتے ہیں..'' تب خاموش طبع ملک سرفراز گویا ہوا ''عادل، آپ لوگ باہر والے ہو، آپ کو کیا پتہ کہ محلے داری کیا ہوتی ہے، سینکڑوں برسوں سے آباد ایک آبائی مکان کی بے شک تنگ کوٹھڑیوں میں رہنا کیا ہوتا ہے، بے شک وہاں سورج کی روشنی نہ پہنچے پر برادری، محلے داری اور ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر زندگی کرنا کیا ہوتا ہے..''

''بُل شِٹ..'' عادل کہاں ماننے والا تھا ''بہرطور یہ کوئی بہترین بندوبست نہیں ہے.. گندبلا میں رہنا، تاریک کوٹھڑیوں میں زندگی بسر کرنا..''

ہمارے نپولین قریشی صاحب البتہ بہت خوش وخرم تھے اور وہ پوچھتے ''تارڑ صاحب.. کیا ہم ہیرامنڈی بھی جائیں گے..''

اور نسیم کہتا ''چلے بھی گئے تو فائدہ.. نہ آپ کو اور نہ غالباً مجھے..''

اس دوران کرنل عامر قدرے جذباتی ہو گئے..'' یہاں کہیں میرے نانا جان کی حویلی تھی، مجھے دکھا دیں..''

''کرنل صاحب.. ہم آپ کے نانا جان کی وہ حویلی تلاش کرنے نہیں آئے جسے آپ نے آج تک دیکھا ہی نہیں، ہمارے شیڈیول کو اتھل پتھل نہ کریں..''

لیکن یہ گجر سرفراز تھا جس کا دل موم ہونے کے لیے بہانے تلاش کرتا تھا، اس نے عامر کی ڈھارس بندھائی ''کرنل جی.. ہمارے حاجی صاحب ذرا جلالی طبیعت کے ہیں، یہ ہمیں ڈانٹتے ڈپٹتے رہتے ہیں، مجذوب ہیں ان کی باتوں کا برا نہیں ماننا.. آیئے ہم آپ کے نانا جی کی حویلی کو تلاش کرتے ہیں..''

وہ دونوں ہم سے الگ ہو کر ایک گلی میں گم ہو گئے..

''سر جی، ہم ہیرامنڈی کب جائیں گے؟'' فہد ایک ناراش شکل، روٹھا ہوا خوش شکل نوجوان، نہایت لجاجت سے پوچھتا ہے..

''تم ذرا بڑے ہولو تب جائیں گے، وہاں نابالغ لوگوں کا داخلہ ممنوع ہے..'' نسیم نے ہرزہ سرائی کی..

''تُوں کی جانیں بھولئے مجھے انارکلی دیاں شاناں'' تنویر خواجہ زیر مونچھ مسکراتا ہوا بولا..

''یہ انارکلی کہاں سے آ گئی سر..''

''بھولی بھینسوں کو کیا پتہ کہ ہیرامنڈی کی شانیں کیا ہوتی ہیں..'' فہد کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ایک بھولی بھینس کیوں ہے..

ویسے تو میری سمجھ میں بھی نہ آیا لیکن میں تنویر کی یاری کے احترام میں چپ رہا..

''جاوید، اب کدھر؟''

''سر، وہ کیا کہتے ہیں کہ تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو..تو ہم لاہور شہر کے طول و عرض میں جو سینکڑوں کولہو ہوا کرتے تھے، سرسوں اور دیگر مغزوں وغیرہ کے تیل نکالتے تھے تو اب صرف ایک کولہو پورے شہر میں اب بھی اپنے بیل کے ساتھ بندھا موجود اور متحرک ہے تو تیل کی دھار دیکھتے ہیں..''

ہم گلیوں گلیوں سفر کرتے بالآخر اُس دکان تک جا پہنچے جہاں دو نوجوان جانے کیا کیا بیچتے تھے لیکن بہر طور خالص سرسوں کا تیل بیچتے تھے اور ان کے عقب میں واقعی ایک کنواں نما، رہٹ آثار، کولہو کے آثار تھے پر بیل نہ تھا..

''بیل کہاں ہے؟''

''تارڑ صاحب، آج اتوار ہے، اس لیے بیل نہیں ہے..''

''بیل اتوار کو چھٹی کرتا ہے؟'' سعید بٹ، منہ پھٹ بولا..

''ہاں جی، اگر آپ بھی پورا ہفتہ کولہو میں جتے مشقت کرتے، گیڑے لگاتے تو کم از کم ایک دن تو چھٹی کرتے..''

سب نے سعید بٹ کی جانب دیکھا، وہ بیل تو نہ تھا، یا شاید تھا..

دکان کے باہر ایک بورڈ آویزاں تھا..

ایک باتصویر کولہو کی پیشانی..''امرتسری کولہو، قائم شدہ 1947ء..خالص تیل کولہو المشہور المعروف، مناسب دام، خالص عمدہ دام، وقفہ برائے نماز، عرصہ دراز سے آپ کی خدمت میں پیش پیش، نماز قائم کریں، ماں باپ کا احترام کریں، دوپٹہ سر پر ہو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے..''

اب کسی نے اُس دکان کی تنگنائی میں جھانکا، کچھ غور وفکر کیا اور یہ عادل ہی تھا ''مجھے بتایا جائے کہ آخر اس کولہو میں بندھا جانے والا بیل، کیسے اس دکان کے اندر جاتا ہوگا..''

اور واقعی کولہو تو نظر آ رہا تھا پر اُس کا بیل کدھر سے داخل ہو کر وہاں تک جاتا ہوگا..

وہ آبائی دکاندار تیل کی دھار دیکھنے والا مسکرایا ''سر..بیل یہاں سے داخل نہیں کیا جاتا، اگر آپ جھانکیں تو برابر میں ایک گلی ہے جس پر اس دکان کا ایک داخلہ کھلتا ہے تو بیل وہاں سے لے جایا جاتا ہے..''

''کیسے پسماندہ لوگ ہیں..'' عادل معترض ہو گیا، ''ابھی تک کولہو کے بیل ہیں، ایک تیل نکالنے کی مشین لگا دیں، تیل ہی تیل..ان کی پسماندگی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے..''

''عادل..دراصل آپ امریکہ اور یورپ کے جہانوں کے جہاں گرد ہو..جہاں ہر شے میکانکی ہے..جیسے جولاہے کی ایک کھڈی پر کھٹ کھٹ ایک کھیس بُنا جاتا ہے اور وہ کسی مشین پر بھی تیار ہو سکتا ہے جیسے ایک کنویں میں سے بیلوں کی مشقت سے ٹنڈوں میں پانی بھرا جاتا ہے اور وہ ایک پیٹر پمپ سے بھی کثرت سے کشید کیا جا سکتا ہے..ایسے ہی بے شک ایک کولہو کو ترک کر کے سرسوں اور بیجوں کا تیل بھی میکانکی ذریعے سے نکالا جا سکتا ہے..لیکن کھڈی، پر بُنے ہوئے کھیس، کنویں کی گہرائی میں سے ٹنڈوں کے لبریزی کے پانیوں اور کولہو کے کشید کردہ تیل میں فرق ہوتا ہے..اس مٹی کی مہک کا فرق ہوتا ہے..''

''بُل شٹ..'' عادل نے کندھے اچکائے..

''محلّہ چومالہ
گوردوارہ..ربانی سٹریٹ، گلی میاں منکو..''

یہ کونسا محلّہ ہے..کیا چومالا سے مراد چار مالائیں ہیں اور یہ گوردوارہ کونسا ہے اور یہ میاں منکو کون ہیں جن کے نام پر یہ گلی آباد ہے..

وہ شہر ہی کیا جو سب سوالوں کے جواب دے..

ہر قدیم شہر میں کچھ بجھارتیں ہوتی ہیں جو بوجھی نہیں جا سکتیں..

کچھ بھید ہوتے ہیں جو عیاں نہیں ہوتے..

اب یہ جو دائیں جانب بجلی کی تاروں کے گھنے جنگل میں سے ظاہر ہونے والا ''کوچہ تیر خانہ'' کا جو نیلا بورڈ ہے تو اس کوچے میں کونسے تیر بنتے تھے..کیا تیر نیم کش اسی کوچے میں سے نکلتے تھے اور جگر کے پار نہ ہوتے تھے..تیر پہ تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے..

میں کوچہ تیر اندازاں، کوچہ کمانگراں، کوچہ گھنگھروسازاں وغیرہ سے تو واقف تھا لیکن یہ کوچہ تیر خانہ

کیا تھا..یہ لاہور کی قدامت کے کارخانے تھے..راستے میں، تنگ بازار سے اٹھنے والی، بلند ہوتی گلی کے دائیں جانب ایک عظیم حویلی کی عمارت سربلند ہوتی تھی..یہ ''حویلی واجد علی شاہ'' تھی جسے کیا ہی نفاست اور ذوق جمال سے نوتعمیر کیا گیا تھا..

کوچہ فقیر خانہ''

اور وہاں کوئی فقیر نہ تھا..

فقیر خانہ میوزیم یہاں سے دور لاہور کے ایک اور گوشے میں تھا اور میوزیم گواہ تھا کہ کبھی میں اور قرۃ العین حیدر قدامت کے معجزوں کی کھوج میں وہاں آئے تھے..

قدامت اور پرانی تہذیب کے نشان اپنی جگہ..لیکن جاں نثاری اور مکمل عشق بلکہ جاں فروشی اپنی جگہ..

ذوالفقار علی بھٹو نے اگرچہ بالآخر مایوس کیا لیکن پاکستان کی سیاسی تاریخ میں جیسے جیالے اُس کے ہوئے، کسی اور لیڈر کے نہ ہوئے، وہ اس کے ناروا قتل کے احتجاج میں جل گئے..

شٹر گرا ہوا تھا کہ آج اتوار تھا..

دوکان کے ماتھے پر آویزاں بورڈ پر ایک شخص ابھی تک بھٹو کے عشق میں مبتلا اپنے عشق کا اعلان برسرعام کرتا تھا..

''معراج دین

بھٹو کا دیوانہ اینڈ جنرل سٹور''

ذرا کچھ فاصلے پر کوئی جاوید اقبال کسٹم والے تھے، اقبال کے فرزند نہ تھے اور ان کے دروازے پر ایک بورڈ پر درج تھا کہ علامہ اقبال اس گھر کے تھڑے پر بیٹھ کر جانے کیا کرتے تھے..



''چوک جھنڈا، حسّو تیلی کی بیٹھک''

ہم گلیوں گلیوں اور کُوچوں کُوچوں کے بھیتر بھیتر ہوتے، ان گلیوں میں پھٹ پھٹ کرتے تیز رفتار موٹر سائیکلوں سے بچتے، نگاہ بلند رکھتے کہ کبھی کبھار کوئی ایسی لاہورن دکھائی دے جاتی جو کسی ایسے کنویں سے بھرتی تھی جس کے پانی میٹھے تھے، اگرچہ اب تو وہ درجنوں کنویں معدوم ہوئے جو شہر لاہور کی واٹر سپلائی کے منبعے تھے.. پچھلی بار ایک ایسا کنواں دریافت کیا لیکن اُس میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا.. تو ہم لاہور کی ان گلیوں کی دھوپ چھاؤں اور نیم اندھیاروں میں سے نکل کر ایک کھلی فضا میں آ نکلے اور یہ چوک جھنڈا تھا، چوک کے درمیان میں ایک بہت بلند بانس، سبز پیراہن میں لپٹا، سویر کی دھوپ جو کہ ابھی کوٹھوں اور ممٹیوں تک اترتی تھی، اُس دھوپ تک پہنچ کر اُس کی مدھم کرنوں میں ایک سبز پھریرا لہراتا تھا.. تو یہ چوک جھنڈا تھا، حسّو تیلی جہاں کریانے کی دکان کرتا تھا، تیل بیچتا تھا، یہ جھنڈا اُس درویش اور بزرگ کی یادگار تھا.. جھنڈے کے بانس کے چبوترے پر اپنے تیل میں جل کر سیاہ ہو چکے چند دیئے تھے.. جمعرات کے روز حسّو تیلی کی یاد میں اہل لاہور تیل کے دیئے روشن کرتے تھے..

اور جہاں ایک مزار نما مقام کی جالیوں کے باہر ایک تحقیقی معلومات کا بورڈ ''بیٹھک حضرت حسّو تیلیؒ'' آویزاں تھا، ہم نے اُسے حضرت حسّو کا مزار جانا اور فاتحہ پڑھی لیکن بعدازاں کھلا کہ اُن کا مزار کہیں اور ہے، یہ ان کی بیٹھک تھی جہاں وہ اسی بازار میں تیل فروخت کرنے کے بعد شام کو آ بیٹھتے تھے..

''بیٹھک حضرت حسّو تیلیؒ''

''یہ کمرہ سید حسن شاہ المشہور حسّو تیلی کے نام سے منسوب ہے، جو کہ عہد اکبری کے صوفی بزرگ تھے۔ آپ کا تعلق سلسلہ سہروردیہ سے تھا اور آپ کی بیعت حضرت شاہ جمال کے ہاتھ پر ہوئی تھی، پیرومرشد نے آپ پر خصوصی نظر کرم کیا۔ ''خزینۃ الاصفیا'' میں لکھا ہے کہ مرشد نے ہدایت کی کہ غلہ پورا تول کر دیا کرو تو آپ نے کم تولنا بند کر دیا اور ترازو گاہک کے ہاتھ میں دے دیا کرتے تھے کہ خود ہی تول لو.. آپ نے 1012 ہجری میں وفات پائی.. آپ کا مزار ایبٹ روڈ کے نزدیک جانکی دیوی ہسپتال کے قریب ہے۔''

منشی کنہیالال نے بھی لاہور کے صوفی بزرگوں کے باب میں حسّو تیلی کا تفصیلی ذکر کیا ہے..ان کا کہنا ہے کہ حسّو تیلی گاہک کو ترازو دے کر کہتا تھا کہ جنس تم خود ہی اپنی دین ایمان سے پوری تول لو..اور جو گاہک پورا تول کر لے جاتا تھا، گھر پہنچ کر تولتا تو تول زیادہ نکلتا اور اگر زیادہ تول کر لے جاتا تو جنس گھٹ جاتی..کنہیالال کا کہنا ہے کہ حسّو تیلی کو حضرت لال حسین کے ساتھ اس کمال کی محبت تھی کہ وہ کہا کرتا تھا کہ حسّو، حسین ہے اور حسین، حسّو ہے..دوئی باقی نہیں ہے..

جاوید ایک تو سُر یلے خاندان کا چشم و چراغ اور پھر ایک پروفیشنل گائڈ یعنی سونے پر سہاگا..جُگت ایسی لگاتا کہ بندہ تھاں مار دیتا، فقرہ ایسا کستا کہ وہی مرا ہوا بندہ مسکراتا ہوا زندہ ہو جاتا..اگر چہ وہ میرے احترام میں ذرا احتیاط کرتا لیکن خصلت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا کمالِ فن دکھا دیتا..عادل اگر چہ اندرون شہر میں در بدر ہونے سے چنداں دلچسپی نہ رکھتا تھا، محض ہمارے ساتھ یکجہتی کے اظہار اور یاریاں نبھانے کی خاطر چلا آیا تھا، اور گنگنانے لگا تھا، کوئی کلاسیکی طرز کے گیت پر طبع آزمائی کرنے لگا تھا جس پر جاوید نے سر جھٹک کر ہاتھ لہرا کر اُسے خوب داد دی ''واہ جی واہ..سر جی کیا بات ہے..آپ تو سُر میں ہیں، سبحان اللہ..شکر ہے اوپر سے کوئی اینٹ نہیں آ گئی..''

ڈاکٹر نسیم ذرا بے چین ہوا جاتا تھا، وہ اپنے آبی بوجھ سے فراغت حاصل کرنا چاہتا تھا تو اس نے جاوید سے کہا ''یار.. یہاں کہیں مجھے فارغ کرا دو..اب کنٹرول نہیں ہو رہا..'' تو جاوید کہنے لگا ''ڈاکٹر صاحب..میں آپ کو یہاں کہیں، کسی کونے میں لے تو چلوں گا لیکن فارغ میں نے نہیں کرانا، آپ نے خود ہی ہونا ہے..''



''لاہور کی سب سے گندی گلی، ٹبّی گلی''

تو یونہی گلیاں گلیاں بھٹکتے اُس گلی میں آ نکلے جو میرے لیے اس اتوار کی سویر میں سب سے یادگار اور پُرفسوں گلی ثابت ہوئی..

جاوید نے باقاعدہ ہمیں چُپ رہنے کی درخواست کی، عاتف کو اپنا کیمرہ پوشیدہ کرنے کے لیے کہا اور ہم اُس گلی میں داخل ہو گئے..

اور یہ گندی گلی تھی..

لاہور کی بدنام ترین گلی تھی..

ایک بُلند ٹیلے یا ٹبے پر واقع ایک ٹبّی گلی تھی..

یہاں آج بھی دنیا کا سب سے قدیم پیشہ ہوتا ہے۔ یہاں جو مجبور اور حالات کی ہلاک کردہ عورتیں پیشہ کرتی تھیں، وہ ہرگز گندی نہ تھیں، یہاں پر آنے والے مرد گندے تھے، انہوں نے اسے گندا کر دیا۔ ان کی گلیاں کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی ہیں اس کے باوجود کہ وہ خود بے ایمانی، تعصّب اور منافقت کی غلاظت میں لتھڑے ہوئے ہیں، اپنی خواتین کو ایک مذہبی قید میں رکھتے ہیں اگرچہ ان میں سے کچھ کی اخلاقیات ان خواتین سے بدتر ہیں اور اس کے باوجود یہ عورتیں اور ان کی گلی گندی ہے..

ہم اس گلی میں داخل ہوئے تو یہ لاہور کی دیگر گلیوں کی نسبت ستھری تھی، ہرگز گندی نہ تھی..

-

ابھی سویر تھی، اس کے مکین اپنی کوٹھڑیوں کی جھاڑ پونچھ کر رہے تھے، ایک درمیانی عمر کی خوش شکل عورت اپنی کوٹھڑی میں جھاڑو دیتی باہر آئی اور ہم پر ایک نفرت کی نگاہ کی کہ تم لوگ تو رات کی تاریکی میں آتے ہو، صبح سویرے کہاں چلے آئے اور منہ موڑ کر کوٹھڑی کی تاریکی میں واپس اتر گئی اور وہ ہرگز ایک گندی عورت نہ لگتی تھی، ایک عسرت زدہ گھرانے کی گھریلو عورت لگتی تھی.. بیشتر کوٹھڑیوں کے آگے دروازے نہ تھے، آہنی شٹر گرے ہوئے تھے جیسے وہ عام سی دکانیں ہوں... پرچون کی، منیاری کے سامان، نالے پراندوں اور چوڑیوں اور پھل فروٹ کی دکانیں ہوں لیکن وہاں پھل فروٹ تو فروخت ہوتے تھے پر جنس اور ہوس کے ہوتے تھے اور

ان کے خریدار رات کی تاریکی میں چلے ہی آتے تھے..

لگا ہے جنس کا بازار دیکھو..

یہ وہ بازار مصر تھا جہاں یوسف کا حسن نہیں، زلیخا کا حسن برائے فروخت تھا..اس گلی کے مکین ہمہ وقت ڈرے ڈرے سے رہتے ہیں کہ جانے کون اس گلی میں آ نکلے، ہماری تشہیر کر دے اور کوئی مقدس قانون حرکت میں آ جائے اور ہمیں بھیڑ بکریوں کی مانند ہانک کر پولیس سٹیشن لے جائے، تو جونہی کوئی اجنبی لوگ اس گلی میں داخل ہوتے ہیں تو کوئی ایک مکین، کوئی فقیر، کوئی خوانچہ فروش پکارتا ہے..چائے گرم، چائے گرم وغیرہ..اور یہ صدا کسی اور شخص تک جاتی ہے تو وہ خبردار کرتا ہے کہ چائے گرم، چائے گرم..یعنی ہوشیار..ان اجنبیوں سے پردہ پوشی کر لو..چنانچہ چند ایک دروازے بند ہونے لگتے ہیں، شٹر گرنے لگتے ہیں..

میرے ناول ''اے غزالِ شب'' کا ایک کردار قادر قاسمی جو ماسکو میں مختلف قومیتوں کی گوریاں ممالک غیر میں سپلائی کرتا ہے، وہ اسی گندی گلی میں شب و روز بسر کرتا تھا..تب میں نے محض سُنی سنائی کو تصور کر کے اس گلی کو ناول میں نے بیان کیا تھا، آج دیکھا تو کھلا کہ یہ وہ گلی تو نہیں جس کی تصویر کشی میں نے کی، یہ تو کوئی اور گلی تھی جو ہرگز گندی نہ تھی..

یہ ممکن ہی نہیں کہ تاج محل کا ذکر آئے اور ساحر لدھیانوی یاد نہ آئے، ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق، یاد نہ آئے اور یہ بھی ممکن نہیں کہ جہاں کہیں عورت فروخت ہوتی ہو، کوٹھے، چکلے اور مجبوری کے گھنگھرو چھنکتے ہوں، رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے وہاں ''چکلے'' یاد نہ آئے..ساحر، اقبال سے بغاوت نہ کر دے، کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے..

''چکلے''

یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثنا خوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں؟
یہ پُر پیچ گلیاں یہ بے خواب بازار
یہ گمنام راہی یہ سکّوں کی جھنکار
یہ عصمت کے سودے یہ سودوں پہ تکرار
ثنا خوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں؟
تعفن سے پُر نیم روشن یہ گلیاں

یہ مَسلی ہوئی اَدھ کِھلی زرد کلیاں
یہ بکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟
وہ اُجلے دریچوں میں پائل کی چھن چھن
تنفس کی اُلجھن پہ طبلے کی دھن دھن
یہ بے روح کمروں میں کھانسی کی ٹھن ٹھن
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟
یہ گونجے ہوئے قہقہے راستوں پر
یہ چاروں طرف بھیڑسی کھڑکیوں پر
یہ آوازے کھنچتے ہوئے آنچلوں پر
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟
یہ پھولوں کے گجرے یہ پیکوں کے چھینٹے
یہ بے باک نظریں یہ گستاخ فقرے
یہ ڈھلکے بدن اور یہ مدقوق چہرے
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟
یہ بھوکی نگاہیں حسینوں کی جانب
یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ سینوں کی جانب
لپکتے ہوئے پاؤں زینوں کی جانب
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟
یہاں پیر بھی آ چکے ہیں جواں بھی
تنومند بیٹے بھی، ابا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے ماں بھی
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟
مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی اُمت، زلیخا کی بیٹی

ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟
بلاؤ خدایانِ دیں کو بلاؤ
یہ کوچے، یہ گلیاں، یہ منظر دکھاؤ
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ
ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

ساحرلدھیانوی کی ''ثناخوانِ مشرق کہاں ہے'' اپنی جگہ لیکن اُن کے ایک قریبی دوست شاعری کے سحر میں اُن کی برابری کرتے ہوئے، میرے دوست اور وہ بھی شاعر ڈاکٹر انیس احمد کے سگے چچا، احمد ریاض ابھی تک گمنام، چک جھمرا میں ان کی قبر بھی گمنام اپنے واحد مجموعہ کلام ''موجِ خُوں'' میں دل کو خُوں کرنے والے شعر ''طوائف اور شاعر'' کے عنوان سے یوں درج کرتے ہیں کہ وہ میرے دل کی افسردگی اور شرمندگی کی تصویر ہوتے ہیں، گویا کہ شاعر نہیں میں خود ہوں، اپنا موازنہ گندی گلی کی بدن فروشوں سے کر رہا ہوں..

''طوائف اور شاعر''

جہاں کا ذوقِ طوائفیت ہر اک حسیں شے خریدتا ہے
تو کیفِ نغمات بیچتی ہے میں حسنِ افکار بیچتا ہوں
تجھے بھی مجبوریٔ طلب ہے تو زلف و رخسار بیچتی ہے
مجھے بھی مجبوریٔ طلب ہے میں اپنے اشعار بیچتا ہوں
ترا تقدس، مری شرافت، نہ تیرے بس میں نہ میرے بس میں
تُو روحِ مغرور بیچتی ہے میں ذہنِ خوددار بیچتا ہوں
تری حمیت کا مول چشمِ ہوس کا اِک آتشیں تبسم
میں اپنی حرمت کے موتیوں کو درونِ بازار بیچتا ہوں
نہ تیرے وعدوں کی کوئی قیمت، نہ میری قسموں کی کوئی اُجرت
تو عہد و پیمان بیچتی ہے میں قول و اقرار بیچتا ہوں
تیری جوانی لٹی لٹی سی، مری جوانی گھٹی گھٹی سی
تو حسن اور جسم بیچتی ہے میں عشق اور پیار بیچتا ہوں
تو نیشِ تہذیب سے ہے چھلنی میں جورِ آداب سے ہوں زخمی

تو لذتِ درد بیچتی ہے میں لطفِ آزار بیچتا ہوں
تری دکاں میں ہیں تیرے اجداد کی وراثت کے تیز نشتر
میں اپنے ماضی کی سازشوں کے رموز و اسرار بیچتا ہوں
تو اپنے ماحول کی بھکارن، میں اپنے حالات کا بھکاری
تو اپنا کردار بیچتی ہے میں اپنا کردار بیچتا ہوں

اور اُس گلی میں ایک خوش مزاج شخص ایک ''ٹیٹو سٹوڈیو'' کھولے بیٹھے تھے.. آپ کیسے کیسے ٹیٹو اپنے بدن میں کھدواتے تھے اُن کی تصویریں آویزاں تھیں.. گُل بوٹے، غیر ملکی حسینائیں اور مذہبی نعرے وغیرہ تو مجھے ''خس و خاشاک کے زمانے'' کی ایک کردار شباہت کی یاد آ گئی جس نے ایک ہاتھی کا ٹیٹو اپنے بدن کے ایک نازک مقام کی قربت میں نقش کروا رکھا تھا..

وہ خوش مزاج ٹیٹو آرٹسٹ مجھے پہچان گیا اور میں نے پوچھا ''یہاں کون لوگ اپنے بدن پر ٹیٹو بنوانے کے لیے آتے ہیں؟''

''بس جی، روشن خیال لوگ آتے ہیں..''

''عورتیں بھی آتی ہیں؟''

وہ مسکرانے لگا..

اندرون شہر غالباً یہ ٹیٹو آرٹسٹ واحد تھے جو یہاں کے مکین اپنے بدنوں پر کیسے ٹیٹو کھدواتے ہوں گے.. شاید..

''میں ایک گندی عورت نہیں ہوں.. تم گندے ہو..''

''چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے..''

''کبھی ہم بھی خوبصورت تھے..''

''رزق حلال میں برکت ہے..''

تب میں نے کواڑ سے لگی ایک لڑکی کا چہرہ دیکھا.. بس ایک پل کے لیے دیکھا اور وہ میرے بدن پر نقش ہو گیا.. اُس کی رنگت گوری تھی جس میں اُس کی دونوں آنکھیں سیاہ تتلیوں کی مانند پھڑ پھڑاتی تھیں اور پھر وہ کواڑ بند ہو گیا، وہ ہرگز ایک گندی لڑکی نہ تھی، میں تھا جس کی آنکھوں میں گندگی آ گئی تھی..

گندی گلی نے مجھے شرمسار کر دیا، سوگوار کر دیا..

''جب ہیرا منڈی اپنے موجودہ مقام پر آباد ہوئی تب کشمیر، کابل اور علاقہ غیر سے لاہور کے ٹکسالی

بازار میں لاکر جن عورتوں کو فروخت کیا جاتا اُن کے بیوپاری یہی کہتے کہ وہ انہیں خرید کر لائے ہیں، ان میں سے کچھ کے ساتھ کچھ بدہیئت اور بدقماش نوعیت کے لوگ نکاح کر لیتے اور کچھ کو ہیرا منڈی کے دلال خرید لیتے..خاندانی کنجر لوگوں نے پابندی لگائی ہوئی تھی کہ ہیرا منڈی کے کوٹھوں پر دھندا نہیں ہوگا، صرف ناچ گانا ہوگا چنانچہ ''خاندانی'' طوائفیں صرف رقص کرتیں اور اگر شب بسری کرتیں تو صرف اُس شخص کے ساتھ جن کی وہ رکھیل ہوتیں..

علاقے کا رئیس اور آنریری مجسٹریٹ میاں حمید نام کا کوئی معتبر تھا جو ٹکسالی سے لے کر بازار شیخوپوریاں تک بیشتر کوٹھوں اور دکانوں کا مالک تھا..میاں حمید کو کسی نے مزید آمدن کی راہ دکھائی جس کے تحت اُس نے ایک کٹڑی یا محفوظ محلہ تعمیر کیا جس کی گیارہ گلیاں تھیں، ہر گلی کے دونوں جانب کوٹھی خانے، ہر کوٹھی خانہ تین منزلہ، ہر منزل پر تین کوٹھڑیاں جن کی کھڑکیاں گلی میں کھلی تھیں اور ہر کھڑکی..میں ایک رنڈی، ایک بدن فروش بنی ٹھنی گاہکوں کے انتظار میں..(گویا یہ اُن زمانوں کا ایک ایسا سپر سٹور تھا بلکہ سپر مارکیٹ تھی جہاں بدن فروخت ہوتے تھے) یہاں بدن فروشی کے لیے لائسنس حاصل کرنا پڑتا تھا اور اسے جاری کرنے کا پروانہ بھی میاں صاحب کے پاس تھا.عزیز تھیٹر بھی میاں حمید کی ملکیت میں تھا..دلالوں کو خدشہ ہوتا تھا کہ یہ مجبور عورتیں کہیں فرار نہ ہو جائیں تو گئی رات کو جب ان کوٹھڑیوں کا کاروبار اختتام پر پہنچتا تو ان عورتوں قیدیوں کی مانند بند کر دیا جاتا، دھندا کرنے والیوں کو آتشک ایسی بیماری لگ جاتی تو بھی انہیں اس کا علاج کروانے کی خاطر باہر جانے کی اجازت نہ دی جاتی، میاں صاحب کا ایک کارندہ جس کا نام حکیم اللہ دتہ قصوری تھا، وہ ان عورتوں کو جلاب دے کر تندرست کرنے کی کوشش کرتا..کوئی ایک آدھ رنڈی صحت یاب ہو جاتی اور جو نُچڑ نُچڑ کر مر جاتی اُس کی لاوارث لاش میاں معصوم شاہ کے مزار کے باہر رکھ دی جاتی، ٹبی گلی کے کچھ خدا ترس دلال خیرات کرتے اور ان کے کفن دفن کا بندوبست کر دیا جاتا..

ٹبی گلی کی رنڈیاں کبھی ہیرا منڈی سے نہ گذرتیں کیونکہ ہیرا منڈی کے خاندانی لوگ اُن پر لعنت بھیجتے کہ یہ تو ٹبی کا مال ہے، ان کوٹھی خانوں کی رنڈیوں کو تماش بین لوگ اور یہ سب کم حیثیت مزدور پیشہ لوگ ہوتے تھے، نگ، مال، دانہ یا پٹولا کے نام سے پکارتے..بعد ازاں زمانے جدید ہو گئے اور انہیں ''پیس'' کہا جانے لگا..جو بدن فروش گھوم پھر کے گاہک تلاش کرتی تھی، وہ گشتی کہلاتی تھی اور شریف محلے کا کوٹھی خانہ، چکلہ کہلاتا تھا..

(نین سکھ کے پنجابی ناول ''مادھولال حسین، لہور دی ویل'' سے اخذ شدہ اقتباس)..

ہیرا منڈی کا علاقہ بھی جانے کیوں بازارِ حسن کہلاتا ہے..لیکن ٹبی گلی تو بازارِ آتشک اور شرمناک

مجبوری تھا، بازارِ موت تھا اور سب کے سب بیوپاری ماشاءاللہ مرد حضرات تھے.. جو عورت سے صرف اس لیے برتر تھے کہ بقول راجندر سنگھ بیدی اُن کے پاس ایک ڈیڑھ انچ کے مغروری تھی.. آج بھی وہ اس ڈیڑھ انچ کی مغروری کے بل پر مقدّس حوالوں کے بل پر عورت کو پنجروں میں بند کر کے فروخت کرتے ہیں.. انہیں مالِ غنیمت قرار دے کر لونڈیاں بنا لیتے ہیں، سکول کی بچیوں کو اغوا کر کے اُن کے ساتھ اگر وہ خوش بخت ہوں تو جہادی نکاح کر لیتے ہیں یا پھر سرِ بازار انہیں بیچ کر اپنی آخرت سنوار لیتے ہیں..

مجھے علم نہ تھا کہ ٹبّی گلی کی رنڈیاں جب مرد کے عطا کردہ مہلک امراض میں مبتلا ہو کر مر جاتی ہیں اور ان کی لاوارث لاش میاں معصوم شاہ کے مزار کے باہر رکھ دی جاتی ہے پھر بہت خدا ترس مرد دلال خیرات کرتے، اپنی عاقبت سنوارنے کا مکمل بندوبست اُن کے کفن دفن کا بندوبست کر دیتے ہیں تو انہیں کہاں دفن کیا جاتا ہے.. کسی قبرستان میں گندی گلی کی ان گندی عورتوں کو دبا دیا جاتا ہے.. تو کیا بعد از تدفین ان کی مغفرت کے لیے کوئی دعا کرتا تھا، مشکل ہے کہ عمر بھر سنگ زنی کرنے والے ہاتھ اُن کے لیے دعا میں اٹھتے ہوں.. ان کی قبر پر کون چراغ جلانے آتا ہوگا.. مجھے علم نہ تھا.. اگر ہوتا تو میں ہوتا جوان کی ڈھیری کے سرہانے کھڑے ہو کر اُن کے لیے فاتحہ پڑھتا، وہاں چراغ جلاتا، معافی کا خواستگار ہوتا کہ یہ میں ہوں ایک مرد، جس نے تمہیں کشمیر، کابل اور علاقہ غیر سے اٹھایا اور یہاں گندی گلی میں لا بٹھایا.. تمہیں اپنی عیش کی خاطر مہلک جنسی بیماریاں لگا دیں.. یہ میں ہوں..

اور مجھے اُس گندی گلی کی ایک کوٹھڑی میں مکین اُس خوب رُو اور گوری چٹی لڑکی کا خیال آتا تھا جسے دیکھ کر میری آنکھوں میں گندگی بھر گئی تھی.. وہ بھی تو یونہی کبھی نہ کبھی معصوم شاہ کے مزار کے سامنے ایک لاوارث لاش کی صورت مُردہ پڑی ہوگی تو اُسے کون کفنائے اور دفنائے گا.. جو کبھی ایک پٹولا تھی..



"شیخوپوریاں بازار میں نور جہاں اور عشق لہر"

یہ بادامی آنکھوں والا ملک سرفراز تھا جو ہمیں ٹھّی گلی سے باہر آتے ہی شہابے حلوہ پوڑی کی دکان پر ناشتے کے لیے لے گیا، بقول اُس کے اندرون شہر میں تین حلوہ پُوڑی کے شہنشاہ تھے..

شہابا جو حیرت انگیز طور پر ایک بھیا، ایک اہل زبان تھا. شہابے نے ابھی تک اپنی نستعلیق زبان دانی اور لہجے کو قائم کر رکھا تھا، وہ کسی حد تک ایک لکھنوی لہجے میں گاہکوں سے مخاطب ہوتا تھا "اجی حضور قدم رنجہ فرمایئے، سرکار چلے آیئے، اپنی جاں پیش کروں یا اپنی کڑکتی ہوئی پوری اور جانِ جاں حلوہ پیش کروں.. ذرا میرے ہاں کی قیمے کی ٹکیا تو چکھ لیجیے، جو کچھ آج تک چکھا ہے اُسے بھول جایئے گا حضورِ انور."

تو کیا عادل، ڈاکٹر نسیم، کرنل عامر، عاتف، فہد، قریشی صاحب، قاضی جاوید سب کے سب شہابے کی پُوڑیوں، چنوں، اچار اور قیمے کی ٹکیوں کے اسیر ہوئے..

ہم شیخوپوریاں بازار میں تھے..

یہاں شُوز اور خاص طور پر تلے دار جوتیوں اور کھسّوں کی متعدد دکانیں کھلی تھیں ایک دکان کے باہر ایک اپنے آپ میں گم شدہ بوڑھا کھڑا تھا جسے دیکھ کر جاوید نے سرگوشی کی کہ "سر.. یہ صاحب حضوری باغ کے لاہوری شاعروں میں شرکت کرنے والے صاحب ہیں."

بادشاہی مسجد اور شاہی قلعہ کے درمیان میں وہ باغ اور اُس کے درمیان میں ایستادہ سنگ مرمر کی پویلین جسے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے تاریخی مغل عمارتوں کو اکھاڑ کر اُن کے سنگ مرمر کو یہاں ایستادہ کر دیا، حضوری باغ میں اُن زمانوں میں تو تقریباً ہر شام مقامی شاعر اور داستان گو اکٹھے ہوا کرتے تھے اور مجھے ان اوپن ایئر محفلوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ہے.. بیشتر شاعر کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہوتے تھے، دن کے وقت کباب بیچتے جیسے استاد گام، کسی معمول سے پیشے سے منسلک ہوتے جیسے استاد عشق لہر اور شام ہوتی تو حضوری باغ میں چلے آتے، یاد رہے کہ پنجابی کے داستانوی شاعری استاد دامن بھی اگرچہ دعویٰ کرتے تھے لیکن پڑھے لکھے نہ تھے اور درزی کا کام کرتے تھے.. چنانچہ میں نے فوری طور پر اس شخص سے ملنے کی خواہش

کی اور وہ مجھے جانتا تھا، بسم اللہ اور جی آیاں نُوں کہتا اپنی جوتیوں کی دکان میں لے گیا..

رشید چوہدری نے اپنے شعر سنانے سے اجتناب کیا، دو چار سنائے اور پھر کہنے لگا، میری کیا حیثیت، استاد عشق لہر اور استاد گام کے سامنے میری کیا حیثیت..

روایت ہے کہ استاد گام جب کبھی مشاعرے میں جاتے ان کے ہمراہ ان کے کچھ چاہنے والے ہاکیوں سے مسلح ہو کر ان کے دائیں بائیں چلتے، کسی کی جرأت نہ تھی کہ استاد گام شعر پڑھیں تو وہ ''بے اختیار'' داد نہ دے.. اسی لیے جب ان سے پوچھا گیا کہ استاد جی، بڑا شاعر کون ہوتا ہے تو انہوں نے فرمایا ''جس کے ساتھ ہاکیوں والے زیادہ ہوں..''

استاد کا یہ فرمان ویسے آج بھی ایک کھرا سچ ہے، ان دنوں ہاکیوں والوں کی جگہ ان کے مریدوں اور کالم نگاروں نے لے لی ہے..

کہا جاتا ہے کہ ہاکیوں والوں کی موجودگی کے باوجود جب استاد شعر پڑھنے آتے تو بدطینت مخالفین اور حاسد نعرے لگاتے کہ..گام کبابیا ہے..کباب بیچتا ہے تو استاد نے طیش میں آ کر کیا ہی قادرالکلامی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ شعر کہا جو آج بھی لاہور کے اہل ذوق کو ازبر ہے جو کچھ یوں ہے..

کوئی اَن ویچے، کوئی فن ویچے
لوکی کہندے نیں گام کبابیا اے
گام کباب نہ ویچے تے.....ویچے
آپ فِل ان دے بلینکس، کر سکتے ہیں تو کر لیجئے..

میں نے اس شعر کے بارے میں رشید چوہدری سے پوچھا تو وہ مسکرا دیا ''تارڑ صاحب.. یہ تو استاد نے اپنی استادی کا مظاہرہ کیا تھا ورنہ انہوں نے بہت کمال کی شاعری کی ہے، چنانچہ انہوں نے نہ صرف استاد گام اور استاد عشق لہر کے چند شاندار شعر سنائے بلکہ انہیں کرم امرتسری کا بھی بہت سا کلام ازبر تھا..

رشید چوہدری، ہیرا منڈی اور ٹبّی گلی کا پرانا باسی تھا اور اسے اس علاقے کی تاریخ سے بہت شناسائی تھی، اس کا کہنا تھا کہ رقص کرنے والی، گلوکاراؤں اور طوائفوں کے ڈیرے اور بستیاں بدلتی رہتی تھیں.. انگریزوں کے عہد میں ان کے ڈیرے شہر سے باہر ہوتے تھے اور جب آبادی رینگتی ہوئی ان کی آماجگاہوں تک پہنچ جاتی تھیں تو انہیں پھر سے شفٹ کر دیا جاتا تھا اور غلام عباس کا افسانہ ''آنندی'' بھی تو یہی داستان تھی.. اور ہاں اردو کے یہ نامور افسانہ نویس انہی ہیرا منڈی بستیوں میں پیدا ہوئے.. منٹو اور بیدی کے علاوہ

جس شخص نے طوائفوں اور ہیرامنڈی کے حوالے سے یادگار افسانے ''نیلی بائی'' جیسے لکھے وہ رحمان مذنب تھا پر اُس کا چرچا نہ ہوا.. مذنب صاحب اکثر چیمبرلین روڈ پر واقع میری دکان ''کسان اینڈ کمپنی'' میں قدم رنجہ فرمایا کرتے تھے.. وہ شاید ایک امام مسجد کے بیٹے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ ہمارا گھر یوں جانئے کہ ایک سرحد پر واقع تھا.. ادھر لاہور کی ''شرافت'' کا اختتام ہوتا تھا اور اُدھر گھنگھروؤں کی چھنک کا آغاز ہوتا تھا.. چنانچہ میں ایک ایسے ماحول میں پلا بڑھا کہ ایک کان میں اذان کی صدا بلند ہوتی تھی اور دوسرے کان میں پائل کے گیت چھم چھم کرتے اترتے تھے..

مذنب صاحب نے تب جب کہ میں کچی عمر کا تھا، عشق کیا ہے، خلل ہے دماغ کا، کیا ہے، مجھ پر آشکار کیا کہ.. میں ایک طوائف پر عاشق ہو گیا اور میں بہت برس اُس کے کوٹھے کی سیڑھیوں تلے منتظر رہتا کہ کب آخری گاہک اترے اور میں اوپر جا کر چند لمحوں کے لیے اُس کا چہرہ دیکھ لوں، یہ عشق عشق ہے عشق..

شہابے کے پُوڑی بازار کے تقریباً سامنے ایک نیلی محرابوں سے تزئین شدہ نہایت پرکشش عمارت کے نیلے آثار تھے اور جاوید کا کہنا تھا کہ گئے بیت چکے زمانوں میں نور جہاں نے بھی یہاں کوٹھا کیا، کچھ عرصہ یہاں ڈیرہ ڈالا اور مجھے یہ بیان مخدوش سا لگا تو میں نے دانائے راز چوہدری صاحب سے رجوع کیا..

''ہاں جی.. نور جہاں نے ایک مختصر مدت کے لیے یہاں قیام کیا تھا، کوٹھا کیا تھا، یہاں ابھی تک کچھ لوگ ہیں جو گواہی دے سکتے ہیں..''

یہ روایت اب بھی مجھے مخدوش سی لگتی ہے.. لیکن کیا پتہ.. ملکہ پکھراج کے بارے میں بھی تو ایک روایت ہے کہ وہ کبھی یہاں ہار سنگھار کر کے بیٹھا کرتی تھیں.. دراصل ہمارے ذہن میں اس علاقے کے بارے میں بہت پراگندگی اور پارسائی کا تعصب ہے.. ہیرامنڈی کی طرف ایک گلی، تھی گلی، بدن فروش عورتوں کی تھی، بقیہ علاقے میں جو کوٹھے، چوبارے اور بیٹھکیں تھیں وہ رقص اور گائیکی کے فن کی آماجگاہیں تھیں، جس کسی گلوکار یا گانے والوں نے سُر سنگیت کے جادو جگانے کے فن کو ثابت کرنا ہوتا تھا وہ ان کوٹھوں پر آ بیٹھتا تھا.. بڑے غلام علی خان، امانت علی خان، خورشید پاؤنڈاں والی، عنایت بائی ڈھیرو والی. فریدہ خانم..

ہم شیخوپوریاں بازار میں تھے..

''ایک زمانے میں شیخوپورہ سے بہت سی گانے والیوں اور طوائفوں نے بہتر مستقبل کے لیے اپنے آپ کو یہاں منتقل کیا تو اس نسبت سے یہ شیخوپوریاں بازار کہلایا..''

میں نے رشید چوہدری کا شکریہ ادا کیا، وعدہ کیا کہ کبھی میں ان کی دکان سے اپنے بچوں کے لیے کھسّے خریدنے آؤں گا اور قافلہ پھر سے رواں ہو گیا..



''میرے ابّا جی مجھے ہیرا منڈی لے کر آئے تھے..''

ذرا ٹھہریئے میں ہیرامنڈی کی کچھ گم گشتہ یادیں تازہ کرلوں..اس بازار سے میری بہت پرانی شناسائی تھی، میں پہلی بار شاید چھ برس کی عمر میں اپنے ابا جی کے ہمراہ یہاں آیا تھا..

جی ہاں، میرے ابا جی مجھے ہیرامنڈی لے آئے تھے..

تب ہم چیمبرلین روڈ پر واقع ایک شاندار چوبی گیلریوں والے سہ منزلہ مکان میں رہتے تھے.. منٹو پارک میں شاید تحریک پاکستان کے حوالے سے ایک جلسہ تھا اور ابا جی مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے.. گھر واپسی پر ہم ایک ایسے بازار میں سے گذرے جس کے چہرے، آوازیں، صدائیں اور خوشبوئیں، لاہور کے سب بازاروں سے مختلف اور پرکشش تھیں، ابا جی نظریں جھکائے چلتے جاتے تھے اور انہوں نے کہا ''بیٹا.. یہاں اچھے لوگ نہیں آتے، یہ ہمارے گھر کا مختصر راستہ ہے اس لیے ہم یہاں سے گذرتے ہیں..''

اور یہ فقرہ میرے ذہن پر ثبت ہو گیا ''یہاں اچھے لوگ نہیں آتے..''

انگلستان میں ایک طویل آوارہ گرد قیام کے بعد لاہور لوٹا تو ایک شب میرے بچپن کا ایک دوست، نام ظاہر کرنا مناسب نہیں، اسے کمال شاہ کہہ لیجئے وہ میری اداسی دور کرنے کی خاطر مجھے ہیرامنڈی لے گیا اور وہاں اُس کی بہت شناسائیاں تھیں، وہ ایک مقبول شخصیت تھا کہ وہ ان خواتین کے چھوٹے موٹے کام کرتا رہتا تھا یہاں تک کہ اگر وہ اپنے بچے کو سکول داخل کروانے کے لیے لے جاتی ہیں تو باپ کے خانے میں بے دھڑک اس کا نام لکھوا سکتی ہیں، ہم دو کوٹھوں پر گئے جہاں اس کا صدق دل سے استقبال کیا گیا..ان میں سے ایک اپنے زمانے کی کوئی مشہور رقاصہ تھی اور اس نے ایک پاکستانی فلمی گانے پر مناسب رقص کیا..دوسرے کوٹھے والی نے شاہ صاحب کو باقاعدہ بازار میں اتر کر کمال شاہ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی، اس پر بھی شاہ صاحب کا کوئی احسان تھا اور وہ ایک مفلوک الحال قسم کی اگرچہ شکل والی طوائف تھی..میں نے نوٹ کیا کہ وہ ہر رقص کے اختتام پر کسی بہانے پچھلے کمرے میں جاتی ہے، کمال جانتا تھا کہ وہاں اُس کا بچہ چارپائی پر ماں کے بغیر ہے اور وہ اسے کبھی لاڈ کرنے اور کبھی دودھ پلانے جاتی ہے..اور میں شدید طور پر ایک حسیاتی صدمے سے دوچار ہوا اور پھر وہ دن اور آج کا دن، میں کبھی اُس بازار میں مُجرا دیکھنے کے لیے نہیں گیا..ایک شب میرے

عزیز دوست ڈاکٹر محمد رمضان ہمیں ''پھجے کے پائے'' کھلانے کے لیے اُس بازار میں لے گئے.. ہماری بیگمات بھی ہمارے ہمراہ تھیں، اور وہاں کی شبینہ رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے جو تماشبین گلے میں موتیے کے ہار ڈالے، عطر لگائے پھرتے تھے وہ ہماری کار میں جھانک کر عجیب سے فقرے کستے تھے اور ہم نے توبہ کی کہ محض پائے کھانے کی خاطر ہم نے اپنی منکوحہ جات کے حوالے سے ایسی نازیبا باتیں سنیں اور منکوحہ جات نے بھی گھر واپس آ کر ایسی جگہ لے جانے پر ہماری جو دُرگت بنائی وہ بھی بے مثال تھی..

آخری بار میں اپنے ٹیلی ویژن سیریل ''ایک حقیقت سو افسانے'' کے ایک ڈرامے کی شوٹنگ کے لیے ایک شب وہاں گیا، ایک صحافی کے کردار میں، مجھے کچھ کوٹھوں پر جانا تھا، اُس بازار میں کچھ مشاہدہ کرنا تھا اور جب میرا شوٹ ختم ہو گیا اور ایک اور کردار کی شوٹنگ کا آغاز ہو گیا تو میں نے وقت گذاری کے لیے، اور اُس لمحے ہیرا منڈی اپنے جوبن پر تھی، روشنیاں، کوٹھوں میں سے چھنکتی پائل اور ہارمونیم کی آوازیں، طبلے کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھم چھم، موتیے اور عطر کی مہک، پان کی گلوریاں، کھمبوں کی روشنی تلے بنی سنوری بدن فروش عورتیں، منکتے ہوئے خواجہ سرا اور پان کی پیک تھوکتے، آنکھوں میں سرمہ لگائے دلال.. خوراک کی دکانیں اور خاص طور پر پان سگرٹ کے کھوکھے رونق ہی رونق تھے.. چنانچہ محض وقت گذاری کی خاطر کہ شوٹنگ مکمل ہونے پر ہی ٹیلی ویژن کی ویگن نے مجھے گھر لے جانا تھا، میں خریدار تو نہیں تھا لیکن اُس دنیا میں تھا.. اس کے باوجود کہ میں رزق روزگار کی آفیشل ڈیوٹی کی مجبوری میں یہاں آیا تھا لیکن میں ہمہ وقت مجرم محسوس کرتا رہا.. ابا جی نے کہا تھا کہ یہاں اچھے لوگ نہیں آتے.. یہ کچو کے مجھے تب بھی لگتے رہے جب میں برسوں پہلے کمال شاہ کے ہمراہ یہاں آیا تھا.. البتہ اس ہیرا منڈی سے ملاقات کا ایک پرلطف اگرچہ شرمندگی سے لبریز پہلو بھی تھا.. چونکہ ان زمانوں میں، میں اداکاری کے حوالے سے ایک نابالغ سا سپر سٹار تھا اور بہت پہچان رکھتا تھا چنانچہ میں بے مقصد منہ اٹھائے چل رہا ہوں تو کسی کوٹھے پر بنی سنوری کوئی سنوریا مجھے پکارتی ہے، صدقے جاؤں، آپ تو ہمارے ہو اور ہم سے ہی آنکھ نہیں ملاتے، آ جاؤ.. ایک ترچھی ٹوپی والے صاحب، کوئی موسیقار لپکتے ہوئے آتے ہیں اور کوکا کولا کی ایک ٹھنڈی بوتل پیش کرتے ہیں اور لچک کر کہتے ہیں ''انہوں نے بھیجی ہے'' اور میں پوچھتا ہوں کہ ''کون اُن نے بھیجی ہے'' تو وہ نظروں سے ایک بالکونی کی جانب اشارہ کرتے ہیں اور وہاں ایک موٹی سی ادھیڑ عمر اگرچہ بنی ٹھنی خاتون مسکراتی ہیں.. ''تارڑ جی، پیاسے نہ چلے جانا..'' میں نے یوں عنایت کردہ کم از کم تین بوتلیں حلق میں اتاریں اور پھر کان لپیٹ کر ٹیلی ویژن کی ویگن میں آ بیٹھا..

دراصل ٹیلی ویژن پر ایک اداکار ہونے کی حیثیت میں وہ مجھے کسی حد تک اپنا سمجھتی تھیں، ہم پیشہ سمجھتی تھیں، بلکہ ایک خاتون جو گاہکوں کی امید سے تھیں، اپنے بالا خانے سے اتر کر نہایت سادگی سے اور اِک ادا سے کہنے لگیں ''چلیے آئیے، آپ تو ہمارے خاندان سے ہو...''

کیا ایسے عبرت ناک تجربے کے بعد میں دوبارہ بہ قائمی ہوش وحواس ہیرا منڈی جا سکتا تھا..

اور اب ستتر برس کی قربت میں بڑھاپے نے یوں بھی ہوش وحواس کو جبری رخصت پر روانہ کر دیا تھا تو میں ایک مرتبہ پھر ہیرا منڈی چلا آیا تھا، اگرچہ یہ منڈی اجڑ چکی تھی اور اس کے باوجود میں مجرم محسوس کر رہا تھا کہ اباجی نے کہا تھا کہ یہاں اچھے لوگ نہیں آتے..بے شک صبح سویرے تھی، یہ بازار لاہور کے کسی اور اندرونِ شہر کے بازار سے مختلف نہ تھا لیکن وہاں گئے زمانوں کی پرچھائیاں تو تھیں، برصغیر کی نامور گلوکاراؤں، رقاصاؤں اور پکے راگ الاپنے والوں کی پرسوز صدائیں تو اس ہوا میں تھیں جو صرف مجھے سنائی دیتی تھیں..اس میں مجرم محسوس کر رہا تھا..

ہم رشید چوہدروی کی شاعرانہ دنیا سے الگ ہوئے جہاں ابھی تک استاد گام، استاد عشق لہر اور کرم امرتسری کے شعر گونجتے تھے اور شیخوپوریاں بازار میں چلنے لگے..

بائیں جانب ایک سہ منزلہ مکان نظر آیا جس کے در و دیوار اپنے بچھڑ چکے مکینوں کے لیے نوحہ کُناں تھے کہ یہ گھر لاہور کے سب سے بڑے محسن سرگنگا رام کا ہوا کرتا تھا، اور ان کا کوئی ایک گھر نہ تھا، کوئی ایک حویلی یا رہائش گاہ نہ تھی، لاہور شہر میں وہ وسیع جائیدادوں کے مالک تھے اور ان میں ایک وہ بنگلہ تھا، جس میں پنجاب کا پہلا کامرس کالج، ہیلی کالج آف کامرس قائم ہوا، یہ سرگنگا رام کے زمانہ کے ساتھ اپنے آپ کو بدلنے والے ذہن کا منصوبہ تھا کہ اگلے زمانے بینکنگ اور کامرس کے ہیں تو جب گورنر پنجاب نے اس منصوبے کی منظوری دے دی تو اُس میٹنگ میں اعلان ہوا کہ جونہی اس کالج کو قائم کرنے کے لیے کوئی مناسب عمارت دستیاب ہو گئی، کامرس کی کلاسوں کا آغاز ہو جائے گا، سرگنگا رام نے میز پر اپنی ذاتی رہائش گاہ کی چابیاں رکھیں اور کہا ''یہاں اس کامرس کالج کا آغاز کر دیں.'' اور وہ خود ایک اور گھر میں منتقل ہو گئے..

ایک اور تاریخی حیرت ہماری منتظر تھی..



''لاہور کا پہلا تھیئٹر، عزیز تھیئٹر اور پاکستان ٹاکیز''

ایک شکستہ ہو چکی عمارت کے ماتھے پر جاوید نے ہمیں متوجہ کیا کہ سر.. ذرا غور سے دیکھئے چونے کی چُنائی پر کچھ لکھا ہے.. پڑھا نہیں جاتا، اُبھر رہا ہے، مٹ رہا ہے، ذرا آنکھیں میچ کر دیکھئے..

بمشکل انگریزی میں کندہ کچھ حروف پڑھے گئے..

''عزیز تھیٹر..''

یہ شہر لاہور میں قائم کیے جانے والا پہلا تھیٹر ہال تھا جہاں یقیناً آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے سٹیج کیے گئے، پارسی تھیٹر اور کلکتہ سے آنے والے تھیٹر والوں نے لاہوریوں کے سامنے زندہ ناچ گانا پیش کیا اور جب پہلے خاموش فلمیں چلی آئیں اور ان کے بعد باتیں کرنے والی فلمیں چلی آئیں یعنی فلمیں باتونی ہو گئیں، تو عزیز تھیٹر بھی باتیں کرنے لگا..ٹاک کرتا ٹاکیز ہو گیا، بالآخر پاکستان ٹاکیز ہو گیا..

''عزیز تھیٹر'' کے اندر داخل ہوئے تو وہاں کسی اجڑ چکی تہذیب کی نشانیاں روبہ زوال تھیں، پاکستان ٹاکیز کی عمارت کی بالکونیاں اور داخلے کے دروازے شکستہ ہو رہے تھے..

ایک سرخ رنگت کے سینما میں داخل ہونے والے بوسیدہ دروازے پر ایک تختی آویزاں تھی ''لوئر سٹال-216 ٹکٹ 12 روپے''

ایک کونے میں، ایک مستقل طور پر بہتے نلکے کے پہلو میں اردو اور انگریزی میں ''فائر پوائنٹ Fire Point'' درج تھا..شاید اس سٹور میں تھیٹر میں آگ بھڑک اٹھنے کے موقع پر آگ سے نمٹنے اور اسے بجھانے کے سامان ہوا کرتے تھے..

ہمیں خدشہ تھا کہ کوئی ہمیں روک لے گا..

ایک سرخ دروازے کے آگے کرسی پر براجمان جیکٹ اور ایک گرم چادر میں لپٹا، ادھیڑ عمر، سفید مونچھوں والا شخص، اُس کے آگے ایک لڑکھڑاتی میز تھی اور اُس پر سینما میں داخلے کی ٹکٹوں کی ایک گٹھی پڑی تھی اور وہ اپنے آپ میں گم ایک لاپرواہ سا شخص تھا اور اُس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ زندگی نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا..

جاوید قاضی نے اپنی مونچھیں پھڑکا کر اُس شخص کی سفید مونچھوں سے پوچھا ''بزرگو کونسی فلم چل رہی ہے!''

''فوٹو داخلے پر لگی ہیں، دیکھ لو..''

''فلم کا نام کیا ہے؟''

''فوٹو لگی ہے..''

''ٹکٹ کتنے کا ہے؟''

''بارہ روپے کا..''

''فلم کتنے بجے شروع ہوگی؟''

''بارہ بجے..''

''لو جی ہر پاسے بارہ بج رہے ہیں..'' یہ فقرہ سعید بٹ کے علاوہ اور کون کہہ سکتا تھا. تب تنویر خواجہ نے قاضی جاوید کی بے چاری سی مونچھوں کی پھڑک کو پرے کیا اور اپنی دبیز اور گھنی مونچھوں کو پھڑ پھڑا کر ٹکٹ والے بابا جی سے کہا ''بزرگو.. عام حالات میں آپ کتنی ٹکٹیں فروخت کر لیتے ہیں؟''

ایک تو اُس شخص نے اپنے آپ کو بابا جی قرار دینے پر ناگواری کا اظہار کیا اور بولے ''یہی کوئی پچاس ساٹھ ٹکٹیں..''

اس پر تنویر خواجہ نے پیشکش کی ''بزرگو.. یہ تو کوئی چھ آٹھ سو کی رقم بنتی ہے، ہم آپ کو ہزار روپے پیش کرتے ہیں، ہمارے لیے خصوصی شو کا اہتمام کر دو..''

بابا بے قرار نے اس پیشکش کو حقارت سے ٹھکرا دیا ''فلم بارہ بجے چلے گی، اس سے پہلے نہیں..''

ہمیں خدشہ تھا کہ کوئی ہمیں روک لے گا.. بابا بے قرار یا اُس کے آس پاس منڈلاتے ہوئے کچھ مخدوش الشکل، ناراض اور غصیلے نوجوان..

کسی نے نہ روکا اور ہم ایک چرچراتا ہوا سرخ دروازہ دھکیل کر پاکستانی ٹاکیز بلکہ عزیز تھیٹر کے ہال میں داخل ہو گئے..

وہ ایک اور موہنجوڈارو تھا، ایک کھنڈر ہو چکا گئے زمانوں کا ایک تھیٹر تھا، اُس کی ہواؤں میں آغا حشر کے مکالمے گونجتے تھے، پارسی دوشیزاؤں کے گورے بدنوں کی مہک تھی.. بیشتر کرسیاں ٹوٹی ہوئی تھیں، فرش پراگندہ تھا، اور ہال کے اوپر ایسے بوکس یا خصوصی نشست گاہیں اپنی قدامت کی راکھ میں روپوش ہوتی تھیں.. ان ہال سے بلند منزلوں پر واقع خصوصی نشست گاہوں کے گرد سنہری آرائشیں ابھی تک ماند نہ ہوئی تھیں..

''کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ بابا بے قرار میری پیشکش کو قبول کر لیتے اور ہم ان کرسیوں پر براجمان ہو کر

کوئی فلم دیکھ لیتے..''خواجہ آزردہ ہو گیا..

جاوید سُریلا مسکرادیا''سر جی..یہ تو اچھا ہی ہوا..ان ٹوٹی پھوٹی کرسیوں کے اندر لاہور کے سب سے قدیم اور بزرگ کھٹمل قیام پذیر ہیں، اور وہ ان پر براجمان ہونے والی کسی بھی پشت کو برداشت نہیں کرتے.. ذاتی تجربہ ہے سر..اور یوں بھی یہاں با قاعدہ کوئی فلم نمائش نہیں ہوتی،ٹوٹے چلتے ہیں..لاہور کے قدیم شہر پر آبائی لاہوریوں کا نہیں،افغانوں کا قبضہ ہے،ضیاءالحق کے افغان جہاد کے نتیجے میں افغان یہاں پر قابض ہو چکے ہیں تو یہاں پشتو فلموں کے چُنیدہ ٹوٹے چلتے ہیں..''

''آئے ہیں اس گلی میں تو ٹوٹے ہی دیکھ لیں..''خواجہ ٹوٹوں کی خبر پر باغ باغ ہو چکا تھا..

''خواجہ،ہم شریف لوگ ہیں..''میں نے اُسے پیار سے ڈانٹا..

''جی بالکل سر..''وہ فوراً مودب ہو گیا''لیکن آپ گاہے بگاہے ہمیں یاد دلاتے رہا کریں کہ ہم شریف لوگ ہیں..''

میں لاہور کے سب سے اولین تھیٹر اور پھر سینما کے اندرون کا ماحول بیان نہیں کر سکا..بے شک کُرسیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور ان میں بزرگ کھٹمل قیام پذیر تھے،فرش اکھڑا ہوا تھا اور فضا میں ایک ناگوار بُو تھی جو چرس کی بھی ہو سکتی تھی لیکن..اس کے سوا وہاں بیت چکے زمانوں کی بوسیدہ ہوتی مہک بھی موجود تھی..میں تصور کر سکتا تھا کہ جب اسے تعمیر کیا گیا تھا تو شہر لاہور کا ایک سحر انگیز عجوبہ ہوگا..جب یہ نیا نکور ہوگا،قطار اندر قطار آرام دہ نشستیں،فرش پر دبیز قالین،بلند چھت نقش و نگار سے آراستہ دمکتی ہوئی اور پھر وہ بوکس جن کے آگے سنہری گُل بوٹے ایک شاہانہ انداز میں بجلی کے قمقموں سے زندہ ہوں گے،دیواروں میں نصب الیکٹرک پنکھے جوان دنوں کم کم ہوا کرتے تھے اور پھر وہ وسیع سٹیج جس پر آج ایک گندی سی سکرین تنی ہوئی تھی اور وہ پورے سٹیج کو ڈھانپتی نہ تھی،کناروں کے پیچھے کاٹھ کباڑ دکھائی دے رہا تھا تو جب ایک عام لاہوری اس حیرت کدے میں داخل ہوتا ہوگا تو گویا ایک پرستان میں داخل ہوتا ہوگا..اور جب اس کے افتتاح کے موقع پر سٹیج کا دبیز پردہ اٹھا ہوگا اور کسی ڈرامے کے اداکار ہاتھ سے پینٹ کردہ پس منظر کے آگے مختلف کاسٹیومز میں نمودار ہوئے ہوں گے تو اس لاہوری پر کیا گذری ہوگی..اُس نے شہر لاہور کا باسی ہونے کا فخر تو کیا ہوگا..عزیز تھیٹر کا افتتاح،ٹائی ٹینک کے افتتاح سے کم اثر انگیز اور شاندار تو نہ ہوگا..

شکستہ،کچھ اوندھی پڑی،پھٹی ہوئی گدیوں والی نشستوں کے درمیان چوہوں کی سیر گاہیں تھیں..جن کی موجودگی سرک سرک جاتی تھی..

پاکستان ٹاکیز کے نیم تاریک ہال میں بے شک چوہے سرکتے تھے اور کھٹملوں کے ڈیرے تھے لیکن وہاں عظمت رفتہ کی ماتمی سرگوشیاں بھی تھیں..کبھی ہم بھی خوبصورت تھے..

پاکستان ٹاکیز کے اُس بازار پر کھلتے داخلے کے اندر قائداعظم کا فرمان اتحاد، عقیدہ اور ڈسپلن جلی حروف میں درج تھا" پاکستان زندہ باد" بھی نمایاں تھا اور اُس کے عین نیچے اس فرمان کی نہایت ہوش ربا، نیم برہنہ، اشتعال انگیز تصویریں رنگین اُس کی تفسیریں تھیں، جو کچھ پاکستان ٹاکیز کی بوسیدہ سکرین پر ان دنوں متحرک ہوتا تھا اُس کی تعبیریں تھیں اور بیشتر پشتو زبان کی فلموں کے ٹکڑوں کی جلوہ افروزیاں تھیں اور ان افروزیوں کے دامن بھی اور سینے بھی چاک تھے، بے باک تھے..

شنیدہ کے بود مانند دیدہ..

بلو بکلا.. صائمہ خان سویٹ گرل کے روپ میں اور نظر بدڈور کیسے کیسے بدروپ میں، نمائش اور افزائش کے کیسے کیسے آپے سے باہر آتے ابل ابل کر باہر آتے روپ میں.. مہاتما گاندھی نے شاید اسی نوعیت کے فلمی پوسٹر کہیں دیکھ لیے تھے اور وہ شعبہ فلم کے ہمیشہ کے لیے مخالف ہو گئے تھے یہاں تک کہ احمد عباس نے انہیں خط لکھا کہ مہاتما جی.. ساری فلمیں ایسی نہیں ہوتیں، جیسے سارے انسان مہاتما نہیں ہوتے تو کسی ایک پوسٹر کو دیکھ کر پوری فلم انڈسٹری کو تو مطعون نہ کیجیے.. احمد عباس نے "آوارہ" ایسی لازوال فلم کا سکرپٹ لکھا اور کہا گیا کہ اگر وہ نہ ہوتے تو راج کپور نہ ہوتا..

تنویر خواجہ نے ایک مرتبہ پھر کہا کہ سرجی، ویسے آپ کی مرضی لیکن صرف عبرت حاصل کرنے کے لیے اگر ہم پاکستان ٹاکیز میں کچھ ٹوٹے دیکھ لیتے تو کچھ حرج نہ تھا.. زیادہ سے زیادہ اس صائمہ خان صالح خاتون کی کچھ حشر انگیزیاں دیکھ کر لاحول پڑھ لیتے.. ویسے آپ کی مرضی...

ہم پاکستان ٹاکیز کے باہر ایک مرتبہ پھر اس بازار میں آ گئے.. اب کدھر جانا ہے، کیا دیکھنا ہے.. بس یہی طے ہو رہا تھا کہ "وہ" آ گیا..

سنہری کشیدہ کاری کی ایک چادر اور نیلے رنگ کے سوٹ میں ملوث "وہ" مٹکتا ہوا آ گیا، گھونگھٹ اپنے چہرے سے پرے کیا اور مجھے کہنے لگا "صدقے جاؤں، میری ایک تصویر اتار لو.. کسی امریکی اخبار میں شائع کر کے مجھے مشہور کر دو.. اور "وہ" ایک اپنے تئیں ایک جنسی پوز بنا کر کھڑا ہو گیا" "وہ" ادھیڑ عمر کا ایک خواجہ سرا یا عرف عام میں ایک کُھسرا تھا، بال رنگے ہوئے، شیو کی ہوئی اور موٹے ہونٹوں پر موٹی تہہ سرخ لپ سٹک کی..

میں نے اُس کا دل رکھنے کے لیے ایک دو تصویریں اتروائیں اور پھر پہلے قاضی جاوید سے کہا کہ قاضی صاحب، آپ حقوق نسواں کے علاوہ حقوق خواجہ سراؤں کے بھی چیمپئن ہیں تو ذرا اس بیچارے یا بیچاری کے ساتھ ایک تصویر اتروا لیجیے..

قاضی صاحب با قاعدہ ''بلش'' کر گئے..''وہ.. بھائی.. تارڑ صاحب.. میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کا ڈائریکٹر ہوں، اس کُھسرے بھائی جان کے ساتھ اگر میری تصویر کہیں شائع ہو گئی تو جماعت والے ادھم مچا دیں گے.. سوری..''

''آپ تو اپنے آپ کو روشن خیال کہتے ہیں..''

''روشن خیالی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے سر.. اور اس میں کُھسرے شامل نہیں ہوتے..''

تب میں نے تنویر خواجہ سے درخواست کی تو وہ بھی بکری ہو گیا اور ''لاحول وِلا'' کہہ کر پرے ہو گیا..

یہ صرف مزنگ کی خورا کی، ثقافتی اقدار اور خوش مزاجی کا نمائندہ ندیم شیخ تھا جو فوراً آمادہ ہو گیا..

وہ خواجہ سرا بہت شکر گزار ہوا.. ندیم اُس کے برابر میں کھڑا ہو گیا، مسکراتا ہوا، کسی بھی احساس ندامت سے گریزاں ندیم بلکہ اُس نے خواجہ سرا سے کہا، ذرا نخرے تو دکھاؤ اور اُس ادھیڑ عمر خواجہ سرا نے شرما کر اپنے گھونگھٹ کے پٹ کھول دیئے..

سعید بٹ نے اگرچہ وہ انکاری ہوتا تھا اُس کی مٹھی میں ایک نوٹ تھما دیا..

ایسے انوکھے اور قدرتی لوگ صرف ہیرا منڈی میں ہی ملتے ہیں..



''چیت رام کون تھا؟''

ہم تھک رہے تھے..

لاہور کی تاریخی اور ثقافتی سیاحت بہت ہو چکی..

''جاوید، کہاں ہے وہ چوبارے اور کوٹھے جہاں برصغیر کی نامور رقاصائیں اور کلاسیکی گویے، اپنے رقص اور گائیکی سے حشر برپا کرتے تھے..''

''سر جی، ہم نے نور جہاں کا مبینہ کوٹھا دیکھ لیا..ابھی ذرا چیت رام روڈ پر چلتے ہیں، پہلے بالائی اور پھر زیریں چیت رام روڈ پر چلتے ہیں..''

''اور یہ چیت رام کون تھا؟''

''کہتے ہیں کہ ایک ہندو بھگت تھا، پھر مسلمان ہو گیا..بہت دنیا اس کی پیروکار تھیں، پہلے اُس کی قبر پر چلتے ہیں..''

سنگ مرمر کا ایک طاقچہ تھا، جس کے چبوترے پر ایک بجھا ہوا چراغ تھا اور اُس چراغ کے گرد گیندے کے زرد پھولوں کا ایک ہار تھا..طاقچے کے اندر چیت رام کی ''قبر'' تھی، بہت ہی مختصر، زیادہ سے زیادہ ایک فٹ کی..اور اُس پر کچھ پھول پڑے تھے..

میرا گمان ہے کہ یہاں چیت رام کی سمادھی ہے، قبر اتنی مختصر تو نہیں ہو سکتی..

کوئی کھوج کرے کہ یہ چیت رام کون تھا جس کے نام کی دو گلیاں اس بازار میں ابھی تک موجود تھیں..

اور اُس بھگت کو ماننے والے آج کے شہر لاہور کے وہ کونسے عقیدت مند تھے جو اُس کی قبر پر چراغ روشن کرتے تھے، اور ان چراغوں کے گرد گیندے کے پھولوں کے ہار آویزاں کرتے تھے..

لاہور یہ کیسا بھید ہے جو آشکار نہیں ہوتا، اپنے آپ کو پوشیدہ رکھتا ہے..

تو یہ چیت رام کون تھا..

ڈاکٹر عمر عادل بے شک ایک نازک مزاج شخص ہے اور اگر ہم بھڑ کیلے ذوقِ لباس کو درگذر کر دیں تو سینما موسیقی، ثقافت، قدیم تہذیبوں کا ایک خزانہ شخص ہے اور یہ خزانہ بولتا چلا جاتا ہے..عمر کا کہنا ہے کہ 1934ء میں

نور جہاں کے بڑی بہن، سگی نہیں سوتیلی بہن عیدن بائی جب کلکتے سے واپس آئی تو اُس کے ہمراہ بے بی نور جہاں بھی تھی جو بے بی سے بی بی ہو جانے کے مراحل خوش اسلوبی اور خوش بدنی سے طے کرتی خوش نکھار ہوئی جاتی تھی..

عیدن بائی اسی چیت رام روڈ پر..نیوین یعنی زیریں چیت رام روڈ کے کوٹھا نمبر 46 میں فروکش ہوئی اور گانے بجانے اور مجرا کرنے کے گلشن کا کاروبار اختیار کیا اور وہ اہل لاہور کی محبوب ہو گئی..لیکن عیدن بھائی اپنی سوتیلی بہن کی بہت رکھوالی کرتی تھی، اسے تماش بینوں کی حریص نگاہوں سے بچا کر رکھتی تھی، اسے مجرے کے کمرے کے عقب میں ایک کمرے میں رکھتی تھی کہ عیدن بائی کو یقین کامل تھا میری یہ بہن کوٹھوں پر مجرے کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوئی، اسے ایک فلم کی بڑی اداکارہ بننا ہے اسے چکلے پر نہیں بٹھانا.. میں مجرا کرتی ہوں اور رزق کماتی ہوں اسے کوٹھے پر نہیں بیٹھنا..

عمر کا کہنا ہے کہ اس کے ہاں ایک قدیم تصویر ہے جس میں عیدن بائی رقص کر رہی ہے اور نور جہاں پس منظر میں تانپورہ لے کر بیٹھی ہوئی ہے کہ وہ کبھی کبھار اسے اجازت دے دیتی تھی کہ وہ دیگر موسیقاروں کے ہمراہ تانپورہ کو چھیڑتی رہے..

46-نیواں چیت رام روڈ جس کے برابر میں خواجہ سراعاشی بٹ کا کوٹھا ہے..نور جہاں ہوا کرتی تھی..

چیت رام لاہور والوں کا بہت ہی لاڈلا تھا کہ اسی بازار میں اُس کے نام کی دو سڑکیں ہیں جو ایک دوسرے کے متوازی چلتی ہیں، کہہ لیجئے کہ ایک بالائی چیت رام روڈ جہاں اُس کی بالشت بھر کی قبر کے سرہانے اب بھی چراغ جلتے ہیں، دوسری زیریں چیت رام روڈ..اور یہ روڈ جو بادشاہی مسجد کے ایک مینار کے زیر سایہ تھی یہ ذرا نقلی سی شاہانہ سیاہ اور سنہری بگھیوں اور سفید گھوڑوں اور نامور ڈھول بجانے والوں کی روڈ تھی..کوڑے سے بھرے زرد رنگت کے سرکاری کوڑے دانوں کے پہلو میں متعدد ایسی بگھیاں منتظر تھیں کہ کوئی آئے، ان کے آگے دو سفید گھوڑے جوتے اور پھر اُن میں کوئی دولہا، کوئی پہلوان، کوئی سیاسی لیڈر سوار ہو کر اپنی اپنی جیت کا چرچا کرے اور بگھی کے ہمراہ ڈھول بجتے ہوں، دولہا جس نے ایک دُلہن کو جیتا، پہلوان جس نے اپنے حریف کو مات دی اور سیاسی لیڈر جس نے الیکشن میں دھاندلی کر کے، اُس دولت کے دریا بہا کر جس کے پانی کرپشن اور بے ایمانی کے سوتوں سے پھوٹتے تھے اور جس کے ہمراہ غنڈے اور پیشہ ور قاتل زیادہ تھے..جیسے بقول استادِ عشق لہر بڑا شاعر وہ ہے جس کے ساتھ ہاکیوں والے زیادہ ہوں..

چاند بگھی والے..ملن بگھی والے جن کی بگھیوں کے ہمراہ گیسو دراز چڑا سائیں قلندر اور تنویر حسین ڈھولی مناسب کرائے پر میسر آ سکتے تھے..

ایک نیلے رنگ کے بورڈ پر ایک سفید سجے ہوئے گھوڑے کی پینٹنگ کے پہلو میں درج تھا..''چاند بگھی والے.. پروپرائٹر بھولا..شادی بیاہ کے موقع پر خوبصورت ڈانسر، گھوڑیاں اور اعلیٰ ترین شاہی سواری نئی

بگھیاں دستیاب.. 24 گھنٹے سروس" دکان کے اندر دیواروں پر دو بڑے سائز کے رنگین پوسٹر چسپاں تھے.. پروپرائٹر بھولا کے خشمگیں مونچھوں والے چہرے کے بائیں جانب سرخ کرتے اور لاچے میں ملبوس سوہنی ڈھول والا گلے میں ڈھول لٹکائے کھڑا تھا اور دائیں جانب عزت مآب جاوید ڈھول والا نظر نواز ہوتا تھا..



"ہارٹ آف ہیرامنڈی"

اور اب ہم "ہارٹ آف ہیرامنڈی" میں پہنچ چکے تھے.. اب کے بام و در اجاڑ پڑے تھے، کوٹھے بے آباد اور بالکونیاں ویران..

بائیں جانب ایک ابھی تک شاندار حویلی کے چہرے نے ہمارے قدم روک دیئے.. اُس کے داخلے کے ماتھے پر یورپی طرز کی دیدہ زیب گل بوٹوں کی آرائش ابھی ماند نہ پڑی تھی.. ایک محراب کے پہلوؤں میں سفید سیمنٹ سے تخلیق کردہ پھول اور بیلیں اُس کے گرد پار ہوتی تھیں اور ماتھے پر انگریزی میں ابھرا ہوا تھا..

"ایل۔ نارائن داس، سن آف گوبند رام وکیل، اپریل 1934ء"

اس حویلی کے صدر دروازے پر لٹکے ہوئے ٹاٹ کے بوسیدہ پردے میں سے ایک عسرت زدہ شکل نے جھانکا.. یہاں صورتیں کیا ہوتی ہوں گی اور اب کیا ہو گئیں..

وہ نشان بھی ملیامیٹ ہو گئے تھے جہاں بڑے غلام علی خان آیا کرتے تھے، فریدہ خانم جس کوٹھے پر بیٹھ کر غزل سرا ہوتی تھی.. یہاں فلم سٹار نادرہ کا کوٹھا ہوا کرتا تھا، مہدی حسن، غلام علی بھی آتے جاتے رہتے تھے، یہیں کہیں برصغیر کی نامور کلاسیکی گلوکارہ عنایت بائی ڈھیرو والی کا گھر تھا جو کہ ٹھمری اور دادرے کی گائیکی میں بے مثال تھی، خواجہ سلطان، خواجہ خورشید انور کے چھوٹے نامور وکیل بھائی ہمیں عنایت بائی کے ریکارڈ، گراموفون کو چابی دے کر سنوایا کرتے تھے اور جیسے کلکتے کی آرمینیا نژاد گوہر جان ہر گیت کے آخر میں اپنا تعارف کرواتی تھی کہ گوہر جان کلکتے والی تو اسی روایت میں.. دادرے کے آخر میں، عنایت بائی ڈھیرو والی..

مجھے ایک اور خاتون کے کوٹھے کو محض دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا اور وہ تھی، خورشید پاؤنڈاں والی.. ہر وہ شوقین مزاج لاہوری بوڑھا جو ابھی تک سانس لیتا ہے.. اسّی کے پیٹے میں ہے آج بھی خورشید پاؤنڈاں والی کی یاد میں آہیں بھرتا، سوگوار ہوتا ہے.. میرے ہمسائے ٹھیکیدار منور جنہوں نے گلبرگ تین کے بیشتر گھر نہایت ایمانداری سے تعمیر کیے، وہ جب ایک لاٹھی کے سہارے بمشکل چلتے ہمارے گھر کے سامنے جو مختصر پارک ہے، اس میں سردیوں کی دھوپ سینکنے آ جاتے ہیں تو گئے زمانوں سفر کر جاتے ہیں.. تارڑ صاحب.. ہائے ہائے.. جب خورشید پاؤنڈاں والی ہیرامنڈی میں اپنے کوٹھے پر بیٹھ کر تان لگاتی تھی تو یقین کیجیے اُس کی سریلی آواز

کی لہریں یہاں تک پہنچتی تھیں، آپ کیا جانیں کہ ہمارے زمانوں میں آوازیں کیسی ہوتی تھیں، آپ اگر کبھی خورشید کو سن لیتے تو یہ نور جہاں اور فریدہ وغیرہ کو بھول بھال جاتے..

جاوید بے شک انہی گلیوں اور بازاروں کا پروردہ تھا، پر اُسے خورشید پاؤنڈا والی کے کوٹھے کے بارے میں کچھ آگاہی نہ تھی..

وہاں جہاں مصور اقبال حسین کے ریستوران ''کوکونسٹ'' جو اس کا آبائی گھر تھا، اب تو اس کے آس پاس بے شمار ریستوران نمودار ہو چکے ہیں اور اُن میں خوراک کے حوالے سے سُمیر کے این سی اے کے کلاس فیلو اور دوست احمد چیمہ کا ''انداز'' سرفہرست ہے جہاں خواتین یا مرد نہیں، نہایت اچھی شکل والے خواجہ سرا آپ کو سرو کرتے ہیں تو اس بے محابا کمرشل ازم نے ہیرا منڈی کے قدیم کوٹھوں، مکانوں اور بیٹھکوں کو ہڑپ کر لیا ہے، وہاں ایک جعلی سی فوڈ سٹریٹ جنم لے چکی ہے..

ایک مدت تک اگرچہ وہ دونوں الگ الگ اپنی دنیاؤں میں گم تھے، بادشاہی مسجد اپنی عبادت اور پاکیزگی میں اور اُس کے زیرِ سایہ جو خرابات ہیرا منڈی کی شکل میں گھنگھرو چھنکاتی، طبلے بجاتی، نغمہ سرا ہوتی تھی اور پھر کمرشل ازم نے ان دونوں کو یکجا کر دیا، کچھ فرق باقی نہ رہا..اور باقی رہے نام اللہ کا..

اور ہاں وہ عمارت ابھی تک موجود ہے جو کبھی پٹیالہ گائیکی والے امانت علی خان، فتح علی خان کی بیٹھک ہوا کرتی تھی..ازاں بعد وہ راوی روڈ منتقل ہو گئے اور جاوید کا کہنا ہے کہ شفقت امانت علی خان نے اپنے لیے ایک عالیشان گھر تعمیر کر لیا ہے..نہ صرف فتح علی خان بلکہ اسد امانت علی خان کے ساتھ میری کچھ شناسائیاں تو تھیں پر ان کا تذکرہ کچھ طویل ہو جائے گا..یہ پورا خاندان ''انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو'' کے آسیب میں مبتلا اٹھتا جاتا ہے..

ویسے یہ جو ایک دن تھا، اور ہم پر کیا کیا گذری تھی، نہال چند مندر، محمد رفیع کی گلیاں، حتو تیلی کا چوک جھنڈا، گندی ٹبی گلی، بازار شیخوپوریاں، عزیز تھیٹر المعروف پاکستان ٹاکیز، گنگا رام کا گھر، نور جہاں کی بیٹھک، فریدہ خانم، مہدی حسن، بڑے غلام علی خان، امانت علی خان کی اجڑ چکی آماجگاہیں، بس ایک دن تھا..

اور جب ہم لوٹے تو چیت رام روڈ کے آغاز میں ایک سرخ چھوٹی اینٹوں میں نصب ایک مقفل دروازہ نظر میں آنے لگا..بوسیدہ اور سرخ پینٹ میں لتھڑا ہوا..دروازے کے اوپر ایک ایگزاسٹ فین نصب تھا، چُونا گرتا تھا اور موسموں نے اس کی بیرونی دیوار کو مار ڈالا تھا..

محمد اقبال محمد ایڈووکیٹ، ایک بورڈ آویزاں..

اور اُس کے عین اوپر..

ایک اور بورڈ، سیمنٹ کے بغیر ننگی نانک شاہی اور جدید اینٹوں پر آویزاں..

''استاد دامن اکیڈمی (رجسٹرڈ) دامن چوک، ٹکسالی گیٹ..''

استاد دامن ایک بھاری بھر کم شخصیت..ذات کے درزی، پڑھے لکھے ہرگز نہ تھے لیکن اس کے باوجود انہیں انگریزی، روسی وغیرہ پر مکمل ''عبور'' تھا.. یوسف کامران ان کے ہاں آتا جاتا رہتا تھا اور وہ مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا پر میں نہ جا سکا.. بقول یوسف، دامن استاد ایک لاجواب باورچی تھے، جیسا گوشت وہ بُھونتے تھے، جیسے کوفتے وہ بناتے تھے وہ اکثر اس لیے ہوتے تھے کہ انہیں وہسکی کا تڑکا لگاتے تھے..وہ ایک قدرتی لاہوری شاعر تھے جنہوں نے ''لالی اکھیاں دی کہندی اے، روئے تُسی وی او، روئے اسی واں'' ایسے درد بھرے شعر کہے جنہوں نے جواہر لال نہرو کو بھی رُلا دیا...

میں نے آخری بار انہیں فیض صاحب کی موت پر ایک رکشے میں سے اترتے دیکھا...کچھ عرصے کے بعد وہ بھی اجل کی راہ کے مسافر ہو گئے..

یہی روایت تھی کہ دامن جس کوٹھڑی میں، ہیرا منڈی کے آغاز میں، ایک مسجد کے زیر سایہ کوفتوں کو وہسکی کا تڑکا لگاتے مقیم تھے وہاں کبھی شاہ حسین رہا کرتا تھا..

مجھے نہیں معلوم کہ شاہ حسین کو کیسے یہاں مقیم کیا گیا کہ یہ کوٹھڑی اور یہ تعمیر اکبر اعظم کے عہد کی ہرگز نہیں ہے..ان زمانوں کی کوئی اینٹ بھی سلامت نہیں ہے، ہاں، شاہدرہ کے پرانے شہر کے اندر جو شاہ حسین کی بیٹھک ہے اُس کے بارے میں شک شبہ نہیں ہے..البتہ یہ عین ممکن ہے کہ کبھی اس مقام پر شاہ حسین نے قیام کیا ہو..لیکن اس کوٹھڑی میں تو ہرگز نہیں..یہ ایک رومانوی داستان طرازی ہے کہ دامن جہاں رہتے تھے وہاں گئے زمانوں میں شاہ حسین بھی رہتے تھے..

وہ ایک دن، تمام ہو رہا تھا..

ہم واپس لوٹتے تھے، بہت تھک چکے تھے، شہر لاہور کی یاترا کے بعد واپس لوٹتے تھے، یہ ایک دن تھا، ہم لاہور کی سحر انگیز قدامت کے خمار میں رہے تھے اور شائبہ سا ہوا کہ چیت رام روڈ کے سوہنی اور جاوید ڈھول بجانے والے یکدم اپنی رنگین تصویروں میں سے باہر آ کر متحرک ہو گئے ہیں اور ڈھول بجانے لگے ہیں..

میلہ چراغاں کے چراغ روشن ہونے لگے ہیں..
اور ہر چراغ کی لَو میں مادھو کا چہرہ ہے..
شاہدرہ کی بیٹھک شاہ حسین کے سامنے مادھو کا نگر ہوا کرتا تھا..
یہ کیسے عشق تھے، کیسے آفت عشق تھے..

شمس تبریز کے ساتھ مولانا روم کا عشق، سرمد منصور کا ایک ہندو لڑکے پر مٹ جانا..یہاں تک کہ میر

کا بھی اُسی لونڈے سے دوالینا یہ کیسی وابستگیاں تھیں..

ایک دن تمام ہوتا تھا..

پاکستان کے بارے میں ایک دنیا گردنے کہا کہ یہ پاکستان، ایک ایسا پوشیدہ راز ہے جو ابھی تک عیاں نہیں ہوا..

یوں، لاہور بھی ایک ایسا مقفل راز ہے جو کبھی نہیں کھلتا..

اور جب ہم اس پوشیدہ راز کے کچھ گوشوں سے پردہ اٹھاتے تھے تو شاہ حسین کی پُکار چلی آتی تھی..

ے مائے نیں، میں کنّوں آکھاں..
دردو چھوڑے دا ایہہ حال نیں..

گندی گلی کی ایک خوش رُولڑکی جسے دیکھ کر میری نظروں میں بھی گندگی آ گئی تھی..وہ بھی چلی آتی تھی..ساحر بھی تو چلا آتا ہے..

ے یہ مَسلی ہوئی اُدھ کھلی زرد کلیاں
مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی..یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی اُمت، زلیخا کی بیٹی..ثنا خوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں

اور ساحر کے جِلَو میں احمد ریاض ہے..گویا مجھے بھی ایک بدن فروش کا ہم پیشہ قرار دیتا ہے..

تجھے بھی مجبوریٔ طلب ہے تو زلف و رخسار بیچتی ہے
مجھے بھی مجبوریٔ طلب ہے میں اپنے اشعار بیچتا ہوں
تو اپنے ماحول کی بھکارن میں اپنے حالات کا بھکاری
تُو اپنا کردار بیچتی ہے، میں اپنا کردار بیچتا ہوں

اور ایک طوائف امراؤ جان ادؔا، گندی گلی میں ایک گندی زندگی بسر کرنے پر مجبور اپنی بہنوں کے دل کی آواز ہوتی ہے..

کس کو سنائیں حالِ دلِ زار اے اداؔ
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

تو شہر لاہور کی آوارگی میں ہم نے بھی زمانے کی سیر کی..



''لاہور کے رنگ جو رُخصت ہو گئے''

فرض کیجئے آپ فنِ مصوری کے شیدائی ہیں، اپنی آنکھوں میں رنگوں کے امتزاج کو اُتارنا چاہتے ہیں، قوسِ قزح کی ست رنگی پینگ پر جھولنا چاہتے ہیں تو آپ کسی مصوری کی نمائش دیکھنے چلے جاتے ہیں.. ایک آرٹ گیلری کے اندر داخل ہوتے ہیں اور آپ کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں آویزاں سب تصویریں ایک ہی رنگ کی ہیں، سب نقش، سارے منظر، سارے چہرے نہ صرف ہو بہو ایک جیسے ہیں بلکہ صرف ایک ہی رنگ میں پینٹ کیے گئے ہیں تو آپ پر کیا گذرے گی.. کیا آپ ایک گہرے دکھ میں مبتلا نہیں ہو جائیں گے.. میں بھی ایک مدت سے اسی کرب کا شکار ہوں صرف اس لیے کہ میں گواہ ہوں کہ کبھی اس آرٹ گیلری میں جو تصویریں آویزاں تھیں ان میں دنیا جہان کے شوخ اور بھڑکیلے رنگ تھے، ہر تصویر کا اپنا ایک جہان تھا، زندگی اور تنوع سے شرابور سانس لیتا اور اس کے سانسوں میں بہاروں کی مہک رچی ہوئی تھی.. لاہور کی آرٹ گیلری میں کبھی قوسِ قزح کے سب رنگ دمکتے تھے اور یہ رنگینیاں جو نو بہار تھیں لاہور کے آبائی باشندوں کے دم قدم سے تھیں.. کبھی یہاں ہم مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو ہماری ہمسائیگی میں پارسی اور عیسائی بھی رہا کرتے تھے، یہاں تک کہ ہندو خاندان بھی آباد تھے..

اُدھر گڑھی شاہو کے علاقے میں پاکستان ریلوے کی ملازمت کرنے والے بہت پر امن اور رنگیلے عیسائی رہا کرتے تھے.. وہ برٹ انسٹی ٹیوٹ کے ڈانسنگ ہال میں کرسمس اور نیو ایئر مناتے مسرت سے ناچتے تھے، گڑھی شاہو کے گھروں کے اندر سے پیانو کی آوازیں ابھرتی تھیں اور مجھے یاد ہے ایک بوڑھا عیسائی پیانو پر بیتھوون کا ''مون لائٹ سناٹا'' بجایا کرتا تھا.. انگریزوں کے رخصت ہونے پر وہ بیچارے سے ہو گئے تھے لیکن انہوں نے ان کی روایات کو سینے سے لگایا ہوا تھا، ہم عیسائی لڑکوں کو ''کرنٹے'' اور لڑکیوں کو ''کرنٹیاں'' کہا کرتے تھے اور ان کے بارے میں طرح طرح کے لطیفے مشہور تھے۔ جیسے ایک اینگلو انڈین سیاہ کالی حسینہ نے ایک ٹانگے والے سے پوچھا ''ٹانگا والا.. گاری شاہو جانے کا کیا مانگتا؟'' تو کوچوان نے کہا ''میم صاحب کرایہ دو روپے ہوگا..'' اس پر میم صاحب اپنے آنے والی تھاں پر آ گئیں اور کہنے لگیں ''دُر فٹے مُنہ.. ہاہائے وہاں کا کرایہ تو چار آنے ہے..'' اس پر ٹانگے والے نے مسکرا کر کہا ''اس طرح بات کر

تو پھر کرایہ چار آنے ہی ہوگا..''

لکشمی مینشن میں ہمارے دوستوں میں متعدد کرنٹے بھی شامل تھے لیکن وہ مُنہ بگاڑ کر بات نہیں کرتے تھے، ٹھیٹھ پنجابی بولتے ایک دوسرے کو لاہوری گالیوں سے نوازتے تھے..اور ہم اُن کی ہمشیرگان پر نظر رکھتے تھے جو سکرٹ پہنے مال روڈ پر مٹکتی پھرتی تھیں..

فیروز سنز کی غلام رسول تارڑ بلڈنگ کے برابر میں ہوٹل انڈس کے پہلو میں سے ایک راستہ وکٹوریا پارک میں اترتا تھا اور ہمارے لیے تو خوابوں میں اترتا تھا کہ یہاں کسی حد تک متمول اور بہت پڑھے لکھے عیسائی آباد تھے اور وہ گڑھی شاہو والے اپنے مذہبوں کو کسی قدر حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے..وہاں خوش نظر بنگلے تھے جن کے لان میں لڑکیاں چڑی چھکا یا بیڈمنٹن کھیلتی تھیں اور جب وہ شاٹ لگانے کے لیے اُچھلتی تھیں تو اُن کے آبنوسی بدنوں کی چھلکاہٹ سے ہمارے دل اُچھلتے تھے..

لاہور کی آرٹ گیلری ہمیشہ سے بے رنگ نہ تھی..

لکشمی مینشن میں ہمارے فلیٹ کے برابر میں لوما نام کی ایک سُوکھی سڑی کالی لڑکی رہتی تھی جو میری سب سے چھوٹی بہن شائستہ کی گُوڑھی سہیلی تھی..وہ دونوں سر جوڑے جانے کیا کیا باتیں کرتیں، کھِی کھِی کر کے ہنستی رہتی تھیں، ہم ہمیشہ عید کے موقع پر اُنہیں سویاں بھیجتے اور ادھر سے کرسمس کے دنوں میں کشمش بھرا کرسمس کیک آجاتا..مری امی جان اُس کیک کو ہاتھ نہ لگاتیں لیکن ہم سب بہن بھائی اُسے بہت رغبت سے کھاتے اور لوما کو ''تھینک یو، میری کرسمس'' کا کارڈ بھیجتے..

لکشمی مینشن میں دو ہندو خاندان بھی آباد تھے..ان کی جانب سے بھی تہواروں کے موقع پر مٹھائیاں آتی رہتی جنہیں پھر امی جان ''ہندو مٹھائیاں'' کہہ کر پرے کر دیتیں اور ہم اُنہیں ہڑپ کر جاتے..

اور ہاں ان زمانوں میں ہم اتنے جاہل اور پسماندہ ہوا کرتے تھے کہ ہمیں کچھ علم نہ تھا کہ یہ سُنّی شیعہ کے معاملات کیا ہیں یا پھر یہ احمدی کون ہیں، ہم اپنی جہالت میں سبھی کو مسلمان سمجھتے تھے، ہم کیسے بھٹکے ہوئے لوگ ہوا کرتے تھے..اتنے بھٹکے ہوئے کہ ریگل چوک کے برابر میں سٹینڈرڈ ریستوران کی چھت پر رقص کرتی اینجلا کو اپنی چھت پر کھڑے ہو کر چوری چھپے دیکھا کرتے تھے..ریگل سینما کی راہداری میں ایک ڈانسنگ سکول ہوا کرتا تھا اور کچھ لڑکے وہاں داخلہ لے کر والز اور کوئک سٹیپ کے رقص سیکھا کرتے تھے، بہت ہی بھٹکے ہوئے لوگ تھے، یقیناً ''لبرل'' تھے..عین ممکن ہے کہ بد بخت روشن خیال تھے اور کچھ بعید نہیں کہ لعین سیکولر بھی ہوں..

جیسے قاہرہ ایک ایسا شہر ہے جہاں اب بھی مسلمانوں کی اکثریت کے پہلو بہ پہلو کوپٹک یا قبطی، عیسائی اور یہودی، اتنے ہی مصری جتنے کہ مسلمان مصری ہیں، صدیوں سے رہتے چلے آئے ہیں بلکہ قبطی تو سب

سے قدیم مصری ہیں، ہماری سب کی ماں حضرت ماریہ قبطیہ جن کے بطن سے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے اسی قبیلے کی ایک فرد تھیں..اوران قبطی عیسائیوں کا پوپ بھی پاپائے روم سے الگ ہوتا ہے..اُندلس کے یہودی حکیم مامون نے قاہرہ میں ایک ایسا ہسپتال تعمیر کیا جو ان زمانوں میں نہ صرف افریقہ بلکہ یورپ میں بھی سب سے جدید ترین تھا..

سب آگاہ ہیں کہ جب یہودیوں کو اندلس سے نکالا گیا تو تُرکوں نے انہیں پناہ دی..وہ آج تک استنبول میں آباد ہیں اور اس شہر میں یہودیوں کے علاوہ عیسائی اور مختلف قومیتوں کے لوگ صدیوں سے رہتے چلے آتے ہیں..تفصیل میں کیا جانا، دمشق، قرطبہ، یارقند، خُتن، کاشغر سب کے سب شہر ایسے ہیں جہاں مختلف عقیدوں کے لوگ ایک دوسرے کی ہمسائیگی میں رہتے چلے گئے..ہمارا لاہور بھی کبھی ایسا ہی ہوا کرتا تھا، لاہور کی آرٹ گیلری میں آویزاں تصویریں ہمیشہ سے یک رنگی نہ تھیں..ان میں قوسِ قزح کے سب رنگ، سَت رنگ، بھڑکتے اور شوخ ہوا کرتے تھے..لیکن یہ فارس سے نکالے ہوئے فارسی یا پارسی تھے جن کے وجود سے تصویرِ لاہور میں رنگ تھے، دھیمے مزاج کے نازک ملوک، سوہنے اور گوری رنگت والے، پُرامن اور ہمیشہ مسکراتے ہوئے آسانی سے لوگ..کراچی کے بعد یہ لاہور تھا جہاں پارسی کثرت سے آباد تھے..میں تذکرہ کر چکا ہوں کہ لکشمی مینشن میں ہمارے بہت سے محلے دار پارسی خاندان تھے..نوروز کے موقع پر ہمارے فلیٹ کے عین سامنے جو پارسی خاندان رہتا تھا اور ان کے خاندان کی تین لڑکیاں چل نہ سکتی تھیں، لڑکھڑاتی تھیں اور ہم ایسے کٹھور دل بچے ہوا کرتے تھے کہ انہیں ہمیشہ ''لنگڑیاں'' کہتے تھے اور وہ نوروز کے موقع پر اپنے گھر کی سیڑھیوں پر قدیم نمونوں کے رنگین گُل بُوٹے بناتیں اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی میٹھی ڈِش نوروز مبارک کے پیغام کے ساتھ بھیجتیں..رتّی پے ماسٹر پر تو ایک دنیا جان دیتی تھی جس کے رخساروں میں ڈمپل پڑتے تھے اور جان دینے والی دنیا کے ایک شہری ہم بھی تھے..

بین الاقوامی شہرت یافتہ انگریزی ناول نگار بیپسی سدھوا جن کے خاندان کے راولپنڈی کے آبائی گھر کو صدرِ پاکستان کا گھر بنایا گیا، بچپن میں پولیو کا شکار ہوئیں، ایک لاہورن تھیں اور اب بھی ہیں، انہوں نے ''کروایٹرز''، ''آئس کینڈی مین'' جیسے ناول تخلیق کیے گئے جن پر فلمیں بھی بنیں۔آخری بار جب وہ لاہور آئیں اور اب تو واقعی بوڑھی ہو چکی تھیں تو ان کے اعزاز میں جوادبی تقریب منعقد ہوئی اس میں بہ زبان انگریزی میں نے کلیدی مقالہ پڑھا اور وہ آبدیدہ ہو گئیں..وہ ایک عرصے سے امریکہ میں مقیم ہیں، ایک یونیورسٹی میں پروفیسر رہی ہیں لیکن آج بھی وہ اپنے آپ کو امریکی نہیں ایک پرفخر لاہوری پاکستانی کہتی ہیں..انہوں نے لاہور کے بارے میں لکھی گئی انگریزی تحریروں پر مشتمل ایک مجموعہ بھی ترتیب دیا ہے..

ویسے ان کو اتنی مہلت نہ ملی، اگر وہ زندہ رہتیں تو ایک پارسی خاتون پاکستان کی خاتونِ اول ہوتیں..

میری مراد رتی جناح سے ہے..قائداعظم نے اپنی اکلوتی بیٹی دِینا جناح سے صرف اس لیے قطع تعلق کر لیا کہ اس نے ایک پارسی نوجوان کو شریک حیات کر لیا تھا..ویسے آپ لاکھ تاویلیں گھڑیں لیکن یہ تو ایک ناانصافی ہے..اگر قائداعظم ایک پارسی خاتون کے ساتھ شادی کر سکتے تھے، بے شک مسلمان کر کے کر سکتے تھے تو دِینا جناح نے اتنا بڑا جرم تو نہیں کیا تھا کہ اسے عاق کر دیا جاتا..آج قائداعظم کی اولاد کی اولاد ہندوستان میں بہت خوشحال اور متمول ہے اور ان کے ایک نواسے فلمی اداکاراؤں سے رومان لڑانے میں شہرت رکھتے ہیں.. پارسی صدیوں پیشتر عرب فاتحین کی یلغار سے فرار ہو کر اپنے آتش کدے سینوں میں پوشیدہ کیے ہندوستان کے ساحلوں سے آ لگے تھے جہاں ایک ہندو راجہ نے انہیں پناہ دی..اور انہیں کم از کم پاکستان میں ایک مرتبہ پھر اپنی شناخت اور عقیدے کی سرشاری کو محفوظ رکھنے کی خاطر جلاوطنی اختیار کرنی پڑی، وہ امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا میں بکھر گئے تھے لیکن آج بھی ان کے دل پاکستان کے لیے دھڑکتے ہیں..

آج لاہور کی آرٹ گیلری اگر بے رنگ اور پھیکی ہے، اس میں عقیدے اور ثقافت کا کوئی تنوع نہیں ہے۔ اگر تنوع ہے تو تعصب اور عدم برداشت میں ہے، فرقوں کی عداوت کا ہے تو کبھی وہ زمانے تھے جب اس آرٹ گیلری میں رنگ رنگ کی ذوق جمال سے رنگی تصویریں آویزاں ہوا کرتی تھیں.. ہلال، صلیب، مقدس آگ اور شِو مہاراج ان تصویروں میں رنگ بھرتے تھے..

لاہور کی قوسِ قزح کبھی سَت رنگی ہوا کرتی تھی..



''لوہ کا لاہور اور مُہر شہر لاہور کی''

میں نے ایک صاحبِ حال بلکہ صاحبِ لاہور سے یہی سوال کیا کہ سوائے مجید لاہوری اور اکبر لاہوری کے کسی اور ادیب نے اپنے نام کے ساتھ لاہوری کا لاحقہ منسلک نہ کیا جب کہ دہلوی، لکھنوی، ملیح آبادی، نانوتوی، جالندھری، لدھیانوی، پانی پتی، امروہوی، امرتسری، الہ آبادی یہاں تک کہ مچھلی شہری بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں تو ایسا کیوں ہے.. تو اس صاحبِ حال نے قدرے توقّف کیا بلکہ کشف کیا اور کہنے لگا، ایک لاہوری کی تخلیق اور اُس کی شخصیت گواہی دیتی ہے کہ وہ لاہور کا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ بھی لاہور کے حوالے سے مشہور ہوئے اُن میں سے بیشتر لاہور کے نہ تھے، لیکن یہ لاہور کی مُہر تھی جس نے انہیں قبول عام کی سند عطا کی..

تو یہ جو لاہور کی مُہر ہے آخر یہ کیا بلا ہے.. میں عرض کرتا ہوں.. اور ہاں میرے ان مضامین اور کالموں میں جو لاہور کے بارے میں ہیں، کہیں کہیں میں اپنے کو جان بوجھ کر دوہراؤں گا یعنی تکرار سرزد ہوگی اسے آپ برداشت کر لیجئے گا کہ اس تکرار سے موقع محل کی مطابقت منسلک ہے تو لاہور کی مُہر کی چھاپ کا قصہ کچھ یوں ہے کہ میں کیا پتہ تیس یا چالیس برس پیشتر لاہور کے حلقۂ اربابِ ذوق کا سیکرٹری منتخب ہو جاتا ہوں اور اس کے اجلاس ترتیب دینے کی دردسری میں مبتلا ہو جاتا ہوں، ان دنوں ایک صاحب اختر امان نام کے جان بوجھ کر ادب کے حوالے سے قدرے اشتعال انگیز مضمون لکھا کرتے تھے کہ ساحر لدھیانوی، فیض سے کہیں بڑا شاعر ہے.. اقبال ایک خشک اور سرد مزاج کا بورنگ شاعر ہے جو ہرگز فلسفی نہیں ہے، احمد ندیم قاسمی کی نثر اور شاعری بے جان ہے.. وزیر آغا اپنے مزارعوں کی بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہے اور ادیبوں کو کنوؤں کی پیٹیاں تحفے میں بھیج کر زیر احسان کرتا ہے.. وغیرہ.. چنانچہ ایسے مضامین سے حلقے کے اجلاس میں ادھم مچ جاتا اور ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا چنانچہ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے حلقے کی رونق کا سماں ہو جاتا.. بہت دن ہو گئے اور حلقے کے اجلاس ایک یکسانیت کے ساتھ چلتے رہے تو میں نے اختر امان سے فرمائش کی کہ یار کچھ نہ کچھ دنگا فساد درکار ہے، کوئی ہنگامہ خیز مضمون لکھو.. صدارت منیر نیازی کی تھی اور اختر امان نے اپنے مضمون میں ثابت کیا کہ لاہور ایک بنجر شہر ہے۔ اس کی سب تخلیقی

زرخیزی مستعار شدہ ہے، ن م راشد، امرتا پریتم گوجرانوالہ کے تھے.. راجندر سنگھ بیدی ڈسکہ کا تھا.. اقبال سیالکوٹ سے آئے، فیض کالا قادر سے تعلق رکھتے تھے.. احمد ندیم قاسمی سون سکیسر سے وارد ہوئے.. پطرس بخاری پشاور سے آئے، اے حمید، سیف الدین سیف، احمد راہی، ظہیر کاشمیری امرتسر کے تھے.. ساحر لدھیانے کا تھا.. ناصر کاظمی، اختر شیرانی اور کنہیا لال کپور کا وطن کوئی اور تھا.. خشونت سنگھ ہڈیالی میں پیدا ہوئے.. یہاں تک کہ منیر نیازی ہوشیار پور سے براستہ ساہیوال آئے، اشفاق احمد بھی اُدھر کے تھے بلکہ تارڑ اگرچہ پیدا تو لاہور میں ہوا لیکن یہ بھی گجرات کے ایک گاؤں کا ہے.. تو لاہور کے پلّے میں تو کچھ بھی نہیں، یہاں صرف پہلوان اور نہاری یا سری پائیوں کے باورچی ہوتے ہیں، قابل فہم طور پر غدر مچ گیا، اور تب منیر نیازی نے سب کو ڈانٹ کر چُپ کرایا اور اختر امان سے کہنے لگا.. کاکا میں تم سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں.. اور منیر کا جب کوئی شیدائی اُس سے کہتا کہ خان صاحب، ٹھیک ہے یہ اقبال اور فیض بھی ہوں گے لیکن آپ کا کوئی جواب نہیں تو منیر کہتا، کاکا میں تم سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں.. چنانچہ منیر نے یہی کہا کہ کاکا میں تم سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں کہ یہ سب یادگار زمانہ لوگ لاہوری نہیں تھے، باہر سے آئے تھے لیکن ایک بات یاد رکھو جب تک لاہور کسی بھی شاعر، ادیب یا موسیقار کو پرکھ کر اُس پر اپنی مہر ثبت نہیں کر دیتا وہ شخص مانا نہیں جاتا.. گمنام رہتا ہے.. لاہور کے پاس ہی تخلیقی صلاحیت کو پرکھ کر اسے سند عطا کرنے کی مُہر ہے، جو کسی اور شہر کے پاس نہیں..

یہ فروری 1965ء کا قصہ ہے جب میں دلّی کے کناٹ پیلس کے ایک ایسے کافی ہاؤس میں جاتا ہوں جہاں ادیب، صحافی اور دانشور جمع ہوتے ہیں.. میں نے اپنے لاہوری ہونے کا بتایا تو ان میں سے بیشتر متوّجہ ہو کر دوست ہو گئے لیکن ایک سِکھ صحافی نے جو کہ لاہور کا تھا، مجھ سے بہت غفلت اختیار کی.. اور جب میں نے سبب پوچھا تو ایک سرد مزاج کے ساتھ بولا ''میں کسی بھی لاہور والے سے ملنا پسند نہیں کرتا.. لاہور نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے اسے میں فراموش نہیں کر سکتا.. انہوں نے میرے پورے خاندان کو ہلاک کر دیا.. میں نسبت روڈ پر رہتا تھا..''

میں کیا جواب دیتا کہ قتل تو ہم بھی ہوئے تھے، کچھ دیر بعد وہ کہنے لگا.. ''نسبت روڈ کے چوک میں ٹانگوں کے گھوڑوں کے لیے پانی کی ایک ناند تھی اور وہاں برگد کا ایک درخت ہوا کرتا تھا، کیا وہ درخت اب بھی وہاں موجود ہے؟''

تو میں نے بتایا کہ چیمبرلین روڈ پر میری بیجوں کی دکان ''کسان اینڈ کمپنی'' ہوا کرتی تھی اور جب میں شام ڈھلے گھر لوٹتا تھا تو اُسی چوک کے راستے لکشمی مینشن پہنچتا تھا.. تو وہ برگد ابھی تک موجود ہے..

''آپ آئے تھے تو اس برگد کا ایک پتہ ہی لے آتے..'' یہ کہہ کر وہ سکھ صحافی رونے لگا اور اُس کی

سفید ہوتی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی "میرے لاہور کی ایک نشانی ہی لے آتے.."

شاہی قلعہ کے اکبری گیٹ سے داخل ہوتے ہی بائیں جانب راجہ رام چندر کے بیٹے لوہ کا ایک مختصر مندر ہے..صرف مقام کی شناخت ہے کہ کبھی کوئی مندر یہاں ہوا کرتا تھا..تو کیا لوہ یہ تصور کر سکتا تھا کہ اُس کے نام پر آباد کیا گیا شہر لاہور ایک عالم میں یادگار ہوگا..دمشق، قرطبہ، یار قند اور سمرقند کی ہمسری کرے گا اور اُس کے نام کی سحر انگیزی سے ایک دنیا اسیر ہوگی..

موت موت ہے اور لاہور، لاہور ہے..



''موت، موت ہے اور لاہور، لاہور ہے''

یہ اُن دنوں کا قصہ ہے جب ہندوستان میں پہلا ٹیلی ویژن چینل، دُوردرشن کے نام سے قائم ہوا.. وہ پاکستان ٹیلی ویژن کی تخلیقی اور ڈرامائی شخصیت کے سامنے ایک بونا سا تھا، نہایت معمولی اور بچگانہ نوعیت کا لیکن کبھی کبھار وہاں کوئی تاریخی شخصیت انٹرویو کے لیے آ بیٹھتی اور وہ غیر معمولی ہو جاتا..اور ان میں فلمی دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے خوش شکل وِلن پران کا انٹرویو تھا..میزبان اُن سے اُن کی حیات اور اداکاری کے بارے میں جو بھی سوال کرتا اُن کا جواب اسی فقرے سے شروع ہوتا کہ لاہور کے حوالے کے بغیر میری حیات مکمل نہیں ہو سکتی اور بالآخر میزبان نے تنگ آ کر کہا، پران صاحب آپ کی ہر بات کی تان لاہور پر آ کر ٹوٹتی ہے..آپ ساری زندگی بمبئی میں رہے، اُس کا تذکرہ نہیں کرتے، لاہور کو ہی پکارتے رہتے ہیں حالانکہ آپ تو وہاں صرف پیدا ہوئے تھے، جوان ہوئے تھے، ایک دو فلموں میں بھی کام کیا پھر بمبئی چلے آئے جہاں سے آپ کی شہرت کا آغاز ہوا تو پران نے اپنی سحر انگیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا، یہ درست کہ بمبئی نے مجھے بے مثال شہرت سے ہمکنار کیا لیکن یہ شہر تو نہیں تجارتی مفادات اور ثقافتی ملغوبوں کی ایک بستی ہے..شہر تو لاہور ہے..آپ تصور نہیں کر سکتے کہ میرے زمانوں کا لاہور کیا تھا، وہاں کیسے کیسے مصوّر، اداکار، شاعر، ادیب اور پہلوان ہوا کرتے تھے..میں ایک مثال دیتا ہوں..اُن دنوں لڑکیاں دو چوٹیاں کیا کرتی تھیں اور ان میں رِبن باندھتی تھیں..اگر کسی سویر ایک لاہوری لڑکی غلطی سے ایک ہی رنگ کی بجائے دو مختلف رنگوں کے رِبن چوٹیوں میں باندھ لیتی تھی، ایک سرخ اور دوسرا زرد رنگ کا تو راس کماری سے لے کر کشمیر تک سب ہندوستانی لڑکیاں اپنے بالوں میں سرخ اور زرد رنگ کے رِبن سجا لیتی تھیں کہ لاہور والیوں نے یہ فیشن کیا ہے.. پورا ہندوستان لاہور میں سے جنم لینے والے فیشن کی پیروی کرتا تھا تو لاہور ایسا تھا..

میں کہیں تذکرہ کر چکا ہوں کہ تقریباً پندرہ بیس برس پیشتر میں کسی کوہ نورد آوارگی کے بعد گھر واپس آیا تو میمونہ کہنے لگی، تمہاری غیر موجودگی میں سکندر شاہین کے متعدد فون آئے تھے، تم اُس سے رابطہ کر لو..سکندر شاہین کو لوگ بھول چکے ہوں گے لیکن وہ لاہور کا ایک بانکا شخص تھا، ایک پکّا صاحب جو قائداعظم کی طرح دو رنگوں کے شُوز پہنتا تھا، سٹیج اور ٹیلی ویژن کا ایک منفرد اداکار تھا، اس کے گلبرگ والے گھر میں ہماری ملاقات

ہوئی تو میں نے پوچھا کہ خیریت تھی، کہنے لگا، بمبئی سے ایک مشہور ہدایت کار چوپڑا صاحب اور ان کے نائب لاہور آئے تھے (شاید وہ ییش چوپڑا تھے لیکن مجھے یاد نہیں)..اُن کے پاس ایک ٹیلی ویژن پر لکھنے والے ڈرامہ نگاروں کے کچھ نام تھے اور ان میں آپ کا نام بھی تھا..انہوں نے پیشکش کی تھی کہ اگر تارڑ صاحب میرے لیے ایک فلم لکھنا پسند کریں تو میں انہیں بمبئی میں خوش آمدید کہوں گا اور تمام اخراجات کا ذمہ دار ہوں گا..آپ ان سے پوچھ کر مجھے فون کر دیجیے گا۔ میں فوری طور پر ٹکٹ بھجوادوں گا..میں اگرچہ قدرے خوش تو ہوا پر میں نے کہا..سکندر شاہین، بمبئی فلم انڈسٹری دنیا کی سب سے بڑی انڈسٹری ہے جہاں دنیا بھر کا ٹیلنٹ موجود ہے تو چوپڑا صاحب مجھ ایسے گمنام ڈرامہ نگاروں کے تعاقب میں لاہور کیوں چلے آئے..اس پر سکندر کہنے لگا..میں نے اُن سے بالکل یہی سوال پوچھا تھا اور چوپڑا نے کہا تھا کہ سکندر صاحب، بمبئی کی فلم انڈسٹری میں جتنی بھی تخلیقی ٹیلنٹ ہے، وہ ہدایت کاری ہو، اداکاری کا جوہر ہو یا کہانی کی پرکھ ہو اس میں یا تو بنگال ہے اور یا پھر زیادہ حصہ پنجاب کا ہے..ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہاں جتنا بھی پنجاب کا تخلیقی زور تھا وہ کم پڑتا جارہا ہے اس لیے میں اُس تخلیق کے بڑے سرچشمے لاہور آیا ہوں..لاہور کا ڈرامہ نگار جو کچھ بھی لکھے گا، وہ یقیناً کمال کا ہوگا..

چوپڑا صاحب نے یہ بھی کہا کہ پنجاب کی ہیروئن اور پشاور کا ہیرو ہر نئی فلم کی کامیابی کی ضمانت ہیں چاہے ہیروئن نے کبھی پنجاب نہ دیکھا ہو یا ہیرو ایک مخدوش سا محض نام کا ''خان'' ہو..

میں دنیا میں جہاں کہیں بھی گیا، لاہور وہ جادو بھرا نام تھا جس کے سحر سے سب دروازے کُھلتے چلے جاتے تھے..

ریاض میں مقیم میرے ایک چاہنے والے صحافی جاوید اقبال ہیں اور یہ اُن کا بیان ہے کہ امریکہ میں مقیم ان کی ڈاکٹر بیٹی دماغ کی ایک خصوصی سرجری کی ٹریننگ کے لیے نیویارک کے ایک ایسے ہسپتال میں ریذیڈنسی کی خواہش مند تھی جہاں صرف ایک ہی نشست مخصوص تھی، اس کی ایک جاپانی کولیگ کو گمان تھا کہ صرف وہ اس نشست کی حقدار ٹھہرے گی کیونکہ اس شعبے کی انچارج بھی ایک معمر جاپانی ڈاکٹر تھیں..جاوید اقبال کی بیٹی نے کچھ کوائف جمع کیے اور معلوم ہوا کہ وہاں ایک نہایت سینئر سکھ ڈاکٹر ایک بلند عہدے پر فائز ہیں اور اُن کے والد لاہور کے ہیں..اس نے بمشکل ملاقات کے لیے وقت حاصل کیا اور سردار جی سے کہنے لگی، سَر، میں بھی لاہور کی ہوں..لیکن فیصلہ اُس جاپانی ڈاکٹر کے ہاتھ میں ہے جو یقیناً میری جاپانی کولیگ کی طرفداری کرے گی تو سردار جی کہنے لگے، پُتّر تو فکر ہی نہ کر..جاپانیوں کی ایسی تیسی..تو میری لاہورن بیٹی ہے تو تجھے داخلہ ملے ہی ملے..اور داخلہ مل گیا..یہ لاہور کے جادو ہیں..

دِلّی میں سارک کانفرنس کے دوران معلوم ہوا کہ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں جہاں میں مقیم تھا ہر اتوار کو بوڑھے بابوں کا ایک اجتماع ہوتا ہے جہاں یہ سب حضرات لاہور کی یاد میں آہیں بھرتے ہیں، اس کے گلی

کوچوں کو یاد کرتے ہیں اور اس اجتماع میں شریک ہونے کے لیے ایک لاہوری ہونا شرط ہے اور اس محفل کے روح رواں وغیرہ پران نول ہیں، پران نول، لاہور کے بارے میں لکھی جانے والی ایک تاریخی کتاب کے مصنف ہیں، نسبت روڈ پر کہیں رہتے تھے، صحافت اور سفارت کاری کے خارزاروں کو طے کرتے اب کسی حد تک بوڑھے ہو چکے ہیں، انہوں نے گورنمنٹ کالج کی شان میں بھی ایک قصیدہ لکھا اور جب گورنمنٹ کالج میں ان کے اعزاز میں ایک محفل کا اہتمام ہوا جس میں انہوں نے خصوصی طور پر مجھے مدعو کیا تو وہ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے کر آئے تھے اور انہوں نے وہاں تقریر کرتے ہوئے کہا "میں آج اپنے بیٹے کو نسبت روڈ لے کر گیا تھا کہ بیٹا تمہارا باپ یہاں پیدا ہوا تھا اور تم نے ہمیشہ یاد رکھنا ہے کہ یہی تمہارا وطن ہے، تم ایک لاہوری ہو.. میرے بعد تم نے اس سرزمین کے ساتھ جڑے رہنا ہے.."

تلمیذ حقانی میرا ایک محسن اور دوست اپنے اکلوتے بیٹے کو انکار نہ کر سکا اور اسے مجبوراً کینیڈا منتقل ہونا پڑا اور وہاں دن بہ دن اُس کی صحت گرتی چلی گئی، وہ ٹورنٹو میں مقیم لاہوریوں کو تلاش کرتا اور اُن کے پاس جا کر فریاد کرتا کہ مجھے آپ سے کوئی کام نہیں، پلیز میرے ساتھ لاہور کی باتیں کریں، یہاں تک کہ اُس کا فرمانبردار بیٹا بینک کی ایک بڑی ملازمت کو ترک کر کے اسے لاہور لے آیا اور وہ اسی مٹی میں دفن ہوا..

البتہ ایک نہ سمجھ میں آنے والا وقوعہ ہے کہ سوائے مجید لاہوری یا اکبر لاہوری کے کسی اور ادیب نے اپنے نام کے ساتھ لاہور کا لاحقہ منسلک نہ کیا جب کہ.. دہلوی، لکھنوی، ملیح آبادی، کیرانوی، نانوتوی، جالندھری، میرٹھی، پانی پتوی، امروہوی، امرتسری، الہ آبادی، یہاں تک کہ مچھلی شہری بھی کثرت میں پائے جاتے ہیں، اس کی کوئی نہ کوئی توجیہہ تو ہوگی..



''چار گھر، میری حیات کے، لاہور کے''

میری کُل حیات چار گھروں میں بسر ہوئی، بیت گئی اور مجھ پر ہمیشہ فضل رہا اللہ تعالیٰ کا اور کرم رہا کملی والے کا. قصوئی کے سوہنے سوار کا اور اُس سوار کے پاؤں میں وہ جو گانٹھوں سے بھرے جوتے تھے اور ہر گانٹھ اُس کملی والے کے ہاتھوں سے لگائی گئی تھی تو میں اُن کے صدقے یہاں تک چلا آیا، ابھی تک سانس لیتا خوش نصیبی کے آخری سانس لیتا یہاں تک چلا آیا ہوں.. مجھے شاید کچھ عرصہ بعد ڈیفنس میں تعمیر کردہ، میرے چھوٹے بیٹے سُمیر کی نگرانی میں تعمیر کردہ اپنے پانچویں گھر میں منتقل ہو جانا پڑے، اگرچہ میں جہاں ہوں، بہت خوش ہوں اور آسودہ ہوں پر میں منتقل ہونے سے انکار نہیں کر سکتا کہ ایک بار جب میں نے سُمیر سے کہا.. بیٹے، تم چاروں، تمہاری بیوی اور دونوں بیٹے یہاں صرف ایک کمرے میں رہتے ہو تو بے شک تمہیں ایک سہولت والی بڑی رہائش گاہ درکار ہے لیکن میں اور میمونہ یہاں بہت آرام سے ہیں تو تم منتقل ہو جاؤ تو اُس کا چہرہ اتر گیا، زرد ہو گیا. سُمیر نے اگرچہ وہ فارن سروس میں جا سکتا تھا، صرف اس لیے کسٹم کا شعبہ پسند کر لیا کہ بڑے بھائی سلجوق فارن سروس میں کب کے چلے گئے، ایک مدت سے نیویارک میں مقیم یو این او میں بین الاقوامی امور میں مبتلا ہیں تو اگر میں بھی سفارت کار ہو جاؤں تو ابو اور امی کے پاس کون ہو گا، یہ اکیلے رہ جائیں گے.. اُس نے نہایت اعلیٰ عہدے ترک کر کے صرف لاہور میں ٹھہر جانا پسند کیا تا کہ.. ابو اور امی اکیلے نہ رہ جائیں تو ایسے بیٹے کا چہرہ زرد ہو جائے، اتر جائے، کیسے برداشت ہو سکتا ہے.. چنانچہ میں نے منتقل ہو جانا ہے.. چنانچہ مجھے اپنے لاہور کے ان چار گھروں کو یاد کر لینے دیجئے جہاں میں کبھی گھٹنوں کے بل رینگتا تھا، ایک بچے سے ایک ٹین ایجر میں بدلا، جوان ہوا، عمر ڈھل گئی اور پھر بوڑھا ہو گیا..

لاہور میں ہمارا پہلا گھر ریلوے سٹیشن اور گڑھی شاہو کی قربت میں ''بوڑھ والا چوک''، یعنی برگد والے چوک کے پہلو میں تھا.. وہ ایک محلّہ تھا جس میں داخل ہونے کا ایک بوسیدہ دروازہ تھا جو سرِ شام بند ہو جاتا تھا، دو کولونیئل طرز کے پرانے کمرے اور ایک صحن.. اس گھر کی یادیں کہاں ہوں گی کہ میں ایک رینگتا ہوا گول مٹول سیاہ رنگت کا موٹی موٹی آنکھوں والا ایک فضول اور بُدھو سا بچہ تھا جو کچھ میری یادداشت میں ہے، وہ میرے ابّا جی اور امی

جان کی کہاوتیں ہیں.. میری امی جواُن دنوں ایک ٹین ایجر بالڑی سی لڑکی تھیں، صحن میں آٹا گوندھ رہی ہیں اور میں اُن کے آس پاس ''غاں غاں'' کرتا گھٹنوں کے بل رینگتا صحن کی سیاحت کرتا ہوں اور پھر ان کی بے خبری میں ایک کمرے میں چلا جاتا ہوں. سرخ اینٹوں کے فرش پر کچھ سرخ رنگ کی گولیاں پڑی ہیں جنہیں اٹھا کر میں نہایت رغبت سے نگل لیتا ہوں، یہ چوہے مار گولیاں ہیں جو اُن دنوں چوہوں کو تلف کرنے کے لیے استعمال ہوا کرتی تھیں.. گولیاں نگل کر میں فوراً اوندھا ہو جاتا ہوں.. میری امی جب آٹا گوندھتی آس پاس نظر کرتی ہیں تو میں صحن میں نہیں ہوں، وہ باؤلی ہو کر مجھے تلاش کرتی ہیں اور میں فرش پر ایک مُردہ لال بیگ کی مانند اوندھا پڑا ہوں اور میری باچھوں میں سے جھاگ کے بلبلے پھوٹ رہے ہیں.. گڑھی شاہو کے ڈاکٹر صاحب معائنہ کر کے کہتے ہیں کہ یہ بچہ تو گیا، چوہوں کا زہر اثر کر گیا.. تب مجھے ایک قے ہوتی ہے اور میں یکدم ہوش میں آ کر ''باں باں'' کرتا رینگنے لگتا ہوں اور یہ معجزہ اس لیے رونما ہوا کہ امی نے آٹا گوندھنے سے پیشتر مجھے گرائپ واٹر کے دو چمچے پلائے تھے جن کی وجہ سے مجھے قے ہوئی اور میں ''باں باں'' کرنے لگا.. مجھے بہر طور اتنا یاد ہے کہ گرائپ واٹر کی بوتل پر چسپاں لیبل پر ایک موٹو سا بچہ ایک سانپ کو گرفت میں لیے بیٹھا ہے اور اُس میں سونف کی مہک تھی... بہت برس بیت چکے جب بیروت میں، عربوں کا پسندیدہ ''عرق'' سونگھا تو اس میں بھی سونف کی مہک تھی..

میں اب چلنے لگا ہوں.. محلّے میں کھیلنے لگا ہوں، کھیلتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گیا ہوں تو ایک اجنبی شخص میرے پاس آ کر سرگوشی کرتا ہے ''بیٹے، مٹھائی کھاؤ گے..'' وہ مجھے برفی کا ایک ٹکڑا دیتا ہے اور پھر کہتا ہے ''آؤ، میں تمہیں سیر کراتا ہوں'' وہ مجھے کاندھوں پر بٹھا کر سیر کرواتا ہے جب کہ میں مزے سے برفی کھا رہا ہوں اور وہ اتفاقاً لاہور ریلوے سٹیشن پر پہنچ جاتا ہے اور پلیٹ فارم پر موجود ایک ٹرین میں سوار ہونے کو ہے جب اتفاقاً میرے ابا جی کا ایک دوست مجھے ایک اجنبی شخص کے کاندھوں پر سوار برفی ہڑپ کرتے دیکھ لیتا ہے اور قریب آ کر کہتا ہے ''مستنصر.. تم کہاں جا رہے ہو..'' وہ اجنبی شخص، ایک خرکار، مجھے فوراً کندھوں سے اتار کر پلیٹ فارم پر پٹختا ہے اور بھاگ نکلتا ہے.. اباجان کے وہ دوست مجھے گھر پہنچا دیتے ہیں.. میری حیات کی داستان کتنی مختلف ہوتی اگر وہ شخص مجھے اغوا کر کے لے جاتا.. میں کسی خرکار کیمپ میں ایک زنجیروں میں بندھا مزدور ہوتا، کسی نہری منصوبے میں گدھوں کو ہانک رہا ہوتا، یا پھر وہ شخص مجھے فروخت کر دیتا.. ممکنات کا کچھ شمار نہیں.. بہرطور یہ طے ہے کہ میں اگر ایک مزدور، گدھے ہانکنے والا یا شاید ایک جنسی غلام ہوتا، میں کب کا مر چکا ہوتا..

میرا دوسرا گھر، اور یہ گھر میری یادداشت میں مکمل تفصیل سے محفوظ ہے.. چیمبرلین روڈ پر واقع، احاطہ قادر بخش کے داخلے پر بلند ہوتا وہ گھر جو سہ منزلہ تھا، جس کی محراب دار بالکونیوں کے آگے چقیں تنی ہوتی

تھیں اور جہاں دوسری منزل پر ایک کچے صحن میں میرے ختنے کیے گئے تھے، مجھے دو اینٹوں پر براجمان کر کے جب ابراہیم نائی نے کہا تھا کہ.. مستنصر، اوپر دیکھو، ایک چیل گدھا اُٹھائے لیے جا رہی ہے تو میں نے نہایت اشتیاق سے اوپر دیکھا تو نیچے سے ابراہیم نائی نے میرا کام تمام کر دیا.. مجھے مختصر کر دیا.. اِسی گھر کی تیسری منزل پر بچھی چھت پر بسنت بہار کے بہت مزے لُوٹے، بڑی گڈیاں اور پتنگیں لوٹیں اور ڈور سے اپنی انگلیوں کو خون کیا۔ 1947ء میں جلتے بھڑکتے شاہ عالمی گیٹ کے مکانوں اور حویلیوں سے اٹھتی راکھ کو میں نے اپنے چہرے پر گرتے محسوس کیا، وہاں نہ صرف عمارتیں جلتی تھیں بلکہ ہندو آبادی کے بدن بھی جلتے تھے، میں نے ان راکھ زمانوں کو اپنے ناول ''راکھ'' میں بیان کیا ہے، چیمبرلین روڈ کے اسی گھر میں میری منجھلی ہمشیرہ شاہدہ، ایک چار برس کی موٹی بچی، گھنٹی بجنے پر دوڑتی ہوئی لکڑی کی گیلری کی جانب لپکی کہ نیچے کون ہے تو گیلری پر اڈتی ہوئی نیچے بازار میں واقع سبزی کی دکان میں گاجروں اور گوبھی کے پھولوں پر جا گری..

اُس کی ناک بہت ستواں تھی، اس کریش لینڈنگ کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لیے ''پھینی'' ہوگئی. سب مذاق کرتے کہ گاجریں کھانے کے لیے اُس نے گیلری میں سے بازار میں چھلانگ لگا دی تھی، بہر طور وہ مرتے مرتے بچی..

ہم چھ بھائی بہن تھے، تین بھائی اور تین بہنیں اور ہم سب کو مرنے کا بہت شوق تھا.. میں اپنا قصہ بیان کر چکا ہوں کہ میں نے چوہوں کا زہر کھا لیا اور اوندھا ہو گیا، مجھ سے چھوٹا بھائی زبیر کھڑکی میں سے لٹک کر گڈی اُڑا رہا تھا کہ نیچے گلی میں جا گرا، لوگوں نے سمجھا کہ مر گیا، ہسپتال لے گئے تو وہ ہوش میں آ گیا، البتہ ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ سب سے چھوٹا بھائی مبشر صرف چھ ماہ کا تھا اور پروین کی گود میں تھا کہ ایک اور بچّی نے طیش میں آ کر اسے پروین سے چھینا اور زمین پر پٹخ دیا، موصوف بھی لگتا تھا کہ رحلت فرما گئے ہیں لیکن بچ گئے البتہ ہسپتال میں ٹانگے رہے کہ اُن کی بھی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی.. پروین اپنی سہیلیوں کے ساتھ چھت پر آنکھوں پر پٹی باندھ کر چھپن چھپائی کھیل رہی تھی، چھت کی منڈیر مختصر تھی، چلتی ہوئی آئی اور دھڑام سے نیچے صحن میں آ گری.. کپڑے جھاڑ کر اٹھ بیٹھی اور خوفزدہ سہیلیوں سے کہنے لگی ''میری امی کو نہ بتانا کہ میں گر گئی تھی..''

اب رہ گئی سب سے چھوٹی ہمشیرہ شائستہ.. وہ شاید دو برس کی تھی جب اُسے تیز بخار ہوا.. مجھے یاد ہے اسے ایک پیڑھی پر لٹایا ہوا تھا وہ اتنی چھوٹی سی تھی، ابھی وہ بھلی چنگی کلکاریاں مار رہی تھی کہ یکدم ساکت ہو گئی اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں.. امّی جان نے بین کرنے شروع کر دیئے کہ ہائے میری پیاری دِھی رانی اور میں اپنی ہمشیرہ کی موت کے غم میں رونے لگا.. خالو عزیز احمد میری امی کی ڈھارس بندھانے لگے کہ چُپ کر نواب بیگم، اللہ کی مرضی. صبر کر.. اور اس دوران وہ شائستہ کی کھلی آنکھیں بند کرنے لگے.. پر وہ بند نہ ہوتی تھیں، کھلی رہتی تھیں، ڈاکٹر خان فوراً آئے اور اسے دو چار جھانپڑ رسید کیے ایک ٹیکہ لگایا تو وہ زندہ ہو گئی.. میں

بھی اسی خاندانی خصلت کے تابع پچھلے دنوں دو تین بار پار چلا گیا اور پھر لوٹ آیا.. چنانچہ ہم سب بہن بھائیوں کو مرنے کا بہت شوق تھا، اور یہ زبیر تھا جو سچ مچ جگر کے سرطان کا شکار ہو کر چلا گیا. لوٹ کر نہ آیا، چلا ہی گیا..

ہم چیمبرلین روڈ والے دیدہ زیب گھر سے ایک جدید علاقے لکشمی مینشن میں منتقل ہو گئے.. بیڈن روڈ اور ہال روڈ کے سنگم پر واقع مال روڈ کی جانب چہرہ کیے وہ گھر جہاں میں جوان ہوا، میری شادی ہوئی، اللہ تعالیٰ نے مجھے تین بچوں سے نوازا.. یہیں پر میری دوستی سعادت حسن منٹو سے ہوئی.. میں نے ایک تحریر میں دعویٰ کیا تھا کہ برصغیر میں شاید ہی کوئی ایسا محلّہ ہو جہاں ایک ہی زمانے میں اتنے ڈھیر سارے نابغۂ روزگار لوگ قیام کرتے ہوں.. سعادت حسن منٹو، اُن کے برابر میں مشہور براڈ کاسٹر اور سفارت کار حامد جلال.. اُن کا بیٹا مشہور مصّور شاہد جلال، اُن کی بیٹی بین الاقوامی تاریخ دان عائشہ جلال.. تاجور نجیب آبادی اور اُن کے فرزند، مولانا محمد حسین آزاد کا پوتا.. پروفیسر جی ایم اثر، خورشید شاہد، سلمان شاہد، سابق صدر رفیق تارڑ کے بڑے بھائی سلیم تارڑ اور ملک معراج خالد.. میں اُن زمانوں کو اپنے ناول ''راکھ'' میں بیان کر چکا ہوں.. اسی لکشمی مینشن کو تاجر مافیا نے برباد کر ڈالا.. یہاں تک کہ منٹو کے گھر کے باہر جو تختی آویزاں تھی اُسے اکھاڑ پھینکا.. میرے گھر 17.. لکشمی مینشن کو بھی اجاڑ دیا.. اب وہاں پلازے بن چکے ہیں اور منٹو، مولانا آزاد، تاجور نجیب آبادی، ملک معراج خالد اور سلیم تارڑ کی روحیں ماتم کرتی ہیں.. لکشمی مینشن میں رہنے والے پارسی، عیسائی اور ہندو خاندان کب کے اس بستی کو چھوڑ کر باہر کے ملکوں میں جا آباد ہوئے ہیں..

لمحۂ موجوُد میں گلبرگ کے جے بلاک میں فردوس مارکیٹ کے قریب میں اُس گھر میں ہوں جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا، دو کنال کے پلاٹ میں ہم تینوں بھائیوں نے الگ الگ حصّے بنائے اور ہم منتقل ہو گئے.. میں پچھواڑے میں مقیم ہوں.. آج سے تقریباً چونتیس برس پیشتر میں نے اپنے ہاتھوں سے پائن کا ایک بالشت بھر بُوٹا لگایا تھا.. وہ اب اتنا بڑا ہو چکا ہے کہ دور دور سے دکھائی دیتا ہے اور لوگ حیران ہوتے ہیں کہ پہاڑوں کا یہ درخت لاہور کے گرم موسموں میں کیسے اتنا تن آور ہو گیا.. اور وہ نہیں جانتے کہ میں تقریباً ہر برس کوہ نوردی کے لیے جب برفیلی بلندیوں پر جاتا ہوں تو وہاں سے اس شجر کے لیے برفیلے اور خنک موسموں کے سندیس لاتا تھا.. مجھے اس گھر سے بچھڑنے کا یہی قلق ہے کہ میرے بعد یہ درخت کیسے زندہ رہے گا، سُوکھ جائے گا..

اسی گلبرگ والے گھر میں میرے تینوں بچّوں کی شادیاں ہوئیں، ان کے بچّے ہوئے، میرے پوتے، نواسے اور ایک پوتی ہوئی، یہ ایسا برکت والا گھر ہے، اور بس چند روز کی بات ہے جب مجھے اس چوتھے گھر کو بھی نہ چاہتے ہوئے بھی چھوڑ جانا ہے، جہاں میں اور میمونہ بوڑھے ہوئے ہیں، اسے چھوڑ جانا ہے..

ہولے ہولے سامان منتقل ہو رہا ہے، گھر خالی ہو رہا ہے..اور مجھے ہول اٹھتا ہے..یہ طے ہے کہ وہ پانچواں ڈیفنس والا گھر میرا آخری گھر ہوگا اور جب میں وہاں سے منتقل ہوں گا تو پھر اپنے آخری اور ابدی گھر میں منتقل ہوں گا...اور میں بخوشی جاؤں گا کہ میں ایک خوش بخت اور خوش نصیب شخص رہا ہوں، مجھے کچھ غم نہ ہوگا کہ مجھے کالی کملی والے کی جُوتیوں میں اُن کے اپنے ہاتھوں کی لگائی گئی گانٹھوں کی قربت نصیب ہو جائے گی..



''صدائیں شہر لاہور کی''

دنیا کے ہر قدیم شہر کی آوازیں، صدائیں، سرگوشیاں، روشنیاں الگ اور منفرد ہوتی ہیں اور یہ ہزاروں برس سے آباد ان بستیوں کی تاریخ، ثقافت اور مذہب میں سے جنم لیتی ہیں..وہ دنیا کا سب سے قدیم آباد شہر جواب برباد ہو رہا ہے دمشق ہو، قرطبہ، مکّہ مکرمہ، یارقند، قونیا، تبریز یا استنبول ہو، آپ آنکھیں بند کر کے ان میں داخل ہو جائیں تب بھی ان کی صداؤں سے آپ پہچان جائیں گے کہ آپ کس شہر میں ہیں، آنکھیں کھول کر دیکھیں تو اس کی روشنیاں اس کے نام کی مالا جپتی ہوں گی..اسی طور شہر لاہور کی آوازیں، صدائیں، سرگوشیاں اور روشنیاں بھی الگ اور منفرد ہیں..

جیسے نجیب محفوظ کے ناولوں میں صرف اور صرف قدیم قاہرہ محفوظ ہے..ترک ارہان پاموک اپنے استنبول کے سحر میں مبتلا اکثر صرف استنبول کو اپنے ناولوں میں زندہ کرتا ہے..چارلز ڈکنز، لنڈن کے تذکرے کرتا ہے..ایمل زولا، پیرس کے پرانے گلی کوچوں میں بھٹکتا پھرتا ہے..جیمز جوائس اپنے شہر ڈبلن کے ایک دن کے بارے میں ''یولیسس'' جیسا بڑا ناول تخلیق کرتا ہے..فیوڈور دوستووسکی اپنے سینٹ پیٹرز برگ کے قصیدے گاتا ہے..البرٹو موراویا، روم کے گیت الاپتا ہے..گارسیا اپنے غرناطہ کو شاعری میں لازوال کرتا ہے..شیخ سعدی، شیراز اور عمر خیام، نیشاپور کے خمار میں رہتے ہیں تو اسی طور..ان ادبی سربلندیوں کے نقار خانے میں، میرے ایسا ایک طوطی بھی ہے جس کی پکار کوئی نہیں سنتا اور پھر بھی میں کُوکتا چلا جاتا ہوں اور میری ہر کُوک میں بھی میرا شہر لاہور ہے..

میں نے ایک زمانے میں تقریباً سو کے لگ بھگ جو ٹیلی ویژن ڈرامے لکھے اُن میں سے بیشتر کا پس منظر پرانا لاہور ہے..''سورج کے ساتھ ساتھ'' ڈرامہ سیریل میں۔1930ء کے لاہور کی ڈرامائی تصویر کشی کی گئی..''ہزاروں راستے'' میں بھی لاہور کا اندرون جلوہ گر تھا جب کہ سیریل ''فریب'' میں بھی لاہور کی پرانی گلیاں اور حویلیاں تھیں جن میں فلم سٹار رانی نے مرکزی کردار ادا کیا..میرے تقریباً سبھی ناولوں کے کردار لاہور میں سانس لیتے تھے ''راکھ'' اور ''اے غزالِ شب'' میں بھی لاہور، لاہور ہے..اور یہ مقولہ کیسے جنم میں آیا..بقول مجید شیخ پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں کے لیے جنگ کرنے والی ایک لاہوری پلٹن تھی جس میں سب کے سب لاہوری ہندو، مسلمان اور سکھ سپاہی تھے..بلجیم کے میدانِ جنگ میں انگریزوں نے انہیں موت کے

منہ میں جھونک دیا اور جب وہ دشمن پر حملہ آور ہوتے تھے تو نعرہ زن ہوتے تھے کہ.. موت، موت ہے اور لاہور، لاہور ہے..

تو کچھ تذکرہ شہروں کے شہر لاہور کی آوازوں اور صداؤں کا ہو جائے..

میں اُن زمانوں میں دوسری یا تیسری جماعت کا طالب علم بچّہ تھا اور اندرون شہر رنگ محل مشن ہائی سکول میں پڑھتا تھا جہاں کم از کم ایک استانی گوری تھی اور ہر سویر ہم ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری'' گانے کے بعد ایک پادری صاحب کا وعظ سنتے تھے، چیمبرلین روڈ پر واقع احاطہ قادر بخش کی قربت میں ہمارا جو مکان تھا، وہاں سے رنگ محل مشن ہائی سکول تک جانے کے دو راستے تھے.. ایک تو کرشنا گلی میں سے برآمد ہو کر بانساں والے بازار کے راستے شاہ عالمی گیٹ کے اندر جاتا تھا، جہاں موٹی موٹی ہندو عورتیں سونے کے زیورات خریدتی تھیں اور دوسرا موچی دروازے کی جانب سے رنگ محل تک چلا جاتا تھا.. میں اپنا بستہ سنبھالے اکثر یہی راستہ اختیار کرتا، موچی دروازے کے اندر داخل ہو کر جب بائیں جانب مُڑتا تو کانوں میں ایک دھمک گونجنے لگتی.. دھم دھم.. ایک عجب وجد آور دھم دھم کی گُونج.. یہ ورق کوبوں کا بازار تھا.. درجنوں نیم تاریک دکانوں کے اندر چمڑے کی کتابوں کے اوراق میں رکھے گئے سونے اور چاندی کے ذرّے، کُوٹ کُوٹ کر سنہری اور روپہلی ورق بنائے جا رہے ہوتے، ان ورق کوبوں کی ردھم عجب بے خود کر دینے والی ہوتی تھی.. اگرچہ میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا لیکن ہمیشہ وہاں ٹھہر جاتا اور میرا جی چاہتا کہ میں یہ سکول ترک کر دوں اور ورق کوبوں کی دھم دھم ردھم پر جھومتا رقص کرنے لگوں.. اور اگر میں ایسا کرتا تو مولانا جلال الدین رومی کی پیروی کرتا.. شمس تبریز کی گمشدگی کے بعد مولانا روم اپنے محبوب کی جدائی میں بھٹکتے پھرتے تھے جب وہ ایک بازار سے گذرے جہاں صلاح الدین ورق کوب، دھم دھم ورق کُوٹ رہا تھا.. مولانا اس دھن کو سُن کر وجد میں آ گئے اور سرِ بازار رقصم.. ناچنے لگے.. صلاح الدین نے انہیں رقص کرتے دیکھا تو پہلے ورق کوبی کی لَے تیز کی اور پھر خود بھی بے خود ہو کر باہر بازار میں آ گیا اور مولانا کے ساتھ رقص کرنے لگا، اگرچہ وہ ورق کوبی نہیں کر رہا تھا لیکن اس کے باوجود ورق کوبی کی دھم دھم جاری تھی تو وہ کون تھا جو ورق کوٹ رہا تھا، کوئی تو تھا، کون تھا، وہی تھا..

ایک روایت کے مطابق شاہ حسین لاہوری بھی اسی ورق کوبی کی دُھن پر وجد میں آ کر بے خود ہو جاتے تھے.. ابھی وہ ہندو بچے مادھو کے عشق میں مبتلا نہ ہوئے تھے.. مادھو لال حسین نہ ہوئے تھے..

لاہور کی ایک گلی کا نام ''گلی گھنگھرو سازاں'' ہے..

تو ذرا اس میں جھانک کر دیکھ لیتے ہیں کہ وہاں گئے زمانوں میں جتنے بھی خاندان آباد تھے اُن سب کا پیشہ گھنگھرو سازی تھا..

پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے
تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے

لاہور کی ''گلی گھنگھر وسازاں'' میں سے قتیل شفائی کے اس گیت کی صدائیں سُنائی دیتی ہیں اور یہ ایک شرعی ستم ہے کہ اس گلی کی مسجد کا نام بھی ''مسجد..گلی گھنگھر وسازاں'' ہے۔ یہ سب لوگ انشاءاللہ، گھنگھر وساز یقیناً جہنم کی آگ میں ڈالے جائیں گے..اگر چہ ایک قباحت درپیش ہے کہ اس گلی میں اب گھنگھر وساز نہیں رہے، گھنگھروؤں والیاں تو بازارِ حسن سے کب کی کوچ کر گئیں، انہوں نے گلبرگ اور ڈیفنس میں ڈیرے جمائے اور انہیں ناچنے کے لیے نہ کسی پائل اور نہ گھنگھروؤں کی حاجت ہے، انڈین آئٹم سونگز ڈیک کے سپیکروں میں سے دھم دھم باہر آتے ہیں اور وہ اپنے مہربان سیاستدانوں، صنعت کاروں اور شہر کے شرفاء کے سامنے اعضاء کی شاعری کرتی ہیں اور ہر شعر پر نہ صرف داد کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں بلکہ نئے نوٹوں کے پلندوں کی بارش بھی کی جاتی ہے۔ عام شاعری کی نسبت اعضاء کی شاعری زیادہ منافع بخش ہوتی ہے اور اعضاء کو شاعری سے الگ بھی سودمند کیا جاسکتا ہے..ہیرا منڈی کے اُجڑنے سے دین دار حضرات کی تشفی تو ہو گئی کہ معاشرے کا یہ ناسور ختم ہو گیا پر ناسور کہاں ختم ہوتا ہے، وہ پورے شہر میں پھیل گیا..ویسے یقین جانئے کہ اس بازار کے بارے میں سب سے اہم اور ذاتی تجربات پر مشتمل کتاب ''اُس بازار میں'' حضرت شورش کاشمیری نے تحریر کی تھی جن کی اسلام سے شیفتگی میں کچھ شک نہیں، ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے..

لاہور کی آوازوں اور صداؤں میں ایک صدا ایک بوڑھے گلوکار کی ہے جو دَف بجاتا گلی گلی گاتا پھرتا ہے..میں لاہور کے گورنر دینا ناتھ کی حویلی کے تباہ ہوتے آثار میں بھٹکتا پھرتا تھا جب وہ گلوکار دف بجاتا آیا اور ایک نعت رسولؐ الاپنے لگا، کھڑکیوں کی اوٹ میں چہرے تھے، حویلی دینا ناتھ کے قدیم کمروں میں زندگی کرتے لوگ اُس گلوکار کے لیے اپنے بچوں کے ہاتھوں خوراک، آٹا، پھل فروٹ بھیجتے تھے اور وہ ان تحائف کو اپنی جھولی میں سمیٹتا تھا، کبھی کچھ دس بیس روپے بھی کسی جھروکے میں سے ڈولتے ہوئے اُس کے قدموں میں آ گرتے، میں نے پوچھا ''بابا آپ کون ہیں؟'' کہنے لگا ''میں صدا لگاتا ہوں، میرا باپ، میرا دادا بھی انہی گلیوں اور حویلیوں میں صدائیں لگاتے تھے لیکن میرے بچے باغی ہو گئے ہیں انہوں نے کھوکھے بنا لیے ہیں، کاروبار کرتے ہیں..میں لاہور کا آخری صداکار ہوں..'' اور جب میں نے اُس کی تصویر اتارنے کے لیے کیمرہ اُس پر مرکوز کیا تو اُس نے اپنا چہرہ چھپا لیا ''نہیں یہ جائز نہیں..''

لاہور کی ایک اور آواز، ایک سُریلا بہتا ہوا گیت ایسا ہے جواب سنائی نہیں دیتا لیکن وہ میرے بچپن کے دنوں میں ہمیشہ کے لیے ریکارڈ ہو چکا ہے..سب جانتے ہیں کہ لاہور کے پرانے شہر کے گرد ایک خنک شفاف پانیوں والی مختصر اتنی کہ اُسے پھلانگا بھی جاسکتا تھا، ایک نہر بہتی تھی، اور اس نہر کے آس پاس باغ باغیچے

تھے، گرمیوں کی آگ برساتی حدّت میں یہاں سایہ دار ٹھنڈک ہوا کرتی تھی.. بڑی رونقیں ہوا کرتی تھیں.. پہلوان حضرات ڈنٹر پیلتے، لاہوری اپنے پالتو پرندوں کے پنجرے اٹھائے چلے آتے اور پرندوں کو، خاص طور پر بٹیروں کو نہر کنارے ٹہلاتے.. خواتین اس نہر میں کپڑے دھوتیں اور بچہ لوگ اس میں چھلانگیں لگا کر اس کے خنک پانیوں میں ڈبکیاں لگاتے کہ یہ چھوٹی سی ندی براہ راست دریائے راوی کے پانیوں میں سے جنم لیتی تھی.. یہاں چوسر اور شطرنج کے شوقین بھی بساط جماتے اور ہاں ہم ایسے بچّہ لوگ وہاں ڈنٹر پیلتے پہلوانوں کی نزدیکی سے احتیاط کرتے کہ اُن کے بارے میں کچھ کہانیاں مشہور تھیں، نعیم بخاری بھاٹی گیٹ کے پہلوانوں کی بچّہ لوگ سے الفت کے چشم دید گواہ ہیں.. مجھے صرف دو بار اس نہر میں ڈبکیاں لگانے کا اتفاق ہوا ہے.. اور جب میرے ماموں جان چیمہ صاحب کو میری اس نازیبا حرکت کا علم ہوا تو انہوں نے نہ صرف مجھے زدوکوب کیا بلکہ سرزنش کی کہ تم اس گندے نالے میں نہاتے ہو.. خبردار.. اور وہاں پہلوان بھی ہوتے ہیں..

لاہور کی ایک اور صدا جس کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے ''بو کاٹا'' کی تھی..

؎ اِک دن رہیں بسنت میں، اِک دن رہیں بہار میں

بسنت کو پہلے تو ایک ہندو یا سکھ تہوار قرار دے کر مطعون کیا گیا اور پھر دھات کی ڈور کو بہانہ بنا کر لاہور کی اس شانداری کے رنگوں پر پابندی لگا دی گئی.. بجائے اس کے کہ اُن مجرموں کی گرفت کی جاتی جو آہنی ڈور کی سپلائی میں ملوث ہیں، پوری بسنت کا گلا کاٹ دیا گیا. مریض کا مناسب علاج کرنے کی بجائے اُسے ہلاک کر دیا گیا.. میں نے اپنی کسی تحریر میں یہ گذارش کی تھی کہ آپ لاکھ پابندیاں لگائیں، عوام الناس نے بہر طور موج میلہ کرنا ہے، آپ لٹھ بردار شبابی حملے نیو ایئر نائٹ منانے والوں پر کریں لیکن مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی.. جب آپ اس سرزمین میں سے پُھوٹنے والے میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کا شرعی قلع قمع کریں گے تو وہ ہو جائے گا.. لیکن لوگوں نے چونکہ موج میلہ کرنا ہے اس لیے اُن کی جگہ غیر ملکی تہوار آ جائیں گے.. بسنت یا بیساکھی اور مقامی میلوں ٹھیلوں کی سرکوبی کی جائے گی تو ہمارے ثقافتی مزاج اور اخلاقیات سے الگ، اجنبی تہوار رائج ہو جائیں گے.. نیو ایئر نائٹ کا ہلا گلا.. اور پھر ''سینٹ ویلنٹائن ڈے'' جس روز پورے لاہور میں نہ صرف لڑکیاں بلکہ نہایت عمر رسیدہ خواتین بھی سرخ جوڑے پہنتی ہیں، گلاب کا ایک پھول سو سو روپے میں فروخت ہوتا ہے، فارم ہاؤسوں اور حویلیوں میں جشن برپا ہوتے ہیں تو آپ دین ایمان سے فیصلہ کریں کہ کیا یہ بہتر نہ تھا کہ ہم اپنی سرزمین کے آبائی تہواروں سے جُڑے رہتے.. لڑکیاں بالیاں بسنت کے روز زرد پیراہن میں خوش زرد ہوتیں..

لاہور کے گلی کوچوں میں ایک اور صدا کرتی تھی ''داس قُلچے.. آ داس قُلچے'' داس قلچہ سینکڑوں برسوں سے لاہوریوں کا مرغوب چلا آیا ہے.. ایک خستہ نان جس تنور میں لگایا نہیں، بیک کیا جاتا ہے اور اس

کے ہمراہ چنے اور بُوند نما سے بیسن کی ''لونچڑیاں'' ۔لاہور میں اب یہ صدا بلند نہیں ہوتی ،صرف ایک تنور ہے پورے شہر میں جہاں داس قُلچے پکائے جاتے ہیں اور وہ بھی بند ہونے کو ہے کہ پیزا کے زمانوں میں کون ہے جو داس قُلچے کھاتا ہو..

بوکاٹا!



''لاہور کا مسخ ہو چکا چہرہ''

جی ہاں تذکرہ چل رہا ہے، شہر لاہور کی صداؤں، آوازوں اور روشنیوں کا.. اُن زمانوں کے مدھم چراغ اب بھی یادوں کے قبرستان میں جلتے ہیں جب میلہ چراغاں مادھولال حسین کے مزار کے نواح میں نہیں، شالیمار باغ کے اندر دھوم مچاتا تھا.. ظاہر ہے تب میں بہت چھوٹا تھا، یعنی کوئی محض ستّر برس پیشتر پاکستان کی تخلیق سے ذرا پہلے.. تو اگر حقیقت اور فسانہ آپس میں مدغم ہو جائیں، تفریق باقی نہ رہے تو اس میں میرا کچھ دوش نہ ہوگا کہ دماغ تصویریں محفوظ نہیں کرتا، بیتے دنوں کی پرچھائیاں، شائبے اور سراب سنبھال لیتا ہے.. شالیمار باغ کے اندر جو میلہ شاہ حسین یا میلہ چراغاں برپا ہوتا تھا اُس میں ایک ٹھہراؤ اور سکون ہوتا تھا، لاہور کی آبادی بھی کم تھی، چنانچہ تب ہجوم اور بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی تھی، کھوے سے کھوا نہیں چھلتا تھا، ہر شخص ایک اپنی دنیا میں حرکت کرتا تھا.. ظاہر ہے ڈھول بجتے تھے اور دور دور سے آنے والے جن میں ہندو اور سکھ بھی شامل ہوتے تھے، بولیاں بولتے، نعرے لگاتے رقص کرتے تھے، نہ دھکم پیل ہوتی تھی اور نہ ہی ہلڑ بازی، عقیدت اور مسرت کی ایک لہر تھی جو ہجوم کے چہروں پر چھلکتی تھی، شالیمار میں داخل ہوتے ہی ڈھول کی دھم دھم کے علاوہ سینکڑوں فوّاروں کے اُبلنے سے جو ترل رِل اور چھم چھم کی بوندوں کی موسیقی وجود میں آتی تھی، وہ بھی سنائی دیتی تھی.. فوّاروں کے دونوں جانب راستوں کے کناروں پر چراغ جلتے تھے اور اُن میں سے کچھ فوّاروں کی بوچھاڑ سے بُجھ بھی جاتے تھے.. سنگ مرمر کی پیولین سے دوسرے تختے پر اُترتے سفید آبشاری بہاؤ کے گرد بھی چراغ روشن ہوتے تھے لیکن سب سے روح پرور نظارہ دوسرے تختے پر ہی واقع وہ کھلے آسمان والا چوکور احاطہ تھا جس کی دیواروں میں سینکڑوں محرابی طاق تھے اور ان سب میں بھی دیئے روشن ہوتے تھے اور فرش کے تالاب میں ہلکورے لیتے پانیوں میں عکس ہوتے روشنی کے شعلوں کی صورت آنکھوں کو خیرہ کرتے تھے، ازاں بعد شالیمار باغ کی تاریخی شناخت کے مجروح ہو جانے کے خدشے کے تحت میلہ چراغاں کو شالیمار بدر کر دیا گیا اور یہ ایک درست اقدام تھا.. ورنہ آبادی کے بڑھنے کی وجہ سے شالیمار باغ کی قدامت مسمار ہو جاتی.. اُن دنوں ابھی ترقی کا ہولناک عفریت وجود میں نہ آیا تھا جو ایک نابینا بُل ڈوزر کی مانند اپنے راستے کی ہر تاریخی مقام کی عظمت کو روندتا چلا جاتا ہے.. شالیمار تو ہے ہی پانیوں اور فوّاروں کی رومانی داستان تو باغ کے باہر پانیوں کی ترسیل کا جو قدیم نظام ایستادہ تھا، اُس کی عمارت

صرف ایک سڑک تعمیر کرنے کی خاطر منہدم کر دی گئی... ابھی انہی دنوں بظاہر ترقی اور سہولت کا بل ڈوز ہر جانب دندناتا پھرتا ہے اور عالی شان لاہور کی پہچان چوبرجی کی دلکش تاریخی عمارت، لکشمی بلڈنگ، متعدد قدیم کلیساؤں اور لاہور کے جی پی او کی عمارت کی بنیادوں میں نقب لگا رہا ہے... شاید ارسطو نے کہا تھا کہ تاجروں کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور نہ دو کہ انہیں ریاست نہیں تجارت عزیز ہوتی ہے..

جیسے فیض صاحب سے ایک میمن تاجر نے پوچھا تھا کہ فیض صاحب، آپ کیا کرتے ہو؟ تو انہوں نے ذرا شرمندہ ہو کر کہا کہ شاعری کرتا ہوں تو وہ کہنے لگا، بابا تمہارا دھندہ کیا ہے تو فیض نے مزید شرمندگی سے کہا کہ جی، میں کتابیں لکھتا ہوں تو میمن نے اُنہیں تھپکی دے کر کہا، تو بابا ایک دو بوری ہمیں بھیج دو، خرید لے گا..

مجھے سیاست سے کچھ لگاؤ نہیں ہے، میں نے آج تک کسی سیاسی پارٹی کو جوائن نہیں کیا، میری ہمدردی ہو سکتی ہے لیکن میں نے اپنے ضمیر کی آواز کو کبھی فروخت نہیں کیا اگرچہ بہت سی ترغیبات پیش کی گئیں کہ اگر میری کوئی پارٹی ہے جس کے ساتھ میں دل و جان سے منسلک ہوں تو وہ پاکستان پارٹی ہے، تو نہ کسی سیاسی مخالفت میں اور نہ کسی نظریاتی اختلاف کے باعث اگر میں اپنے دُکھڑے بیان کرتا ہوں، لاہور کے چہرے کو مسخ کر دینے کے دکھ میں ہوں تو صرف اس لیے کہ دنیا بھر میں کسی اور شہر میں بلکہ کسی اور تاریخی شہر میں کہیں جنگلا بس سروس کے نام پر پورے شہر کی شکل بگاڑ دی گئی ہو، شہر کی شکل ہیبت ناک فلائی اوورز، پُلوں اور شاہراہوں کی تعمیر سے اوجھل کر دی گئی ہو ایسا کبھی نہیں ہوا.. آج میں شہر کی جانب سفر کرتا ہوں تو مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ لاہور کی نہر کا پُل گذر گیا ہے یا نہیں، اچھرہ کہاں ہے.. شادمان کدھر گیا، کیا چوک قرطبہ آ گیا ہے یا نہیں.. مزنگ کا علاقہ کہاں گیا کہ سب کچھ سیمنٹ کے انبار میں روپوش ہو گیا ہے.. سنگِ میل پبلی کیشنز کے شوروم کے سامنے تب گول باغ کی ہریاول نظر نواز ہوتی تھی، ٹاؤن ہال دکھائی دیتا تھا اور گورنمنٹ کالج کے برج مینارے مجھے اُن دنوں کی یاد دلاتے تھے جب میں تقریباً ساٹھ برس پیشتر اس قدیم درسگاہ کے برآمدوں میں پھرتا تھا اور اب سنگِ میل کی شیشے کی کھڑکی کے آگے سیمنٹ کی ایک دیوارِ چین کھڑی ہے اور جس پر سے کبھی کبھار ایک سرخ بس گذر جاتی ہے..

سنکیانگ کے صدر مقام اُرمچی میں بھی اسی نوعیت کی ایک بس چلتی ہے اور اُسے آر بی ایس یعنی ریپڈ بس سروس کہا جاتا ہے لیکن اُس کے لیے پورے شہر کا حلیہ نہیں بگاڑا گیا، وہ شاہراہ کے کناروں پر چلتی ہے، کہیں کہیں اُس کے سٹیشنوں کے لیے البتہ کچھ جگہ مخصوص ہوتی ہے... میں یونان کے پہاڑ ڈیلفی پر مقیم آئندہ زمانوں کے حال بتانے والا اوریکل تو نہیں ہوں لیکن میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ آئندہ زمانوں جب ہم نہ ہوں گے کوئی نہ کوئی آئے گا جو کنکریٹ اور سیمنٹ کی اس بدشکلی کو مسمار کر کے لاہور کا چہرہ بحال کر دے گا..

تاجر مافیا نے تو لکشمی مینشن کو بھی نگل لیا ہے.... اگرچہ اُس نے میرے 17 نمبر فلیٹ کو بھی ہڑپ کر

لیا ہے جہاں میں جوان ہوا، میری شادی ہوئی، میرے بچے ہوئے اور میں ادھیڑ عمر ہوا لیکن میں کس شمار قطار میں ہوں، اس مافیا نے تو سعادت حسن منٹو کے فلیٹ کے باہر آویزاں اُس کے نام کی تختی بھی اکھاڑ پھینکی کہ اب وہاں ایک پلازا تعمیر ہوگا..

ارسطو نے سچ کہا تھا، اپنی ریاست کی باگ ڈور تاجروں کے ہاتھوں میں مت دو..



"بال چراغ عشق دا اور شہر لاہور کا میلہ چراغاں"

یہ روشنی بھی عجب سحر انگیز معجزہ ہے کہ حضرت انسان ازل سے اس کی سحر انگیزی میں دم بخود، حیرت زدہ، پرمسرت اس کے اسیر رہے ہیں اور روشنی سے مراد بجلی سے بھڑکنے والے نیون سائن، بلب اور سرچ لائٹ نہیں ہیں بلکہ اس کا آغاز ایک دیئے کی روشنی سے ہوتا ہے، اِک چراغ سے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی نور کے ایک چراغ میں روشن ہوتا ہے اور میاں محمد بخش لکھتے ہیں..

بال چراغ عشق دا تے کر دے روشن سینہ
دل دے دیوے دی رُشنائی جاوے وِچ زیناں

تو یہ عشق کے چراغوں کی روشنی ہے جو سینے کو روشن کرتی ہے اور یہ دل کے دیئے کی رُشنائی ہے جو زمینوں کے اندر تک سرایت کرتی ہے تو کہیں نور جہاں کا وہ گیت بھی اسی شعر سے متاثر ہو کر نہیں لکھا گیا کہ دل کا دیا جلایا میں نے، دل کا دِیا جلایا.. کوہ طور پر بھی اُسی عشق کی اللہ کے نور کے چراغ کی روشنی تھی جس نے ایک گڈریئے موسےٰ کو اپنی جانب راغب کر لیا تھا..

میرا بچپن تو شہر لاہور میں گذرا، لیکن ہم کبھی کبھار اپنے ننھیال کے قصبے گکھڑ منڈی میں اپنی نانی جان کے ہاں چھٹیاں گذارنے جاتے اور یہ آج سے لگ بھگ چھیاسٹھ برس پیشتر کا قصہ ہے، اُن دنوں وہاں تو کیا لاہور کے کچھ حصّوں میں بھی بجلی نہیں ہوا کرتی تھی، میرے نانا جان نمبردار تھے اور یوں نانی جان بھی نمبردارنی کہلاتی تھیں.. تب دولت اور خوراک کی فراوانی نہ تھی، ہماری امارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ پورے محلے میں صرف ہمارے گھر میں لالٹین تھی اور وہ بھی اہم موقعوں پر چمکا لشکا کر روشن کی جاتی تھی ورنہ اِک مٹی کا دیا تھا.. نانی جان سرِ شام روئی کو ہتھیلیوں میں حرکت دے کر ایک پُونی بناتیں، دیئے میں تیل ڈالتیں اور اُس میں وہ روئی کی پُونی بھگو کر اُسے روشن کرتیں.. پُونی پہلے تو پھٹ پھٹ پٹاخے مارتی پھر اُس کی لَو پُرامن ہو کر جلنے لگتی اور یہ بھی یاد رہے کہ پورے محلّے میں ماچس صرف ہمارے گھر میں ہوا کرتی تھی اور محلّے والے ہمارا چولہا جلنے پر آگ لینے ہمارے ہاں آیا کرتے تھے.. یا تو ایک چمٹے سے ایک سلگتا ہوا کوئلہ لے جایا جاتا

جس سے ان کے ہاں چولہا سلگایا جاتا یا پھر مقامی لوہار سے بنوایا ہوا ایک آہنی کُھرپہ سا آگ کے حصول کے لیے مخصوص ہوا کرتا تھا.. محلے کے سبھی گھروں میں سرِ شام دیئے بھی نہ جلتے تھے کہ ہر کوئی تیل افورڈ نہیں کر سکتا تھا..خاص طور پر چاندنی راتوں میں تو لوگ روشنی کے حوالے سے خود کفیل ہو جاتے، دِیا روشن کرنا گناہ سمجھا جاتا کہ سب کچھ تو دکھائی دیتا ہے تو پھر دِیا کیوں جلانا..آپ کو یاد ہوگا کہ جب صاحباں بھی اپنے محبوب سے ملنے کے بہانے تلاش کرتی ہے تو جہاں وہ نانہجار بیٹی یہ دُعا کرتی ہے کہ اگر میرا باپ مر جائے تو میں شکرانے کے طور پر ایک بکرا قربان کروں..اور فقیر کی وہ کُتیا مر جائے جو ساری رات بھونکتی رہتی ہے، پانچ سات ٹُوہ لینے والی ہمسائیاں اگر فوت ہو جائیں تو کیا ہی بات ہے اور بقیہ کو تاپ یعنی بخار چڑھ جائے اور پھر وہ دعائیں کرتی ہے کہ اُس ہندو کراڑ کی ہٹی جل جائے جہاں ہمیشہ دیا جلتا رہتا ہے کہ اُن زمانوں میں پورے گاؤں میں صرف بنیے کی دکان پر ہی دیا روشن رہتا تھا جس کے نتیجے میں جملہ عشاق خفیہ طور پر اندھیرے میں اپنے محبوب سے ملنے کے لیے نہیں جا سکتے تھے..یہ سب خواہشیں پوری ہونے پر ہی صاحباں کا مرزا سنسان گلیوں میں بے خطر گھوم سکتا تھا..

وہ جو ایک دیئے کی مدھم لَو میں سے پھوٹنے والی روشنی ہوا کرتی تھی وہ بھی بہت بجھی بجھی اور تاریکی میں گھلنے سے بہت روشن نہ ہوتی تھی، یوں لوگوں کے نین نقش مکمل طور پر عیاں نہ ہوتے تھے، صرف پہچان ہو جاتی تھی..یوں ہر شخص اپنے ذات میں تنہا بھی ہو سکتا تھا اور اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کی جستجو کرتا تھا..ویسے ان زمانوں میں یقین کیجیے کہ مکمل اندھیرے میں بھی دیکھا جا سکتا تھا، نابینائی تب اترتی ہے جب آس پاس روشنیاں ہوں اور اگر ایک مکمل تاریک گُھپا ہے تو دھیرے دھیرے آنکھیں اُس تاریکی کی عادی ہو کر دیکھنے لگتی ہیں..

ہم گاؤں کی کچی گلیوں اور جوہڑ کے برابر میں پھیلے ویرانے میں رات کے وقت لُکن میٹی وغیرہ کھیلتے تھے تو ہمیں ہر شے، ہر چہرہ اندھیارے میں صاف نظر آتا تھا، یہ کبھی نہ ہوتا تھا کہ ہم نے پھتو کی بجائے پھاتاں کو دبوچ لیا ہو..یہ جو دیئے اور چراغ کے الوہی روشن کھیل ہیں ان کی کہانیاں عجب اور ست رنگی ہیں..اگر عثمان مروندی کے مزار پر چار چراغ ہمیشہ جلتے ہیں تو پانچواں چراغ جلانے کی آرزو کیوں کی جاتی ہے کہ یہ سب دیئے دل کے ہیں..دِل کا دیا جلایا میں نے..تو اب شہر لاہور کے بھی کچھ چراغ جلاتے ہیں..میلہ چراغاں کا میں تفصیلی تذکرہ کر چکا ہوں کہ کیسے مارچ کے مہینے میں ہمارے گاؤں سے ہمارے عزیز دور پار کے، اُن کے سنگی بیلی چلے آتے تھے اور میری امی ان کے لیے حقّوں اور بستروں کے انتظامات میں ہلکان ہو جاتی تھیں، میں اُس شب کا بھی تذکرہ کر چکا ہوں جب میں نے مادھولال حسین کے عرس کے موقع پر پوری شب ایک الاؤ کے گرد بیٹھے ملنگ باباجات کے ساتھ گذار دی تھی جو بھنگ گھوٹتے نعرے لگاتے تھے کہ..

دِنیں گھوٹیاں تے راتیں پیتیاں
لوکی کہن، مر گئے نیں، اساں اللہ نال گلاں کیتیاں

یعنی ہم دن کے وقت بھنگ گھوٹتے ہیں اور رات کو پیتے ہیں، لوگ ہمیں مست پا کر سمجھتے ہیں کہ ہم مر گئے ہیں حالانکہ ہم تو اللہ سے باتیں کر رہے ہوتے ہیں..

مجھے مزنگ کا وہ ملنگ یاد آ گیا جو بھنگ پینے میں مشغول تھا تو مقامی مسجد کے مولوی صاحب نے اُسے سرزنش کی کہ... کچھ تو شرم کرو.. انسان چاند پر پہنچ گیا ہے اور تم بھنگ پی رہے ہو تو ملنگ نے کہا ''مولوی جی، یہ آخری پیالہ پی کر میں بھی وہیں پہنچنے والا ہوں، فکر نہ کرو.''

میں جب میلہ چراغاں کو یاد کرتا ہوں تو تقریباً ستر برس پیشتر کی یادوں کے بھی کچھ مدھم سے چراغ جلتے ہیں اور یہ چراغ، شاہ حسین کے مزار کے آس پاس نہیں، شالیمار باغ کی روشوں اور آبشاروں اور فواروں کے آس پاس جلتے تھے، میلہ چراغاں اُن گئے زمانوں میں شالیمار باغ کے اندر روشن ہوا کرتا تھا.. مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو.. اگر چراغ ہیں تو اُن کو یاد کر کے دیکھتے ہیں..



”پہلے پیر کا میلہ اور لاہور کی دیوالی“

لاہور کی روشنیوں میں وہ دن بھی تھے جب شالیمار باغ میں میلہ چراغاں منعقد ہوتا تھا اور نہ صرف فواروں کے اُبلتے پانیوں کے کناروں پر دیے روشن ہوتے تھے بلکہ اس باغ کا جو شمع دان تھا، سنگ مرمر کے وہ سینکڑوں طاقچے تھے اُن سب میں بھی چراغ لَو دیتے تھے..

اب اگر میں ماضی کے قبرستان میں اتر ہی چکا ہوں تو وہاں ایک اور دفن شدہ میلے کی قبر پر یاد کا ایک چراغ جلتا ہے اور یہ تھا پہلے پیر کا میلہ.. اور یہ بھی شالیمار باغ میں گُل و گلزار ہوا کرتا تھا.. اور اس میلے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں صرف خواتین شرکت کر سکتی تھیں اور مجھے بھی اس میلے میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا اور اس سے پیشتر کہ آپ فوری طور پر اس نتیجے پر پہنچ جائیں کہ اگر اس میلے میں صرف خواتین شرکت کر سکتی تھیں تو شاید میں بھی اُن دنوں کوئی لڑکی وغیرہ ہوا کرتا تھا اور بعد میں بذریعہ آپریشن وغیرہ ایک نام نہاد مرد ہو گیا تو ذرا صبر کیجئے، میں آپ کو اس وقوعے سے آگاہ کرتا ہوں..

میری ایک نہایت پیاری چھوٹی خالہ جان ہوا کرتی تھیں اور میں اُن کا پسندیدہ بھانجا اس لیے بھی ہوا کرتا تھا کہ ابھی دیگر بھانجا حضرات کے پیدا ہونے میں کچھ وقت تھا.. وہ مجھے ساتھ ساتھ لیے پھرا کرتی تھیں، مجھے یاد ہے کہ اندرونِ شہر وہ ایک نہایت دیدہ زیب عمارت والے سکول میں شاید ساتویں جماعت میں پڑھتی تھیں اور وہ مجھے ایک دفعہ اُس سکول کی سٹیج پر کھیلے جانے والے کسی ڈرامے کو دیکھنے کے لیے ساتھ لے گئی تھیں اور میں نے دیکھا کہ سٹیج پر مختلف لڑکیاں بہروپ بھرے اداکاری کرتی تھیں اور اُن کی کلاس فیلوز نہ صرف تالیاں پیٹتی تھیں بلکہ سیٹیاں بھی بجاتی تھیں، یہی کوئی شاید تقریباً ستر برس پہلے کے لاہور میں.. اور وہاں سٹیج پر مونچھیں لگائے خالہ جان کی عزیز ترین سہیلی حُسنہ بھی اداکاری کر رہی تھیں اور اُن کی مونچھیں بار بار ٹیڑھی ہو جاتی تھیں اور ان کی کلاس فیلوز خوب نعرے لگاتی تھیں.. یہی چھوٹی خالہ جان مجھے اپنی سہیلیوں کے ہمراہ شالامار باغ کے پہلے پیر کے میلے میں ساتھ لے گئیں.. وہاں داخلے پر جو ”سکیورٹی“ اہلکار تھیں وہ اندر جانے والوں پر کڑی نظر رکھتی تھیں، اُن میں سے ایک نے مجھے روک لیا ”مرد اندر نہیں جا سکتے“

خالہ جان کو بہت غصہ آیا اور کہنے لگیں ”ہائے ہائے ایک بچے کو مرد کہتی ہو، ابھی کل تو میں اسے گود

میں کھلاتی تھی، معصوم کو مرد بنادیا، شرم کرو..''

ویسے اُس خاتون کا زیادہ قصور نہ تھا کہ میں نے اپنی عمر کی نسبت کچھ زیادہ قد کاٹھ نکال لیا تھا.. بہر طور مجھے داخلے کی اجازت مل گئی.. اور ہاں یہ رات کا نہیں دن کا سماں تھا.. شالیمار کی روشوں کے دونوں جانب عارضی کھوکھوں میں مختلف اشیاء اور فوارّوں کی نمائش لگی تھی.. چوڑیاں، چُنریاں، چادریں، زنانہ کھُسے ، چاندی کے زیور، گُڑیاں اور پتنگیں کہ اُن زمانوں میں لڑکیاں بھی آزادانہ پتنگیں اُڑاتی تھیں اور پھر خوراک کے کھوکھے، آلو چھولے، لڈو پیٹھیاں والے چٹنی اور مُولی کے قتلوں کے ساتھ، کھٹے میٹھے چنے، اِملی کا شربت، پٹھورے اور چنے اور حلوہ پُوڑی..

اس میلے کی سب سے واضح یاد جو میرے ذہن پر نقش ہوگئی وہ ان کھوکھوں کی ''سیلز گرلز'' تھیں.. اور اِن میں سے کچھ نے مردوں کا روپ دھار رکھا تھا، پگڑیاں باندھ رکھی تھیں اور نقلی مونچھیں لگا رکھی تھیں.. پُرلطف یاد یہ ہے کہ وہ باقاعدہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے آنکھیں مارتی کھوکھوں پر آنے والی لڑکیوں کے ساتھ مردوں کی مانند ''فلرٹ'' کرتی تھیں، اُن پر فقرے کستی اور اُن سے محبت کا اظہار کرتی تھیں اور لڑکیاں بھی اُن سے بے دریغ ''فلرٹ'' کرتی تھیں اور شاید کچھ عشقیہ شعروں کا بھی تبادلہ ہوتا تھا، یادرہے کہ یہ وہ دن تھے جب لوگ کسی چلمن سے لگے چہرے پر عاشق ہو کر زندگی بھر کے لیے شاعر ہو جاتے تھے اور اکثر شلوار میں سے ایک لمحے کے لیے جھلک دکھا جانے والے ٹخنے پر مرمٹتے تھے.. لڑکیاں زیادہ سے زیادہ کوٹھے پر ننگے پاؤں جا سکتی تھیں اور اگر کسی لڑکی کے بارے میں یہ پتہ چل جاتا تھا کہ وہ کبھی کبھار ریڈیو پر فلمی گانے سنتی ہے تو اُس کا کردار مخدوش ہو جاتا تھا اور اُس کا رشتہ مُشکل سے ہوتا تھا..

خالہ جان اور ان کی سہیلیوں نے کچھ خریداری کی، چُوڑیاں خریدیں اور شاید لڈو پیٹھیاں والے رغبت سے کھائے اور پھر فوارّوں سے پرے شالیمار باغ میں اُن زمانوں میں آموں کے جو درخت ہوتے تھے، وہاں کا رُخ کیا، ایک مناسب مقام پر ڈیرہ جمایا، اُن کی ایک سکھی جو ایک ڈھولکی گٹھڑی میں باندھ کر لائی تھی اُس نے ڈھولکی نکال کر اُسے گھاس پر رکھا اور بجانے لگی.. لڑکیاں بالیاں گیت گانے لگیں.. خالہ جان نے اپنی پوٹلی میں سے ایک دبیز رسّہ نکالا.. پہلے آس پاس کے درختوں کا جائزہ لیا گیا کہ ان میں سے کس کی ڈال مناسب بلندی پر ہے اور وہ اتنی مضبوط ہے کہ اُس پر رسّہ ڈال کر جھولا جا سکے.. وہ عجب منظر بھی میرے ذہن میں ایک متحرک تصویر ہوتا ہے کہ لڑکیاں اور اُن میں میری خالہ جان بھی تھیں، وہ موٹا رسّہ کسی ڈال پر پھینک رہی ہیں اور وہ اُس ڈال تک اوّل تو پہنچتا نہیں اور اگر پہنچ جائے تو اُس کے اوپر پار ہو کر لٹکتا نہیں.. تب ایک کوہ پیا نوعیت کی لڑکی رسّہ تھام کر ایک بندریا کی مانند درخت پر چڑھ جاتی ہے اور اُسے ڈال سے لٹکا دیتی ہے.. جُھولا وجود میں آجاتا ہے.. اور پھر سکھیاں آج سے تقریباً ستر برس پیشتر کے لاہور میں، شالیمار باغ میں، پہلے پیر کے میلے پر جھولا جھولنے لگتی ہیں.. اپنی نوخیزی کے زور سے اُس جھولے کو درختوں کی چوٹیوں تک لے جاتی آسمان سے باتیں کرتی ہیں..

اُچیاں لمّیاں ٹالیاں تے وِچ گُجری دی پینگ وے ماہیا..

باغوں میں پڑے جھولے، تم بُھول گئے ہم کو، ہم تم کو نہیں بھولے..

جھولا کس نے ڈالا رے..

ہولے ہولے جھلائے میراسیّاں..

کیسے کیسے جُھولے خواب ہوئے..اب تو سراب ہوئے..اگر موت موت ہے اور لاہور، لاہور ہے تو وہ لاہور تو کب کا مر چکا اور اگر اُس میں کچھ آخری سانس تھے تو تاجر مافیا نے اُن کا گلا گھونٹ دیا..

لاہور کی یادوں کے دیئے بجھتے جاتے ہیں اور ان میں سے ایک یاد ایسی ہے جو کبھی بھڑکتی ہے اور کبھی بُجھتی ہے اور وہ ہے لاہور کی دیوالی کی یادوں کے روشن دیئے..چیمبرلین روڈ پر واقع ہمارا گھر ایک ہندو اور سکھ آبادی میں گھرا ہوا مسلمان جزیرہ تھا..سامنے کرشنا گلی کے شاندار گھروں اور حویلیوں کا ایک وسیع کامپلیکس تھا جس کے چاروں اُور آہنی پھاٹک سرِ شام بند ہو جاتے اور ہم اُن میں سے جھانکتے تو اُن کے اندر موٹی موٹی ہندو عورتیں سیر کر رہی ہوتیں، اُس کے برابر میں گاندھی سکوئر، ذرا فاصلے پر نسبت روڈ اور دائیں جانب گوروارجن نگر، عالی شان مکانوں والے علاقے..اور وہ سب کے سب دیوالی کے موقع پر جگمگانے لگتے، لاکھوں دیئے منڈیروں پر روشن ہو جاتے، ہمارے گھر میں ہندوؤں کی جانب سے مٹھائیاں آتیں اور..ہم بھی اپنی منڈیروں پر دیئے جلاتے، گوالمنڈی چوک میں درجنوں دکانیں مٹھائیوں کی سج جاتیں اور مٹھائیوں کے تھال سڑک تک آ جاتے اور اُن کے درمیان میں سے گذرنا مُشکل ہو جاتا...آسمان آتش بازی کے بھڑکنے سے بھڑک کر روشن ہو جاتا.. گوالمنڈی چوک کے مٹھائی کے تھالوں کے درمیان ہندو، کرشن کا رُوپ دھار کر رقص کرتے پھرتے..

یہ شہر لاہور کبھی صداؤں، آوازوں اور روشنیوں کا شہر ہوا کرتا تھا، آوازیں معدوم ہوئیں اور روشنیاں کب کی بُجھ چُکیں..

میرا شہرِ آرزو ایک خواب ہوا، ایک سراب ہوا، تنگ نظری اور تعصّب کا شکار ہوا..اس کے سارے چراغ، سارے دیئے، سب دِیپ بجھ گئے..



''لاہور کو مصوّر کرنے والے مصوّر''

شہر لاہور کی تصویر تب تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اُن مصوروں کو خراجِ تحسین نہ پیش کیا جائے جنہوں نے اسے تصویر کیا.. اس کے کوچۂ و بازار، تنگ گلیوں، بوسیدہ جھروکوں، سکھ دور کی حویلیوں، کٹڑیوں، محلّوں اور اس کے مکینوں کے چہروں میں یُوں رنگ بھرے، اُنہیں کینوس پر یوُں منتقل کیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے لاہور عجائب گھر میں محفوظ ہو گئے.. لاہور شہر کی گھنی اور تنگ گلیوں میں دھوپ کی جو چند کرنیں اترتی ہیں وہ کیسے کسی جھروکے یا بوسیدہ مکان کو روشن کر کے اُسے ایک نیا رُوپ عطا کرتی ہیں.. ایسی بے شمار تاریخی عمارتیں ہیں جو نہ صرف امتدادِ زمانہ کا شکار ہوئیں بلکہ تاجر مافیا اور افغان ''حملہ آوروں'' نے اُنہیں بے دردی سے ڈھا دیا اور وہاں جُوتوں کی فیکٹریاں قائم ہو گئیں، چین کی کاٹھ کباڑ مصنوعات کے گودام تعمیر ہو گئے..

دنیا کے ہر تاریخی شہر کو مصوروں نے پینٹ کیا اور آپ گوگل سے مدد حاصل کر کے یہ جان سکتے ہیں کہ لنڈن، پیرس، روم وغیرہ کو کن مصوّروں نے کینوس پر منتقل کر کے اُن کی ثقافتی تاریخ رنگ میں رقم کی.. مثلاً بیشتر امپرشنسٹ مصوّروں نے مانے، لاٹرک اور رینوئر نے پیرس کے نواح اور دریائے سین کے کناروں پر جو میلے اور رقص ہوتے تھے اُن کو تصویر کیا.. بلکہ لاٹرک نے پیرس کے بدنام زمانہ پگال کے گلی کوچوں اور وہاں کی طوائفوں کے چہرے مصوّر کیے.. اسی لیے اقبال حسین کو بھی لاٹرک سے تشبیہ دی جاتی ہے کہ اقبال نے ہیرا منڈی کی بدنی فروش عورتوں کی روزمرہ زندگی اور اُن کی حسرتوں، دُکھوں اور معاشرے کی دھتکار اُن کے چہروں پر نقش کر کے کمال کی مصوری کی... اور استنبول کو مصوّر کرنے والے بیشتر یورپی مصوّر تھے کہ تُرک ابھی منی ایچر مصوری کی بُھول بھلیوں میں گُم تھے اگرچہ اُن میں بھی ہمیں جنگوں اور قدرتی مناظر کے پس منظر میں استنبول کی جھلکیاں نظر آتی ہیں.. اور یہ ایک اور المیہ ہے کہ دنیا کے یہ تاریخی شہر ان مصوروں کو اپنی ثقافتی تاریخ کا ایک حصّہ جان کر اُنہیں ایک نمایاں مقام دیتے ہیں، اُن کی تصویریں، ڈرائنگ اور نقش ان شہروں کے گھروں اور بازاروں میں آویزاں ہیں اور ہر شہری اُن کے نام اور کام سے واقف اُنہیں اپنا مُحسن سمجھتا ہے جب کہ لاہور کو پینٹ کرنے والے مصوروں سے لاہور بھی واقف نہیں ہے.. اگرچہ یہ سب مصوّر ناموری اور شہرت کے لیے نہیں، لاہور سے اُلفت کا اظہار کرنے کے لیے اس شہر میں دربدر ہوتے اسے اپنی تصویروں کا موضوع بناتے

ہیں..لاہور اُن کا محبوب ہے اور محبوب کی تصویر کشی ناموری کے لیے نہیں کی جاتی، اپنے عشق اور دل گرفتگی کے اظہار کے طور پر کی جاتی ہے..ایک گہرے رنج اور اداسی میں مبتلا ہو کر کی جاتی ہے کہ اس چہرے کو ابھی سے نقش کر لو، کل اس نے نہیں رہنا..آج اس کے نین نقش کینوس پر محفوظ کر لو..

درکار تو یہ ہے، اگر خراجِ تحسین پیش کرنا ہے تو تقاضا تو یہی ہے کہ لاہور کو مصوّر کرنے والے رنگوں اور روشنیوں کے شناسا لوگوں کے بارے میں تفصیل سے ایک کتاب تحریر کی جائے لیکن مصوّری کے معاملے میں میری ہُنر مندی اور شناسائی میں کُچھ گہرائی نہیں ہے، میرا علم بے حد مختصر ہے اور جتنا بھی ہے وہ میرے مصوّر دوستوں کی دین ہے اس لیے میں مختصر مختصر اور سرسری سرسری اُن کا تذکرہ کروں گا..

ان مصوّروں میں سرفہرست اعجاز انور ہے..میں نے ''کسان اینڈ کمپنی'' کے باب میں اس مختصر قد کے، جھاڑ جھنکار سفید بالوں والے تقریباً خبطی شخص کے بارے میں خاصی تفصیل سے لکھا ہے..اور اُس کے جھاڑ جھنکار سفید بال ایسی جھاڑیاں ہیں جن میں پرندے اپنا گھونسلا بنا کر انڈے دے سکتے ہیں اور اگر اُن انڈوں میں سے چوزے پرندے نکل آئیں تو بھی اعجاز انور کو خبر نہ ہو کہ وہ اتنا بے خبر ہے..اُس کی بڑی بڑی گردشی آنکھوں میں قدیم لاہور کے جھروکے اور بوسیدہ عمارتیں ہمیشہ کے لیے نقش ہو چکی ہیں..

اگرچہ وہ قدرے کنجوس اور ناپ تول کا ماہر ہے اور میں متعدد بار در پردہ نہیں براہ راست اُس سے فرمائش کر چکا ہوں کہ بے شک تم کوئی اپنا بڑا ادا اٹر کلر مُجھے پیش نہ کرو..دو چار بُرش چلا ایک مختصر سا جھروکا ہی عطا کر دو پر اُس کے کانوں پر جُوں تک نہیں رینگتی کہ وہ کان اُس کے بالوں سے ڈھکے ہوئے ہیں اور اُن پر جُوں تو کیا ہاتھی بھی رینگ جائے تو اُسے خبر نہ ہو اور اس کے باوجود میں اُسے شہر لاہور کو تصویر کرنے والا سب سے بڑا مصوّر قرار دیتا ہوں..بے شک وہ لاہور کے آسمان پر بسنت کے روز اتنی پتنگیں اور گڈیاں پینٹ کر دیتا ہے کہ اتنی تعداد میں کبھی لاہور کے آسمان پر اتنی اڑانیں نہیں ہوتیں لیکن یہ مبالغہ اور رومان ہر مصوّر کا حق ہے..پکاسو نے کہا تھا کہ مصوّر حقیقت کو پینٹ نہیں کرتا، اُس کے نزدیک جو حقیقت ہونی چاہیے اُس تصوّر کو پینٹ کرتا ہے..

خالد اقبال صاحب کے بارے میں کُچھ کہنا سُورج کو ایک زیرو کا بلب دکھانے کے مترادف ہے کہ چراغ میں تو روشنی بہت ہوتی ہے..وہ بلاشبہ پاکستان میں لینڈ سکیپ مصوّری کے باوا آدم ہیں، میں نے اُنہیں سرِ فہرست اس لیے نہیں رکھا کہ اُنہوں نے لاہور شہر کی بجائے اس کے گرد و نواح میں پھیلے ہوئے کھیتوں، ندی نالوں، اینٹوں کے بھٹوں، خانہ بدوشوں کے خیموں، جُھگیوں، کیکر، املتاس اور سُرخ پھولوں کے درختوں اور سب موسموں کو پینٹ کیا اگرچہ میرے پاس اُن کی عطا کردہ ایک ایسی پینٹنگ ہے جس میں املتاس کے زرد پُھولوں میں پوشیدہ ایک قدیم حویلی کے آثار ہیں جو کبھی پنجاب یونیورسٹی کی نیو کیمپس کے کھیتوں کے کناروں پر اپنے مسمار ہو جانے کے دُکھ میں مبتلا دکھائی دیتی ہے..آج پاکستان کے جتنے بھی مصوّر لینڈ سکیپ پینٹ کرتے

ہیں وہ سب کے سب اُسی مصوّری کے پیرکامل کی پیروی کرتے ہیں..بلکہ سعید اختر کا کہنا ہے جو مصوّر بھی لینڈسکیپ پینٹ کرتا ہے وہ خالد اقبال سے متاثر ہوگا' بے شک وہ آگاہ بھی نہ ہو کہ خالد اقبال کون ہے..

اگر گردش ایام کے سرکش گھوڑے کی باگ پل بھر کے لیے کھینچ لی جائے تو وہاں معین نجمی ہوا کرتے تھے، اداکار اسلم پرویز کے بھائی ایک تارڑ ہوا کرتے تھے جن کا شمار جدید مصوّری کے بانیوں میں ہوتا ہے، اُنہوں نے بھی لاہور کو اپنے تجریدی انداز میں کینوس پر منتقل کیا..اینا مولکا احمد جنہوں نے پاکستان میں مصوّری کو فروغ دینے میں ایک پائینر کا کردار ادا کیا اُن کی کُچھ تصویروں میں بھی لاہور کے کُچھ نقش دکھائی دیتے ہیں.. نسیم حفیظ قاضی، جنہیں لوگ بُھول چکے، وہ بھی لاہور کے اوّلین مصوّروں میں شامل ہیں..خالد سعید بٹ نے منیچر تصویروں میں اس شہر کو اُجاگر کیا..اُستاد میراں بخش نے داتا دربار کی ایک ایسی تصویر بنائی جس میں اس کی ابتدائی شکل دیکھی جا سکتی ہے..''کوآ پرا'' والے محمد جاوید اور رُومی صاحب نے بھی لاہور کو اپنے مخصوص انداز میں تصویر کیا..

غلام مصطفےٰ ایک ایسا مصوّر ہے جس نے لاہور کے گلی کُوچوں کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا.. اُس نے جتنی ہُنرمندی سے روشنی اور دُھوپ سے گلی محلّوں اور اُن کے باسیوں کو ایک الگ رُوپ میں ڈھالا اُس کی جتنی بھی توصیف کی جائے کم ہے..ایک اور منفرد شخص محبوب علی ہے جس نے وُڈکٹ تکنیک سے لاہور کے نین نقش سراسر مختلف زاویوں سے ابھارے..اور وُڈکٹ سے اُس کی وابستگی ہی اُسے ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے..

اقبال حسین کا میں سرسری تذکرہ کر چکا ہوں، اگرچہ وہ طوائفوں، بدن فروش عورتوں اور رقص کرنے والیوں کا پینٹر کہلاتا ہے، وہ خود ہیرامنڈی کے کوٹھوں کی پیداوار ہے، اُس کی پرورش اُسی ماحول میں ہوئی جس پر معاشرہ پھٹکار کرتا تھا تو اُس سے بہتر اُس اداس اور دُکھی حیات کی تصویر کشی کون کر سکتا تھا، یہ اُس کی اپنی ہڈبیتی تھی جسے اُس نے کینوس پر منتقل کیا..اُس کے بیشتر ماڈل اُس کے اپنے گھر کے افراد تھے، اُس کی نزدیکی رشتے دار خواتین تھیں اور وہ اُن کی روزمرہ زندگی اس لیے کاملیت کے ساتھ پینٹ کر سکتا تھا کہ وہ خود اُس روزمرہ زندگی کا ایک کردار تھا..کسی بڑے خاندان، حسب نسب اور اونچی ذات پر تکبر کرنے والے تو بہت ہیں لیکن یہ اقرار کرنے والے کتنے ہیں کہ ہم معاشرے کی حقارت اور دھتکار کا شکار ایسے خاندان کے ہیں جس کا پیشہ گانا بجانا اور بدن فروشی ہے، اس اقرار کے لیے ایک بہت بڑا دل چاہیے، اور اقبال کے پاس ایک ایسا ہی دل ہے..اقبال نے لاہور کے ایسے چہروں کے پورٹریٹ بنائے جن سے کوئی اُلفت نہ رکھتا تھا، یہ دوستوفسکی کے ''ذلتوں کے مارے لوگ'' تھے..اقبال نے ان چہروں کے علاوہ شہر لاہور کے در و بام اور دریائے راوی کے پانیوں کو بھی اپنے انداز میں کینوس پر منتقل کیا..یہ خالد اقبال تھے جنہوں نے اُس کا در پردہ ٹیلنٹ دریافت کیا

اور اُسے نیشنل کالج آف آرٹس میں لے آئے..اقبال بھی خالد اقبال کو اپنا گورو مانتا ہے اور اُن کی عظمت کا اعتراف کرتا ہے..اُس نے ایک مدت نیشنل کالج آف آرٹس میں مصوری کے درس دیئے اور پھر بادشاہی مسجد کے سامنے اپنے آبائی گھر "کوکوزنیسٹ" نام کا ایک منفرد ریستوران قائم کر کے بہت نام کمایا..

اگرچہ ہم اس عہد کے سب سے بڑے مصور سعید اختر کو لاہور کو مصوّر کرنے والوں میں شامل نہیں کر سکتے لیکن اقبال حسین کی مانند اُنہوں نے بھی لاہوریوں کے چہرے پورٹریٹ کی صُورت میں کینوس پر منتقل کیے..البتہ تحریک پاکستان کے حوالے سے، اس تحریک میں حصہ لینے والے رہنماؤں کے گروپ فوٹو کے پس منظر میں بادشاہی مسجد کی جو جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں وہ اُن کے کمالِ فن کا مظہر ہیں..

اعجاز الحسن کا تذکرہ اس لیے آ سکتا ہے کہ وہ لاہور کے سیاسی مزاج کو اپنے انقلابی انداز میں تصویر کرتے ہیں، اُن کے پینٹ کردہ لاہوری گُل بُوٹے اور املتاس کے زرد پُھول دلکش اور نرالے ہیں..

میرے دوست غلام رسول مرحوم نے مصوری کی تعلیم پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی جہاں وہ ذوالقرنین حیدر کے ساتھ باقاعدہ کُشتی لڑا کرتے تھے..اُنہوں نے لینڈ سکیپ مصوری میں بہت نام کمایا، اسلام آباد کے نواح میں جتنے کھیت کھلیان، شجر اور ویرانے تھے اُنہیں تصویر کیا..میں جب اُنہیں گندھارا کے مجسّموں کی تلاش میں گندھارا عہد کے قدیم قصبے سری بہلول لے کر گیا تو وہ اُس ماحول سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہیں ٹھہر گئے اور اُس قصبے کی گلیوں اور لوگوں کو مصور کرتے رہے، بعدازاں ان تصاویر کی نمائش اسلام آباد میں کی جہاں مُجھے مہمان خصوصی بنا دیا گیا..غلام رسول پنجاب کے زمینی مناظر کا مصوّر تھا اور ان منظروں میں کہیں نہ کہیں بھینس بھی بہر طور جلوہ گر ہوتی تھی..اور بھینس ایک ایسا جانور ہے جو بیشتر مصوروں کی عقل سے بڑی ہوتی ہے اُسے پینٹ کرنا بے حد دشوار ہوتا ہے..اُستاد اللہ بخش پنجاب کے جانوروں کو مصور کرنے کے بادشاہ تھے، اُن کے کھیتوں میں ہل چلاتے زور آور بیل اور چراگاہوں میں چرتی بھینسیں زندہ لگتی تھیں، اسی طور غلام رسول بھی بھینسوں کو پینٹ کرنے میں ایک خاص مقام رکھتا تھا..اُس نے پنجاب یونیورسٹی کے زمانوں میں لاہور کے سکیچ بنائے اور اندرونِ شہر کی کُچھ جھلکیاں نقش کیں..

ذوالقرنین حیدر، خالد اقبال کے مُرید اور خلیفۂ اوّل، اُن کے فن کی پیروی یُوں کی کہ ہیر کی مانند خود ہی خالد اقبال ہو گئے۔

شاہد جلال..لکشمی مینشن کا باسی، لاہور کے باغوں اور گلزاروں کی بہاروں کو اپنے کینوس پر یُوں اتارتا ہے کہ اُس کے شجروں میں پرندے کُوکتے سنائی دیتے ہیں اور اُس کے تخلیق کردہ پُھولوں پر شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہیں..اُس کا انداز اپنا مولکا احمد کی مانند کینوس پر گھنے پینٹ جما کر ایک تصور کو اجاگر کرتا ہے..

اعجاز انور کے بعد یہ نذیر احمد ہے، اور یہ بھی خالد اقبال کا معترف اور پیروکار، جس نے ایک مرتبہ کہا

تھا کہ خالد صاحب کینوس پر بُرش کی سٹروک لگا کر کہتے ہیں کہ یہ بادل ہوں گے اور پھر اُسی بُرش کو بغیر کسی اور رنگ میں ڈبوئے کینوس پر لگاتے ہیں تو وہ پانی ہو جاتے ہیں.. نذیر احمد نے نہ صرف لاہور بلکہ پورے پنجاب کی لینڈ سکیپ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا، وہ خود ایک دیہاتی خصلت کا شخص ہے.. چنانچہ اُس کی تصویروں میں کچے گھروندے، جوہڑ، ہریاول سے چُور کھیت اور اُن پر اُمڈتے بادل، یہ سب قدرت کے مظاہر یُوں دکھائی دیتے ہیں جیسے وہ ایک کھڑکی میں سے جو کہ کینوس ہے یوں دکھائی دینے لگتے ہیں کہ اُن کی کچی مٹی کی مہک، کھیتوں کی ہریاول کی خوشبو اور بادلوں کی نمی کو آپ اپنے بدن پر محسوس کرتے ہیں.. اُس نے نہ صرف لاہور کی نہر کنارے سُرخ پھولوں والے شجروں اور املتاس کی زردی کو پانیوں عکس کیا بلکہ میرے نزدیک اُس کی مصوری کے معجزوں نے راوی کے پانیوں کے بہاؤ میں سے جنم لیا ہے.. دریائے راوی کے پانی اگر کلام کر سکتے، ایراوتی اور پاروشنی کے پانی اگر گواہی دے سکتے تو اُن کے آبی ہونٹوں پر صرف اور صرف نذیر احمد کا نام ہوتا کہ اے اکھڑ مزاج مصوّر یہ عین ممکن ہے کہ آئندہ زمانوں میں ہمارے پانی خشک ہو جائیں، گھاگرا کی مانند ہم معدوم ہو جائیں تو بھی ہم تمہاری تصویروں میں ہمیشہ کے لیے بہتے رہیں گے.. ہم تمہارے کینوس پر منتقل ہو کر دوام حاصل کر گئے ہیں..

لاہور، راوی ہے.. اور راوی نذیر احمد ہے..

بے شک دنیائے مصوّری میں اور بھی سخنور بہت اچھے ہوں گے جنہوں نے لاہور کی گلیوں، چوباروں، بُرج میناروں کو مصوّر کیا، اگر میں نے اُن کا تذکرہ نہیں کیا تو یہ مصوّری کے بارے میں میرے محدود علم کا شاخسانہ ہے، اُن سب سے معذرت.. جیسے پہلی جنگ عظیم کے دوران لاہور پلٹن کے سپاہی، انگریزوں کی وفاداری میں، بلجیم کے کارزار میں دشمن پر حملہ کرتے ہوئے نعرہ لگاتے تھے کہ موت، موت ہے اور لاہور، لاہور ہے.. ایسے ہی اگر لاہور، لاہور ہے تو لاہور کو مصوّر کرنے والے مصوّر ہی مصوّر ہیں..



''لاہور کے بھٹیار خانے..ریستوران اور خوراک خانے''

اِن زمانوں میں تو شہر لاہور میں ہوٹل یا خاص طور پر ریستوران زیادہ ہیں اور آسمان پر پتنگیں کم..ایم ایم عالم روڈ، قصوری روڈ اور جوہر ٹاؤن میں اتنی کثرت ہے کہ بندہ ان علاقوں میں محض گذر جائے تو بھی بدہضمی کا شکار ہو جاتا ہے اور خوراکیں بھی مقامی کم اور بین الاقوامی زیادہ..لاہوریئے چینی، جاپانی، تھائی، اطالوی اور امریکی خوراکوں کے اتنے رسیا ہو چکے ہیں کہ اپنے مُرغ چنے، حلوہ پُوڑی، داس قلچے اور لڈّو پیٹھیاں والے وغیرہ بُھول چکے ہیں..میرے دوست تنویر خواجہ نے پچھلی بقرعید کے موقع پر ایک پُورے بکرے کے گوشت کو خصوصی طور پر بُھونا، کلیجی اور پھیپھڑاا الگ، چانپیں اور پسلیاں الگ..کُچھ بُھونا اور کُچھ سیخوں پر چڑھا کر کوئلوں کی آگ پر سینکا، آدھی عید غارت کر کے صرف اپنے بال بچوں کے لیے خصوصی پکوان بنائے اور پھر گھر کے اندر جا کر اپنے تئیں اُنہیں ایک سرپرائز دی کہ.. بچّو، آ جاؤ آ جاؤ لان میں..دیکھو تو سہی میں نے تمہارے لیے کیسی لاجواب لاہوری خوراک تیار کی ہے.. بچّہ لوگ نے کہا..ابّا ہم تو برگر اور پیزا وغیرہ کھا چکے.. آپ کھا لو..تنویر نے سر پیٹ لیا..وہ خود گوجرانوالا کا ہونے کے باوجود کتنا کھا سکتا تھا چنانچہ اُس نے سعید بٹ کو طلب کیا جو اچھی بُری خوراک کا بیری ہے..میں نے آج تک اُسے کسی دسترخوان سے اٹھتے نہیں دیکھا، لوگ اُسے اٹھا دیتے ہیں..

لکشمی مینشن کے زمانوں میں 1953ء کے لگ بھگ ہمارے اینگلو انڈین دوست ایک کباب کو نان میں لپیٹ کر مال روڈ پر مٹرگشت کرتے اُسے نہایت فخر سے کھاتے تھے اور جب ہم پُوچھتے کہ ہیری یا ٹامی، نان کباب کھا رہے ہو تو وہ کہتے، نومئین..آئی ایم ہیونگ اے برگر..امریکی فلمیں دیکھ دیکھ کر ہم سب اُن کے کرداروں کو برگر ہڑپ کرتے دیکھتے تو خواہش کرتے کہ کاش ہم بھی اس دال روٹی وغیرہ کی بجائے یہ الوہی خوراک برگر کھا سکتے..تب لاہور میں برگر کہاں ملتے تھے..میں 1956ء میں انگلستان گیا تو نوٹنگھم میں سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ایک ٹھیلے والے سے برگر خریدا، اُسے کھاتے ہوئے ایک فخریہ تصویر اتروائی اور مینشن کے دوستوں کو روانہ کر دی..دیکھو میں سچ مچ کا ایک برگر کھا رہا ہوں..دوست حسد کی آگ میں جل جل گئے..

اُن زمانوں میں ریستوران وغیرہ کم کم ہوتے تھے..لوگ بھی کم کم وہاں جاتے تھے بلکہ اس حرکت کو قدرے معیوب سمجھا جاتا تھا..کہا جاتا تھا کہ فلاں شخص تو ''ہوٹلنگ'' کرتا ہے یعنی بد بخت گھر کا کھانا چھوڑ کر ہوٹل کا زہر کھاتا ہے..میرے ماموں کو جب علم ہوا کہ میں بھی کبھی کبھار اس قبیح فعل کا مرتکب ہوتا ہوں یعنی ''ہوٹلنگ'' کرتا ہوں تو اُنہوں نے پوچھا ''مستنصر سُنا ہے شیزان ہوٹل میں چائے کی ایک پیالی ایک روپے میں ملتی ہے..'' مین نے اقرار کرتے ہوئے شرمندہ ہو کر کہا ''ہاں جی..ویسے آپ کی چینک خالی ہو جائے تو چائے دوبارہ بھی آرڈر کی جا سکتی ہے..'' تو وہ کچھ حساب کتاب کر کے بولے ''چائے کتنی پی جا سکتی ہے..زیادہ سے زیادہ دو تین کپ..پھر بھی ساڑھے پانچ آنے کا ایک کپ..گھر میں چائے چڑھاؤ تو ساڑھے پانچ آنے میں پورا خاندان چائے پی سکتا ہے..اتنی فضول خرچی کیوں کرتے ہو..

میں صرف اُن ہوٹلوں یا ریستورانوں کا ذکر کروں گا جو میرے تجربے میں آئے ورنہ لاہور کے قدیم ہوٹلوں کا کُچھ شمار نہیں..

ان میں سرفہرست ''شیزان کانٹی نینٹل'' ہے جو مال روڈ پر بھٹی فوٹو گرافر کے پہلو میں واقع تھا اور بھٹی فوٹو گرافر مال روڈ اور بیڈن روڈ کے کونے میں سمٹا ہوا تھا جہاں سے میں نے اپنی شادی کے موقع پر بن ٹھن کر ایک ''ویڈنگ فوٹو'' اور خاندان کی ''گروپ فوٹو'' اتروائی..

''شیزان'' کا نام دراصل مشہور مصوّر شمزہ کا دستخط تھا..جیسے وہ اپنی تصویروں کے کونے میں شمزہ لکھتا تھا ایسے اُس نے اس ریستوران کا منفرد بورڈ تخلیق کیا..

میری زندگی کی بہت سی شامیں ''شیزان کونٹی نینٹل'' میں گذریں..وہاں کی چائے کی زرد مہک آج بھی مُجھ میں مہکتی ہے..سہ منزلہ سٹینڈ کی تھالیوں میں سجی پیسٹریاں اور گرم پیٹز، اُن کے ذائقے ابھی تک زبان کو ترساتے ہیں، یہ لاہور کی ''ایلیٹ'' کلاس کا مسکن تھا، یہاں تک کہ کہا جاتا تھا کہ کُچھ لوگ بیڈن روڈ سے نان اور چنے نوش کر کے شیزان کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر خلال کرتے تھے تا کہ لوگ یہی قیاس کریں کہ یہ بندہ شیزان میں کھانا کھا کر آیا ہے..

ہم کبھی کبھار پُورا مہینہ کنجوسی کرتے، آنہ آنہ جوڑتے رقم جمع کرتے اور شیزان کی کانٹی نینٹل فُوڈ کے اجنبی ذائقوں سے سرشار ہوتے..اور ان میں میری من بھاوَنی دو ڈشیں ہوا تھیں.''پُولے ڈی لا کیو'' یعنی چکن کا سینہ گرم پنیر سے بھرا ہوا اور ''بیف سٹرا گنوف'' جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ رُوس کے کسی زار سٹرا گنوف کی پسندیدہ خوراک تھی.تقریباً پچاس برس بعد جب مُجھے ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی میں ایک سنہری تمغہ دینے اور لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا گیا اور میرے اعزاز میں منعقدہ ایک محفل میں اردو دان اور محقق لڈ میلا واسالووا نے

جو کہ فیض کی عاشق ہیں، اُن کی شاعری کے بارے میں ایک انمول کتاب لکھ چکی ہیں اور جنہیں میں لاہور میں فیض صاحب کی قبر پر لے گیا اور وہ قبر کی جانب چلتی بلند آواز میں ''آئے تھے غمگسار چلتے'' کا ورد کرتی تھیں، اُنہوں نے کہا ''ہم رُوسی پاکستان کو فیض کی شاعری اور تارڑ کی نثر سے پہچانتے ہیں..'' بے شک یہ مُجھے خوش کرنے کے لیے ایک مبالغہ تھا کہ کہاں میں، کہاں یہ مقام اللہ اللہ..تو اُس شب اپنے فائیو سٹار ہوٹل پہنچ کر میں نے شیزان کی یاد میں ''بیف سٹرا گنوف'' کی فرمائش کی کہ دیکھیں اس خوراک کو ایجاد کرنے والے اسے کیسے تیار کرتے ہیں، میں لُڈمیلا کی مانند مبالغہ نہیں کرتا لیکن یقین جانئے شیزان کونٹی نینٹل کے ''بیف سٹرا گنوف'' کے سامنے ماسکو کا پکوان بے رُوح تھا، ''شیزان کونٹی نینٹل'' کے باہر ''رائٹس آف ایڈمشن ریزروڈ'' کی تختی آویزاں تھی اور انگریز سرکار کو رخصت ہوئے کُچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے چنانچہ ''ڈریس کوڈ'' میں پابندی تھی کہ آپ غیر تہذیب یافتہ دیسی لباسوں، شلوار قمیض میں نہیں اور تہبند اور کُرتے میں تو ہرگز نہیں اس ریستوران میں داخل نہیں ہو سکتے تھے..

سرگودھا کے ایک سینکڑوں مربعوں کی اراضی کے مالک زمیندار سر پر بُلند شملے والی پگ باندھے، کُرتے اور تہبند میں ملبوس شیزان میں چلے آئے تو اُنہوں نے جو کُچھ آرڈر کیا اُس کا انکار ہو گیا..مینجر صاحب نے اُن سے درخواست کی کہ وہ مناسب لباس میں نہیں ہیں اس لیے رخصت ہو جائیں..زمیندار صاحب طیش میں نہیں آئے، نہایت ٹھنڈے دماغ سے جیب میں سے چیک بُک نکالی اور کہنے لگے ''یہ ہوٹل کتنے کا ہے.. میں اسے خریدنا چاہتا ہوں..'' مینجر نے کہا ''سر میں تو ادھر ملازم ہوں..'' تو چوہدری صاحب بولے..''تم کتنے کے ہو، تمہیں بھی خرید لیتا ہوں..'' اور چوہدری بس ٹل گئے کہ ''خرید کر اٹھوں گا اور پھر اپنا آرڈر دوں گا، پھر انکار کرنا..'' بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا..یہ شیزان کب کا بند ہو چکا، اب شاید وہاں چینی جُوتوں کا کاروبار ہوتا ہے..

''شیزان کانٹی نینٹل'' کی جڑواں بہن ''شیزان اورینٹل'' مال روڈ کے پار گھوڑوں کی نعل کی شکل کی نیم قوس عمارت دیال سنگھ مینشن میں بسیرا کرتی تھی.. پاکستان کمیونسٹ پارٹی کا صدر دفتر ماتھے پر سُرخ پرچم سجائے، درانتی اور ہتھوڑے سمیت دور سے دکھائی دیتا تھا..اس دیسی شیزان کی دیسی خوراکیں بھی سُتھری اور یادگار تھیں، خاص طور پر ''چوزہ مصالحہ'' اور بُھنے ہوئے بٹیر وغیرہ.. نچلی منزل پر چائے کے رسیا پہروں بیٹھے رہتے اور شیشے کی چھت تک جاتی کھڑکیوں میں سے مال روڈ پر گزرتی ٹریفک کے نظارے کرتے..اوپر والی منزل صرف لنچ اور ڈنر کے لیے مخصوص تھی..اور میری کُچھ شہری یادیں بھی اس نذرِ آتش ہو چکے ریستوراں سے وابستہ ہیں..میری پہلی کتاب ''نکلے تری تلاش میں'' کی افتتاحی تقریب یہیں اس کی بالائی منزل پر منعقد ہوئی تھی،

اشفاق احمد نے صدارت کی اور مقالے پڑھنے والوں میں مقبول جہانگیر، فخر زمان، رحمان مذنب اور تلمیذ حقانی شامل تھے..ازاں بعد، یوں تو سفر حیات کا بے حد طویل تھا اور اس سفر کے دوران سینکڑوں تقاریب پاکستان کے علاوہ نیویارک سے سڈنی تک میرے تذکرے سے منعقد ہوئیں لیکن..وہ جو پہلی تقریب تھی شیزان اورینٹل میں، وہ جو گھبراہٹ اور سنسنی تھی، بدن کے روئیں ہیجان میں آتے تھے، یقین نہ آتا تھا کہ میں ایک مصنّف بن چکا ہوں، توصیف ہوتی تھی تو شک گزرتا تھا کہ یہ میں کہاں..ویسی کیفیت پھر کبھی بدن پر نہ گزری..اسی شیزان میں ذوالفقار تابش کے ہمراہ ابن انشاء سے ملاقاتیں ہوئیں اور ''دھند کے پیچھے شہر تھا'' اُنہوں نے اس خیال کو بے پناہ پسند کیا یہاں تک کہ جب وہ لنڈن جانے سے پیشتر آخری بار ملے تو اُنہوں نے کہا ''تم نے اس تصور پر ناول ضرور لکھنا ہے'' میں نے برسوں بعد ناول تو نہ لکھا ایک کہانی لکھی جو ''15 کہانیاں'' میں شامل ہے..

میں نے اسی شیزان کے ایک کونے میں بیٹھی ایک زرد پیراہن والی سنہری لڑکی کو دیکھا تھا جس کے سراب نے مجھے خوب خوار کیا..

ڈنمارک میں شائع ہونے والے دل آزار کارٹونوں کے احتجاج میں طیش میں آئے ہوئے لوگوں نے جگہ جگہ اپنے لاہور کو جلایا اور شیزان بھی اُس پاگل پن کی زد میں آ کر رزقِ آتش ہوا..اُس کی راکھ میں مجھے اشفاق احمد، تلمیذ حقانی، ابن انشاء اور اُس سنہری لڑکی کی صُورتیں پنہاں دکھائی دیتی رہیں..لاہور ریلوے سٹیشن کے عین سامنے کولونیئل زمانوں کا ''برگنزا ہوٹل'' ہوا کرتا تھا..اُدھر لنڈے بازار میں ''بابو ہوٹل'' ایک الگ پہچان رکھتا تھا، میرے لیے وہ ایک مقدّس مقام تھا کہ میرے ابّا جی جب شاید 1925ء کے لگ بھگ، تقریباً نوّے، سو برس پیشتر رزق روزگار کی تلاش میں گاؤں سے نکل کر لاہور آئے تو اُنہوں نے اپنی ہجرت کی پہلی رات بابو ہوٹل میں گزاری..سرما کی قہر ٹھہرے کی راتوں میں وہ بازار میں انتظار کرتے کہ کب ہوٹل کے تنور کے گرد بیٹھے مسافر رخصت ہوتے ہیں اور کب وہ تندور کے گرد اُس کچّے فرش پر جس میں حدّت ہوتی تھی ایک اور دن کی دربدری کے بعد شب بھر کے لیے دراز ہوتے ہیں..میں نے اپنے ٹیلی ویژن سیریل ''سُورج کے ساتھ ساتھ'' میں اسی ہوٹل کی تصویر کشی کی ہے..بلکہ اپنے ناولوں میں بھی لنڈے بازار کے اس ہوٹل کے تذکرے کیے ہیں..اور یہ ہوٹل اسی نام سے اب بھی موجود ہے اور لنڈے بازار کا محور ہے..اور اب بھی وہاں ایک تنور موجود ہے اور میں دوبارہ وہاں گیا اور ہر بار جی چاہا کہ اگر اس کے تنور کے گرد گاہکوں اور نانبائیوں کا اتنا جمگھٹا نہ ہوتا، تو میں تنور کے آس پاس کچّی مٹّی کا جو فرش اب بھی ہے اُس پر لیٹ کر یہ تو محسوس کرتا کہ میرے ابّا جی اسی حدّت آمیز مٹّی پر جب شب گزارتے تھے تو وہ کیا محسوس کرتے تھے..

ریلوے سٹیشن سے اِدھر چلے آئیے..میکلوڈ روڈ کی مسافت اختیار کیجیے تو وہاں بوسیدگی سے دوچار

مخدوش سا ''زمیندار ہوٹل'' ہوا کرتا تھا جو ہر نوعیت کے گورے اور مخدوش سیاحوں کی آماجگاہ ہوتا تھا.. وہاں صفائی ستھرائی کی چنداں حاجت نہ تھی کہ جتنے بھی ہپّی مکین ہوتے وہ چرس کے دھوئیں میں گُم افلاک کی سیر کرتے اپنے حال سے بے خبر ایک پتھر ہو جاتے.. یعنی ''سٹون'' ہو جائے.. بالکونیوں پر اُن خواتین کے جانگیے اور اگر وہ پہنتی تھیں تو اُن کے براسُوکھ رہے ہوتے.. لاہوری نوجوان ہوٹل کے گرد منڈلاتے رہے.. نہایت روح پرور ماحول ہوا کرتا تھا.. ''زمیندار ہوٹل'' سے آگے بڑھتے ہوئے لاہور کا ایک لینڈ مارک ''لاہور ہوٹل'' چوک قلعہ گجر سنگھ کے ایک کونے میں اپنی شانداری اور سہولت میں تب یکتا نظر نواز ہوتا تھا، میں نے اپنی کچھ عہدِ جوانی کی شامیں، کبھی جمال بٹ کے ساتھ اور کبھی خاور زماں کے ساتھ اسی ہوٹل میں گزاریں..

عین سامنے ''ہوٹل اوریئنٹ'' ہوا کرتا تھا..

اسی چوک قلعہ گجّر سنگھ کے میکلوڈ روڈ والے کونے پر ''راکا پینٹر'' کا سٹوڈیو تھا جس نے ''کسان اینڈ کمپنی'' کا ایک ایسا بہت بڑا سائن بورڈ نقش کیا کہ لوگ صرف اُسے دیکھنے کی خاطر دور دور سے آتے..

اب ذرا لکشمی مینشن کے نواح میں آ جاتے ہیں، وہ لکشمی نگر جسے ٹریڈر مافیا نے مسمار کر دیا..

مینشن میں داخل ہونے کے دو راستے تھے...

ایک ہال روڈ کی جانب سے اور دوسرا راستہ بیڈن سے نکلتا تھا اور اس کے کونے پر انصاری ہوٹل تھا جس کے شامی کباب مشہور تھے اور اسی ہوٹل میں سعادت حسن منٹو نے مُجھے ایک پیسٹری کھلا کر اپنے کُرتے کی جیب میں سے میری کوٹھا عشق کی محبوبہ کا ایک خط برآمد کر کے مُجھ سے پُوچھا تھا کہ تم اس لڑکی کو کہاں کہاں پسند کرتے ہو.. اُوپر سے، نیچے سے یا درمیان سے..

''ادبی دنیا'' کے ایڈیٹر گروشو مارکس ایسی لگن مونچھوں والے مولانا صلاح الدین احمد ہر دوپہر اسی انصاری ہوٹل میں کھانے کے لیے آتے، کسی سے بات نہ کرتے، آنکھ نہ ملاتے.. کھانا کھاتے رہتے..

''انصاری ہوٹل'' کے برابر میں لاہور کا پہلا ''جُوس کارنر'' تھا.. میری معلومات کے مطابق اس کے سوا کہیں اور مالٹے، سنگترے اور انار کا جُوس میسر نہ تھا کہ اُن دنوں جُوس پینے کا زیادہ رواج نہ تھا اور صرف اہل ذوق جنٹری ہی خصوصی طور پر خان صاحب کے اس جُوس کو رونق بخشتے.. یوُں بھی ہر ایک کے پاس آٹھ آنے کہاں ہوتے تھے کہ جُوس پینے کی عیاشی افورڈ کر سکے..

اُدھر ہال روڈ کی جانب سے لکشمی مینشن کا جو داخلہ تھا، بائیں جانب میرا گھر 17-سی لکشمی مینشن ہوا کرتا تھا اور دائیں ہاتھ پر ''فراسٹی مالٹی'' کا آئس کریم پارلر دوسری منزل پر واقع تھا اور یہ بھی شاید لاہور کا واحد اور پہلا آئس کریم پارلر تھا.. یہ نہ صرف اپنی آئس کریم کے لیے مشہور تھا بلکہ پوشیدگی کی خواہش کرنے

والے نوجوان جوڑوں میں بے حد مقبول تھا.. مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا.. یعنی ٹھنڈے اور گرم کا ایک حسین امتزاج تھا.. اگرچہ اس کے گورے چٹے مالک نسیم صاحب محلے دار اور دوست تھے لیکن مجھے کبھی وہاں بیٹھ کر آئس کریم کھانے کا اتفاق نہ ہوا.. ویسے تب دنیا کی بہترین ٹُوٹی فروٹی آئس کریم باغِ جناح کے گلستان ریستوران میں ملتی تھی.. اُن زمانوں میں سابق صدر چاچا رفیق تارڑ کے بڑے بھائی سلیم تارڑ ہمارے ہاں مقیم تھے اور میں اُن کا بغل بچّہ ہوا کرتا تھا، اور وہ مجھے جب کبھی وہ قدرے آسودہ ہوتے اور کم ہی ہوتے تو گلستان ریستوران کی آسمانی ذائقے والی ٹُوٹی فروٹی آئس کریم کھلانے کے لیے لے جاتے.. تارڑوں میں میرے ابّا جی کے علاوہ سب سے خوش شکل اور خوش لباس شخص تھے.. سعادت حسن منٹو کے ساتھ بھی اُن کا یارانہ تھا اور تب کسی خودکشی کے سلسلے میں اُن کا نام بھی آتا تھا.. وہ اپنے والد چوہدری سردار خان سے چُھپ کر بمبئی گئے تاکہ فلموں میں ہیرو بن جائیں لیکن اُن کے مناسب رابطے نہ ہو سکے اور وہ واپس آ گئے.. ورنہ اُن میں نہ شکل کی اور نہ ٹیلنٹ کی کُچھ کمی تھی.. اشوک کمار کے انداز میں سگرٹ کا دھواں بکھیرتے اور روزمرہ زبان میں فلمی مکالموں کا انداز اختیار کرتے اور اُس میں ہندی کی آمیزش کرتے.. نہایت دھیمے مزاج کے مہربان اور نفیس شخص جو کسی ضرورت مند کے لیے اپنی جیب خالی کر دیتے چاہے شام کا کھانا نصیب نہ ہو.. وہ میرے بچپن کی آئیڈیل شخصیت تھے.. انشورنس کے کاروبار میں وہ بہت کامیاب تھے.. یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ کسی سے رجوع کرتے تو وہ شخص اُن کی گفتگو اور شخصیت کی سحر انگیزی سے مسحور ہو کر اپنی انشورنس نہ کروا لے.. متمول ہونے کے بعد اُنہوں نے اپنے آبائی گاؤں، گکھڑ منڈی سے کُچھ دور پیر کوٹ کو اپنا مسکن بنایا.. وہاں ایک جدید سہولتوں کی ڈسپنسری قائم کی جہاں ہر ایک کا مُفت علاج ہوتا تھا.. اور وہ پُورے علاقے میں اپنی دریا دلی اور سخاوت کے لیے مشہور تھے.. اگر کسی غریب کسان کا بیل مر جاتا ہے.. کسی کا گھر ڈھے جاتا ہے.. کسی کی بیٹی کی شادی کی راہ میں غُربت حائل ہے تو چاچا سلیم تارڑ ایک پنجابی حاتم طائی کے رُوپ میں اپنا دھن نثار کر دیتا.. اُسے سب لوگ پرنس سلیم کے نام سے پُکارتے.. اور پھر اُس کا اکلوتا بیٹا عید کے روز ایک حادثے کا شکار ہو کر مر گیا.. اور جس طور اُس شخص نے یہ جُدائی سہی وہ گریۂ یعقوب کی یوسف کی جُدائی سہنے سے کم نہ تھی.. بس یہ ہوا کہ اُن کی سدابہار مسکراہٹ میں خزاں کی زردی آ گئی... آخری بار وہ میری بیٹی عینی کی شادی کے موقع پر ''آواری ہوٹل'' میں آئے، چھڑی ٹیکتے ہوئے، مُجھے پیار کرتے، عینی کے لیے دعائیں کرتے.. سٹیج پر چاچا رفیق تارڑ تشریف رکھتے تھے اور مہمانوں میں چاچا سلیم تارڑ ابھی تک شکل کے من موہنے اور اپنی خزاں آلود مسکراہٹ کے ساتھ، بمشکل سانس سنبھالتے بیٹھے تھے... جی ہاں وہ مُجھے گئے زمانوں میں باغ جناح کے اوپن ایئر ریستوران میں ٹُوٹی فروٹی آئس کریم کھلایا کرتے تھے اور میں اُن کا بغل بچّہ ہوا کرتا تھا..

اس میں کُچھ شک نہیں کہ چاچا رفیق تارڑ ملک کے سب سے بڑے عُہدے پر سرفراز ہوئے اور اس میں بھی کُچھ شک نہیں کہ چاچا سلیم تارڑ ہی میرے پسندیدہ پرنس چارمنگ تھے.. بیڈن روڈ پر ''کیری ہوم'' نام کا ایک ایسا گھریلو ریستوران تھا جو دیسی کھانوں کی عُمدہ کوالٹی اور مناسب قیمتوں کے حوالے سے لاہور بھر میں نامور تھا.. دوپہر کے وقت وہاں جگہ ملنی مُشکل ہوتی اور لوگ باہر کھڑے ہوکر اپنی باری کا انتظار کرتے.. وہاں کا پالک گوشت اور خاص طور پر ''چُوزہ مصالحہ'' بہت مشہور تھا.. اور یہ قدیمی طعام گاہ اب بھی موجود ہے، میرے مرحوم بھائی زبیر کے عزیز ترین صحافی دوست ضیا صاحب اس کے مالک ہیں.. ضیاء ابھی پچھلے دنوں میری ستترہویں سالگرہ کے موقع پر ماڈل ٹاؤن پارک میں میرے لیے ایک شاندار کیک لے کر آئے..

اُنہی زمانوں میں یکدم لوہاری دروازے کے باہر ''نعمت کدہ'' نام کے ایک طعام خانے کی دُھوم مچ گئی، وہاں کے پلاؤ اور روسٹ مُرغ کی شہرت ہوگئی، خوراک کی عُمدگی کے علاوہ ''نعمت کدہ'' کی وجۂ شہرت یہ بھی تھی کہ یہ طعام خانہ ایئر کنڈیشنڈ تھا اور یہ ایک ناقابل تصوّر عیاشی تھی.. یہ بھی باہر سے آنے والے لوگوں سے بھرا رہتا..

شیزان کے مقابلے میں مال روڈ پر ''حیات فرنیچر'' کے برابر میں ایک ریستوران ''گارڈینیا'' نام کا کُھلا اور دنوں میں پسندیدگی کی معراج پر پہنچ گیا.. یہ ریستوران، شیزان کی نسبت ماڈرن اور کُھلا کُھلا سا تھا.. میں، خاور زمان اور فخر زمان کے ہمراہ یہاں آ بیٹھتا اور یہیں سے میری سگرٹ نوشی کا آغاز ہوا.. ایک روز جب میں بے حد رنجیدہ اور اداس تھا میں نے خاور کے گولڈ فلیک پیکٹ میں سے ایک سگرٹ سلگا لیا.. اور پھر چل سو چل..

اُنہی گئے وقتوں میں مال روڈ پر ''ایم یاسین خان بیکری'' کے قریب ''شاہنواز موٹرز'' کے ایک کونے میں ایک منفرد اور الگ طرز تعمیر کا کافی ہاؤس "CHALET" نام کا وجود میں آیا.. ''شلے'' یعنی ایک دیہاتی سوِس جھونپڑا.. کوئی بہت ہی الپس کے برف پوش پہاڑوں اور سوئٹزرلینڈ کے عشق میں ڈوبا شخص تھا جس نے اسے تخلیق کیا..

لاہور کی شدید گرمیوں میں ڈھلواں چھت والا ایک سوس دیہاتی گھر جس کی بالکونیوں میں سُرخ جرنیئم کے پُھول بہار دیتے تھے..

یہ کسی نہ کسی عشق کا اظہار تھا..

جیسے میں ابھی ابھی دو ماہ پیشتر اپنے موجودہ نئے گھر میں ڈیفنس کے ''آر'' بلاک میں منتقل ہوا ہوں تو گلی کے پار کیا دیکھتا ہوں کہ جرمنی کے کسی شہر کا، بلیک فارسٹ کے کسی قصبے کا ایک ڈھلوان چھتوں والا شاندار گھر ہے، بھاری بھرکم طرز تعمیر کا.. ایک جرمن گھر.. ایک ریٹائرڈ ایئر فورس آفیسر میرے ہمسائے مُجھ سے ملنے

کے لیے آئے..اُنہوں نے بتایا..سیالکوٹ کے ایک معروف صنعت کار یرقان کا شکار ہوئے، علاج معالجے کے لیے آسٹریا گئے، ایک آسٹرین نرس نے ہسپتال میں اُن کی بہت خدمت کی اور وہ اُس کے عشق میں مبتلا ہو کر اُسے بیاہ لائے، اُنہوں نے اپنی دوسری بیوی کی خاطر آسٹرین طرز تعمیر کا یہ گھر خصوصی طور پر تعمیر کیا تا کہ وہ پاکستان میں بھی اپنے آبائی ماحول میں زندگی بسر کر سکے..

چنانچہ لاہور کا ''شیلے'' بھی لگتا تھا کہ کسی سوس خاتون کے عشق میں تعمیر کیا گیا..

یہ ایک مختصر سا ریستوران تھا، اس کے اندر داخل ہوتے ہی مُجھے تو یہی محسوس ہوتا تھا کہ میں سوئٹزرلینڈ میں آ گیا ہوں..ویسی ہی کھڑکیاں..سوِس کُکّو کلاک..سکی اِنگ کے سامان..کوہ پیمائی کے بوُٹ.. لکڑی کے غیر آرام دہ بنچ اور کافی میں وہی ذائقہ..اور پھر ژیلیا لاہور میں وارد ہوگئی.. 1965ء میں جپسی مُجھ سے ملنے اور شادی کرنے کے لیے آ گئی..میں نہایت فخر سے اُسے ''شیلے'' میں لے گیا جو اُسے پسند نہ آیا..یہ تو ایک بھونڈی نقل ہے..ہمارے شیلے ایسے تو نہیں ہوتے..وہ ایک نک چڑھی لڑکی تھی.. بانہوں میں ایرانی وزیراعظم کے تحفہ کردہ کنگن سجائے دراصل وہ پاکستان اور مُجھ سے مایوس ہوئی ورنہ ''شیلے'' اتنا بُرا تو نہ تھا..

اور ہاں جپسی ''پارک ہوٹل'' کے ایک قدیم بُلند چھتوں والے کمرے میں ٹھہری جہاں ان دنوں ''آواری'' تعمیر ہو چکا ہے..

اگر ہم لاہور میں آئس کریم کی تاریخ کا سُراغ لگائیں تو وہ فراسٹی مالٹی اور ٹوٹی فروٹی وغیرہ سے سفر کرتی ''ہیکو آئس کریم'' تک پہنچتی ہے.. پوُرے لاہور میں باغِ جناح کے داخلے پر ہیکو آئس کریم کے دوسفید رنگ کے ٹھیلے ہوا کرتے تھے..اور ہر کوئی اس ٹھنڈک بھری، گلے میں گُھل جانے والی کریم خریدنا افورڈ نہ کر سکتا تھا..آج کے زمانوں کے لوگ تصوّر نہیں کر سکتے کہ اُن زمانوں میں ایک پیسٹری یا آئس کریم کھانا کیسی الوہی کیفیت ہوا کرتی تھی..البتہ سال میں ایک دو مرتبہ گھریلو طور پر اس نعمتِ غیر مترقبہ کے حصول کی خاطر..آئس کریم مشین چالو کی جاتی تھی...ہم سب بچّے اس مشین کا ہینڈلُ چلاتے بے دم ہو جاتے..مشین میں ڈالا گیا دودھ اور اُس کے گرد نمک کا ایک حصار.. پورا صحن پانی پانی ہو جاتا اور بالآخر آئس کریم تیار ہو جاتی..اور ہم یقین نہ کر سکتے کہ مشین کے کُوزے میں ایک انجماد ظہور پذیر ہو چکا ہے..آئس کریم کی شکل اختیار کر چکا ہے..یہ ایسے زمانے تھے..شاہ دین بلڈنگ میں واقع ''ہیکو ریستوران'' نہ صرف آئس کریم بلکہ دیگر کانٹی نینٹل ڈشوں کے لیے بھی بہت مشہور تھا..

اور تب فیروز سنز کے پار مال روڈ پر ایک مختصر کونے میں ''گوگو بار'' ظہور میں آیا..یہ ایک چھوٹا سا کھوکھا تھا..شاید لاہور میں ایک اعلیٰ کافی اور فرنچ فرائز کا یہ ایک پائنیر تھا، کھوکھے کے باہر چند اونچے بنچ پڑے

ہوتے اور آپ کُھلی فضا میں اس کی کافی کی مہک سے لطف اندوز ہوتے..

یہ کھوکھا، گوگو بار، میجر عزیز بھٹی نشان حیدر کے برادر کی کاوش تھا..

اگرچہ ہم لوگ جو مال روڈ کے لکشمی مینشن کے باشندے تھے اور دیگر لاہوری باشندوں کو حقیر جانتے تھے لیکن مُجھے خبر ملی کہ ابراہیم جلیس لاہور آئے ہوئے ہیں اور میکلوڈ روڈ پر غالباً ''ویسٹ اینڈ ہوٹل'' میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو میں پہنچ گیا..

وہ ایک ترقی پسند ادیب جانے مانے تھے..''چالیس کروڑ بھکاری'' لکھ چکے تھے اور اُن زمانوں کے معروف کالم نگار تھے تو اُنہوں نے مُجھے شامی کباب کھلائے اور پھر میری آٹوگراف بُک پر لکھا:

''آٹوگراف بُک ایک ایسا اصطبل ہے جس میں عربی گھوڑے اور خچر ساتھ ساتھ بندھے ہوتے ہیں..''

ابراہیم جلیس

اِک روزِ ابر۔لاہور

''ویسٹ اینڈ ہوٹل'' درمیان میں صحن اور اُس کے گرد سہ منزلہ عمارت میں چھوٹے چھوٹے کمرے، پگڑیاں باندھے ہوئے بوڑھے ویٹر..اس کی حالت تب بھی اتنی اچھی نہ تھی، افسردہ اور زوال پذیر تھی اور اب تو وہ ایک کھنڈر ہو چکا ہے..مال روڈ پر ہی تقسیم سے پیشتر کا ''الفنسٹن ہوٹل'' تھا جو بعد میں ''اِنڈس ہول'' کہلایا اور اس کا ریستوران بھی لاہور کے اعلیٰ طعام خانوں میں شمار ہوتا تھا..ایک عرصے تک یہ مال روڈ پر روزانہ گشت کرنے والے لاہوری کراؤڈ کی آماجگاہ رہا..اس کے برابر میں وہ گھاٹی تھی جو وکٹوریہ پارک کی اینگلو انڈین بستی کی خوشنمائی میں اترتی تھی..''انڈس ہوٹل'' اپنی کوزی بار کے حوالے سے بھی ایک پسندیدہ ٹھکانہ ہوا کرتا تھا..

مال روڈ کی دوسری جانب ''لارڈز ہوٹل'' بھی اپنی وسعت اور جدید آرائش کی وجہ سے نہ صرف لاہور جنٹری..ادیبوں اور شاعروں، سیاستدانوں کی بیٹھک بن گیا بلکہ یہ سیکنڈ ہینڈ کاروں کے دلالوں کا بھی فیورٹ ہوا کرتا تھا..اسی لارڈز ہوٹل کے سامنے میرا ایک زمانے کا دوست علی قزلباش اپنے ڈرائیور جان محمد کے ہمراہ ایک سٹول پر بیٹھا سیکنڈ ہینڈ کاروں کا بیوپار کیا کرتا تھا، بعدازاں اُن دونوں نے علی جان موٹرز کے نام سے کوئنز روڈ پر ایک شوروم قائم کیا..

مال روڈ پر سب سے پہلا چینی ریستوران ''کیتھے'' نام کا فیروزسنز کے پہلو میں وجود میں آیا..میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ گلبرگ کا ''شنگھائی'' لاہور کا پہلا چینی ریستوران تھا یا ''کیتھے''..بہر طور یہ ''کیتھے'' تھا جس کی بہت شہرت ہوئی..اُن زمانوں میں چینی خوراک کے بارے میں بہت سی افواہیں گردش کرتی تھیں کہ

چینی لوگ فرائیڈ مینڈک کھاتے ہیں..کیڑوں مکوڑوں کے سُوپ پیتے ہیں اور سانپوں کو بُھونتے ہیں..تب پرانز یا جھینگوں کو بھی مخدوش سمجھا جاتا تھا.. مجھے یاد ہے کہ میرے ایک دو دوستوں نے ''کیتھے'' میں ڈنر کرنے سے انکار کر دیا تھا..بلکہ میرے ایک قدیمی دوست کے والد صاحب کو بھنک پڑ گئی کہ یہ سب اکٹھے ہو کر چینی خوراک کھاتے ہیں تو بہت خفا ہوئے، کہنے لگے ''یہ مستنصر تو انگلستان میں رہ کر آیا ہے جانے وہاں کیا کیا کھاتا رہا ہے اور اب تمہیں کتّے بلّے کھلا رہا ہے..'' میرے دوست نے فوراً اپنی صفائی پیش کی کہ ''نہیں ابا جی، مستنصر کھاتا ہے، میں تو نہیں کھاتا..'' حالانکہ وہ جھینگوں کے سُوپ کا شیدائی تھا..''کیتھے'' زیادہ دیر نہ چلا، بند ہو گیا..

ڈولنگٹن مارکیٹ میں واقع ''کیپری'' لاہور کا سب سے زیادہ رومانوی اور نیم تاریک ریستوران ہوا کرتا تھا، وہاں کا کلب سینڈوچ اور فرنچ فرائز اپنی جگہ لیکن اپنے کسی عشق خاص کے ہمراہ اُس کی دوسری منزل کا خوابناک ماحول اپنی جگہ..یہ معصومیت کے وہ زمانے تھے جب عشق کے بخار میں سلگتے نوجوان جوڑے سر جوڑے بیٹھے رہتے اور یہی اُن کے وصل کی معراج ہوتی..البتہ میز کے نیچے ہاتھ پل بھر کے لیے تھام لینا ایک ایسا ہیجان خیز تجربہ ہوتا تھا کہ ازاں بعد ایک اور بخار ہو جاتا، راتوں کو نیند نہ آتی..

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میں صرف اُن ریستورانوں کا تذکرہ کروں گا جہاں زندگی کی کُچھ شامیں بسر ہوئیں، جو میرے ذاتی تجربے میں آئے، جن کی یادیں لوحِ دل پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گئیں ورنہ لاہور میں عشق کے امتحاں اور بھی تھے..مثلاً لاہور میں جو خیامِ غالب، عدم یا اختر شیرانی ہوا کرتے تھے اُن کی پیاس بجھانے کے لیے بھی بہت سے جھرنے خمار کے میسّر تھے..جیسے کسی نے ایران کے مذہبی انقلاب کے بارے میں کہا کہ پہلے لوگ نماز گھر میں پڑھتے تھے اور شراب باہر کُھلے عام پیتے تھے اور اب لوگ نماز باہر پڑھتے ہیں تا کہ سند رہے اور شراب گھر میں پیتے ہیں، بس یہ فرق ہے..تو لاہور بھی کچھ اسی نوعیت کا مذہبی انقلاب آیا..

ہال روڈ پر لکشمی مینشن کے پہلو میں ایک شراب خانہ کُھلے عام ہوتا تھا جس کے دروازے کاؤ بوائے بارز کی مانند دھکیلنے سے کُھل جاتے تھے..ہم تب بچّہ لوگ تھے جھانک بھی نہ سکتے تھے کہ اندر کیا ہو رہا ہے لیکن جو کُچھ بھی ہوتا تھا، غُل غپاڑہ نہ ہوتا تھا..

انڈس ہوٹل، انٹرنیشنل ہوٹل، ایمبیسڈر ہوٹل، فلیٹیز ہوٹل، پارک ہوٹل.. باغ جناح کی جم خانہ کلب..کاسمو پولٹن کلب وغیرہ میں ناعاقبت اندیش اور مخرب الاخلاق حضرات کے جمگھٹے ہوا کرتے تھے.. یہاں تک کہ پاک ٹی ہاؤس میں بھی چائے کی کیتلی میں چائے کی بجائے اُسی رنگ کی وہسکی معجزاتی طور پر نمودار ہو جاتی تھی..زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر یا وہ جگہ بتا جہاں خدا نہ ہو..والے لعین اور لعنتی زمانے تھے... عدم کے مطابق، یوں تو سفرِ حیات کا بے حد طویل تھا..میں مے کدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا..ویراں شود آں شہر

کے مے خانہ نہ دارد.. تو اس حساب سے لاہور ویران نہ تھا..

مُجھے تو اس شراب خانہ خراب سے کُچھ زیادہ رغبت نہ ہوئی پر یہ خانہ خراب نہ ہوتی تو کیا خیّام، حافظ، غالب، جوش، مجاز، اختر شیرانی، ساحر، منٹو، ظہیر کاشمیری، فیض، عدم یا فراز وغیرہ ہوتے.. سب کے سب جہنم کی آگ.. نہ ہوتے تو اچھا تھا..

پیو کہ مُفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید
گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں

نیو ایئر کی شب کو بھی بہت ہنگامے ہوتے.. پارک ہوٹل، فلیٹیز ہوٹل کے علاوہ باغ جناح کی جم خانہ کلب کا جشن مُجھے بہت یاد ہے.. ویسے مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیو ایئر نائٹ میں، جب کہ فلیٹیز ہوٹل کے چوبی فرش پر جوڑے رقص کرتے تھے تو وہاں جو میوزیکل بینڈ تھا جس کی موسیقی پر سب سر دُھنتے تھے، اُس میں ڈھول بجانے والے، یعنی ڈرمّر ایک خوش شکل گورے چٹے نوجوان تھے اور حاضرین اُن کی ڈھول نوازی سے متاثر ہو کر اُن پر نوٹ نچھاور کرتے تھے اور اُن میں ایک دو نوٹ میرے بھی تھے.. اور وہ میر آف ہنزہ کے بیٹے میر غضنفر تھے جو ان دنوں گلگت بلتستان کے گورنر مقرر ہیں..

میں نے صرف لاہور کے ریستورانوں اور ہوٹلوں کو جو بھی یاد آیا، اُسے یاد کیا ہے، لاہور کے دیگر خوراک خانوں کے تذکرے سے اجتناب کیا ہے.. میری دکان کے قریب چوک گوالمنڈی میں واقع سردار مچھلی فروش، جو فٹ پاتھ پر ایک لنگوٹ باندھے چاک شدہ مچھلیوں پر بیسن کا لیپ کر رہا ہوتا اور مُجھے گزرتے دیکھ کر کہتا.. باؤ جی، سلام اے.. آج آپ نے نہ مچھلی منگائی اور نہ پکوڑے.. اب وہی بے چارہ سردار الحاج ہو چکا ہے اور لاہور بھر میں درجنوں دکانیں تلی ہوئی مچھلی کی اُس کی تصویر آویزاں کر کے لاکھوں میں کھیلتی ہیں.. جب کہ سردار فٹ پاتھ پر کھیلتا تھا..

رائل پارک کے بٹ صاحب کی حلوہ پُوڑی..

میرے دوست بھادی پہلوان کی دودھ دہی کی دکان کی لسّی، بھادی پہلوان جو ''مسٹر ایشیا'' تن سازی کے میدان میں ہوا اور پاکستان نے اُسے یاد نہیں رکھا.. جب تک زندہ رہا مُجھے اپنی خاص گھنی دودھ اور بالائی سے تیار کردہ کھیر کے تسلے بھیجتا رہا..

لوہاری کے باہر ''نعمت کدہ'' کے لذّت کے سلسلے..

چیمبرلین روڈ پر مسجد تاجے شاہ سے متصل وہ کباب فروش، نسل در نسل کباب فروشی.. جب سلگتے ہوئے کوئلوں پر بُھنتے کبابوں کی چربی اور پیاز کے پانی آگ پر بوند بوند گرتے تو اُن کی مہک اور خوشبو کی

دیوانگی دُھومیں مچاتی.. وہ خشک پتّوں کے ''ڈونوں'' میں کباب اور چٹنی ڈال کر پیش کرتا اور اس میں کچھ مبالغہ نہیں کہ میں مُلکوں مُلکوں گھوما، بہت کھایا اور تجربہ کیا لیکن اُن کبابوں کی لذت کے مقابل کوئی ذائقہ نہ آیا..

میں آج سے چھپن برس پیشتر بہت برس بسر کر کے انگلستان سے لوٹا تو نوازش شیخ نے کہا ''چوہدری، میں آج تمہیں تکّے کھلاؤں گا..''

یہ لفظ ''تکّے'' میرے لیے اجنبی تھا ''یہ کیا ہوتے ہیں؟''

''مزنگ تھانے کے پہلو میں ایک گلی ہے، وہاں ایک قصاب گوشت فروخت کرتا ہے.. کبھی کبھار میں اُسے پیغام بھیجتا ہوں کہ آج شام میں اپنے چند دوستوں کے ہمراہ آؤں گا تو وہ میرے لیے خصوصی طور پر بہترین گوشت الگ کر کے رکھ لیتا ہے.. جب گوشت کی فروخت سے فارغ ہوتا ہے تو کوئلے سلگا کر اُس گوشت کو سیخوں میں پرو کر بھونتا ہے.. یہ تکّے ہوتے ہیں..''

اگرچہ وہ ایک قصائی ہے پر کہتا ہے کہ میں ''بھٹّی'' ہوں..

یہ لاہور کے سب سے بڑے خورا کی کرشمے کا آغاز تھا..

مزنگ چوک میں اُس قصاب نے ''بھٹّی تکہ شاپ'' کے نام سے گوشت بھوننا شروع کر دیا.. کباب لگانے شروع کر دیئے اور برسوں میں نہیں مہینوں میں وہاں اتنا ہجوم ہو گیا کہ بھٹی کی تکہ شاپ کے پہلو بہ پہلو بے شمار تکہ شاپ کھل گئیں کہ بھٹی آخر کہاں تک سب گاہکوں کو تکّے سپلائی کر سکتا تھا اگرچہ اس دوران اُس نے دائیں بائیں دو تین اور دکانیں بھی خرید لیں لیکن تب بھی جو گاہک مایوس ہو جاتے وہ ان ذیلی تکہ شاپوں سے رجوع کرنے لگتے..

کہا جاتا ہے کہ بھٹّی تکہ شاپوں کے ویٹر بھی امیر کبیر ہو گئے کہ گاہکوں کے اژدہام میں کچھ حساب نہ تھا کہ کون ادائیگی کر گیا ہے اور کون نہیں.. یوں ویٹروں نے سمن آباد میں اس اضافی آمدن سے کوٹھیاں خرید لیں.. بھٹی صاحب بھی جب اپنی تکّہ فروشی سے بہت ثروت مند ہو گئے تو موصوف کو مائل کیا گیا کہ اب آپ فلم پروڈیوس کریں.. جانے کون سی فلم تھی جو اُن کی دولت کے باوجود پایۂ تکمیل کو نہ پہنچی لیکن مزنگ کا یہ ان پڑھ قصاب فلم کی ہیروئن کے عشق میں مبتلا ہو گیا..

ظاہر ہے لُٹ گیا، قلاش ہوا، محتاج ہوا اور آخری عمر میں چوک قرطبہ میں اُس نے پھر بہ نفس نفیس تکّے لگانے شروع کیے.. اور اُس نے اپنے پرانے گاہکوں سے رابطہ کیا، جن میں، میں بھی شامل تھا کہ حضور، میں واپس آ گیا ہوں.. آپ نے آنا ہے.. عجب معجزہ ہے کہ ایک مرتبہ پھر اُس کی '' بھٹّی تکّہ شاپ'' شہر بھر میں مقبول ہو گئی اور اُس کے آس پاس بھی تکّہ شاپس کھلتی گئیں..

نہ ہوا پر نہ ہوا، کسی اور کا نصیب.. اگرچہ یاروں نے بہت زور تکّے بھوننے میں مارا..

بھٹی کے ہاتھوں میں آخر وہ کونسا جادو یا کرشمہ تھا کہ وہ جہاں بیٹھ جاتا وہ پورا علاقہ اُس کی موجودگی سے آباد ہو کر ثروت مند ہو جاتا.. میرا خیال ہے یہ اُس کے رزق کے حصول کے لیے مکمل ایمانداری اور ذائقے کی لگن تھی.. وہ گوشت کی کوالٹی پر سمجھوتا نہ کرتا تھا، ہر کباب اور ہر سیخ کو خود بھونتا تھا.. اور اُس میں لالچ نام کو نہ تھا.. اب تو مر کھپ گیا ہو گا اور اس کے باوجود اُس کے نام کے حوالے سے ابھی تک قرطبہ چوک میں ایک دو تکّہ شاپس بہر طور موجود اور مناسب کاروبار کرتی ہیں..

کہا جاتا ہے کہ ہر تاریخی شہر، نہ صرف اپنی قدیم عمارتوں، در و بام کی قدامت، باشندوں کے ذوق جمال اور گلی کوچوں میں نظر نواز ہوتی شکلوں سے پہچانا جاتا ہے بلکہ وہ لوگ جن تندوروں، بھٹیار خانوں اور چُولہوں کے گرد بیٹھتے ہیں، اُن کی نسبت سے بھی اُس کی پہچان ہوتی ہے..

میں نے اپنی یادداشت کے ضُعف کے باوجود شہر لاہور میں، میرے تجربے اور شناسائی میں آئے ہوئے کُچھ ایسے ہی تندوروں اور چُولہوں کا تذکرہ کر دیا ہے.. اگرچہ بہت کچھ باقی رہ گیا ہے.. اور باقی رہے نام اللہ کا..



"اِک دن رہیں بسنت میں"

لاہور کے میلے ٹھیلے، تہوار، جشن، سب حکائیتیں، سب روائتیں، سب سراب ہوئے.. اس کے چہرے پر جتنے بھی رنگ تھے، سُرخ، سبز اور بسنتی وہ سب رخصت ہوئے اور آج کے لاہور کا چہرہ بے رنگ ہو گیا.. مُجھ سے تو اب یہ پہچانا بھی نہیں جاتا، اور جیسا بھی بے رنگ سہی اس کا چہرہ تھا وہ سب محض ایک میٹرو بس چلانے کے لیے سیمنٹ کے بدصورت فلائی اوور اور بھدّے ٹیلوں نے ڈھانپ لیا.. میں کلمہ چوک سے چوبُرجی کی جانب سفر کرتا ہوں تو میرے اوپر سیمنٹ اور سریئے کی ایک ایسی دیوار برلن اٹھتی ہے جس نے شہر لاہور کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے.. جیسے فرازؔ نے ایک مشہور شعر کو یوں مُجھ پر منطبق کر دیا کہ..

پہلے اُس نے مُس کہا، پھر تن کہا، پھر صَر کہا
اس طرح اُس ظالم نے مستنصر کے ٹکڑے کر دیئے

تو یوں اُن ظالموں نے لاہور کے ٹکڑے کر دیئے، ترقی، سہولت اور فلاح کے نام پر لاہور کی شکل بگاڑ کر دی..

اور میں ٹُمیر کے ڈرائیور سے کہتا ہوں.. افتخار، کیا ہم لاہور کی نہر کا اچھرے والا ٹپل پار کر چکے ہیں.. شادمان جانے والی سڑک کہاں ہے.. اچھرہ جو ایک ہندو دیوی کے مندر کے نام سے مشہور ہوا، وہ کہاں ہے.. گزر گیا یا آنے والا ہے.. مجھے سوائے سیمنٹ کے حصاروں، ستونوں اور ٹیلوں کے اور کچھ نظر نہ آتا اور وہ کہتا ہے.. صاحب جی ہم تو مزنگ چوک میں پہنچ گئے ہیں جسے قرطبہ چوک کا نام دیا گیا ہے.. میٹرو بس کے بعد ایک اور آفت اورنج ٹرین نام کی لاہور پر نازل ہوگئی ہے.. ٹرین کیا ہے، ایک مست ہاتھی ہے جو لاہور کی تاریخی کھیتوں کو اجاڑتا پھرتا ہے.. میں نے ابھی پرسوں ایک ایسا منظر دیکھا کہ مجھے یقین نہ آیا کہ کیا یہاں زلزلہ آیا ہے یا ہلاکو خان کی افواج کا یہاں سے گزر ہوا ہے.. قدیم مکان اور جھروکے مسمار کیے جا رہے تھے، ان کے مکینوں کو ڈرا دھمکا کر "مناسب" ادائیگی کر کے یہاں سے بے دخل کر دیا گیا تھا.. چلیے یہ تو انصاف ہو گیا لیکن یہاں ایک ایسا قدیم جھروکا ہوا کرتا تھا کہ میں جب کبھی ادھر سے گزرتا تھا مجھے اُس میں براجمان ایک عشق خاص کی شکل نظر آتی تھی، وہ جھروکا اورنج ٹرین کے مَست ہاتھی نے کھنڈر کر دیا اور یہ بھی کوئی بڑا سانحہ نہ تھا..

لاہور جو بنیادی طور پر ایک جین شہر ہوا کرتا تھا، بعد میں ہندو، سِکھ اور مُسلم ہوا تو اُس عہد کی سب سے بڑی پہچان ''جین مندر'' زمین بوس کر دیا گیا تھا.. بے شک بابری مسجد کے انہدام کے سانحے کے بعد ہم مومنین نے ہر وہ معبد ڈھا دیا جو مسلمان نہ تھا، ہندوؤں سے انتقام لینے کی خاطر ان مذاہب کی پرستش گاہوں کو بھی مسمار کر دیا جن کا ہندومت سے کچھ واسطہ نہ تھا. گردواروں اور جین مندروں کو بھی کھنڈر کر دیا.. اس کے باوجود جین مندر کے کچھ آثار باقی تھے.. اورنج ٹرین نے ان آثار کو بھی ملیا میٹ کر دیا اور اب وہاں ایک میدان تھا، اینٹوں کے ملبے سے اٹا ہوا ایک ویرانہ تھا..

اورنج ٹرین کے ہاتھی کے سامنے جو کچھ بھی آیا اس نے روند دیا.. چوبرجی، لکشمی چوک.. متعدد تاریخی گرجا گھر.. یہاں تک کہ شالیمار باغ میں.. اور شنید ہے کہ جب محکمہ آثارِ قدیمہ کے انچارج سے کہا گیا کہ یہ جو ایک بیہودہ سا قانون انگریزوں کے زمانے سے چلا آتا ہے کہ کسی بھی تاریخی عمارت کی قربت میں، کم از کم دو سو میٹر کے فاصلے تک کوئی تعمیر نہیں کی جا سکتی تو اس میں ترمیم کر دو تاکہ ہم چھک چھک کرتے اپنی ٹرین چوبرجی اور دیگر قدیم آثار کو پامال کرتے گزر جائیں تو جانے وہ کون تھا جس نے انکار کر دیا.. چنانچہ اسے فوری طور پر تبدیل کر کے ایک ایسے شخص کو مقرر کر دیا گیا جس نے جھک کر کہا ''حضور.. آپ حکم کریں تو میں چوبرجی کیا شالیمار باغ کے انہدام کو قانونی قرار دے دوں..''

آج بہت سے دینی حلقے اور ہم جیسے ماضی پرست بھی واویلا کرتے ہیں کہ لاہور کو کیا ہو گیا ہے.. جمعیت کے ڈنڈا برداروں کے باوجود لاہوری بڑے ٹھاٹھ سے نہ صرف نئے سال کا جشن مناتے ہیں بلکہ ''ویلنٹائن ڈے'' کو ایک قومی دن کے طور پر یوں مناتے ہیں کہ گلاب کا ایک پھول دو سو روپے میں فروخت ہوتا ہے.. نہ صرف ناریاں بلکہ بڑی بوڑھیاں سرخ جوڑے زیب تن کر کے اِٹھلاتی پھرتی ہیں تو ایسا ہونا ہی تھا.. انسان کی فطرت میں ہلا گلا کرنا، موج میلہ کرنا شامل ہے.. اور جب آپ اس دھرتی کی زرخیز کوکھ میں سے پھوٹنے والے تہواروں اور میلوں کو غیر اسلامی قرار دے کر ان کا گلا گھونٹ دیں گے تو ان کی جگہ ''سینٹ ویلنٹائن ڈے'' تو آئیں گے...

آمد بہار کی ہے بلبل ہے نغمہ سنج..

گندم کی فصل سنہری ہو رہی ہے تو بیساکھی کے ڈھول بجتے تھے.. اور جب..

موسم بدلا رُت گدرائی..

تو رُت بدلتی ہے اور سرسوں کے کھیت بسنتی ہوتے ہیں تو اہل جنوں بے باک ہوتے ہیں.. بسنت کے موسم آتے ہیں..

اِک دن رہیں بسنت میں..

بسنت کی سب یادیں، سب یادگاریں، چیمبرلین روڈ پر ایستادہ اُس قدیم سہ منزلہ رہائش گاہ سے وابستہ ہیں جہاں میرا بچپن گذرا.. جہاں میں نزدیک مسجد تاجے شاہ میں داخل کیا گیا..اُس مسجد کے درمیان میں ایک اکھاڑا ہوا کرتا تھا اور میں لنگوٹ پہن کر دیگر طالب علم بچوں کے ساتھ کُشتیاں کرتا تھا اور جس کے امام کی مذہبی شدت نے مجھے بہت زدوکوب کیا.. یہاں تک کہ میں بیگانہ ہو گیا..اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ مسجد میں داخلے کے پہلے دِن ہمارے گھر میں ''بوُندیاں'' بانٹی گئی تھیں اور امی جان نے میری بلائیں لی تھیں..اور میں اقرار کرتا ہوں کہ ہم جو چار پانچ بچے جھومتے ہوئے قرآن پاک پڑھتے تھے وہاں ایک گوری سی بچی ماتھے پر ایک جھومر سجائے آتی تھی اور میں نے اس کا جھومر چرا لیا تھا اور خوب مار کھائی تھی..

لاہور کی، آج سے تقریباً پینسٹھ برس پیشتر کی نسبت ایک بخار تھا..

ایک وحشت ایک جنون تھا جس کا رنگ بسنتی تھا..

موچی دروازے کے اندر ایک بسنت بازار سجتا تھا، درجنوں دکانیں رنگ رنگ کی پتنگوں، گُڈیوں اور کنکووں سے آراستہ ہو جاتی تھیں..

بسنت کی آمد سے ایک ماہ پیشتر شہر لاہور کے نواح میں، باغوں اور کھلے میدانوں میں تیز دھار کی شیشہ آمیز ڈوریں لگنے لگتی تھیں..اور جو بہت شائقین ہوتے تھے وہ اپنی پسند کے مطابق، اپنے پسندیدہ رنگ کی ڈور ذاتی طور پر لگواتے تھے، ڈور کا مانجھا چیک کرتے تھے، اگر وہ اُنگلیوں میں خراش خراش ڈالتی تھی تو اسے پاس کر دیتے تھے..

اور یاد رہے کہ بسنت کے بعد جتنے بھی لاہوری بچے ہوتے تھے وہ شوربے میں انگلیاں ڈبونے سے گریز کرتے تھے کہ ان کی انگلیوں پر بسنت کی ڈوروں کے سرکنے سے خون آلود خراشیں آجاتی تھیں اور شوربے کی مرچیں اُن خراشوں میں سرایت کر کے انہیں ''ہائے امی جی..بے بے'' وغیرہ پکارنے پر مجبور کر دیتی تھیں..

بسنت ایک بخار تھا..

ابا جی میری انگلی تھام کر موچی دروازے کے بسنت بازار میں لے جاتے اور میں شاید بارہ برس کا تھا، رنگ محل مشن ہائی سکول میں پڑھتا تھا..اور میں اُس بازار میں سجی گڈیوں اور پتنگوں کو دیکھتا، خاص طور پر پتنگوں کے عشق میں مبتلا ہو جاتا..وہ جوان زمانوں کے اہل ذوق تھے، بس وہی جانتے ہیں کہ ایک پتنگ کی بناوٹ میں کیسی جنسی کشش دل کو گرفت میں لیتی تھی..

ایک کسی اُستاد کاریگر کے ہاتھوں سے تخلیق کردہ پتنگ کے بدن کی موزونیت کسی لاہوری دوشیزہ کی نوخیزی سے کم نہیں ہوتی..وہ جب کندھے مارتی، اِٹھلاتی اور ٹھمکے مارتی ہوا میں بلند ہوتی ہے تو اُس کی اُٹھان

میں ایک جنسی ہیجان ہوتا ہے..اور جب وہ ایک ڈھیلے پن کے بعد ہوا میں تن جاتی ہے تو آپ کی انگلیوں میں سے سرکتی ڈور آپ کے بدن میں ایک سنسنی کا ہیجان برپا کر دیتی ہے..

بسنت کی رات..بخار اور بے چینی کی رات..''تناواں رات'' ہوا کرتی تھی یعنی آپ نے جتنے بھی گڈے،، گڈیاں اور پتنگیں خریدی ہیں ان میں ڈور باندھنے کی رات..اور یہ تناویں ڈالنا بھی ایک فن تھا..کیسے کیسے پتنگ کے بدن میں چھید ڈال کر ان میں ڈور ڈال کر اسے اڑان کے لیے بیلنس کیا جائے..چنانچہ شوقین لوگ ایسے کاریگروں سے رجوع کرتے جو''تناویں'' ڈالنے کے متناسب ہنر سے واقف تھے..بسنت کی رات..بخار اور بے چینی کی رات..

نیند کم ہی آتی، میں بار بار بستر سے اٹھ کر کارنس پر سجی اپنی ''شہزادیوں'' کو دیکھتا کہ کل سویر سب سے پہلے یہ والی گڈی اڑاؤں گا، اگر ہوا قدرے تیز ہوئی تو یہ ''شرلا'' مناسب رہے گا، شرلا، شرلا ٹے مارنے والا، پھڑ پھڑاتا پان والا گُڈّا..یہ بتانے کی کیا حاجت ہے کہ گڈی کی ''دُم'' ہوتی تھی اور گڈا اپنے ''پان'' سے پہچانا جاتا تھا..میں سرگی سویرے، منہ اندھیرے اٹھ بیٹھتا اپنی بسنتی متاع کے ساتھ چیمبر لین روڈ والے سہ منزلہ مکان کی سیڑھیاں طے کرتا، کوٹھے پر پہنچ جاتا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لاہور کے ابھی تک ملگجے اندھیرے میں ڈوبے آسمان پر بسنت کی پہلی پتنگ تلاش کرنے لگتا..ہوا میں ایک مترنم ٹھنڈک جو میرے بدن پر چھبتی تو اُس کے روئیں روئیں میں سرایت کر کے مجھے ایک عجب سرخوشی سے دوچار کرتی..''پہلے ہر سُو تاریکی تھی، پانیوں پر ایک رُوح تیرتی تھی اور تب اُس نے کہا کہ روشن ہو جائے تو روشن ہو گئی'' بائبل کا لکھا سچ ثابت ہوتا اور اذن ہوتا کہ روشنی ہو جا اور سویر کی دھندلی روشنی ظاہر ہونے لگتی..جب میں آسمان پر پہلی پتنگ کو یوں ہلکورے لیتے دیکھتا جیسے وہ ابھی نیند میں ہے اور پھر ہولے ہولے بیدار ہو کر یکدم ہوا کے دوش پر سوار ہوا ایک زندہ وجود کی مانند ایک دوشیزہ کی مانند انگڑائیاں لیتی، جیسے ایک چکور چاند سے پریت لگاتا ہے ایسے وہ آسمان سے پریت لگاتی بلند ہوتی جاتی..تب میں دھڑکتے دل سے اپنی پہلی گڈی کو فضا میں بلند کرتا، اگر تو ہوا مناسب ہوتی تو وہ خود بخود بے چین ہو کر اُڑنے لگتی اور اگر بدقسمتی سے ہوا سانس روکے ہوئے ہوتی تو پھر ''تنکے'' مار مار کر میرا حشر ہو جاتا..

آسمان بھرنے لگتا، اُس پر بسنتی شہزادیاں، ہر رنگ اور ہر بدن کی راج کرنے لگتیں، ان کے ساتھ ایک ملا جلا شور نعروں کا اور فلمی گانوں کا بلند ہونے لگتا..تب موسیقی کا واحد منبع گراموفون تھا، ابھی ریڈیو گرام، ٹیپ ریکارڈر یا ڈیک پلیئر وغیرہ دریافت نہ ہوئے تھے..اور نہ ہی فریحہ پرویز کا ''دل ہوا بوکاٹا'' تخلیق ہوا تھا تو میری یادداشت کے مطابق ان زمانوں میں تین گانے بسنت کے دن لاہور کی چھتوں پر گونجتے تھے..

''میری پیاری پتنگ چلی بادلوں کے سنگ''

''میں بن پتنگ اُڑ جاؤں رے''

اور ایک لوک گیت ''میرا رنگ دے بسنتی چولا..''

تقریباً پینسٹھ برس بعد میری پچھترویں سالگرہ کے موقع پر ابرارالحق کے علاوہ فریحہ پرویز تھی جو مجھے سالگرہ مبارک کہنے کے لیے اور میرے لیے گانے کے لیے آ گئی.. یہ دونوں کسی بھی تقریب میں شمولیت کے لیے بجا طور پر لاکھوں کے سودے کرتے تھے پر یہ ان کی الفت تھی کہ وہ میرے لیے بے دام چلے آئے..

ابرارالحق نے گانے کے آغاز میں میری جانب اشارہ کر کے کہا ''اِک تے جٹ.. فیر ایڈی ایڈی اُکھ'' اور فریحہ نے میری فرمائش پر ''یہ جو ہلکا ہلکا سرور ہے، یہ تیری نگاہ کا قصور ہے'' کے بعد جب ''پتنگ باز سجناں'' گایا اور ''دل ہوا بوکاٹا'' کی تان بلند کی تو میں اپنے بچپن کی تمام بسنتوں میں چلا گیا اور میرا دل یادوں کی تیز دھار ڈور سے کٹ کے رہ گیا..

دوپہر سر پر آ جاتی اور لاہور کے آسمان پر کسی ایک اور پتنگ کی گنجائش نہ رہتی، وہ اتنا بھر جاتا..

بسنت کی ایک اپنی کوڈ آف کنڈکٹ تھی، کچھ طے شدہ اخلاقی ضابطے تھے مثلاً اگر ایک پتنگ اٹھان میں ہے، کندھے مارتی ہوا کا زور پکڑ کر بلند ہو رہی ہے تو آپ نے اپنی گڈی کی ڈور ایک جھٹکے سے اُس کی ڈور پر ڈال کر ''کھینچا'' مار کر کاٹ نہیں دینی، یہ ایک معیوب حرکت تھی.. کیونکہ اس لمحے جب پتنگ کی ڈور ایک تناؤ میں آ رہی ہوتی ہے اور وہ اپنا دفاع نہیں کر سکتی اُس پر اپنی ڈور ڈال کر ایک جھٹکے سے کاٹ دینا ایک غیر اخلاقی حرکت ہوتی تھی.. اگر ''مُجرم'' کی شناخت ہو جاتی تو پتنگ باز سجناں کو یہ حق حاصل ہوتا کہ وہ اُس کے کوٹھے پر پہنچ کر اُس کی مناسب گوشمالی کرے..

ویسے گڈیاں اور پتنگیں اڑانے کی نسبت گڈیاں لوٹنا اور اُنہیں ''چھوڑنا'' زیادہ پر کیف اور پر مسرت مشغلہ ہوا کرتا تھا..

کوئی بھی ان زمانوں میں تصور نہیں کر سکتا تھا کہ بسنت کے دن جب کسی کٹ چکی گڈی یا پتنگ کی ڈور دھیرے سے آپ کی قربت میں سرکنے لگتی ہے اور آپ اسے دبوچ لیتے ہیں، کھینچتے ہیں اور اس کے آخر میں جو پتنگ گرتی چلی جا رہی ہے یکدم زندہ ہو کر تن جاتی ہے تو اس لُوٹ مار یا مالِ غنیمت میں کتنی راحتیں پوشیدہ ہیں..

میں آپ کو بھولپن کے اُن زمانوں کی ایک خواہش میں شریک کرتا ہوں.. میری خواہش تھی کہ میں بہت امیر ہو جاؤں، میرے پاس اس قدر دولت آ جائے کہ میں سڑک کے پار ہمارے گھر کے سامنے جو مکان ہے اُسے خرید لوں.. پھر چند ملازم بھرتی کروں اور انہیں اپنے پلّے سے ڈور، گڈیاں اور پتنگیں خرید کر انہیں حکم دوں کہ تم نے یہ گڈیاں اور پتنگیں اڑانی ہیں اور پھر انہیں ''بو'' کر دینا ہے، ان کی ڈور چھوڑ دینی ہے تا کہ.. میں

اپنے کوٹھے پر کھڑا اُنہیں لُوٹ سکوں..

بسنت کی آمد پر جہاں ڈوروں اور پتنگوں کے میلے سجتے تھے وہاں خاردار جھاڑیوں کی بھی بہت مانگ ہوتی تھی جنہیں ایک بانس پر باندھ کر لاہور کی سڑکوں پر کٹ کٹ کر گرنے والی پتنگوں کی ڈوروں کو ان میں الجھا کر لُوٹا جاتا تھا..انہیں تب "ڈھینگریاں" کہتے تھے..

اُن زمانوں میں اگر کسی شخص کی بے عزتی کرنا مقصود ہوتا تھا تو کہا جاتا تھا کہ جا اوئے تم گڈیاں اڑانے والے نہیں، لوٹنے والے ہو..

علاوہ ازیں کسی "بو شُدہ" کٹ چکی پتنگ کو "چھوڑنا" بھی ایک آرٹ تھا..اس مقصد کے لیے عام طور پر ایک چھوٹی سی، تیز طرار نابالغ سے گڈی استعمال کی جاتی..یہ شرلاٹے بھرتی شرارتی گڈی کٹی ہوئی پتنگ کی ڈور سے چمٹ جاتی، ڈور کے گرد اپنی ڈور لپیٹ کر اُسے قابو کر لیتی اور یوں یہ منظر عام ہوا کرتا تھا کہ ایک نومولود سی گڈی ایک بہت بڑی پتنگ کی ڈور چھوڑ کر اسے ہولے ہولے اپنے خوش نصیب مالک کے کوٹھے تک لا رہی ہے..

اور ہاں بسنت کی اُس رُت میں لاہور شہر کے چوبارے اور کوٹھے دھانی رنگوں سے شوخ ہوتے دمک رہے ہوتے..لڑکیاں، بالیاں، ناریاں، شہر کی سوہنیاں اور سجاوٹیں، بسنتی چولے پہنے، زرد رنگ کے پہناوے زیب تن کیے چین کی زرد شہزادیاں ہوتیں کوٹھوں پر جلوہ گر ہوتیں "بوکاٹا" کے نعرے لگا رہی ہوتیں.. وہ بسنت بہار میں ایک زرد بہار کی صورت نمایاں ہوتیں..برابر کی شریک ہوتیں اور ایسا کبھی نہ ہوا کہ اُن پر کسی نے آوازے کسے ہوں یا اُن کو زچ کیا ہو..وہ برابر کی شریک تھیں..

پتنگ اڑنے کے لُطف اپنی جگہ لیکن پتنگ لوٹنے کے پاگل پن کا بھی کچھ حساب نہ تھا..

برابر کے کوٹھے پر ایک بڑی ساری خوش رنگ پتنگ آن گری..درمیان میں دیوار حائل تھی اور میں اُس کے حصول کی دیوانگی میں تین منزلہ کوٹھے کے پہلو میں، بازار سے بلندی پر، وہ جو ایک چھوٹی اینٹوں کا ایک مخدوش سا چھجہ ہے اُس پر اتر کر ہولے ہولے قدم رکھتا برابر کے کوٹھے پر پہنچ جاتا ہوں، وہ پتنگ حاصل کر کے پھر اُسی پُل صراط سے گزرتا ہوں اور اس دوران میرے قدموں تلے دو بوسیدہ اینٹیں اپنا قدم مسکن ترک کر کے کھسکتی ہیں اور لڑھکتی ہوئی گہرائی میں بازار میں جا گرتی ہیں..لیکن میں خوفزدہ نہیں ہوتا کہ میں نے ایک پتنگ لُوٹ لی ہے..بعدازاں بازار کے ایک دکاندار نے اباجی کو خبر کر دی کہ آپ کا برخوردار ایک بازی گر کی مانند چھجے پر چل رہا تھا اور وہ اینٹوں کے ہمراہ خود بھی گر سکتا تھا تو انہوں نے نہ صرف مجھے بہت ڈانٹا بلکہ "ماموں" علی احمد کو بسنت کے اگلے روز میری حفاظت پر تعینات کر دیا..یہ "ماموں" ہمارے دور پار کے کچھ رشتے دار تھے، ان دنوں تانگہ چلاتے تھے اور اکثر غائب ہو جاتے تھے، موصوف گانجے کے بہت شوقین تھے چنانچہ کسی نہ کسی

لاہوری چنڈوخانے میں دریافت ہو جاتے.. چیمبرلین روڈ کے اس خوش نظر چوبی بالکونیوں والے گھر کے کوٹھے سے بلند سیڑھیوں کے اوپر معلق ایک ''ممٹی'' تھی...زیادہ سے زیادہ چھ فٹ بائی چھ فٹ کی ایک بلند سطح تھی اور میں ایک بندر کی مانند اُس پر چڑھ کر گڈیاں اُڑایا کرتا تھا اور یہ آس پاس کے تمام کوٹھوں سے بلند مقام تھا... مجھے نہیں معلوم کہ میں کیسے اُس مختصر ممٹی پر اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے، جب کہ آس پاس گہری گہرائیاں تھیں، ہوا کی شدت سے پاؤں اکھڑتے تھے اور بہت نیچے بازار میں چلتے لوگ بونے نظر آتے تھے، کھڑا ہو کر گڈیاں اڑاتا تھا..ویسے اب سوچتا ہوں تو شاید اُس بلند ممٹی پر اپنے آپ کو لڑکھڑانے سے بچانے کا تجربہ مجھے آئندہ کے زمانوں کی کوہ نوردی کے دوران بہت کام آیا..بہت خطرناک برفیلی بلندیوں پر اگر میں اپنا توازن برقرار رکھنے میں کامیاب رہا تو یہ صرف بسنت رُت میں اُس بلند ممٹی پر کھڑا رہنے کی دین تھا..

جوں جوں دِن ڈھلتا، بسنت کا جوش بڑھتا جاتا..

شام کی قربت ہونے لگتی تو لاہور کے لوگ بے دریغ ہونے لگتے..اپنی جمع شدہ پتنگوں کو ہواؤں کے سپرد کرتے کہ ابھی شام ہو جائے گی..بسنت تمام ہو جائے گی اور یہ بسنتی شہزادیاں، کنواری رہ جائیں گی، انہیں جی بھر کے اُڑالو..

بسنت کی کوئی شام تھی، دل میں اداسی بھرتی ایک شام تھی، میں لُوٹی ہوئی اور بچی کھچی گڈیاں اور ڈوریں سمیٹ رہا تھا..میری انگلیاں زخمی ہو چکی تھیں لیکن ان زخموں کی ٹیسیں بھی لُطف دیتی تھیں کہ یہ بسنت کے گھاؤ تھے، جب اُس شام کے سرمئی اندھیارے میں جب کہ میں سب کچھ سمیٹ کر نیچے گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا جب..کوئی کیا جانے کہ ان زمانوں کے ایک بچے کے دل پر کیا گزرتی تھی جب بسنت کا دن ڈھل جاتا تھا، شام ہونے لگتی تھی، کوٹھے خالی ہوتے جاتے تھے اور بسنت کی آخری دو چار پتنگیں اور گڈیاں اُس سرمئی اندھیرے میں ڈوبتے آسمان میں تنہا رہ جاتی تھیں اور اُس کا دل ڈوبتا تھا کہ یہ بسنت بھی پل بھر میں بیت گئی اور اب مجھے پورا ایک برس انتظار کرنا ہوگا اور تب جا کر میں پھر ایک صبح سویرے، منہ اندھیرے اس کوٹھے پر آؤں گا اور بسنت رُت میں رنگا جاؤں گا..

تو جب بہت دیر تک میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیم تاریک آسمان کو تکتا رہا اور آخری پتنگیں اوجھل ہونے لگیں تو میں ایک بھاری دل سے بہ چشم نم کوٹھے سے اترنے کو تھا تب..میرے کانوں کے گرد ایک تیز سرسراہٹ سرکی اور میں نے جب ہاتھ مار کر جاننا چاہا کہ یہ کیا ہے تو میری انگلیوں پر ایک ڈور سرکنے لگی اور میں نے فوراً اُسے بھینچ لیا..میں اپنی آخری ڈور لوٹنے کی مسرت سے سرشار ہو گیا، پر یہ ایک کٹی ہوئی آوارہ ڈور نہ تھی، میں نے اسے گرفت میں لیا تو کچھ دیر سرکنے کے بعد اُس میں تناؤ آنے لگا..جس کا مطلب تھا کہ اس کے آخر میں بہت نامعلوم تاریک ہو چکی بلندیوں میں گم کوئی کٹ چکی پتنگ بندھی ہوئی تھی اور وہ بہت ہی بڑی محسوس

ہوتی تھی کہ سرکتی ڈور میں تناؤ اتنا شدید تھا کہ وہ نہ صرف مجھ سے سنبھلتی نہ تھی بلکہ اُس میں زور اتنا تھا کہ وہ میرے قدم اُکھاڑتی تھی اور میں بمشکل اپنے آپ کو سنبھالتا تھا.. وہ اپنے زور میں مجھے گھسیٹتی ہوئی کوٹھے کے کناروں سے گرا کر بازار میں بھی گرا سکتی تھی اور ڈور کی تیزی میری انگلیوں میں گھاؤ چیرتی انہیں خون آلود کرتی تھی، پر میں نے ڈور کو چھوڑا نہیں.. آہستہ آہستہ اُسے کھینچتا گیا یہ جانے بغیر کہ اُس کے آخر میں وہ کونسی عفریت بندھی ہے جس میں اتنا زور ہے.. کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، جو کچھ بھی تھا میں اُسے اتارتا گیا اور درد کی شدت سے میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں بلکہ میں نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا.. پر میں اسے چھوڑتا نہ تھا.. میرے بازو درد کرنے لگے.. اور بالآخر جب تاریکی مکمل ہو چکی تھی تو میری نظروں کے سامنے ایک بہت بڑا گڈا پھڑ پھڑاتا ہوا ظاہر ہوا.. وہ مجھ سے قد میں کہیں بڑا تھا جو اڑایا گیا اور کٹ گیا جب کہ وہ آسمانوں میں چھید کرتا تھا اور اُسے میں نے لوٹ لیا تھا.. نہ صرف گڈا بلکہ اُس کی ڈور اتنی زیادہ تھی کہ اُسے سمیٹتے ہوئے مجھے رات ہو گئی.. وہ اتنا بڑا تھا کہ میں اسے تنگ سیڑھیوں میں سے نیچے نہیں لے جا سکتا تھا چنانچہ اُسے وہیں ممٹی کے سائے میں چھوڑ کر اپنی فتح پر مسکراتا نیچے چلا گیا..

بسنت سے اگلے روز لاہور کے پتنگ باز ساجن، بچھی کھچی گڈیاں اور لوٹی ہوئی پتنگیں بے دریغ اڑاتے تھے.. وہ پچھلی شب کا لوٹا ہوا مالِ بسنت گڈا اتنا بڑا تھا کہ میں اسے خود سے تو اڑا نہ سکتا تھا، میں نے ماموں علی احمد سے درخواست کی کہ وہ میری مدد کریں، اسے اڑا کر پھر اُس کی ڈور مجھے تھما دیں..

ماموں علی احمد ہمارے دور پار کے عزیز تھے اور لاہور میں تانگہ چلاتے تھے، متعدد دور پار کے عزیزوں کی مانند جو شہر لاہور میں رزق کی تلاش میں آتے تھے وہ بھی ہمارے گھر میں رہتے تھے جب کبھی گھر نہ لوٹتے غائب ہو جاتے تو کسی چنڈو خانے میں تلاش کر لیے جاتے.. گورے چٹے مہربان سے ماموں تھے، انہوں نے مجھے سائیکل چلانا سکھایا اور اپنے تانگے پر بہت سیر کروائی.. انہوں نے وہ جائنٹ گڈا ڈم سے پکڑ کر فضا کے سپرد کیا اور جب اُس کی ڈور کھینچ کر اسے ہوا میں بلند کرنا چاہا تو وہ ذرا سا بلند ہوا اور پھر ڈور اُس کا حجم سہار نہ سکی اور وہ ٹوٹ کر نیچے کہیں پہنائیوں میں گم ہو گیا.. آج بھی تقریباً پینسٹھ برس بعد میرا اُس عظیم گڈے کے یکدم ڈور سے منقطع ہو کر جدا ہو جانے کا زخم نہیں بھرا..

جب پاکستان وجود میں آیا اور اباجی کا سرینگر میں قائم کردہ بیجوں کا فارم اُدھر رہ گیا تو انہوں نے گکھڑ منڈی کے ریلوے سٹیشن سے متصل کچھ اراضی ٹھیکے پر حاصل کی اور وہاں ''رچنا نرسری فارم'' کو یوں تشکیل دیا کہ اُس کے درمیان میں ایک روش ایک راستہ تھا جس کے دونوں جانب پھولوں کی کیاریاں اور پھلدار پودے تھے اور یہ روش بالآخر ایک شہتوت کے درختوں کے چوک میں اختتام پذیر ہوتی تھی اور اباجی اُن کے سائے میں چارپائی ڈالے، اُس چارپائی پر دنیا بھر کی زراعت کی انگریزی کتابیں ڈھیر کر کے، اُن کی ورق

گردانی کرتے، حقے کے کش لگاتے اردو زبان میں باغبانی اور زراعت کے بارے میں کتابیں تصنیف کرتے.. یہ وہی مقام ہے جہاں ابا جی نے میرے لیے دو گھڑوں میں کچھ ٹنڈیاں ڈال کر اور مولی اور شہتوت کے پتے گھڑے میں ڈال کر، صرف میرے لیے تتلیاں بنائی تھیں جو بعدازاں کبھی سنولیک اور کبھی مدینہ منورہ کی راہوں میں اڑتی پھریں..

ایک ایسی بسنت آئی جب ابا جی نے کہا ''میری خواہش ہے کہ تم میرے ساتھ گکھڑ منڈی چلو، اور وہاں بسنت مناؤ، تم جتنی بھی پتنگیں اور گڈیاں چاہو گے میں تمہیں خرید دوں گا..'' یہ ایک بہت بڑا لالچ تھا کہ میں پتنگوں کی ایک پوری دکان حاصل کر سکتا تھا چنانچہ میں راضی ہو گیا..اور ہاں ابا جی اولاد کو حکم دینے والے باپ نہ تھے، درخواست کرنے والے صرف خواہش کا اظہار کرنے والے باپ تھے..

بسنت کی اس سویر گکھڑ منڈی کے ریلوے سٹیشن کے پہلو میں ''رچنا نرسری فارم'' کی روش کے گرد بہار کے پھولوں کے رنگوں میں، میں نے بسنت رنگ شامل کیا اور ایک شاندار لکھنؤ کاٹ گڈا آسمان کے سپرد کر کے اسے بلند کیا، اگرچہ ماحول تو مفقود تھا لیکن وہ پھولوں بھری تنہائی میں گڈا اڑانے کا بھی ایک خمار تھا..اور یہ خمار یکدم چکنا چُور ہو گیا، وہ گڈا جب آسمان پر ابھرا تو یکدم درجنوں پرندے جن میں کوؤں کی اکثریت تھی اُسے ایک اجنبی پرندہ جان کر جو اُن کی آسمانی راجدھانی میں مُخل ہوا تھا، اُس پر پل پڑے..اُن کا کچھ قصور نہ تھا انہوں نے آج تک اس نوعیت کا پرندہ دیکھا ہی نہ تھا..وہ پل پڑے اور چونچیں مار مار میرے گڈے کو تار تار کر دیا..میں نے ایک پتنگ اڑائی کہ شاید وہ اس کی نسوانیت کا کچھ لحاظ کریں لیکن کوؤں نے اُس پر بھی یلغار کر دی اور اُس کی عصمت بھی تار تار کر دی، میں روتا ہوا ابا جی کے پاس آ گیا ''مجھے لاہور لے چلو..ابھی''

یہ بچپن کے دن تھے..

اور وہ جو مخدوش سی جوانی نام کی شے ہم پر آئی اُن دنوں ایک بسنت چاچا ملک محمد رفیع کے مسجد وزیر خان کے سامنے واقع محلّہ ککے زئیاں کی ایک بہت ہی بلند مٹی پر گزری..اور میں بتا نہیں سکتا کہ مجھ پر کیا گزری..وہ مٹی ایک سہ منزلہ قدیم مکان کے کوٹھے پر معلق، زیادہ سے زیادہ آٹھ فٹ بائی آٹھ فٹ کے رقبے کی چھت، جہاں میرے علاوہ کوئی ایک درجن حضرات پتنگیں اُڑا رہے تھے اور مجھ سے تو اُس بلندی پر کھڑا بھی نہیں ہوا جاتا تھا، وہ تو آسمانوں میں معلق تھی، اور وہ آسمان پتنگ اور گڈیوں سے اتنے لبریز تھے..تنی ہوئی ڈوریں سورج کی کرنوں سے زیادہ گھنی تھیں کہ جب کوئی مٹی پر معلق کوئی شخص پتنگ اڑاتا تو وہ اکثر اڑاتے ہی آوارہ ڈوروں کی زد میں آ کر کٹ جاتی..

میں تو سہما بیٹھا رہا. شام ہوئی تو مجھے کسی نے سہارا دے کر اُس عرشِ مُعلّے سے اتارا..

بسنت سے اگلے روز ہم، طیب اور خاور اور میں چوک صفاں والا کے اُس قدیم اور دل کش گھر چلے

جاتے جہاں خواجہ خورشید انور کے بھائی خواجہ افضل مقیم تھے اور طیب کی بہن بانو باجی اُن کی اہلیہ تھیں.. پر وہ جتنی دبنگ، موٹی تازہ، گوری چٹی اور سوہنی شکل کی خاتون تھیں، وہ خواجہ افضل کی اہلیہ نہیں اُن کی اہل لگتی تھیں..وہ ہمارے لیے ایسے کشمیری پکوان بناتیں جن کے ذائقے کب کے کشمیر کی تاریخ میں گم ہو چکے تھے..

لاہور کی بسنت سے اگلے روز بسنت قصور چلی جاتی اور ہم بھی چلے جاتے، اور میں نے اس اجمال کی تفصیل ''پیار کا پہلا پنجاب'' میں بیان کر دی ہے..کیسے ہم دونوں، میں اور خاور، طیب کے والد میاں محمد حسن کی حویلی میں قیام کرتے تھے اور اُس کی اونچی چھتوں پر چڑھ کر پتنگیں چڑھاتے تھے..

اب اگر شہر قصور کی بسنت میں آپ کی پتنگ کٹ جاتی ہے تو آپ تصّور کیجئے کہ وہ کٹ کر کہاں کہاں گر سکتی ہے..

شاید نور جہاں کے اُس آبائی محلے کی کوٹھڑی کی چھت پر، جہاں وہ اللہ رکھی کے نام سے پیدا ہوئی تھی اور اُسے واقعی اللہ نے رکھا، ایسی آواز اور ناموری عطا کی کہ جو کسی اور گلوکارہ کے نصیب میں نہ ہوئی اور پھر اللہ نے اُسے رمضان کی ستائیسویں شب میں اپنے پاس بُلا لیا..اُسے قصور میں ہی دفن ہونا چاہیے تھا لیکن اُسے بوجوہ کراچی کے اُس قبرستان میں دفن کیا گیا جہاں میمونہ کے بھائی اسلم خان بھی خوابیدہ ہیں..میں اُن کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا تو راستے میں نور جہاں تھی اور قبرستان کے داخلے پر ایک بورڈ آویزاں تھا ''قبرستان میں قوالی کرنا اور گانا بجانا منع ہے''

آپ کی کٹی ہوئی پتنگ برصغیر کے سب سے بڑے گویئے بڑے غلام علی خان کے آبائی گھر کی چھت پر بھی تو گر سکتی تھی، اپنے وقت کا تان سین جسے ایک متکبر بخاری نے پاکستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا.. لاہور کے اندرون میں اُس کی کوٹھڑی میں چوری ہو گئی تو وہ رپورٹ لکھوانے کی خاطر مقامی تھانے میں گیا تو تھانیدار صاحب نے اُنہیں دھوپ میں بٹھا کر بہت دیر انتظار کروایا اور جب اُنہوں نے پسینے میں شرابور ہوتے ہوئے درخواست کی کہ تھانیدار صاحب میری رپورٹ لکھ لیجئے تو تھانیدار نے غصے میں آ کر ایک اہلکار سے کہا ''اوئے اس کالے بھینسے کے بچّے کی رپورٹ لکھ لو، یہ خوامخواہ ڈکرا رہا ہے..'' بڑے غلام علی خان یاد رہے کہ قدرے سیاہ رنگ کے تھے..بمبئی کے ایئرپورٹ پر مہاراشٹر کے گورنر نے اُن کا استقبال کیا اور پھر وہ دوبارہ نہ پاکستان لوٹے نہ لاہور اور قصور میں قدم رکھا..وہاں لتا منگیشکر بھی اُن کے قدموں میں بیٹھتی تھی، خان صاحب اکثر گویوں کی مانند خوش خوراک تھے، کہیں بھی پرفارم کرنے کے لیے جاتے تو دیسی گھی کا ایک کنستر اپنے ساتھ لے جاتے اور بُھنے ہوئے گوشت کو دیسی گھی سے پکواتے..ایک مرتبہ مدراس میں ایک شدید مداح نے ان کی دعوت کی، وہ کٹڑ ہندو اور سبزی خور تھا..خان صاحب نے سالن کے ہر ڈونگے میں انگلی ڈال کر کسی بوٹی کی تلاش کی اور جب نہ ملی تو کہنے لگے ''میاں اگر ہم گوشت نہیں کھائیں گے تو گا نہیں سکیں گے..یہ گھاس پھونس کھا کر

ہم بس گھاس پھونس ہی گا ئیں گے ..'' چنانچہ فوری طور پر اُن کے لیے بُھنے ہوئے، دیسی گھی میں بُھونے ہوئے گوشت کا بندوبست کیا گیا..

ہندوستان کے ایک بہت بڑے موسیقی کے نقاد نے اُن کے فن کے بارے میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے..اُس ہندو مداح کا کہنا ہے کہ ایک شب وہ اور بڑے غلام علی خان سمندر کنارے گئے اور اُس شب پورا چاند تھا، سمندر جوش میں تھا، ُبلند لہریں پانی کی دیواروں کی مانند ابھرتی ساحل سے آ ٹکراتی تھیں تو اُنہوں نے کہا.. اب سُنو کہ میں ان لہروں کے پر جوش شور کے ساتھ اپنی آواز کو ہم آہنگ کرتا ہوں اور انہوں نے گانا شروع کر دیا..اُن کی آواز کا اتار چڑھاؤ لہروں کی مانند ہی چڑھتا اور اترتا تھا یہاں تک کہ وہ اور سمندر ایک ہوگئے..

قصور کی بسنت میں کٹ چکی پتنگ بلھے شاہ کے دربار کے صحن میں بھی تو گر سکتی تھی..کافر بھی ہو سکتی تھی..

''عاشق ہویوں رب دا، ہوئی ملامت لاکھ
تینوں کافر کافر آکھدے، توں آہو آہو آکھ''

اب تو اُن نسبتوں کے زمانے ایک خواب ہوئے..ایک زرد رنگ کا سراب ہوئے..
ابھی چند برس پیشتر بسنت کمرشل ہوگئی..

لاہور کی بسنت کی دنیا بھر میں دُھوم مچ گئی..ملٹی نیشنل اداروں نے اندرون اور بیرون لاہور کے گھروں کے وسیع کوٹھے شب بھر کے لیے لاکھوں میں حاصل کیے اور وہ پیرس اور نیویارک کے نائٹ کلب بن گئے..روشنیاں اور شراب، مُجرے اور موسیقی.. ہنگامہ ہے کیوں برپا.. پُرانے اور کم آمدنی والے پتنگ باز بجناں سہم کر پیچھے ہوگئے کہ اب بسنت اُن کے بس سے باہر ہوگئی تھی.. یوں جانئے کہ بسنت اُن کی ایک محبوبہ بسنتی نام کی تھی اور وہ اُسے اپنی پرانی سائیکل پر بٹھا کر شہر لاہور کی سیر کرواتے تھے اور پھر وہ بے وفا ہوگئی، سائیکل چھوڑ کر پورشے سپورٹس کاروں، بی ایم ڈبلیو اور سلور رولز رائس میں جا بیٹھی..

اگرچہ یہ ایک ''ایلیٹ بسنت'' ہوگئی تھی اس کے باوجود میں خوش تھا کہ چلو اسی بہانے شہر لاہور کی دُھوم سارے زمانے میں ہے..میں نے ایک ایسی ہی بسنت قدیم حویلی دھیان سنگھ کی چھتوں پر گزاری اور وہاں پیرس اور نیویارک کے جدید ترین فیشن کے ماڈل دھیان سنگھ کی کیٹ واک پر چلتے تھے..صحن میں ایک میوزیکل کانسرٹ کا پر جوش ہنگامہ برپا تھا..گٹاروں کا شور تھا اور انگریزی پاپ گانوں کی بھرمار تھی..

ایسی ہی ایک بسنت پر شہر لاہور کے سب بڑے، درمیانے اور گھٹیا ہوٹل بھر گئے..سرکاری ریسٹ

ہاؤس لبریز ہو گئے..اسلام آباد کے سب غیر ملکی سفارت کار اُمڈ آئے تھے تو سری لنکا کے سفیر کو جب کہیں جگہ نہ ملی تو وہ اپنی کار میں سو گئے،ایسی دُھوم تھی..

بسنت کی ایک شب، کچھ دیر پہلے نیند سے، جب میں بسنت کے شور و غل سے سو نہ سکا میں نے مُونا کو جگایا ''آؤ ذرا ہم بھی اندرونِ شہر کی بسنت کو دیکھتے ہیں..''

مُونا ایک سپورٹ تھی، مائل ہو گئی، ہم کار میں سوار ہوئے اور لاہور کا آسمان روشن تھا اور اُس میں گڈیاں اور پتنگیں آوارہ شہزادیاں ہوئی جاتی تھیں..شہر کے اندر ٹکسالی دروازے کے اندر ٹریفک کی بھیڑ تھی.. اور ہر ہر کوٹھے پر گھنگھرو چھنکتے تھے ''بوکاٹا'' کی آوازیں آتی تھیں اور لوگ بسنت بخار میں مبتلا بے خود ہوتے تھے..مجھے اچھا لگا کہ لوگ زندگی کے کُوزے سے مسرت کی مے کشید کرتے خوش ہیں..

یکدم بسنت منقطع ہو گئی..اس کی ڈور کٹ گئی..ممنوع قرار دی گئی..اس لیے کہ دھات کی ڈور سے بچوں کے گلے کٹ گئے..موٹر سائیکل سوار دھات کی ڈور گلے پر پھرنے سے زخمی ہو کر گر گئے، کچھ مر گئے..

میرے نزدیک اگر کسی ایک تہوار کے نتیجے میں صرف ایک بچّے کا گلا کٹ جاتا ہے تو اُسے ممنوع ہو جانا چاہیے..صرف ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے..باکسنگ کے کھیل کے دوران اگر کسی باکسر کے سر پر چوٹ لگتی ہے اور وہ مر جاتا ہے تو آپ باکسنگ کو ممنوع نہیں کر دیتے، اُس کے قوانین میں ترمیم کرتے ہیں.. میراتھون ریس کے دوران اگر کوئی کھلاڑی بھاگ بھاگ کر جان دے دیتا ہے تو آپ اُس میں شمولیت کی شرائط کڑی کر دیتے ہیں، میراتھون کو بین نہیں کر دیتے..اگر میلہ چراغاں کے کسی دیئے سے آگ لگ جاتی ہے تو آپ حفاظتی انتظامات کرتے ہیں، میلہ چراغاں کو بُجھا نہیں دیتے، اسی طور آپ دھات کی ڈور بنانے والوں کی سرکوبی کریں، قانونی طور پر گرفت میں لیں، اُن کے گلے کاٹ دیں، اگر ایسا نہیں کرتے تو حکمران نااہل ہیں..بسنت کو تو بین نہ کریں..ہزاروں اُستاد پتنگ ساز اور گُڈیوں کو شہزادیوں کا رُوپ دینے والے بیکار ہو گئے..بُھوکوں مرنے لگے..اور جو چوری چُھپے یہ ''مذموم'' کاروبار کرتے تھے پولیس اُن پر چھاپے مار کر تھانوں میں بند کرنے لگی، وہ پولیس جسے دہشت گردوں سے مقابلہ کرنا چاہیے تھا، وہ پتنگ سازوں اور ڈور لگانے والے ماہر کاریگروں کو دبوچنے لگی..اور پھر خبر لگتی کہ پولیس نے چھاپہ مار کر سینکڑوں پتنگیں اور گڈیاں برآمد کر لیں اور مُجرموں کو گرفتار کر لیا..کیا بات ہے! یہ نہیں کہ گندم کی فصل اب سنہری نہیں ہوتی..رُت نہیں بدلتی اور سرسوں کے کھیت بسنتی نہیں ہوتے..اہل جنوں بیباک نہیں ہوتے..

موسم تو کسی مذہب یا سرکاری نالائقی کے تابع نہیں ہوتے وہ تو بدلتے ہیں..

بسنت بخار اب بھی بدن میں ایک بسنتی رنگ کی حدّت بھرتا ہے پر..لاہور کا آسمان اب بیوہ ہو چکا ہے..بسنت کے دن بھی وہ اجڑا ہوا آفاق ہوتا ہے..بسنت کی سب شہزادیاں..رنگ رنگیلی، نخرے دکھلاتی،

متناسب بدن کی شہزادیاں اور گڈیاں اور لکھنو کاٹ گڈے سب کے سب چلے گئے.. رُخصت کر دیئے گئے..

اور اب لاہور کا آسمان بسنت کے روز بھی ایک بیاباں ہوتا ہے، اُس میں کسی خوش رنگ پتنگ کا پھول نہیں کھلتا، ایک بنجر آسمان ہوتا ہے..

اِک دن رہیں بسنت میں..



''لارنس گارڈن.. باغِ جناح''

خس و خاشاک ہو چکے زمانوں میں لاہور ایک خاموش شہر تھا.. 1950ء کے زمانوں میں 17- لکشمی مینشن کے فلیٹ کی آخری منزل پر مال روڈ کی جانب جو کھڑکیاں کھلتی تھیں، ڈھلتی دوپہروں میں جب اُن کھڑکیوں کے کواڑ ایک خاص زاویئے پر توازن کیے جاتے تو اُن کے بجھے ہوئے شیشوں میں مال روڈ پر سے گزرنے والی ٹریفک عکس ہونے لگتی..ایک متحرک اور رنگین فلم شیشوں کی سکرین پر چلنے لگتی اور ہم سب بہن بھائی حیرت زدہ ہوتے کہ یہ تو کوئی جادو کا کھیل ہے کہ مال روڈ اُن شیشوں پر ایک متحرک تصویر ہوئی جاتی ہے..

اب ٹریفک سے مُراد آج کی بمپر ٹو بمپر ہزاروں کاروں اور موٹر سائیکل کا وہ فضا کو آلودہ کرتا، غل کرتا اژدہام نہیں ہے جہاں پُوری مال روڈ چیئرنگ کراس سے ریگل تک ساکت ہو چکی ہوتی ہے، ریگل سے ٹریفک رواں اگر ہوتی ہے تو ہائیکورٹ چوک میں تھم جاتی ہے..پھر جی پی او چوک میں اُسے پھندہ لگ جاتا ہے..اگر اس منظر کو فضا سے دیکھا جائے تو نیچے مال روڈ کا ایک چپّہ دکھائی نہیں دیتا صرف دھواں اُگلتی مشینی سواریاں نظر آتی ہیں اور وہ بھی سرکتی اور سسکتی ہوئی..

1950ء کی مال روڈ کی ٹریفک سے مُراد یہ ہے کہ ہمیں کھڑکیوں کے شیشے پر عکس ہوتی ایک ویران شاہراہ نظر آتی ہے..ہم ترس جاتے ہیں کہ کوئی تو آئے..اور پھر ایک چھم چھم کرتا لاہوری تانگہ گزرتا جاتا ہے، گھوڑے کے گلے میں بندھے رنگین پُھندنے اُس سپاٹ منظر میں رنگ بھرتے ہیں اور اُن پھندنوں سے بندھی گھنٹیوں کی چھم چھم ایک سمفنی کی مانند مال روڈ کی ویرانی میں گونجنے لگتی ہے..اور تب ہم اپنی قسمت پر رشک کرتے ہیں جب ایک کار اولپل یا آسٹن مال روڈ کی تنہائی میں ایک شہزادی کی مانند چلی جاتی ہے..

اس مال روڈ پر پورے برس میں صرف ایک دن ہنگامہ برپا ہوتا تھا، 14 اگست کے موقع پر فوجی پریڈ ہوتی تھی، دل کو دہلاتے ٹینک مال کے نرم ہو چکے تارکول پر اپنی بھاری زنجیروں کے نقش ثبت کرتے گڑگڑاتے گزرتے اور آس پاس کی چھتوں پر جمع ہجوم بے خود ہو کر ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگاتا، چونکہ ہمارے فلیٹ کی چھت ریگل چوک پر اٹتی تھی اس لیے اباجی کے دوستوں اور ہمارے رشتے داروں کی جانب سے 14 اگست سے بہت پہلے سندیسے آنے لگتے کہ ہمارے لیے ایڈوانس بُکنگ کر لیجیے، ہم نے آپ کی چھت پر

سے پریڈ کا نظارہ کرنا ہے اور دوپہر کا کھانا تو ظاہر ہے ہم آپ کے ہاں کھائیں گے..

یوم آزادی کے سوا پورا سال مال روڈ تقریباً سنسان پڑی رہتی..لاہور ایک خاموش شہر تھا..

ہاں کبھی کبھی اس خاموشی میں شیر دھاڑنے لگتا..

خاص طور پر سردیوں کی اُن شاموں میں، جب ابھی ابھی بارش تھم چکی ہو، فضا نتھری ہوئی ہو اور ہم اپنی اپنی رضائیوں میں آرام آسودگی کے خمار میں ہوں تب یکدم شیر دھاڑنے لگتا، اُس کی گرج ایسی دہلا دینے والی ہوتی جیسے وہ ہمارے پلنگ کے پائے کے ساتھ لگ کر دھاڑ رہا ہو..اتنا قریب ہو..ہم رضائیوں میں روپوش رہتے، سر باہر نہ نکالتے کہ کیا پتہ چڑیا گھر کا شیر ٹہلتا ٹہلتا یہاں آ نکلا ہو..ہمارے فلیٹ کی پوری باون سیڑھیاں طے کر کے ہمارے سرہانے آ کھڑا ہو..

تب لاہور کی فضاؤں میں ایک نکھرا ہوا ستھرا پن تھا، دور کی آوازیں بھی قریب آ جاتی تھیں، چڑیا گھر میں بولنے والا شیر ہمارے صحن میں آ جاتا تھا..چھت پر کھڑے ہوتے تو مسجد وزیر خان کے مینار نظر آتے اور لاہور کے ریلوے سٹیشن میں داخل ہونے والی یا وہاں سے روانہ ہونے والی ہر ٹرین کے انجن کی کُوک ہمیں صاف سنائی دیتی اور ہم جان جاتے کہ یہ بابو ٹرین روانہ ہوئی ہے اور یہ گاڑی پاکستان کے صدر مقام کراچی سے چلی آ رہی ہے..

لاہور اتنا خاموش شہر تھا..

اور اس خاموشی میں میرے گھر سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر لارنس گارڈن نام کا ہریاول کا ایک جزیرہ تھا جہاں بہت قدیم شجروں کی گھناوٹ میں نامعلوم پرندے چہکتے تھے..اُن درختوں پر ایسے عجب طیور اترتے تھے جو دور دراز کے سرد خطوں سے اڑانیں کرتے ذرا دم لینے کے لیے ہریاول کے اس خاموش جزیرے میں اتر جاتے تھے..خاص طور پر اُن سینکڑوں برس پرانے قد آور اور گھنے، بھید بھرے درختوں پر جہاں اُن سے پیشتر وہاں ہمیشہ کے لیے بسیرا کرنے والی ہزاروں چمگادڑیں لٹکتی ہوتی تھیں، مسلسل چیں چیں کرتی چیختی تھیں..

اور یہ عجب اجنبی طیور بھی اپنی طویل مسافتوں کے دوران تھک چکے پروں کو سہلا رہے ہوتے جب یکدم وہ ایک شیر کی دھاڑ سے لرز جاتے..چمگادڑوں پر کچھ اثر نہ ہوتا کہ وہ شیر کی اس دھاڑ کی عادی ہو چکی تھیں..اور انہیں یہ بھی یقین تھا کہ وہ شیر ایک پنجرے میں بند ہے، اگر کھُل بھی گیا تو ہمارے درخت پر چڑھ کر ہمیں ہڑپ نہیں کر سکتا..

صبح کی سیر کی علّت مجھے ایک عرصے سے لاحق ہے..

لکشمی مینشن کے زمانوں میں، صبح سویرے مال روڈ کی ویرانی میں چلتا، میں لارنس گارڈن میں داخل ہوتا..تب چڑیا گھر کے برابر میں لارنس گارڈن میں ایک کچا راستہ اترتا تھا جو اب متروک کر دیا گیا ہے، اس حصے کو چڑیا گھر میں شامل کر لیا گیا ہے..اس راستے کے برابر میں ایک آہنی جنگلے کے پار نہ صرف ہرن،

زیبرے اور زرافے نظر آتے بلکہ متعدد شیر بھی ٹہلتے دکھائی دیتے اور اُن میں سے کوئی ایک شیر نہایت باقاعدگی سے دھاڑتا تھا..

منظر کھلتا تھا، ہریاول کے اُس دل کش جزیرے میں اترتا تھا تو جیسے اس کائنات کی پہلی سویر کی حیرت میں داخل ہوتا تھا.. وہاں ایک پُرانا برگد.. جس کی داڑھیاں زمین میں سرایت کر کے پھر سے اُگتی تھیں اور وہاں اُس کے تنے کی کوکھ میں کچھ بجھے ہوئے چراغ ہوتے، اگر میں بہت سویرے آجاتا تو ایک آدھ چراغ جلتا ہوا دکھائی دیتا، برگد کے تنے کی سلوٹوں میں وہ کون تھے جو دیئے جلاتے تھے.. مذہب اور عقیدے سے ماورا ایسے لوگ جو مایوس ہو چکے تھے.. اپنے دُکھوں سے پناہ مانگنے والے، اذیتوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے، محبوب سے ملاپ کی تمنا کرنے والے.. آج بھی اگر آپ کو آج کے جناح باغ میں جانے کا اتفاق ہو تو وہ برگد اب بھی موجود ہے اور اُس کے تنے میں اب بھی چراغ جلائے جاتے ہیں کہ ابھی تک خلقِ خدا کے دُکھ کم نہیں ہوئے..

صرف بچوں میں ہی نہیں، بڑوں میں بھی ''خزانے کی تلاش'' کا جذبہ بدن میں ایک سنسنی بھرتا ہے.. اُس برگد کی جڑوں میں، میں اپنے ہاتھوں سے ایک گڑھا کھودتا اور اُس میں چند سکّے دبا کر مٹی برابر کر دیتا.. اور پھر کچھ عرصے بعد میں نہایت لاتعلقی سے، جیسے میں جانتا ہی نہیں کہ مٹی کے اندر کیا پوشیدہ ہے، برگد کی جڑوں کو کھودتا اور جب اُس میں دفن سِکّے نظر آتے تو گویا وہ ایک گمشدہ خزانہ تھا جسے میں نے اتفاقاً دریافت کر لیا تھا مجھے اتنی مسرت ہوتی.. اپنے آپ کو فریب دینے اور دھوکا دینے کا یہ کھیل بہت پرانا ہے لیکن کیا کیجیے کہ زندگی بھی تو ان فریبوں اور دھوکوں سے عبارت ہے.. ایک بار میں نے اپنے ہی دفن کردہ سکّوں کے حصول کے لیے زمین کھودی تو وہاں کچھ نہ تھا، شاید کسی نے میرا پوشیدہ خزانہ چوری کر لیا تھا.. اُس شب مجھے نیند نہ آئی..

آ وُ زمیں کھودیں
اور اُس میں اپنے دِل بو دیں
کریں سیراب اُسے اپنے پسینے سے
کہ اس جینے سے..
نہ میں خوش ہوں نہ تم خوش ہو..

اُس برگد سے پرے ''تُرت مراد'' کا مزار تھا.. یعنی بہت شتابی سے تُرت آپ کی مُراد پوری کرنے والا.. مزار کی قربت میں لارنس گارڈن کا سب سے قدیم پام ٹیڑھا میڑھا ہو کر زمین پر بچھا جاتا تھا..

تب شیر دھاڑنے لگتا..

اور وہ ٹرٹ مراد..اگر کوئی تھا تو وہ بھی اُس کی دھاڑ سے اپنی قبر میں لرزنے لگتا کہ مجھے تو قیامت تک نیند کرنی تھی..تب جاگنا تھا اور یہ شیر مجھے ابھی سے دھاڑ کر جگا رہا ہے..

لارنس گارڈن میں داخل ہونے والا چڑیا گھر کے پنجروں کے ساتھ ساتھ جانے والا یہ راستہ جانے کس مصلحت کے تحت بند کر دیا گیا اور اسے چڑیا گھر کے احاطے میں شامل کر لیا گیا..اور مجھے بے حد قلق ہوا کہ اس راستے سے داخل ہوتے، اس پر چلتے ہوئے آپ صبح متعدد ہرنوں، زرافوں، بندروں اور کبھی کبھار کسی شیر کو بھی آسانی سے ''گڈ مارننگ'' کہہ سکتے تھے اور یہ لارنس گارڈن کے اُس حصّے میں جا کھلتا تھا جہاں متعدد قد آور ایسے درخت سایہ فگن ہوتے تھے کہ اُن پر ایک چھوٹے سے جنگل کا گمان ہوتا تھا..اور یہ قدرتی اور قدیم منظر ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گیا..

تب میں لارنس گارڈن کے اُس مرکزی گیٹ یا داخلے کی جانب چلا جاتا جو مال روڈ پر واقع تھا.. بائیں جانب وہائٹ ہاؤس سے مشابہ لاہور جم خانہ کلب کی یونانی طرزِ تعمیر کی شاندار ستونوں والی سفید عمارت تھی جس کے اندر ابھی تک کولونیئل زمانوں کی کچھ پرچھائیاں محفوظ تھیں، وہ زمانے گزرے ہوئے ابھی چند برس ہی گزرے تھے جو اس کے اندرون میں ایک حنوط شدہ یورپی تہذیب کی صورت ایک عجائب گھر تھے، اس کے مرکزی ہال کا فرش شاید مہاگنی لکڑی سے تخلیق کیا گیا تھا اور ہمہ وقت اُسے پالش کرنے پر کچھ وردی پوش مامور ہوتے..اسی ہال کے ایک حصے میں ایک ایسی شاندار بار تھی جس کی سجاوٹ دیکھنے کے قابل تھی..یہ اتنی سجی بنی اور لکڑی کی پُر پیچ بناوٹوں سے آراستہ تھی، بارٹینڈر سیاہ ٹیبل گاؤنوں اور بوٹائیوں میں ملبوس نہایت برطانوی لہجے کی انگریزی میں پُوچھتے کہ سَر..ہاؤ ڈیو لائک یور سکاچ، آن دے راکس آر وِد سوڈا؟ بلند چھتوں سے کرسٹل کے بھاری فانوس لٹکتے جگ مگ کرتے ہال میں رقص کرتے جوڑوں کو جگمگاتے..اگرچہ میں اس کلب کا ممبر نہ تھا لیکن میرے کُچھ دوست تھے جن کے توسط سے میں نے کم از کم دو نیو ایئر نائٹس اسی ہال میں منائیں..

یہ وہی جم خانہ کلب ہے جس کے بارے میں 1965ء کی جنگ ستمبر کے دوران ایک ہندوستانی جنرل نے دعویٰ کیا تھا کہ میں آج شب تک لاہور میں داخل ہو کر یہاں وہسکی کا ایک جام پیوں گا..بہت زمانے گزرے جب عثمانی تُرکوں نے وِی آنا کا محاصرہ کیا تو اُن کے سپہ سالار نے آسٹرین فوج کو ایک پیغام بھیجا کہ کل دوپہر کا کھانا میں وِی آنا میں کھاؤں گا..اگلے روز تُرکوں کا حملہ ناکام ہو گیا تو اہلِ وِی آنا نے تُرکوں کو پیغام روانہ کیا کہ حضور آپ کا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے، چنانچہ اسی طور ہندوستانی جنرل کو بھی اُنہی دنوں سندیسہ بھیجنا چاہیے تھا کہ حضور..آپ کی وہسکی کا جام پانی ہو رہا ہے..کب تشریف لائیے گا..

جم خانہ کلب کے دائیں جانب جو راستہ قدیم درختوں کی گھناوٹ کے سائے میں چلا جاتا تھا، میرا معمول تھا کہ میں اُدھر چلا جاتا اور میری صبح کی سیر کا آغاز ہو جاتا..اُن درختوں پر چمگادڑوں کا بسیرا ہوتا تھا جو

اُلٹی لٹکی اپنے سیاہ پر پھڑ پھڑاتی مسلسل چیں چیں کرتی رہتیں، سینکڑوں کی تعداد میں یہ سیاہ چمگادڑیں یوں محسوس ہتا کہ یہ اُن درختوں کی بیٹیاں ہیں جو آج تک بن بیاہی اپنے کنوار پن کو کھونے کی آرزو میں چیختی چلاتی ہیں.. یہ ایک عجیب وقوعہ ہے کہ لارنس گارڈن کے کسی بھی شجر پر کوئی ایک چمگادڑ بھی نظر نہیں آتی اور یہ درخت اُن کے سینکڑوں اجسام سے زندہ اور پھڑ پھڑاتے لگتے ہیں..

ان درختوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے ہمیشہ ایک ڈر دامنگیر رہتا کہ کوئی نہ کوئی چمگادڑ آپ پر آن گرے گی..

بے شک لارنس گارڈن میں رنگ رنگ کے اجنبی اور خوش الحان طیور چہکتے ہیں لیکن اس باغ کا قومی ترانہ ان چمگادڑوں کی چیں چیں کا شور ہے.. اور یہ آج بھی موجود ہیں..

انہیں چمگادڑوں کے درختوں تلے ایک سویر اور بہت دھندلی سویر.. میں حسب عادت ہولے ہولے جوگ کرتا چلا جار ہا تھا جب سامنے دھند میں سے ایک بزرگوار نمودار ہوئے، نفیس سیاہ اچکن، سفید تہبند اور پاؤں میں ایک نوکدار قصوری کھسہ، سر پر پگڑی.. اور پگڑی میں سے ظاہر ہوتے سفید بالوں کی لٹیں.. کم از کم اسّی برس کے پیٹے میں تو ہوں گے.. ذرا جھومتے جوگنگ کرتے چلے آرہے تھے اور اُن کے عقب میں ایک نادار سا شخص ہاتھوں میں ایک حقہ تھامے مؤدّب حالت میں اور وہ بھی جوگنگ کرتا چلا آرہا تھا.. وہ میرے قریب سے گزر گئے اور میں بھی گزر گیا.. تقریباً پندرہ سیکنڈ کے بعد وہ حقہ بردار ہانپتا ہوا میرے پیچھے چلا آیا اور کہنے لگا ''چوہدری صاحب آپ کو بلاتے ہیں..''

''کونسے چوہدری صاحب..'' میں نے ناگواری سے کہا کہ میں خود ایک مائنر یا چھوٹا موٹا چوہدری ہوا کرتا تھا، میں کسی اور چوہدری کو خاطر میں کہاں لاتا تھا..

حُقّہ بردار نے مجھے ایک چشم حقارت سے دیکھا کہ تم چوہدری صاحب کو نہیں جانتے اور پھر کہنے لگا ''چوہدری قادر بخش تارڑ..'' اور اسے ایک فرضی نام جانیئے..

اب چونکہ بزرگوار ایک تارڑ تھے اس لیے اُن کا احترام مجھ پر لازم تھا اس لیے میں اُس کے ساتھ پلٹ گیا.. انہوں نے مجھے دعوت دی کہ میری سیر میں شریک ہو جاؤ.. اگرچہ میں خوشبویات یا بدبویات وغیرہ کا اتنا ماہر تو نہ تھا لیکن اس قدر سونگھنے والی حساس ناک تو رکھتا تھا کہ.. اُس دھند آلود سویر میں ان ناگہانی تارڑ تایا جی سے بہت اعلیٰ اور خمار بھری وہسکی کی بُو آرہی تھی، میں ان کی سیر میں شریک ہو گیا.. اس سیر کے دوران انہوں نے پہلے تو میری پیٹھ تھپکی کہ پُتر تُو نے تارڑوں کا نام روشن کر دیا ہے اور پھر گفتگو کے دوران وقفے وقفے سے مجھ سے تین اہم سوال پُوچھے..

پہلا سوال..''پتر کبھی کچھ گھونٹ شونٹ بھی لگایا ہے کہ نہیں؟''

اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ ایک نا گہانی تارڑ تایا جی یکدم مجھ سے پوچھتے ہیں کہ پُترتم کچھ شراب وغیرہ بھی پیتے ہوتو اس کے جواب میں، میں انکار کے سوا کیا کرسکتا تھا..

دوسرا سوال.. ''تم مجرے شُجرے کے بھی شوقین ہو کہ نہیں؟''

''جی نہیں..'' میں نے صدق دل سے کہا..

تیسرا سوال.. ''کبھی افیون بھی کھائی ہے کہ نہیں؟''

''کبھی نہیں۔کبھی نہیں۔''

کچھ دیر ایک گہرے توقف میں مبتلا ہونے کے بعد کہنے لگے.. ''پُتر تو شراب نہیں پیتا، مُجرے کا شوق نہیں یہاں تک کہ افیون کا بھی رسیا نہیں، تُو کیسا تارڑ ہے..'' مجھے بے حد رنج ہوا کہ میں مروجہ تارڑ اخلاقیات پر پورا نہیں اترتا تھا اور یوں ایک مخدوش سا تارڑ تھا..

چمگادڑوں کی ان بُلند آماجگاہوں کے سائے سائے چلتے آپ گورنمنٹ کالج لاہور کے ''بوٹانیکل گارڈن'' کے باہر اُس برگد کے قریب پہنچ جاتے تھے جس کی جڑیں ایک نادار کی پسلیوں کی مانند زمین میں سے ابھرتی تھیں.. بوٹانیکل گارڈن میں عوام الناس کا داخلہ ممنوع تھا لیکن میں کبھی کبھار مقفل گیٹ کے دائیں جانب جو گھنی جھاڑیاں تھیں، اُن میں سے راستہ بنا کر اُس کے اندر چلا جاتا تھا..اور وہاں ''اُگ رہا ہے درودیوار سے سبزہ''..والی کیفیت تھی، جیسے آپ کسی رین فارسٹ یا بارشوں کے جنگل میں آ نکلے ہوں جہاں کے شجر اور جھاڑیاں ایک قدیم خواب میں ڈوبے بے خود ہوئے جاتے ہیں، بیلیں بے اختیار جنگل کے فرش پر پھیلتی جا رہی ہیں..عجب شکلوں کے درخت اور جھاڑ جھنکار اُگتے چلے جا رہے ہیں اور یہ جنگل اَن چھوا ہے..اس میں آج تک کوئی ذی رُوح داخل نہیں ہوا..یہ ایسا بوٹانیکل گارڈن تھا... بلکہ بُوٹا گارڈن تھا یعنی بُوٹا..نیکل گارڈن تھا..

اس گارڈن کے برابر میں وہی تُرت مُراد کا مزار تھا..

یہ راستہ بل کھاتا ہے لارنس گارڈن کی دوسری پہاڑی کے پہلو میں سے نکلتا ''گُلستان فاطمہ'' کے گُلشن کے برابر میں آ جاتا ہے..محترمہ فاطمہ جناح کا گُلستان جس کے ایک بنچ پر بیٹھ کر، ماتھے پر بال بکھرا کر، نہایت اداس ہو کر میں نے اپنی سولہویں سالگرہ کے دن ایک تصویر اُتروائی تھی..آج سے ساٹھ برس پیشتر..

اہل لاہور کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ وہ اپنی جوانی میں کبھی نہ کبھی لارنس گارڈن میں اپنی اُس کوٹھے والی محبوبہ کے ہمراہ نہ آیا ہو جو ننگے پاؤں چلی آتی تھی تو وہ لاہوریا نہیں ہے، اے حمید، تب میرے محبوب مصنف کہا کرتے تھے کہ تارڑ اِن دنوں تو عشق ہوٹل کے کمروں اور دوستوں کے فلیٹوں میں روپوش ہوتا ہے، ہم چار آنے کرائے پر ایک سائیکل حاصل کر کے کرشن نگر پہنچتے تھے، گرمیوں کی دوپہروں میں محبوبہ کے

والدین نیند میں مدہوش ہوتے تھے.. ہم سائیکل کی گھنٹی بجاتے تھے تو وہ چوری چھپے گھر سے اترتی تھی اور سائیکل کے ڈنڈے پر آ بیٹھتی تھی.. ہم قہر کی گرمی میں سائیکل چلاتے لارنس گارڈن پہنچ جاتے تھے.. کسی بنچ پر بیٹھ کر محبت کا اظہار کرتے ہوئے کبھی کبھی یونہی اُس کا رخسار چوم لیتے تھے.. یہ ہمارے عشق کی انتہا ہوتی تھی..

''گلستان فاطمہ'' سے ذرا آگے بائیں جانب وہ اوپن ایئر ریستوران ہوا کرتا تھا جہاں چاچا سلیم تارڑ نے مجھے زندگی کی پہلی ٹوٹی فروٹی آئس کریم کھلائی تھی..

دائیں ہاتھ پر ایک گھاس بھرے مختصر میدان میں میگنولیا کے چند پژمردہ پتوں والے درخت کھڑے ہیں، یہ بہت کم ہماری آب و ہوا میں پنپتے ہیں اور ان کے بہت اداس پتوں میں سے کنول ایسے بڑے بڑے پھول کھلتے ہیں جن کی خوشبو میں ایک تیز اور سر کو چکرانے والی ناگوار مہک ہوتی ہے... پھول سفید دودھ رنگت ہوتے ہیں لیکن ان میں ''پنک میگنولیا'' بھی کھلتے ہیں اور اس نام کی ہالی وڈ میں بنائے جانے والی ایک فلم کی بہت شہرت ہوئی تھی..

میگنولیا باغ کے برابر میں دارالسلام نامی مسجد ڈاکٹر اسرار احمد والی واقع ہے، یہ تب نہیں تھی..

اور ہاں میں بھول گیا، میں یہ تحریر محض یادداشت کے سہارے لکھ رہا ہوں اور یادداشت کا اس عمر میں کیا ہے، بھٹک جاتی ہے.. تو میں بھول گیا کہ چمگادڑوں کے بسیروں سے ذرا ادھر جہاں مجھے ایک تایا تارڑ ملے تھے، وہاں دائیں جانب درختوں کا ایک گھنا جھنڈ تھا جو اب بھی موجود ہے وہاں ایک ایسا قدیم شجر تھا جس کے پتوں کے گھنے پن میں سورج کی روشنی بھی سرایت نہ کر پاتی تھی یعنی اُس کے اندر.. دن کو بھی شب کی سیاہی والی کیفیت تھی اور اُس ہریاول سے چُور سیاہی کے بھیتر میں کوئی ایک پنکھ پکھیرو بسیرا کرتا تھا، اُس کی شکل کیسی تھی، جسامت کیا تھی، رنگ کونسے رنگ تھے میں نہیں جانتا کہ میں نے اُسے کبھی نہ دیکھا صرف سُنا.. وہ ایک درد بھری آواز میں کُوکتا تھا اور ایک خاص سُر میں چہکتا تھا.. میں اکثر وہاں ٹھہر جاتا اُس کی کُوک کا منتظر رہتا، ایک روز اُس شجر تلے کھڑے یونہی میرے دل میں آئی کہ اس سے کچھ راز و نیاز کیے جائیں تو میں نے اُس کی کُوک کے جواب میں اپنے تئیں اُسی سُر اور لَے میں ایک صدا دی، اُس کے لہجے کو اختیار کر کے اُسی انداز میں ''کُوہو.. کُوہو.. کُوکُو.. کی کی.. یاہُو'' وغیرہ پکارا.. کیا آپ یقین کریں گے کہ اُس نے پُرمسّرت ہو کر مجھے جواب دیا.. اور ہم باقاعدہ گفتگو کرنے لگے.. کبھی میں اپنے خبط میں مبتلا کوئی اور آواز نکالتا تو وہ گھنے پتوں میں پوشیدہ میری آواز کی نقل کرتا.. چنانچہ یہ میرا معمول ہو گیا کہ لارنس گارڈن میں داخل ہو کر میں سب سے پہلے اُس پرندے کو ہاؤ ڈو یُو ڈو اور گڈ مارننگ کہہ کر آگے بڑھتا.. یہاں تک تو خیریت گزری.. ایک روز میرے ایک واقف حضرت نے مجھے اس درخت تلے کھڑے ہو کر ''کُوہو.. کُوہو'' کرتے دیکھ لیا.. بعد میں انہوں نے پوچھا کہ

تارڑ صاحب آپ کیا کر رہے تھے؟ تو میں نے سنجیدگی سے کہا کہ وہ وہاں میرا ایک دوست پرندہ ہے، میں اُس سے باتیں کرتا ہوں.. ازاں بعد یہ حضرت مجھ سے کترا کر نکل جاتے.. وہاں ایک پہلوان سیر کے لیے تو نہیں ایک بنچ پر بیٹھنے کے لیے باقاعدگی سے آیا کرتے تھے.. اتوار کے روز وہ ہمارے لیے باداموں کا شربت اور حلوہ پوڑی لے کر آتے تھے.. ان حضرت نے اُن پہلوان کو بھی میرے بارے میں بدگمان کر دیا کہ یہ تارڑ پرندوں سے باتیں کرتا ہے.. اس سے بچ کر رہیے..

لارنس گارڈن کا تذکرہ جم خانہ کرکٹ گراؤنڈ اور اس کی خوابناک ڈھلواں چھتوں والی کولونیئل پویلین کے بغیر ادھورا رہ جائے گا.. یہاں میں نے انڈیا اور پاکستان کے درمیان کھیلے جانے والا وہ ٹیسٹ میچ ایک سائبان تلے گھاس پر بیٹھ کر دیکھا جب ہمارے مقصود احمد جو مَیری میکس کہلاتے تھے، گورے چٹے خوش شکل کھلاڑی تھے اور جب گراؤنڈ میں اترتے تو اکثر خاصے ''مَیری'' ہوتے.. اور وہ ننانوے ناٹ آؤٹ تھے، ہندوستانی سپن باؤلر گپتا کے بال کو ایک شاندار چھکا لگانے کے جوش میں کریز سے باہر آ کر نصف پچ پر رقص کرتے بلّا گھما دیا.. گیند بھی گھوم گئی بلّے سے ملاپ نہ کیا.. وکٹ کیپر تمہانے نے آسانی سے اُنہیں سٹمپ کر دیا.. جم خانہ گراؤنڈ میں جتنے بھی ہزاروں کی تعداد میں لاہور کے زندہ دلان تھے اُن سب کے دل فوت ہو گئے، ایک سناٹا چھا گیا۔ مقصود احمد ننانوے پر آؤٹ ہو گئے.. صرف لاہور ہی نہیں پورے ملک میں صف ماتم بچھ گئی.. حیدر آباد میں ریڈیو پر کومنٹری سنتے ایک صاحب اس صدمے کی تاب نہ لا کر انتقال کر گئے.. وکٹ کیپر تمہانے کو بہت رگیدا گیا کہ بھلے آدمی تم نے ضرور مقصود کو سٹمپ آؤٹ کرنا تھا.. نہ کرتے تو تمہارا کیا جاتا.. پس ثابت ہوا کہ یہ ہندو لوگ ازل سے مومنوں کے دشمن ہیں چاہے مومن ''مَیری'' ہی کیوں نہ ہوں، نہایت عیار اور بدلحاظ لوگ ہیں..

میچ کے اختتام پر جب انڈین کرکٹ ٹیم بس میں سوار ہو کر ہوٹل واپس جا رہی تھی تو لاہوریوں نے نہایت ناپسندیدگی سے ہندو تمہانے کو دیکھا اور اُس نابنجار نے ہاتھ ہلا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا..

اُس میچ میں شرکت کے لیے مجھے یاد ہے کہ فضل محمود اور شاید امتیاز احمد اپنی اپنی سائیکلوں پر آئے تھے.. بے شک بعد میں عمران خان کی خوش شکلی کا بہت چرچا ہوا لیکن آپس کی بات ہے کہ فضل محمود کی وجاہت اور نیلی آنکھوں کے سامنے تب کوئی نہ ٹھہرتا تھا. عمران اُن کے مقابلے میں ایک ''چبڑ'' سا جھرّیوں بھرا خربوزہ ہے.. سَوری خان صاحب..

اسی باغ کے ایک گوشے میں ''کاسموپالٹن کلب'' تھی.. یہ جم خانہ کلب کی مانند نک چڑھی اور شاہانہ تو نہ تھی لیکن یہاں بھی انگریز سرکار کے بچے کھچے صاحب حضرات ٹینس کھیلتے تھے، تمبولا کھیلتے تھے اور ''پٹیالہ پیگ''

پی کر کف افسوس ملتے تھے کہ آخر انگریز صاحب بہادر ہمیں بے آسرا چھوڑ کر کیوں چلے گئے..

ایک وکیل صاحب جنہوں نے مجھے یوگا کے اولین درس دیئے اور وہ ہمیشہ ایک چھوٹی سی ٹہنی دانتوں میں دبائے چباتے رہتے تھے تو میں نے اُن سے پوچھا کہ یہ کیا ہے..تو انہوں نے آس پاس نظر کر کے اطمینان کیا کہ کوئی سُن تو نہیں رہا اور اس کے باوجود کہ کوئی نہیں سُن رہا تھا، انہوں نے پھر بھی سرگوشی کی ''یہاں کسی کو خبر نہیں، صرف میں جانتا ہوں، اس باغ میں لونگ کی ایک جھاڑی ہے، یہ اُس کی ایک ٹہنی ہے..''

''وہ والا لونگ..''تیرے لونگ دا پیا لشکارا..والا لونگ''

''نہیں جی..سچ مچ کا وہ لونگ..جسے دانتوں تلے رکھنے سے درد زائل ہو جاتا ہے..''

''اس کی جھاڑی ہوتی ہے؟''

وکیل صاحب نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں کسی اور سے تذکرہ نہیں کروں گا اور ایک جھاڑی کی نشاندہی کی کہ یہ لونگ کی جھاڑی ہے..

میں ہر سویر چوری چھپے اُس جھاڑی سے ایک مختصر ٹہنی توڑتا..اُسے منہ میں رکھ کر چباتا..نہ صرف میرا منہ اور حلق لونگ کی مہک سے معطر ہو جاتا بلکہ میرے مسوڑھوں کو آسودگی حاصل ہوتی، منہ میں جو غیر ضروری لعاب پچھلی شب کے ہوتے وہ خارج ہو جاتے اور میرا پورا بدن کھل اٹھتا..

لارنس گارڈن جب بے وجہ جناح باغ ہو گیا..جیسے لائل پور بے وجہ فیصل آباد ہو گیا..نہ جناح جانتے تھے کہ لارنس گارڈن بھی کوئی گارڈن ہے اور نہ شاہ فیصل جانتے تھے کہ اُن کے نام کا یہ شہر کہاں ہے اور آخر کیوں ہے..تو اسے مشرف بہ اسلام کرنے کی خاطر یہاں ایک شالیمار طرز کا مُغل گارڈن تعمیر کیا گیا، جم خانہ کلب کے ذرا اِدھر جہاں کچھ قدیم درخت ہوا کرتے تھے وہاں ایک منی ایچر شالیمار وجود میں آ گیا اور اُس نے اس باغ کے منظر کو مجروح نہ کیا، اس کی ہریاول میں مدغم ہو گیا..

تو لاہور کی سردی کے کُہر آلود موسموں کی کوئی شب تھی، شہر اپنی ویرانی میں ٹھٹھرتا تھا، میں کسی اداس اور نوجوانی کے بخار میں سلگتا، لکشمی مینشن سے پیدل چلتا جناح باغ چلا گیا..ہر شے دم بخود اور حنوط تھی..بقول ایک قدیم چینی شاعر کے، پرندے جا چکے تھے اور بانس کے جنگل ویران ہو چکے تھے..اور تب میں نے اُس حالت اضطراب میں دیکھا کہ نیچے شالیمار کے آخر میں گہری دھند میں سے ایک تاج محل ظاہر ہو رہا ہے..وہی سفید گنبد اور مینار اور سنگ مرمر کی سِلوں پر قرآن پاک کی آیتوں کی نقاشی، پُھول بُوٹے اور سجاوٹیں..گنگا کے کنارے نہیں، راوی کے کنارے ایک تاج محل..کیا یہ ایک فریب ہے..نظر کا دھوکا ہے..میں نہ یقین کر سکا اور نہ میں مکمل طور پر بے یقین ہو سکا کہ وہاں واقعی دھند میں سے ظاہر ہوتا ایک تاج محل تھا..میں قریب ہوا تو کُھلا

کہ وہ ایک فلم کا سیٹ ہے.. کسی پاکستانی فلم کی شوٹنگ کے لیے جب آگرہ کے تاج محل میں ایک رومانوی منظر اور گیت کو فلم بند کرنے کی اجازت نہ ملی تو ایک سیٹ ڈیزائنر نے پیشکش کی کہ مجھے اجازت دیجئے میں باغ جناح کے مغل گارڈن کے آخر میں تاج محل کا ایک ایسا سیٹ تعمیر کر دوں گا کہ وہ نقل مطابق اصل ایسا ہوگا کہ اگر شاہجہان بھی دیکھے تو مخمصے میں پڑ جائے.. اور ایسا ہی ہوا.. میں نہیں جانتا کہ اُس جینئس سیٹ ڈیزائنر کا نام کیا تھا، وہ گمنامی میں مر چکا ہوگا لیکن جب میں نے زندگی میں پہلی بار آگرہ میں تاج محل کو اپنے سامنے پایا تو میں بھی ایک مخمصے میں پڑ گیا کہ کیا یہ اصل ہے اور وہ نقل تھی یا یہ نقل ہے اور وہ اصل تھی..

باغ جناح میں داخل ہوتے ہوئے جو پہاڑی بائیں جانب بلند ہوتی ہے جس کی چوٹی پر ایک واٹر ٹینک ہے وہاں ایک مصنوعی آبشار کے پُل پر میرے ڈرامے ''مُورت'' کا ایک منظر ریکارڈ ہوا تھا میں شدید گرمی کے باوجود ایک اونی سوٹ اور ٹائی میں ملبوس روایتی ہیرو کے روپ میں بہت بنی ٹھنی میک اپ آلودہ، ہیروئن سے نہایت گلوگیر آواز میں اظہار عشق کر رہا ہوں.. اور تب مجھے محسوس ہوا کہ گرمی کی شدت کی وجہ سے ہیروئن کی بغلوں میں سے ایک بُو جنم لے رہی ہے اور میں اپنے مکالمے بھول گیا.. اور ڈرامے کے پروڈیوسر ہمارے یاور حیات تھے، جب میں نے مکالمے بُھولنے کا سبب بیان کیا تو کہنے لگے ''چن جی.. اگر ایک بڑے اداکار کے سامنے ایک چُڑیل ہو اور اُس سے عشق کا اظہار کرنا ہو تو وہ اُسے ایک مارلن منرو کے رُوپ میں دیکھ کر والہانہ طور پر ڈائیلاگ بولنے لگے گا.. آپ محض بغلوں کی بُو سے گھبرا گئے..''

اُس پہاڑی کے دامن میں لارنس گارڈن کا سب سے دل کش درخت اپنی شاخیں پھیلائے اب بھی کھڑا ہے.. جس کے تنے اور تن بدن پہ کانٹے ہیں اور اس کی پتوں سے عاری ٹہنیوں پر کنول کے بڑے بڑے سفید پُھول اتنی کثرت سے کھلتے ہیں کہ وہ بھر جاتا ہے.. ایسے لگتا ہے جیسے کاغذ یا پلاسٹک کے سینکڑوں پھول اُس کی ویران شاخوں اور ٹہنوں میں پرو دیئے گئے ہوں.. یہ ''بُدھاٹری'' ہے.. مہاتما بدھ کا شجر ہے، بُدھ کے بدن کی مانند بھوک اور تپسیا کے کانٹے اُس کے تنے میں سے پھوٹتے ہیں.. دُکھ کے کانٹوں سے اُس کا بدن بھرا ہوا ہے اور پھر بھی گیان دھیان اور نروان کے سفید کنول اُس کی شاخوں پر کھلتے ہیں..

اس ''بُدھاٹری'' کو میں نے ایک اور سویر میں دُھند میں سے نمودار دیکھا، خشک ٹہنیوں سے پیوستہ سفید کنول پُھول دھند میں دُھند ہوتے تھے اور اُس کے کانٹوں بھرے تنے کے گرد جو گرے ہوئے کنول پُھول تھے اُن پر ایک زرد شہزادی اپنے کومل پاؤں دھرتی تھی..

میں اب بھی کبھی کبھار کسی سویر باغ جناح میں جا نکلتا ہوں.. ستتر برس کا ہو چکا ہوں تب بھی اس باغ میں قدم رکھتا ہوں تو میرا بدن نو جوانی کے بخار سے آشنا ہونے لگتا ہے..

Scanned with CamScanner

سب کچھ وہی ہے.... صرف یہ ہے کہ اب شیر نہیں دھاڑتا، اور میں اُس گھنے شجر کے نیچے کھڑے ہو کر نہایت سوگواری اور سرگوشی میں ''کُوہو کُوہو'' ہولے سے پکارتا ہوں لیکن جواب نہیں آتا..

وہ پرندہ..وہ پکھیرو..جس سے میں باتیں کیا کرتا تھا... یا تو مر گیا تھا یا کُوچ کر چکا تھا..

میں نے بھی تو اب مر جانا تھا..کُوچ کر جانا تھا..



''مال، میکلوڈ جی.. بیڈن روڈ جی'' (فلم ''یکے والی'' کا گیت)

تاج عُرف گھُرو نے بالآخر مجھے تقریباً پینتالیس برس کے بعد تلاش کر لیا اور میرے نئے ڈیفنس والے گھر میں ملاقات کے لیے چلا آیا.. ہم تب ملے تھے جب ہر درخت سرسبز ہوتا ہے اور ہر بطخ ایک راج ہنس دکھائی دیتی ہے اور پھر اب ملے ہیں جب درختوں کے ہاتھ خالی ہو چکے ہیں، اگر کسی ٹہنی پر کوئی ایک آدھ پتّہ موجود ہے تو وہ فنا کی ہواؤں کی سیاہ پھونکوں سے لرزتا ہے، اگر کوئی گُل ہے تو اندیشۂ زوال میں ہے، راج ہنس بھی بطخیں دکھائی دیتے ہیں کہ یوں بھی اب کم کم دکھائی دیتا ہے..

تاج لکشمی مینشن کراوڈ کا ''سازشی'' کردار تھا.. نہ صرف بطخ اور بکرے کو زچ کرنے کے لیے بلکہ منٹو صاحب سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے لیے جتنے منصوبے تیار ہوئے ان سب کا ماسٹر مائنڈ تاج تھا ''راکھ'' میں اس کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے.. نواب تاج اب بھی ایک چھریرے قد کا میری عمر کا نوجوان ہے اور جیسا کہ وہ کہتا تھا کہ میں کبھی شادی کے جھنجھٹ میں نہیں پڑوں گا تو وہ نہیں پڑا، بقیہ بھائیوں کے گھر آباد ہو گئے پر وہ جان بُوجھ کر آباد نہ ہوا، اب بھی لنڈورا پھرتا ہے..

ہم دونوں تقریباً نصف صدی کے بعد ملے تو پرانی یادوں کے سب بادبان کُھل گئے، اُن میں گئے دنوں کی ہوائیں بھر گئیں اور سب کشتیاں ہماری گم شدہ محبتوں، اذیتوں اور جوانی کے سنہرے دنوں کے پانیوں پر سفر کرتیں ہمیں واپس اُس ماضی کی جانب لے گئیں جو بڑھاپے کی دُھند میں روپوش ہوتا جاتا تھا.. ہم نے بیت چکے زمانوں کی گرد آلود کتاب کے ورق الٹائے تو وہ اتنے بوسیدہ ہو چکے تھے کہ خزاں آلود پتوں کی مانند جھڑتے جاتے تھے.. اور اس دوران ہم بیڈن روڈ کی جانب نکل گئے.. اُس کی باتیں کرنے لگے، لکشمی مینشن.. جس کے بارے میں میں بہت لکھ چکا، ناولوں اور کالموں میں اس کے نوحے لکھے کہ تاجر مافیا جسے تاجر حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اُس نے اس یادگار زمانہ سکونت گاہ کو ڈھا دیا، پلازے تعمیر کر لیے.. یہاں تک کہ سعادت حسن منٹو کے گھر کے باہر اُس کے نام کی آویزاں تختی کو اکھاڑ کر کُوڑے میں پھینک دیا تو اس لکشمی مینشن کا مرکزی داخلہ ریگل چوک سے ذرا ادھر ہال روڈ پر واقع تھا اور خارجی راستہ جو قدرے تنگ تھا بیڈن روڈ پر کُھلتا تھا..

ہال روڈ اُن دنوں ایک مکمل ویرانہ تھا، اُدھر نسبت روڈ اور چیمبرلین روڈ سے آنے والے تانگے شام کے بعد ہال روڈ آنے سے گریز کرتے تھے یہ اس قدر ویران اور تاریک روڈ ہوا کرتی تھی..اور دوسری جانب بیڈن روڈ ایک شوخ و شنگ چُلبلی لڑکی کی مانند زندگی کی سب حلاوتوں میں گُھلی ہوئی تھی چنانچہ ہم جو لکشمی مینشن والے تھے ہال روڈ سے گریز کرتے نکلتے تھے تو بیڈن روڈ کی جانب نکلتے تھے..یہ لکشمی مینشن کی ایک ایکسٹینشن یا ذیلی شاخ تھی جس کی ڈال ڈال پر ہم روز و شب چہکتے پھرتے..

اور اب یاد آتا ہے کہ ہال روڈ بھی مکمل ویرانہ تو نہ تھا..

وہاں لکشمی مینشن کی زرد عمارت میں ہال روڈ پر کھلتا ایک مے خانہ تھا، جس کے باہر ایک لیمپ پوسٹ ایک سفید رنگ کے مکاؤ طوطے کی شبیہ تھی جو اشارہ کرتی تھی کہ اِدھر چلے آیئے، یہاں ایک مے خانہ ہے..

اس مے خانے میں داخل ہونے والا ایک باقاعدہ دروازہ نہ تھا، چوکھٹ میں نصب دو کواڑ تھے جو دھکیلنے سے کُھل جاتے ہیں اور جُھولتے رہتے ہیں جیسے کاؤ بوائے فلموں کے شراب خانوں میں داخل ہوتے ہوئے ایک نیم وحشی کاؤ بوائے ایسے کواڑوں کو دھکیل کر اندر داخل ہوتا ہے اور اُسے دیکھ کر ہر جانب سناٹا چھا جاتا ہے اور جب وہ اپنا ہیٹ ٹیڑھا کر کے بارٹینڈر کو مخاطب کرتا ہے تو وہ معترض ہوئے بغیر اُس کا گلاس وہسکی سے لبریز کر کے پُوچھتا ہے ''یُو آر نیو اراؤنڈ ہیئر؟''

نصف صدی کے بعد اگر مصطفیٰ قریشی اپنے سندھی لہجے میں پنجابی بولتا کہتا ہے کہ..نواں آیاں ایں سوہنیا..تو یہ براہ راست ''یو آر نیو آراؤنڈ ہیئر؟'' کا ہی ایک رُوپ ہے..

اُسے مے خانے کے برابر میں ایک نیم تاریک دکان ہوا کرتی تھی اور ہم جب بھی اُدھر سے گزرتے تو ہمیں پیانو کی مترنم دُھنیں لاہور کی دوپہر میں جل ترنگ بجاتی سنائی دیتیں... یہاں ہر کوئی کاریگر موسیقار تھا جو بے سُرے ہو چکے پیانو کی ٹیوننگ کر کے اُنہیں سُر سے شناسا کرتا تھا..

چنانچہ ہال روڈ اگرچہ ایک ویرانہ ہوا کرتی تھی پر اُس ویرانے میں ایک خرابہ اُس مے خانہ کا تھا اور دوسرا پیانو ٹیون کرنے والے نامعلوم شخص کا شاید ایک گھر تھا..

لکشمی مینشن سے نکلتے، انصاری ہوٹل اور خان جُوس کارنر کے پہلو میں سے نکلتے تو عین سامنے ''خان میڈیکوز'' ہوا کرتا تھا اور وہاں مطب کرنے والے ڈاکٹر خان ہمارے گھریلو فزیشن تھے جنہوں نے ایک مرتبہ میری ''مر چکی'' بہن شائستہ کو زندہ کر دیا تھا..''خان میڈیکوز'' کے برابر میں ''کیری ہوم'' ریستوران اُن زمانوں میں ''دیسی کھانوں کا اعلیٰ مرکز'' شہر بھر میں مشہور ریستوران تھا جو اب بھی موجود ہے..

بائیں جانب ''امرتسر سویٹ شاپ'' یا مٹھائیوں کی وہ دکان تھی جس کی مٹھائیوں کی لذت بے مثال

تھی، اگر چہ یہ مٹھائیاں دکان کے وہ زمانے جو فراموش ہوتے جاتے ہیں اُن زمانوں میں اور یہ دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے چند برس بعد کے زمانے ہیں تب لاہور کی ہر روڈ پر.. چاہے وہ چیمبرلین روڈ ہو یا میکلوڈ روڈ یا بیڈن روڈ ہو، دیگر دکانوں اور تجارت گاہوں کے پہلو بہ پہلو ہمیشہ ایک راشن ڈپو ہوا کرتا تھا اور افیون کا ایک ٹھیکہ ہوا کرتا تھا.. مجھے یاد ہے کہ میں بیڈن روڈ کے راشن ڈپو سے اپنا راشن کارڈ دکھا کر گھر کے لیے چینی حاصل کیا کرتا تھا.. البتہ وہاں جو افیون اور بھنگ کا ٹھیکہ تھا وہاں سے کچھ خریداری کرنے کا اتفاق نہ ہوا.. موچی دروازے کے باہر چیمبرلین روڈ کی گھاٹی کے قریب پوسٹ آفس کے برابر میں بھی افیون کا ایک ٹھیکہ ہوا کرتا تھا اور وہاں افیونی حضرات ہجوم کرتے تھے، انارکلی بازار میں، بمبئے کلاتھ ہاؤس کے برابر میں بھی افیون کی سرکاری ترسیل کے بندوبست تھے، یہ سب بندوبست آنجہانی ضیاء الحق نے مقفل کر دیئے تو شنید ہے کہ افیونی حضرات ٹھیکوں پر پڑے قفلوں کو چُومتے تھے اور کہتے تھے ''دشمنی تمہاری بھٹو کے ساتھ ہے، ہمارے ساتھ تو نہیں، ہماری افیون کیوں بند کرادی..''

دراصل افیون اُن زمانوں کے رہن سہن کا ایک حصہ تھی.. تقریباً ہر گھر میں افیون کی کچھ گولیاں دوا کے طور پر موجود ہوتی تھیں، بچوں کو سُلانے اور لاعلاج امراض میں مبتلا مریضوں کی اذیت کو کم کرنے کے لیے ان کا استعمال ایک رواج تھا.. میرے ناول ''خس و خاشاک زمانے'' کا بخت جہان جب تک افیون کی گولیاں نہ نگل لیتا تھا، اُسے سکون نہ ہوتا تھا.. مجھ سے پوچھئے تو میں افیون کے مناسب استعمال کے حق میں بیان دوں گا.. آج بھی بیشتر سکون آور اور درد کی شدت میں افاقہ کرنے والی غیر ملکی دواؤں میں افیون کی آمیزش ہوتی ہے.. کینسر کی اذیت میں مبتلا مریضوں کو مارفیا کے ٹیکے لگائے جاتے ہیں.. جو افیون کی ایک جدید بیٹی ہے... میں بھی جب متعدد آپریشنوں کا شکار ہوا تو میرے بدن میں بھی افیون کی آمیزش والی دواؤں کے ٹیکے لگائے گئے.. اور ان زمانوں میں ہیروئن اور دیگر ہولناک تیز ابی نشوں کا جو راج ہے تو کیا اُن کے مقابلے میں افیون کا مناسب استعمال ایک بہتر متبادل نہیں ہے.. ٹھیکہ افیون سے آگے بیڈن روڈ پر ''اسماعیل اینڈ کو'' کا پرانا کولونیئل شوروم ہوا کرتا تھا، بُلند چھتوں اور شیشوں کے شوکیسوں والا.. اتنا خاموش کہ اُس میں داخل ہوتے تو اپنے قدموں کی چاپ گراں گزرتی... شوکیسوں میں برطانوی عہد کی فوجی وردیاں، تمغے، ڈنڈ اور فوجی محفلوں کے لیے شاندار لباس، کمربند اور آرائش سجی ہوتیں.. ''اسماعیل اینڈ کو'' انگریزوں کے رخصت ہونے کے باوجود اب بھی وجود اس لیے رکھتی تھی کہ پاکستان آرمی نے بھی برطانوی روایات اور فوجی لباس کی پیروی کی.. چنانچہ میرے چھوٹے بھائی مبشر نے بھی لفٹین ہونے کے بعد اپنی پہلی وردی انگریز راج کے انہی درزیوں سے سلوائی.. اور جہاں عسکری میاں ایرانی کے والد صاحب کا مطب تھا، اُس کے برابر میں عینکوں کی ایک دکان شاید ''ایسٹرن آپٹیکل'' کے نام کی تھی، میں اپنی اور اپنے معنک ہو چکے بچوں کی عینکیں یہیں سے بنواتا تھا.. میں نے اس

تاریخی عینک ساز کے بارے میں بہت تفصیل اور تحقیق سے کبھی کوئی کالم لکھا تھا جس کی تفصیل مجھے یاد نہیں..اس عینک ساز نے دلّی کی ایک برطانوی عینک ساز کمپنی میں ملازمت کرتے ہوئے..کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ قائداعظم کی آنکھیں چیک کر کے اُن کی عینک کے شیشے تیار کیے تھے..قائد کے ہمراہ فاطمہ جناح بھی آیا کرتی تھیں اور اُن کے لیے بھی یہی صاحب، جن کا نام میں بُھول رہا ہوں، چشمے تیار کرتے تھے..اور ثبوت کے لیے اُن کے پاس قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح کی آنکھوں کے نمبروں والے کارڈ موجود تھے جوانہوں نے مجھے دکھائے اور ان کی خواہش تھی کہ میں ان تاریخی دستاویزات کو سنبھال لوں..اُن کارڈوں پر باقاعدہ قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح کے دستخط تھے..

پچھواڑے میں لکشمی مینشن کے فلیٹوں کے عقب میں ایک گلی میں ''مینوفیکچر'' کچھ یوں کی جاتی تھیں کہ اگر کوئی انہیں تیار ہوتا دیکھ لے، شیرے کی کڑاہیاں اور ان میں تلتی جلیبیاں اور اتنی ہی میں تلی جانے والی مکھیاں وغیرہ اور وہ جونگ دھڑنگ حلوائی حضرات ان میں کڑچھے چلاتے تھے ان کے بدنوں سے بہتے پسینے کی آمیزش..تو جو شخص بھی اُنہیں تیار ہوتا دیکھ لے، بقیہ زندگی مٹھائیوں سے پرہیز شدید کرے..اگرچہ انہی قدرتی عوامل کی آمیزش سے ہی اُن کے ذائقے تخلیق ہوتے تھے..جیسے تُرک ناول نگار اُرحان پاموک نے استنبول کے کوچہ و بازار میں فروخت ہونے والی، ریڑھیوں اور ٹھیلوں پر سجی مٹھائیوں کے بارے میں کہا ہے کہ اُن کا ذائقہ آس پاس اڑتی دُھول کی آمیزش سے ہی بنتا ہے..جیسے ایک لاہوری کا کہنا ہے کہ جب تک کھلے عام فروخت ہوتے تکے کبابوں، سری پائے اور نہاری کے تسلوں میں گھوڑیوں کی لید کی آمیزش نہ ہو تو ذائقے کی چاشنی کی تکمیل نہیں ہوتی..

''امرتسری سویٹ شاپ'' سے چند قدم آگے پارسی بیرٹ کی بیکری تھی جس کی ڈبل روٹی کی مہک آج بھی میرے بدن میں مہکتی ہے..برابر میں ہمارے اکلوتے فیروز قصائی کی دکان تھی...مجھے تو گوشت کی کچھ پہچان نہ تھی البتہ خالو جان قبلہ فیروز کی دکان میں اُلٹے لٹکے تین چار بکروں کو تادیر پرکھتے رہتے اور پھر ایک ایک بوٹی کو ناپ تول کر ترازو میں رکھواتے..چند قدم آگے پان سگریٹ کی ایک دکان، کسی نخریلی طوائف کی مانند سجی سنوری گئی رات تک اپنے کوٹھے پر بیٹھی گاہکوں کی تواضع کرتی تھی اور میرا ہم جماعت اور دوست، اگرچہ شیخ لیکن کیا ہی دراز قامت اور سوہنا شیخ نجم، بوسکی کے شلوار قمیص میں ملبوس یہیں دن رات کرتا..ازاں بعد، اُس پر کسی نہ کسی نے تو بُری طرح عاشق ہونا تھا تو ایسا ہو گیا اور وہ گھر بار چھوڑ کر اُس ''کسی'' کے ساتھ کوئٹہ فرار ہو گیا..

بیڈن روڈ محض چند دکانوں، بیکریوں، پان سگرٹ کے کھوکھوں وغیرہ سے عبارت نہ تھی، وہاں کچھ یادگارِ زمانہ لوگ بھی رہا کرتے تھے..جیسے استاد امام دین گجراتی نے کیا ہی یادگار شعر کہا ہے کہ..

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ
قصۂ و ناول و افسانہ ہیں ہم لوگ..

اس شعر کے اوزان اگر خطا ہوتے ہیں تو ہو جانے دیجیے، صرف اس کی معنویت پر سر دُھنیے.. بیڈن روڈ پر واقعی زمانے کی یادگار ایسے لوگ رہتے تھے جو اب تو ایک قصہ پارینہ ہو چکے، ناولوں اور افسانوں کے کردار بن چکے.. بیڈن روڈ کے عین درمیان میں میرے مسلم ماڈل ہائی سکول کے زمانوں کا ہم جماعت عسکری میاں ایرانی رہا کرتا تھا.. اُس کے والد ایک مذہبی سکالر ہونے کے علاوہ کمال کے طبیب تھے.. عسکری بعد کے زمانوں میں ایک ایسا نابغہ روزگار مصور اور خطاط ہوا کہ اُسے رنگوں کا ایک جیولر، ایک سُنیار کہا گیا... اُس کے قدیم تعویذوں اور عجیب نقشوں کی مصوری نے ایک دنیا کو مسخر کر لیا.. وہ ایک طویل مدت نیشنل کالج آف آرٹس میں پڑھاتا رہا.. اُس کی تصویروں کے قدیم نقش اور خطاطی کے معجزے دیکھ کر یقین نہ آتا تھا کہ یہ کسی عہد حاضر کے مصور اور نقاشی کے کرشمے ہیں، وہ گئے زمانوں کے کسی بغداد کے شاہکار لگتے تھے..

اور وہ میرا دوست تھا..

مجھے وہ دوپہر یاد ہے جب اُس نے بیڈن روڈ والے مکان کی بیٹھک میں میرے سامنے اپنے متعدد کینوس سجا دیئے ''تارڑ، ان میں سے جو تمہیں پسند آئے..''

وہ سب کے سب میرے دل میں اترتے اپنے قدیم نقش اُس پر ثبت کرتے تھے، چناؤ مشکل تھا..

بالآخر میں نے اُن میں سے ایک قدیم رنگوں کے تعویذ کو پسند کر لیا جس کی خطاطی اپنی قدامت کے بجھے ہوئے بھُورے اور سیاہ رنگوں میں میرے دل میں اترتی جاتی تھی..

''یار یہ تو...'' اُس کے لہجے میں ایک جھجک آئی..

''تم نے خود ہی کہا تھا کہ جو تمہیں پسند آ جائے..''

''ٹھیک ہے یار.. مجھے پتہ نہ تھا کہ ایک کسان کو بھی رنگوں کا اتنا شعور ہے.. لے جاؤ..''

عسکری میاں ایرانی کے ایسے نیم سنہری نقش اور تعویذ لاکھوں میں بکتے تھے.. اور اس نے اپنی وہ تصویر مجھے تحفے میں عطا کر دی... گھر واپس آ کر جب میں نے اسے دیوار پر آویزاں کیا تو میری آنکھیں اُس پر لکھے گئے مقدس حروف کے سحر میں مبتلا ہو گئیں.. وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا اور شام ہونے لگی.. سعید اختر نے وہ تصویر دیکھی تو کہنے لگا.. عسکری بڑا ظالم مصّور اور خطاط ہے اور یاد رہے کہ سعید اختر مصوری اور خطاطی میں اپنا کوئی ثانی نہ رکھتا تھا..

عسکری اور سعید دونوں نیشنل کالج آف آرٹس میں پڑھاتے تھے، گہرے دوست تھے اور اُن کی

آپس میں چُہلیں اور چونچیں کمال کی تھیں.. سعید ایک بہت جذباتی شخص ہے، اگرچہ نیوڈ پینٹ کرنے میں بھی وہ کمال فن کے درجے پر پہنچا ہوا ہے لیکن مذہب سے ایسا لگاؤ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ذکر آ جائے تو اُس کی آنکھوں میں نمی آ جاتی ہے.. اگر بہر طور ٹھپہ لگانا مقصود ہو تو سنّی عقیدے کا ہے اور اُدھر اگر وہ عسکری ہے اور پھر ایرانی ہے تو ظاہر ہے وہ شیعہ مسلک کا تھا.. سعید بے شک عہد حاضر کا سب سے بڑا پورٹریٹ پینٹر ہے لیکن اُس کی وجہ شہرت اُس کے مصورکردہ گھوڑے ہیں، اگر آپ کا نصیب یاوری کرے تو کبھی اُس کا ایک وسیع کینوس پر تخلیق کیا گیا رنگین، سنہری اور نُوری رنگوں کے پروں والا ''براق'' دیکھیے تو آپ محسوس کریں گے کہ اس کا سوار آنے کو ہے، یہ منتظر ہے، آپ کو ایک موجودگی محسوس ہوگی.. تو عسکری، سعید سے کہتا ''یار تم کیسے سُنّی گھوڑے پینٹ کر کے اُنہیں بیچتے ہو.. گھوڑے تو ہم شیعوں کی ملکیت ہیں..''

سعید کہتا ''اب صرف کربلا کے ایک گھوڑے کی وجہ سے تم سب گھوڑوں کے مالک تو نہیں ہو سکتے.. تم تو ماتم کرتے گھوڑے کو خوفزدہ کر دیتے ہو اور میں اُنہیں پچکار کر پیار کرتا ہوں تو وہ میرے کینوس پر اتر آتے ہیں، تم ذرا میرے جیسا ایک گھوڑا پینٹ کر کے تو دکھاؤ..''

''ابے میں تمہاری طرح گھوڑوں کا سوداگر نہیں ہوں..'' عسکری کی دبیز مونچھوں میں سے مسکراہٹ پھڑ پھڑانے لگتی ''تم ذرا میرے جیسے نقش اور تعویذ مصور کرو تو جانوں..''

''عسکری.. میرا مُنہ نہ کھلواؤ..'' سعید اختر ہنسنے لگتا ''تمہارے ہاتھ تمہارے آباؤ اجداد کے چھوڑے ہوئے کچھ قلمی نسخے آ گئے ہیں جن میں تعویذ اور مقدس حروف کے کچھ کلمات درج ہیں، تم انہیں نقل کر کے فروخت کر دیتے ہو، تم بھی تو تعویذوں کے سوداگر ہو..''

''چل یار مجھے کینٹین سے سموسے کھلا، چائے پلا، آج ہی تمہارا ایک گھوڑا فروخت ہوا ہے..''

''چائے تُو پلا.. تم نے کل اپنے بزرگوں کا ایک تعویذ بیچ ڈالا تھا..''

دونوں بڑے تخلیق کار، عسکری در پردہ اُس کے گھوڑوں کا معترف اور سعید اُس کی خطاطی اور رنگوں کے برتاؤ کا پرستار..

اُس نے میرے قدیمی دوست سعادت کے گھر کے سامنے مختصر سے رقبے میں ایک ایسا گھر تعمیر کیا جس کے در و دیوار، سنگ و خشت، آرائش اور طاقچے اور ان میں جلتے چراغ.. گھوڑوں اور شاہوں کی شبیہیں، ظروف اور روا ہے، سب گواہی دیتے تھے کہ ہم عسکری میاں ایرانی کا گھر ہیں.. عسکری یکدم بے وجہ مر گیا..

مرنے کی وجوہات میں بڑھاپا، مختلف عارضے، حادثے اور اتفاقات وغیرہ شامل ہوتے ہیں لیکن عسکری بے وجہ مر گیا.. کوئی معمولی سی تکلیف ہوئی، کہیں درد اٹھا، ہسپتال گیا، تشخیص نہ ہو سکی، کوئی انجکشن لگ گیا، کسی نے پرواہ نہ کی اور وہ مر گیا.. اگرچہ وہ میرے گھر کی ایک دیوار پر اُس نقش اور تعویذ کی صورت زندہ ہے جو

اُس نے آج سے شاید چالیس برس پیشتر مجھے بخش دیا تھا..

بیڈن روڈ جہاں عسکری کے والد کا مطب تھا، اُس کے برابر والی گلی کے اندر ایک مختصر اور عسرت زدہ مکان میں ایک عجوبۂ روزگار شخص رہتا تھا، وہ ہر شام بن ٹھن کر اپنی سرخ فرنچ کٹ داڑھی سنوارتا، پان کھاتا اور پان کی سرخی بھی لبوں پر سرخ، ٹائی بھی سرخ، اور کوٹ کے کالر پر سجا گلاب کا پھول بھی سُرخ... گھر سے نکلتا اور بیڈن روڈ پر چہل قدمی کرتا مال روڈ پر آ نکلتا.. نہایت پُرتمکنت اور اپنے انقلابی نظریات پر مستحکم، ایک بے بدل شاعر اور دانشور.. مجھ سے محبت کرنے والا ظہیر کاشمیری.. جس نے میرے بچپن کی آٹو گراف میں لکھا..

ہمارا عشق ہمیں تمکنت سکھاتا ہے
کشیدہ سر بھی ہیں، پابند زلف یار بھی ہیں..

یہ محض ایک قصہ نہیں، حقیقت ہے کہ بابا ظہیر کاشمیری حسب عادت ایک شام بن سنور کر پان کھاتے مال روڈ پر آ نکلے اور ایک آسودگی اور امن کی حالت میں کچھ گنگناتے تھے جب ریگل چوک کی جانب سے جماعت کے جیالوں کا ایک جلوس ختم نبوت کے نعرے لگاتا سامنے آ گیا.. نوجوان ہر شخص کو روک کر پوچھتے کہ کیا تم رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا آخری نبی مانتے ہو یا نہیں.. تو کون نہیں مانتا.. ظہیر کاشمیری کو بھی روک کر پوچھا گیا کہ بابا تم رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا آخری نبی مانتے ہو یا نہیں.. وہ نہایت شانت ہو کر کہنے لگے، میں تو اللہ کو ہی نہیں مانتا، ایک سناٹا چھا گیا کہ اب اس بابا جی کا کیا کریں، زدوکوب کریں، کیا کریں.. تب کسی نے کہا ''اوئے یہ بابا پاگل ہے.. اسے جانے دو..''

اسی طور ایک اور شام بابا جی کی مڈھ بھیڑ مال روڈ پر نعرے لگاتے ''چلو چلو استنبول چلو'' والے جلوس سے ہو گئی.. کوئی جذباتی سا مذہبی مسئلہ تھا لوگ ترکوں کی مدد کو پہنچنا چاہتے تھے تو ظہیر کاشمیری نے جلوس کے سرخیل کو روک کر مشورہ دیا ''بیٹا.. ادھر بیڈن روڈ کے راستے استنبول چلو.. شارٹ کٹ ہے..''

ظہیر کاشمیری کو جہاں مارکس اور لینن وغیرہ کے اقوال از بر تھے وہاں تاریخ کے شعور کی گہری رمزوں کے بھی شناسا تھے.. جب بولنے پر آتے تو فصاحت اور بلاغت کے دریا بہا دیتے.. اپنے ترقی پسند دوستوں سے بھی سمجھوتہ نہ کیا، نہ کبھی جھکے اور نہ کبھی جھک کر رفعتیں پائیں.. اُسی ایک دو کمروں کے مکان میں تقریباً ناداری کی حالت میں مر گئے..

جہاں وہ ایک مساوات پر مبنی انصاف پسند معاشرے کے خواب دیکھتے تھے، وہاں وہ پاکستان کے وجود کے لیے بھی سر بہ کف ہو جاتے تھے.. میں بہت بار یہ قصہ بیان کر چکا ہوں لیکن کچھ حرج نہیں کہ ایک بار

اور یہی.. میں حلقۂ ارباب ذوق کا ایک بھاری اکثریت سے سیکرٹری منتخب ہو چکا تھا..ایک اجلاس کی صدارت ظہیر کاشمیری کر رہے تھے.. کسی افسانے یا نظم کے بعد بحث شروع ہوگئی.. بلکہ نعرے لگنے لگے..

''سبز ہے سبز ہے..ایشیا سبز ہے..''

''سرخ ہے سرخ ہے ایشیا سرخ ہے..''

جب غل غپاڑہ بہت بڑھ گیا تو ظہیر کاشمیری پھٹ پڑے..سب کو ڈانٹ کر کہنے لگے ''اوئے ناہنجارو.. بدبختو.. یہ پاکستان ایک گھوڑا ہے..یہ بھوکا کھڑا ہے اور تم اسے سرخ اور سبز کرنے کے نعرے لگا رہے ہو..بے وقوفو! اسے پہلے کچھ کھلاؤ پلاؤ.. پانی پلاؤ، چارہ کھلاؤ تا کہ یہ صحت مند اور توانا ہو جائے..پھر بے شک اس پر سرخ یا سبز کاٹھی ڈال لینا..اگر یہ گھوڑا مر گیا تو پھر کاٹھی کس پر ڈالو گے..''

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں، اُجالا ہے..

عسکری میاں ایرانی کے گھر سے آگے جو ایک گلی سی تھی وہاں سے ظہیر کاشمیری کا جنازہ اٹھا اور اُس گلی کے سامنے ایک اور گلی تھی جہاں سے مصور اور کارٹونسٹ قاضی اسلم کی اُس بیوہ کی تصویروں اور کارٹونوں سے سجی گدھا گاڑی نکلتی تھی..

یہ شاید نہیں یقیناً دنیا کی واحد گدھا گاڑی پر سجی آرٹ کی چلتی پھرتی نمائش تھی..

قاضی صاحب اپنے گدھے کو ہانکتے ہوئے مال روڈ پر لے آتے اور لوگ سیاہ روشنائی سے تخلیق کردہ ان کے خاکوں اور کارٹونوں کی داد دینے لگے..

قاضی صاحب، حکومت وقت کے خلاف کارٹون بناتے جنہیں کوئی بھی اخبار شائع نہ کرتا..یوں بھی قاضی اسلم، مجھے شک ہے کہ قدرے خبطی ہو چکے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے فن کی تشہیر کے لیے ایک گدھے کا سہارا لے لیا..

انہوں نے اپنے دستخط ثبت کر کے مجھے بھی ایک کارٹون مرحمت فرمایا تھا جو زمانوں کی دھول میں کہیں گم ہو گیا..

قاضی اسلم کارٹونسٹ کی گلی سے آگے..ایک بلند چھتوں والا، بہت اداس اور نیم تاریک، قرشی صاحب کا دواخانہ تھا...وہ ایک نستعلیق، پرانے زمانوں کے پروقار بزرگ تھے، ان کی حکمت کی بہت شہرت تھی..کہا جاتا ہے کہ وہ علامہ اقبال کی حیات کے آخری ایام میں اُن کے معالج بھی رہے..مجھے ان دنوں ایک شرمناک عارضہ لاحق ہو گیا..بواسیر کی خون آلود اذیت کا شکار ہو گیا تو میں نے حکیم قرشی صاحب سے رجوع کیا..اس لیے بھی کہ وہ اباجی کے جاننے والے تھے..مجھے یہ منطق آج تک سمجھ نہیں آئی کہ وہ بہت روشن خیال،

یورپ کی سائنسی ترقی اور خاص طور پر زراعتی تحقیق کے بے حد مداح تھے..ڈاکٹر حضرات پر ایمان رکھتے تھے اور حکیم حضرات کو دقیانوسی اور متروک قرار دیتے تھے اور اس کے باوجود ان کے قریبی دوستوں کے حلقے میں زیادہ تر حکیم حضرات تھے..حکیم نیر علی واسطی، حکیم فیض دین، چیمبرلین روڈ والے دہلوی حکیم، یہاں تک کہ قریشی صاحب بھی..شاید اس کا سبب یہ تھا کہ ان زمانوں کے حکیم حکمت کے علاوہ دیگر علوم پر بھی دسترس رکھتے تھے اور ادبی ذوق کے مالک تھے..بہرطور حکیم قریشی صاحب نے میری خون آلود بپتا سن کر مجھے کچھ دیسی جڑی بوٹیوں اور خشک ہو چکے نامعلوم سے پتوں وغیرہ کی پڑیاں نہیں "پڑے" باندھ دیئے کہ صبح شام فلاں شربت کے ساتھ..اور اسپغول کا چھلکا سونے سے پیشتر پھانک لیجئے..لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں میں اُن جڑی بوٹیوں کو گھول گھول کر، کبھی ابال کر پیتا گیا تا آنکہ مجھے باقاعدہ ایک سٹریچر پر ڈال کر گاف روڈ کے ایک مشہور ڈاکٹر صاحب کے پاس لے جایا گیا..جنہوں نے کہا کہ اگر آپ پہلے آ جاتے تو دوا دارو سے کام چلایا جا سکتا تھا، اب تو شاید آپریشن کرنا پڑے..تب مجھے ایک بیہودہ سا خیال آیا کہ قریشی صاحب نے علامہ اقبال کا بھی تو علاج کیا تھا اور وہ چل بسے تھے..

بعد ازاں ان کے تنومند فرزند آفتاب قریشی نے تحریک پاکستان کے حوالے سے اپنی خدمات کو خوب خوب قوم کے سامنے پیش کیا اور اس کا نتیجہ "قرشی" شربت اور جوشاندہ ایمپائر کی صورت میں آپ کے سامنے ہے..

قرشی دواخانے کی دیوار کے ساتھ گلی میں ایک عارضی کھوکھے کی صورت بیڈن روڈ کی کچی لڑکیوں کے بدن پکا دینے والے ناولوں والی ایک "آنہ لائبریری" تھی جہاں دت بھارتی اور وہی وہانوی (شوکت تھانوی؟) کے ہیجان خیز ناولوں، جن میں "تکڈم" سرفہرست تھا، کے علاوہ اردو ادب کی بھی بہت ورائٹی میسر تھی..ایک آنہ تو نہیں چار آنے کے یومیہ کرائے پر..اس سے ذرا آگے دوسری "آنہ لائبریری" بیڈن روڈ پر واقع تھی جس کے مالک مولوی صاحب خود بھی پڑھنے لکھنے کے شوقین تھے اگرچہ کچھ خفیف سی دستاویزات کے مطالعے میں غرق بار بار داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کرتے تھے..سبحان اللہ..بیڈن روڈ کی یہ دو "آنہ لائبریریاں" اگر نہ ہوتیں تو شاید آج میں ایک ادیب نہ ہوتا کہ میں ان دنوں ایک ایسے بیل کی مانند تھا جسے دن رات جگالی کرنے کے لیے چارہ چاہیے تھا اور اس کا پیٹ نہ بھرتا تھا..میں وہ دیمک تھا جو ہر شے کو چاٹ جانا چاہتا تھا اور ان لائبریریوں سے مجھے وافر تعداد میں چارہ ملتا تھا، چاٹنے کو کتابوں کے ورق ملتے تھے، اردو ادب جب تمام ہو گیا، ابن صفی، اے حمید، رئیس احمد جعفری، نسیم حجازی وغیرہ بھی پڑھ ڈالے تو اب کیا کروں..ایم اسلم کے سینکڑوں ناول اور منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمہ کردہ بے شمار جاسوسی ناول بھی چاٹ گیا..منشی صاحب کمال کا ترجمہ کرتے تھے مثلاً سر آرتھر کانن ڈائل کے شرلاک ہومز کا ترجمہ یوں کرتے..

"آہ واٹسن کیا خوبصورت سویر..ناشتہ حیران کن.."

"شرلاک..لنڈن میں ہوگیا ایک قتل..بہت ہولناک..نہیں؟"

"ہاں واٹسن..ذرا شرمناک..پی لیں گے چائے تو کریں گے تفتیش.."

ایک زمانہ آیا کہ مجھے دیکھ کر دور سے اشارہ کر دیا جاتا کہ..نہیں، کوئی نئی کتاب نہیں آئی..تب میں نے یورپی ادب کی جانب رجوع کیا کہ ایک بیل کہاں تک بھوکا رہ سکتا تھا، دیمک کب تک بیمار رہ سکتی تھی..

بیڈن روڈ کے آخر میں ایک چوک ہے..سیدھے چلے جائیں تو میکلوڈ روڈ، دائیں جانب جائیے تو کوُپر روڈ اور بائیں جانب شیشہ مارکیٹ سے گزر کر پھر سے میکلوڈ روڈ..اس چوک کے کونے میں مٹھائیوں کی ایک اور مشہور دکان تھی جس کی کچی چھت پر شوقین حضرات باڈی بلڈنگ کے لیے ڈنڈ بیٹھکیں لگاتے تھے اور ڈنڈوں کے سروں پر اینٹیں باندھ کر "ویٹ لفٹنگ" کرتے تھے..

"باڈی بلڈنگ" اُن زمانوں کا کریز تھا..ہر نوجوان کی خواہش تھی کہ وہ "باڈی" بنا کر پانے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکائے اور محلے کی لڑکیوں کو متوجہ کرے..بہت بعد میں میں نے بھی انگلستان کے ساحلی قصبے میں ایک باڈی بلڈنگ مقابلے میں شرکت کر کے "انعام" حاصل کیا، وہ انعام کیا تھا، یہ ایک اور داستان ہے، پھر کبھی سہی..اُن زمانوں میں باقاعدگی سے "باڈی بلڈنگ" کے مقابلے منعقد ہوتے اور "مسٹر پاکستان" کا انتخاب ہوتا..اور ان میں سب سے وجیہہ اور خوبصورت مسٹر پاکستان اقبال بٹ تھا..اور اب میں ایک ایسا قصہ بیان کروں گا جو آج کے تنگ نظر معاشرے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا..پنجاب یونیورسٹی کے غالباً سینٹ ہال میں باڈی بلڈنگ کا ایک مقابلہ منعقد ہوا اور لوگوں کا جوش دیکھنے کے قابل تھا، ہر باڈی بلڈر کی سٹیج پر آمد پر نعروں اور سیٹیوں سے اُس کا استقبال کیا جاتا..آخر میں اقبال بٹ مسٹر پاکستان سٹیج پر آئے اور ان کے پہلو میں اُس مقابلے کی مہمان خصوصی، اُن دنوں کی ایک گوری "مس یونیورس"، تھیں..اگر بٹ صاحب ایک لنگوٹ میں ملبوس تھے تو ظاہر ہے مس یونیورس برقعے میں تو سٹیج پر نمودار نہ ہوئیں، وہ ایک مختصر بکینی میں اپنی بدنی بناوٹ کی نمائش کرتی روشنیوں میں ظاہر ہوئیں اور لاہوریئے اُن پر مر مٹے..مذہبی جماعتوں کے ڈنڈہ بردار ابھی ان دنوں پیدائش کے مراحل میں تھے..

مٹھائیوں کی دکان کے کچے کوٹھے پر ابتدائی، خودساختہ بدن بنانے کے دیسی طریقوں کے باوجود رائل پارک کی دودھ دہی والی مشہور دکان کا مالک اور میرا دوست بھاری پہلوان مسٹر پاکستان ہوا..مشتاق احمد نے "مسٹر ایشیا" کا ٹائٹل جیتا..مشتاق عُرف دھا کو بھی وہاں زور کیا کرتا تھا..

مصر کے نوبل انعام یافتہ ادیب نجیب محفوظ سے کسی رپورٹر نے پوچھا تھا کہ آپ تو زندگی میں صرف ایک بار افریقہ کے کسی ملک گئے، قاہرہ سے ہی نہیں، اپنے محلے سے باہر بھی قدم نہیں رکھتے یہاں تک کہ نوبل

انعام وصول کرنے کے لیے بھی سٹاک ہوم نہیں گئے، کسی عزیز کو روانہ کر دیا تو ایسا کیوں ہے..تو انہوں نے کہا.. میرے اپنے محلے کی گلیوں اور قہوہ خانوں میں کہانیوں اور ناولوں کے اتنے کردار بکھرے پڑے ہیں کہ مجھے یہاں سے باہر جانے کی حاجت ہی نہیں ہوتی تو قاہرہ کی مانند لاہور بھی ایک ایسا ہی شہر ہے..صرف بیڈن روڈ کے کرداروں اور گلی محلوں کے بارے میں بھی ایک ناول آسانی سے لکھا جا سکتا ہے تو اپنا بیانیہ سمیٹنے کی سعی کرتا ہوں..

مٹھائیوں کی اس دکان کے پہلو میں سے میکلوڈ روڈ کی جانب دائیں ہاتھ پر بہترین کبابوں کی ایک دکان کے کوئلوں کے دھوئیں میں پوشیدہ ہوتی ایک گلی ہوا کرتی تھی جس کے آخر میں ایک مختصر سا مکان تھا، یہ مشتاق دھاکو کا آبائی گھر تھا..ہارمونیم، طبلے، ستار اور سارنگیاں اس کی زیبائش تھے..

یہ وہی مشتاق دھاکو تھا جو نہ صرف کمال کا کرکٹ کھلاڑی تھا بلکہ نہایت پرسوز اور منجھی ہوئی آواز کا مالک تھا..وہ ہمیں ملنے کے لیے لکشمی مینشن آتا اور جب چاندنی راتوں میں منٹو صاحب کے گھر کے قریب ایک تھڑے پر بیٹھ کر ''یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں، سُن جا دل کی داستاں'' کی تان بلند کرتا تو بالکونیوں میں بیٹھی ہوئی پارسی لڑکیاں پھولوں کے گجرے نچھاور کرتیں، بعدازاں وہ مشتاق ہاشمی ہو گیا..جب میں صبح کی نشریات کی میزبانی کے فرائض انجام دیتا تھا وہ اسلام آباد ایئرپورٹ کا منیجر ہوا کرتا تھا، میں نے متعدد بار کوشش کی کہ وہ میرے پروگرام میں شامل ہو کر پھر سے اپنے گیت گائے، لیکن اس کی آواز جواب دے چکی تھی..میرا الٹیا شہر بھنبھور..سبھی سے بے خبرے..

مشتاق دھاکو ہی بیڈن روڈ کا اکلوتا گویا نہ تھا، وہاں میرا دل پسند اُداس اور سُریلی آواز والا سلیم رضا بھی رہا کرتا تھا پر مُجھے خبر نہ تھی..کبھی کبھار ٹیلی ویژن کے بلیک اینڈ وہائٹ زمانوں میں ہمارا آمنا سامنا ہو جاتا لیکن کبھی خبر نہ ہوئی کہ وہ میرے ہمسائے میں رہتا ہے اور مجھے خبر اب جا کر ہوئی..ڈاکٹر انیس احمد نے مجھ پر کیسا کرم کیا کہ انہوں نے نہ صرف ''پیار کا پہلا پنجاب'' بلکہ ''لاہور آوارگی'' کے پروف نہایت دیدہ ریزی سے چیک کیے اور ایسی ایسی غلطیوں کی نشاندہی کی جو میرے نہ علم میں تھیں اور نہ گمان میں تھیں..بیڈن روڈ کا باب چیک کرتے ہوئے انہوں نے شکایت کی کہ آپ سلیم رضا کو کیسے بُھول گئے، وہ بھی تو ایک بیڈن روڈیا تھا.. اگرچہ یہ میرے لیے ایک خبر تھی، لیکن میرے پاس ایک جواز تھا..ڈاکٹر صاحب، میں لاہور کی کوئی مصدقہ تاریخ یا عمیق تحقیق مرتّب نہیں کر رہا، صرف جو کچھ میرے ذاتی مشاہدے میں آیا ہے، پون صدی کا قصہ ہے، بس اُس کی یادداشتیں لکھتا جاتا ہوں..نہ میں آگاہ تھا اور نہ ہی بیڈن روڈ پر میں نے کبھی سلیم رضا کو دیکھا تو کیسے اُس کا تذکرہ کرتا..

ڈاکٹر انیس احمد نے مجھے ماضی کی دُھند میں روپوش ہو چکا ایک ایسا قصہ سنایا جس نے میرے دل کو چھو لیا... ''سلیم رضا ابھی بچہ تھا، اپنی ماں کے ساتھ امرتسر میں اُس کٹڑی میں رہتا تھا جہاں ہمارا قیام تھا..ایک

عیسائی خاندان سے تعلق رکھتا تھا.. محلے والے اُس کی ماں کو''موٹی میم'' کہا کرتے تھے.. تقسیم کے موقع پر جب فسادات شروع ہو گئے.. مشرقی پنجاب اور خاص طور پر امرتسر میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا تو ہماری کٹڑی کے سب مسلمانوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان جانے کے لیے جو بھی تھا جتنا بھی تھا رخت سفر باندھ لیا.. اور کیا دیکھتے ہیں کہ سلیم رضا کی ماں، موٹی میم بھی اپنا سامان باندھے بیٹھی ہجرت پر آمادہ ہے تو ہم نے پوچھا کہ موٹی میم آپ تو عیسائی ہیں، آپ کی جان کو تو کچھ خطرہ نہیں تو آپ کیوں اپنا گھر بار ترک کر کے پاکستان جانا چاہتی ہیں تو موٹی میم کہنے لگی ''اس محلے کے سب لوگ میری برادری ہیں، میرے اپنے ہیں، آپ کے بغیر میں یہاں کیسے زندگی گزاروں گی، میں نے آپ کے ساتھ پاکستان جانا ہے..'' موٹی میم اور سلیم رضا خوش نصیب تھے کہ مر گئے.. اگر آج کے پاکستان میں ہوتے تو عیسائی ہونے کی پاداش میں اُن کی بستیاں نذر آتش ہو جاتیں، اُنہیں توہین کا مرتکب ٹھہرا کر کسی بھٹے کے آتش دان میں بھسم کر دیا جاتا.. اُن کے کلیسا ڈھا دیے جاتے.. آسیہ خاتونوں کی حمایت میں انصاف چاہنے والے قتل کر دیے جاتے اور اُن کے قاتلوں کی نماز جنازہ پڑھنے کے لیے لاکھوں لوگ اُمڈ پڑتے چنانچہ یہ اچھا ہوا کہ موٹی میم جلدی مر گئی اور سلیم رضا گمنامی کی حالت میں کینیڈا میں جا مرا.. یہ بڑے نصیب کی بات ہے، سلیم رضا اور زبیدہ خانم پاکستان فلم انڈسٹری کی وہ اولین مدھر آوازیں تھیں جنہوں نے فلموں میں اپنے سُر کی پھونک سے لوگوں پر جادو کر دیا.. یہاں تک کہ مہدی حسن اور نور جہاں نے ان آوازوں کو گہنا دیا.. اگر آپ کچھ کچھ میرے پہاڑوں کے درجنوں سفرناموں سے واقف ہیں تو جانتے ہوں گے کہ وہاں نہ صرف کے ٹو کے دامن میں بلکہ برفیلی بلندیوں اور گھنے جنگلوں اور جھیلوں کی تنہائی میں یہ سلیم رضا کی آواز ہمیشہ تھی جس نے میرا ساتھ دیا.. ؎ جانِ بہاراں، رشکِ چمن، غنچہ دہن، سیمیں بدن، اے جانِ من.. تنویر نقوی کا لکھا ہوا یہ گیت ایسا ہے کہ مرتے ہوئے بھی ایک شخص آرزو کرے کہ..... میری مرتی ہوئی سماعت میں کاش کہ یہ گیت سُنائی دے جائے۔

؎ جنت کی حُوریں تجھ پہ فدا۔ رفتار جیسے موجِ صبا
رنگین ادا، توبہ شکن
شمع فروزاں آنکھیں تری۔ ہر اک نظر میں جادوگری
زُلفیں تیری مُشکِ ختن..
اے ناز پرور، ناز آفریں، لاکھوں حسیں ہیں تجھ سا نہیں..
خندہ جبیں، شیریں سخن.. جانِ بہاراں..

چنانچہ یہ سلیم رضا بھی اگر چہ میں تب خبر نہ رکھتا تھا، بیڈن روڈ کا باسی تھا..

آ گئی رات شام ڈھلتے ہی
بُجھ گیا دل چراغ جلتے ہی
کُھل گئے شہرِ غم کے دروازے
اِک ذرا سی ہوا کے چلتے ہی

مشتاق کا پورا گھرانہ پُرسوز تھا..اس کا جوان مرگ بھائی گلزار بھی کرکٹ کا کھلاڑی تھا.شکور بیدل، شاعر اور نعت خواں، ریڈیو پاکستان میں پروڈیوسر تھا اور..کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے..اُس کا بڑا بھائی اپنی قسمت آزمانے کے لیے..یہاں بیڈن روڈ سے اٹھ کر بمبئی چلا گیا اور اپنا لاہور بھی ساتھ لے گیا، یہ موسیقار خیام تھا اور اب بھی ہے..جس نے نوشاد، او پی نیر، مدن موہن اور ایس ڈی برمن ایسے موسیقاروں کی موجودگی میں اپنی سحر طراز اور انوکھی دُھنوں سے پورے برصغیر کو مسخر کر لیا...''رضیہ سلطان'' کی وہ دھن ''اے دل ناداں، آرزو کیا ہے، جستجو کیا ہے'' کہا جاتا ہے کہ بہت سے موسیقاروں نے ساحر کے سحر طراز کلام..کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے کو موسیقی میں ترتیب دینے کی کاوشیں کیں پر ایسا ہو نہ سکا.''کبھی کبھی'' کے تمام گیت ہی دل میں اترتے ہیں پر ''کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے'' خیام کے معجزۂ فن کی مکمل تفسیر ہے..

محمد ظہور خیام..میرے دوست مشتاق ہاشمی کا بڑا بھائی..بیڈن روڈ کے پہلو میں سے نکلتی اُس گلی کے آخر میں رہتا تھا، ایک پرانے مکان میں، جہاں قالینوں کی بجائے موسیقی کے مختلف ساز سجے ہوتے تھے اور میں اکثر وہاں جاتا تھا اور مشتاق ہارمونیم کے سُر چھیڑ کر مجھے کوئی لوک گیت سناتا تھا، خیام کی اسی ہارمونیم کی کیز پر انگلیاں کبھی رقص کرتی تھیں..

محمد ظہور جالندھر میں پیدا ہوا اور سہگل جالندھری کی پرسوز آواز کی جانشینی اختیار کر کے اُس کے انداز میں گاتا اپنے خاندان سمیت لاہور آیا اور اسی گھر میں کچھ حیات بسر کی..گائیکی کے عشق میں دلّی چلا گیا، مہان کلاسیکی موسیقاروں پنڈت حسن لال بھگت رام کی شاگردی اختیار کی اور بالآخر اپنے لاہور کو لوٹ آیا اور یہاں بابا چشتی...جی اے چشتی اُس کا گورو ہو گیا..

مجھے یاد ہے کہ ایک روز مشتاق مجھے اپنے ہمراہ میکلوڈ روڈ پر واقع رتن سنیما کی بالائی منزل پر لے گیا جہاں گنجے سر والے ٹھیٹھ پنجابی لہجے کے مالک بابا چشتی اپنی آئندہ فلم کے لیے ایک گانا کمپوز کر رہے تھے.فلم شاید ''سسّی پنوں'' تھی اور اُس گانے کے بول مجھے ابھی تک یاد ہیں ''ہٹو بچو، ہٹو بچو سرکار..''

بابا چشتی نوجوان خیام کو ولی صاحب اور ممتاز شانتی کے پاس لے گئے اور انہوں نے اسے اپنی فلم ''ہیر رانجھا'' کی موسیقی ترتیب دینے کے لیے منتخب کرلیا۔ اُن کے بھائی ناظم پانی پتی فلم کے شاعر تھے..

شہروں میں شہر سنا ملتان..

فلم ''بیوی'' کے محمد رفیع کے گائے ہوئے خیام کی ترتیب دی ہوئی دھن میں گائے جانے والے ''اکیلے میں وہ گھبراتے تو ہوں گے.. ہماری یاد آجاتی تو ہوگی'' نے دھوم مچادی.. اور پھر زہرہ بائی انبالے والی کی آواز میں فیض صاحب کی غزل ''دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے، وہ جارہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے'' نے خیام کے نصیب میں ایک ایسی ناموری لکھ دی جس کی چکا چوند میں آج تک کمی نہیں ہوئی..

بیڈن روڈ کا یہ باسی خیام نوّے برس کی دہلیز پار کر چکا ہے..

اُس نے شادی کے لیے ایک پنجابن کو پسند کیا، اگرچہ وہ مسلمان نہیں، گوروں کی اولاد ایک سِکھ گلوکار جگجیت کور تھی، ان کے بیٹے کا نام پردیپ خیام قرار پایا..

اگر موسیقی میں کوئی شخص ولی ہوسکتا ہے تو نوشاد، سجاد، برمن، انل بسواس، خورشید انور، ماسٹر عنایت حسین، ماسٹر عبداللہ کے علاوہ خیام ہوسکتا ہے.. خیام نے اپنی دُھنوں کو کبھی غیرملکی سُروں سے آلودہ نہ کیا، چلنت نوعیت کی ''لارالپا'' ٹائپ کی موسیقی ترتیب نہ دی، شُدھ مشرقی اور ہندوستانی سنگیت میں اپنے گیت گائے.. میرے خیال میں اور یہ خیالِ خام نہیں خیالِ خیام ہے کہ جتنی کثرت سے اُس نے دل میں اتر جانے والی اور وہاں جاکر اُس دل کے ویرانے کو ہمیشہ کے لیے گیتوں سے آباد کردینے والی دُھنیں خیام نے تخلیق کیں، کسی اور موسیقار کے بخت میں یہ نہ ہوا..

تُم اپنا رنج و غم اپنی پریشانی مجھے دے دو
تمھیں غم کی قسم اس دل کی ویرانی مجھے دے دو..
میں دیکھوں تو سہی دنیا تمھیں کیسے ستاتی ہے
کوئی دن کے لیے اپنی نگہبانی مجھے دے دو

شاید خیام، جگجیت کور کے عشق میں تب فنا ہوا جب اُس نے ساحر کی یہ غزل یوں گائی کہ برصغیر کی ایک اجتماعی اداسی میں سرایت کرگئی..

خیام کی ہر کمپوزیشن کی سُریلی اثر انگیزی پر بہت سے کورے کاغذ سیاہ کیے جاسکتے ہیں..

میرا جیون تھا ایک کورا کاغذ جس پر لکھوایا نام تمہارا..

اور اس کے علاوہ ایک وسیع کہکشاں ہے ستاروں اور سیاروں کی جو کہ خیّام کے تخلیق کردہ نغمے ہیں تو ان میں سے کچھ کا تذکرہ اس لیے کرتا ہوں کہ آپ ایک حیرت سے دوچار ہوں کہ اچھا خبر نہ تھی کہ یہ گیت بھی خیّام بیڈن روڈ لاہور والے کے زرخیز ذہن میں سے پھُوٹا ہے.. اور آپ دوبارہ ان نغموں کو سننے اور محسوس کرنے کی خواہش کریں..

''شامِ غم کی قسم آج غمگیں ہیں ہم، آ بھی جا آ بھی جا''	فلم ''فٹ پاتھ''
''پربتوں کے پیڑوں پر شام کا بسیرا ہے''	''شگون''
''جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ سے''	''شعلہ و شبنم''
''پیار کا بندھن، جنم کا بندھن ٹوٹے نہ''	''شعلہ و شبنم''
''بہارو میرا جیون بھی سنوارو''	''آخری خط''
''ہے کلی کلی کے لب پر''	''لالہ رُخ''
''وہ صبح کبھی تو آئے گی''	''پھر صبح ہوگی''
''جیت ہی لیں گے بازی ہم تم''	''شعلہ و شبنم''
''اے دلِ نادان.. آرزو کیا ہے''	''رضیہ سلطان''
''جلتا ہے بدن، ہائے جلتا ہے بدن''	''رضیہ سلطان''
''اِن آنکھوں کی مستی کے.. دیوانے ہزاروں ہیں''	''امراؤ جان ادا''
''دل چیز کیا ہے آپ میری جان لیجئے''	''امراؤ جان ادا''
''دکھائی دیئے یوں کہ بے خود''	''بازار''
''یہ ملاقات اِک بہانہ ہے''	''خاندان''
''نہ جانے کیا ہوا جو تُو نے چُھو لیا''	''درد''
''ٹھہریئے ہوش میں آلوں تو چلے جایئے گا''	''محبت اسی کو کہتے ہیں''
''دُوری نہ رہے کوئی آج اتنے قریب آؤ''	''لوری''
''میں پل دو پل کا شاعر ہوں''	''کبھی کبھی''
''ہم تم اک کمرے میں بند ہوں اور..''	''کبھی کبھی''
''کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا''	''آہستہ آہستہ''

خیام سے تو کبھی ملاقات نہ ہوئی، نہ میں کبھی ممبئی گیا اور نہ انہیں کبھی اپنے لاہور کی یاد آئی البتہ اُن سے جڑے ہوئے کچھ لوگوں سے مختصر ملاقاتیں ہوئیں، ندا فاضلی کا ابھی پچھلے دنوں انتقال ہوا ہے ''کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا'' اُن کا حسنِ بیاں ہے.. میرے ناول ''راکھ'' کے حوالے سے جب جرمنی کی سرکاری ادبی تنظیم ''لٹریٹور کسٹاٹ'' نے برلن میں ایک تقریب منعقد کی تو وہاں ندا فاضلی بھی تھے..اور جب ایک حادثے کے نتیجے میں نکسیر پھوٹنے سے میرا بہت خون بہا تو یہ ندا تھے جنہوں نے اپنے آپ کو میری تیمارداری کے لیے وقف کر دیا..وہ ایک سادہ اور درویش صفت انسان تھے..ایک شب کہنے لگے ''میری شریک حیات ایک ہندو خاتون ہے، ہماری ایک ہی بیٹی ہے اور وہ کبھی کبھی مندر میں بھی جاتی ہے اور نماز بھی پڑھ لیتی ہے..''

خیام کی بیوی بھی سِکھ مذہب کی پیروکار ہے..

دلّی میں ادیبوں کی سارک کانفرنس کے دوران ''امراؤ جان ادا'' کے ہدایتکار مظفر علی کے ساتھ بھی ایک شام بسر ہوئی..

تقریباً پچیس برس پیشتر گوپی چند نارنگ کو میں نے اپنے گلبرگ والے گھر میں ناشتے کے لیے مدعو کیا...میں نے ان کے ہندو عقیدے کے احترام میں ان کے لیے حلوہ پوڑی اور چنوں وغیرہ کا بندوبست کیا جب کہ دیگر مہمانوں کے لیے نہاری اور سری پائے وغیرہ میز پر سجے تھے تو نارنگ اُدھر نہ گئے جدھر حلوہ پوڑی وغیرہ کا اہتمام تھا بلکہ انہوں نے گائے کے گوشت کی نہاری کو نہایت شوق سے تناول فرمایا اور ان کے ہمراہ ایک نہایت خاموش طبع اور دھیمے سے شخص تھے اور نارنگ صاحب نے تعارف کرواتے ہوئے کہا ''یہ شہریار ہیں، جنہوں نے ''امراؤ جان ادا'' کے گیت لکھے..''

ویسے شہریار کو ''امراؤ جان ادا'' کے حوالے سے بہت کوفت ہوتی تھی کہ وہ ہندوستان کے اہم ترین شعراء میں شمار ہوتے تھے اور ان کی پہچان صرف ایک فلم بن گئی تھی..صرف شہریار کے ساتھ نہیں ایسا المیہ تو بہت سارے بڑے شاعروں کے ساتھ ہوا کہ یہ جوش ملیح آبادی ہیں جنہوں نے ''میرے جوبنا کا دیکھو ابھار سجناں'' لکھا اور ''گلوں میں رنگ بھرے'' اِنہی فیض صاحب نے لکھا تھا..آپ نے امانت علی خان کی گائی ہوئی وہ غزل سنی ہوگی ''موسم بدلا رُت گدرائی..'' یہ وہ والے ظہیر کاشمیری ہیں..ادا جعفری ''ہونٹوں پہ کبھی اُن کے میرا نام تو آئے'' ابن انشاء ''انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو''..احمد راہی، سیف الدین سیف، مجاز، حسرت موہانی، سب کے سب اسی المیے سے دوچار ہوئے..

اب تو گنجائش کم ہوگئی ہے لیکن اگر کبھی اُدھر ممبئی کو جانا ہو ہی گیا تو میں جن لوگوں سے ملاقات کا خواہش مند تھا اُن میں سے بیشتر تو ناموجود ہو چکے اور جو موجود ہیں اُن میں گلزار اور خیام سے ملنے کی تمنا رکھتا ہوں..

ویسے گلزار تو اپنے جہلم اور دینے کو نہیں بھولے..
لیکن لگتا ہے کہ خیام اپنے لاہور کو بھول گئے ہیں..
تو یہ خیام بھی، مشتاق دھاکو کا بھائی، بیڈن روڈ کا ایک بیٹا تھا.. بیڈن روڈ، وہ کیسی خیاباں تھی جہاں.. کارٹونسٹ قاضی اسلم، عسکری میاں ایرانی، ظہیر کاشمیری، بھادی پہلوان، مشتاق احمد، مشتاق دھاکو اور اُسی خیاباں میں خیام رہتا تھا.. یہ سب لاہور کے بیٹے تھے..

ے کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے..



''لاہور کی محبوب عورتیں''

اگر ہمارے اقبال کہتے ہیں کہ.. ؎ وجودِ زن سے ہے کائنات میں رنگ..اور اُن کی حیات میں بھی وجودِ زن کی بہت کرشمہ سازیاں موجزن ہیں اور اِن میں عطیہ فیضی اور امیر بائی کی شعلہ سامانیاں سرِفہرست ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ لاہور کی کائنات بھی وجودزن سے رنگین نہ ہوتی..اور وہ ہوئی..اب بھی ہے.. میرے نیویارک کی دوست شاہد چغتائی نے اس شہر کی توصیف یوں کی تھی کہ تارڑ صاحب آپ سرشام ففتھ ایونیو کے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو جایئے اور اُس عورت کے نقش ونگار بدنی تناسب، آنکھوں کا رنگ، اُس کی چال، ہنسی کا انداز اور جنسی کشش کی جھلکیاں تصور میں لایئے جو آپ کے خوابوں کی عورت ہے، کبھی کسی گلی کوُچے میں نظر نہ آئی، کبھی نہ دیکھی، کسک کا ایک کانٹا جگر میں اٹکا رہا، پار نہ ہوا، خلش سی رہی..اور پھر ففتھ ایونیو پر وہ خوابناک عورت اُس کے فٹ پاتھ پر چلتی اگلے پانچ منٹ کے اندر نظر آ جائے گی..اور آپ دل تھام کر رہ جائیں گے..نیویارک درجنوں گوری، کالی، بُھوری، زرد اور گلابی رنگتوں والی نسلوں کی آمیزش کا شہر ہے اور یوں اُن کے باہمی اختلاط سے کہیں نہ کہیں آپ کے خوابوں کی عورت وجود میں آ جاتی ہے..

لاہور بھی مختلف نسلوں کی آمیزش کے حوالے سے نیویارک سے کچھ کم نہیں..اس کے قدیم گلی کوچوں میں نہ صرف مقامی لوگ بلکہ کشمیری، گوجر، پٹھان ککے زئی، جاٹ، راجپوت، افغان، سرخ ٹوپیوں والے قزلباش، درانی، غزنوی، بخاری اور تُرک وغیرہ آباد ہوئے بلکہ ان میں سکھ اور ہندو خون کے دھارے بھی شامل ہوتے گئے..چنانچہ ان کی آمیزش سے وہ لاہورن وجود میں آئی جو اس کے قدیم جھروکوں میں سے جھانکتی، چلمن کی اوٹ میں بیٹھی، رُخ روشن کو سیاہ نقاب سے روپوش کیے ہوئے، جس کی آنکھوں میں ایک سُرمہ سیاہی تھی، اُن میں راوی کے پانیوں کی نیلاہٹ زور کرتی تھی..اور وہ شہر لاہور کے قدیم کنوؤں سے پانی بھرتی تھی، ابھی وہ پانے کسیلے ہوتے تھے اور ابھی جب وہ اُن میں ڈول ڈالتی تھی تو وہ میٹھے ہو جاتے تھے..سب دھڑکتے دِلوں کے خوابوں میں آنے والی مکمل عورت کسی نہ کسی گلی میں سے چلی آتی تھی..انہی گلیوں میں شاہ حسین، سُرخ چوغہ پہنے، پاؤں میں گھنگھرو باندھے..ورق کوبوں کی گلی میں سے گزرتے سونے اور چاندی کے ورق کوٹنے والوں کی ہتھوڑیوں کی دھم دھمک سے بے خود ہو کر ناچنے لگتے تھے..جیسے سینکڑوں برس پیشتر مولانا

رُوم، صلاح الدین ورق کوب کی دکان کے سامنے رُک گئے.. اور پھر ورق کوبی کی ردھم سے بے اختیار ہو کر رقص کرنے لگے اور صلاح الدین ورق کوب کو اپنی حیات میں شریک کر لیا..

کہا جاتا ہے کہ شاید مجھ جیسا کوئی ناہنجار دنیا کا کتا تھا اور اُس نے دیکھا کہ اس مجذوب شاہ حسین کے تو بہت مزے ہیں تو کیوں نہ اس کی مریدی اختیار کر کے لہو ولعب کے سلسلوں میں شمولیت اختیار کر لی جائے تو اُس نے شاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا ''جو کچھ آپ کرتے ہیں، میں آپ کی پیروی کرنا چاہتا ہوں..'' شاہ حسین نے کہا، چلے آ ؤ.. شاہ حسین جب بھی شاہدرہ میں اپنی بیٹھک سے نکلتے تو گلی کوچوں میں چلتے دریائے راوی کے کنارے پہنچتے.. راستے میں کسی گلی کی نیم تاریکی میں سے ایک دمکتی سرخ سیب رنگت، زعفران کی مہک والی، قندھار کے دو سیبوں کو سہارتی ایک کشمیرن ظاہر ہوئی.. شاہ حسین نے اُسے گلے لگا کر چوم لیا.. اس نووارد مرید نے بھی اپنے مرشد کی پیروی کی اور اُس سے لپٹ کر اُس کے بوسے لیے.. ذرا آگے گئے تو وہاں ایک تندور گرم تھا، شاہ حسین نے تندور میں ہاتھ ڈال کر ایک سلگتا ہوا کوئلہ اپنی زبان پر رکھ لیا اور کہا ''اب یہاں بھی میری پیروی کرو..''

چنانچہ لاہور کی لڑکیاں ایسی ہوا کرتی تھیں..

خشونت سنگھ سے کسی نے پوچھا کہ سردار جی آپ لاہور کے حسن کی بہت توصیف کرتے ہیں، اگرچہ آپ ایک ڈرٹی اولڈ مین ہیں لیکن ادھر دلّی اور بنگال وغیرہ میں بھی تو حسن کی زیبائش کی کچھ کمی نہیں تو بابا ڈرٹی نے کہا ''لاہور کے کنیئرڈ کالج میں مجھے مدعو کیا گیا اور یہ اُس شہر کا سب سے پروقار اور ذی شان کالج ہے.. جب میں تقریر کر رہا تھا تو میں نے وہاں جمع سینکڑوں لاہوری لڑکیوں کو پرکھا کہ ان میں کون ہے جس کی شکل اچھی نہیں ہے.. کوئی ایک بھی نہ تھی.. ابھی پچھلے ہفتے مجھے دلّی کے ایک گرلز کالج میں مدعو کیا گیا تو تقریر کے دوران میں نے پرکھا کہ ان لڑکیوں میں سے کون ہے جو خوش شکل ہے.... کوئی ایک بھی نہ تھی..''

پروین عاطف اپنے دونوں بیٹوں کے ہمراہ دلّی گئی.. اُس کا کہنا ہے کہ اُس کے بیٹے خوب بن سنور کر فوری طور پر کناٹ پیلس کی شب میں چلے گئے.. مُنہ بسورتے ہوئے واپس آئے... اماں اُدھر کسی شام یوں بن سنور کے لبرٹی مارکیٹ میں جاتے تھے تو جو شکلیں نظر آتی تھیں اُن کے دیکھنے سے سیروں خون بڑھ جاتا تھا.. یہاں دلّی میں جو کچھ دیکھا ہے.. مجال ہے کسی چہرے میں کچھ کشش ہو.. بجھے ہوئے، پژمردہ سے چہرے.. خون خشک ہو گیا.. واپس کب جانا ہے..

اس طویل تمہید کو صرف اس لیے باندھا گیا ہے تا کہ میں ان عورتوں کا سرسری تذکرہ کر سکوں جو لاہور کی محبوب ہوئیں.. ان میں فلمی اداکارائیں، گانے والی، ناچنے والی، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اپنے چہرے اور آواز کے جادو جگانے والی، شاعرات، سیاسی لیڈر، ادیب، ڈاکٹر اور معلم وغیرہ شامل ہیں..

آغاز کہاں سے کریں..

تقسیم سے پہلے کے زمانوں سے..جو میرے دیکھے ہوئے تو نہیں ہیں لیکن اُن میں دو ''امرتاؤں'' کے قصے کہانیاں ابھی تک لاہور کی ہواؤں میں گردش کرتے ہیں..امرتا شیر گِل..اور امرتا پریتم..

امرتا شیر گِل، علامہ اقبال کے جگری دوست سردار شیر گِل کی بیٹی جس کی ماں ہنگری کی تھی، وہ حسن اور بدنی تناسب میں لاہور کی وینس تھی، اُس کا محبوب جذبہ مصوری تھی اور مرغوب خوراک، مرد..ایک نمفو مینی اِک..مردوں کو کھا جانے والی اور لاہور کا ہر مرد تمنا کرتا تھا کہ وہ کھا لیا جائے..مال روڈ پر گنگا رام کے نام کا مینشن ہے اُس کے عقب میں قدیم کولونیل فلیٹوں کا ایک سلسلہ ہے، وہ فلیٹ اب بھی موجود ہے جہاں امرتا اپنے گورے ڈاکٹر شوہر کے ساتھ رہا کرتی تھی، اسقاطِ حمل کے دوران نوعمری میں مر گئی اور دریائے راوی کے کنارے اُسے آگ کے سپرد کر دیا گیا، امرتا کی ایک پینٹنگ جو اسلام آباد میں نیشنل کونسل آف آرٹس میں ڈی جی کے دفتر میں آویزاں تھی، پراسرار حالات میں چوری ہوگئی اور دو ماہ بعد دلّی میں دو کروڑ روپے میں فروخت ہوگئی، امرتا شیر گل اگرچہ میری پیدائش سے پہلے جل چکی تھی لیکن اُس کی شخصیت، دل آویزی اور جنسی بے دریغی، گوگین طرز کی مصوری اور جوانی کی موت آج بھی مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے..امرتا شیر گل ایک ایسا خوابناک کردار ہے جس کا تصور کسی بھی ناول نگار کے گمان سے پرے ہے..

دوسری امرتا جو پریتم تھی، گوجرانوالہ میں پیدا ہوئی لیکن پھر ایک لاہورن ہوگئی..آل انڈیا ریڈیو لاہور کے پروگراموں میں ستار بجاتی تھی، انارکلی کے پہلو میں جو موہنی روڈ ہے وہاں بسیرا کرتی تھی اور ایک ایسا سوہنا، خوش شکل، متانت بھرا شخص جس کے پنجابی لہجے میں فرانسیسی ایسی مٹھاس تھی، کمال کا ڈرامہ نگار تھا..جس نے میرے اکلوتے پنجابی ناول ''پکھیرو'' کی تعارفی تقریب میں ایک مجھے خوش کر دینے والا مضمون پڑھا، امرتا پر مر مٹا تھا..کہا جاتا ہے کہ وہ دھیمے مزاج کا تخلیق کار امرتا کے مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھا رہتا تھا..جب بھی امرتا کو ملنے کے لیے کوئی لاہوری جاتا تو وہ اُس شخص کا حال احوال دریافت کرتی، قیام پاکستان کے پہلے برسوں میں یہ اینجلا تھی، ریگل چوک کے سٹینڈرڈ ریستوران کی چھت پر رقص کرتی جسے ہر وہ شخص دل دے بیٹھا تھا جو اُس کا رقص دیکھ لیتا تھا..اور ان میں میرا ایک ہم جماعت پٹھان بھی شامل تھا جس نے اپنی جوانی اور دولت اُس پر لُٹا دی..میرے لکشمی مینشن والے فلیٹ کی چھت سے ریگل چوک کے پار سٹینڈرڈ کا اوپن ایئر ریستوران نظر آتا تھا اور اکثر شبوں میں، میں چوری چھپے چھت پر چلا جاتا اور ناچتی ہوئی اینجلا کو دیکھتا..اتنی دوری سے کیا خاک نظر آتا تھا..وہاں روشنیاں جگ مگ کرتی تھیں، میزوں کے گرد بیٹھے بے پرواہ لوگ ہوتے تھے اور اُن کے درمیان ایک سفید رنگت کا نسوانی وجود تھرکتا تھا، اور اُس کی تھرتھراہٹ میرے ٹین ایج بدن میں ایک ہیجان بھرتی تھی..

اُنہی زمانوں میں ہیرامنڈی کی ایک گانے والی جو خورشید پاؤنڈوں والی کے نام سے اہل لاہور کے دلوں میں چھنکتی تھی، بہت مشہور ہوئی.. یہ میری بلوغت سے پہلے کی نامور بدنامیاں ہیں اور میں اپنے ایک ہمسائے منوّر ٹھیکیدار کے توسط سے اس عفیفہ سے متعارف ہوا. منوّر صاحب گلبرگ والے گھر کے سامنے جو ایک مختصر پارک تھا وہاں آ بیٹھتے، بلکہ ان کا موسیقار بیٹا عامر انہیں سہارا دے کر لا بٹھاتا تا کہ طویل عمر نے انہیں لاچار کر دیا تھا.. آنکھیں بجھ رہی تھیں لیکن دل میں گئے زمانوں کے چراغ روشن ہوتے تھے ''تارڑ بھائی.. کیسے زمانے گزر گئے.. اُن دنوں کون تھا جو ہیرامنڈی گانا سننے کے لیے نہیں جاتا تھا، یہاں تک کہ ہمارے محلے کی مسجد کے مولوی صاحب بھی شاید عبرت حاصل کرنے کے لیے جاتے تھے.. تو اُن دنوں وہاں خورشید پاؤنڈاں والی کا راج تھا.. گوری چٹی اور سوہنی اتنی کہ انسان سیر ہو جائے، رجھ جائے تب بھی اُس کا سوہناپن ختم نہ ہو اور اُس کی آواز ایسی تھی کہ لوگ اُس پر روپے نہیں بلکہ سونے کے پاؤنڈ نچھاور کرتے تھے چنانچہ وہ خورشید پاؤنڈاں والی کے نام سے مشہور ہوئی..''

میں پوچھتا ''خورشید کی آواز میں آخر کیا تھا؟''

وہ کچھ دیر کے لیے بڑھاپے کی اونگھ میں چلے جاتے جیسے خورشید کی آواز کو گمشدہ فضاؤں میں سے کشید کر رہے ہوں اور پھر کہتے ''تارڑ صاحب.. یوں جانئے کہ خورشید جب تان لگاتی تو وہ پورے لاہور کے گلی محلوں میں چھنکتی جاتی.. اگر وہ آج ہوتی اور ہیک لگاتی تو اُس کی آواز کی جھانجھر یہاں گلبرگ تک پہنچ کر مجھے پھر سے جوان کر دیتی..''

میں منوّر صاحب کے جنازے میں شریک ہوا تب بھی اس خدشے کے گمان میں رہا کہ اگر خورشید پاؤنڈاں والی جی اٹھے اور ایک تان لگا دے تو ہمارے ٹھیکیدار صاحب بھی جنازے کی چارپائی پر جی اُٹھیں..

لکھنؤ کے اہل دل کو تو پنجابیوں نے قصہ ہیر رانجھا سُنا کر لُوٹ لیا تھا لیکن پنجابیوں کو اُنہی زمانوں میں زہرہ نگاہ نے لُوٹ لیا.. وہ مجھ سے سینئر ہیں اور اُن کا احترام مجھ پر واجب ہے تو میں اُن کے حسن کی کیا توصیف کروں.. کراچی یا اسلام آباد کے آکسفورڈ لٹریری فیسٹیولز میں صبح سویرے ناشتے کی میز پر ان کے ہمراہ انتظارحسین ہوتے یا پھر میں ہوتا.. جیسے اقبال نے کہا تھا کہ.. آج بھی ہے اُس دیس میں چشمِ غزال عام.. تو آج بھی آپا زہرہ نگاہ کی چشمِ غزال کی دل کشی میں کچھ کمی نہیں آئی..

پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں جہاں برصغیر کے مہان شاعر، جگر مرادآبادی وغیرہ شرکت کر رہے تھے وہاں ایک مترنم تقریباً ٹین ایجر دل کش آنکھوں والی نے اپنا کلام سنایا تو اہل لاہور کو لُوٹ لیا.. لاہوریوں نے اُن کے بعد کسی بھی شاعر کو سننے سے انکار کر دیا کہ وہ تو لُٹ چکے تھے، عابد علی عابد نے طیش میں

آ کر مشاعرہ موقوف کرنے کا اعلان کر دیا...

چھلک رہی ہے مئے ناب تشنگی کے لئے
سنور رہی ہے تری بزم برہمی کے لئے

نہیں نہیں ہمیں اب تیری جستجو بھی نہیں
تجھے بھی بھول گئے ہم تری خوشی کے لئے

جو تیرگی میں ہویدا ہو قلب انساں سے
ضیا نواز وہ شعلہ ہے تیرگی کے لئے

کہاں کے عشق و محبت، کدھر کے ہجر و وصال
ابھی تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لئے

جہانِ نو کا تصور، حیاتِ نو کا خیال
بڑے فریب دیئے تم نے بندگی کے لئے

مئے حیات میں شامل ہے تلخیِ دوراں
جبھی تو پی کے ترستے ہیں بیخودی کے لئے

آج کے عہد میں کوئی بھی تصور نہیں کر سکتا کہ اُن زمانوں میں سینما گھروں کی جادوگری ایک کوہ قاف تھی جہاں آپ کے گیلے خوابوں کی پریاں رقص کرتی تھیں، وہ کسی دلیپ کمار، راج کپور یا دیو آنند سے نہیں آپ سے عشق کا اظہار کرتی تھیں.. اگر مدھوبالا ''بے ایمان تیرے نینوا، نندیا نہ آئے'' گاتی تھی تو آپ کے نینوں سے اپنی نیند اجاڑتی تھی.. کامنی کوشل اگر ''ندیا کے پار'' جاتی تھی تو آپ سے ملنے کے لیے اس لیے بھی جاتی تھی کہ وہ بھی ایک لاہورن تھی، کنیئرڈ کالج میں پڑھا کرتی تھی.. ثریا شیخ گوجرانوالا کی جب ''دل لگی'' میں رقص کرتی گاتی تھی ''تُو میرا چاند میں تیری چاندنی'' تو آپ ہی اُس کے چاند ہوتے تھے.. شیاما کا بھی رشتہ لاہور سے تھا.. اور وہ کیسی باکمال نخروں والی اداکارہ تھی..

کامنی کوشل، ثریا اور شیاما یہ تینوں لاہور کی محبوب تھیں لیکن مدھوبالا نے ان سب کو مات دے دی.. وہ ایک مدت تک لاہوریوں کے حواس پر چھاتی رہی.. کمال امروہوی کی ''محل'' کیپٹل سینما میں نمائش ہوئی اور اترنے کا نام نہ لیا.. کیا جانے دل کی کشتی، کب تک لگے کنارے.. لیکن یہ کہہ رہے ہیں دل کے مرے اشارے.. آئے گا آئے گا آنے والا..

لاہوریوں نے اپنے آپ کو صرف برصغیر کی حسیناؤں تک محدود نہ رکھا.. وہ ''کم سٹیچر'' کی ضرورت سے زیادہ پلی ہوئی اطالوی جینا لولو برجیڈا پر بھی مر مٹے..

فلم ''پکنک'' کی کم نووک کے جنسی حسن کی گرفت میں بھی جکڑے گئے.. صوفیا لارین تو انہیں ایک بے دریغ بدن کی، بے پناہ ابھار والی ایک کشمیرن لگی..

اور پھر وہاں ایوا گارڈنر تھی..

''سنوز آف کلی منجاروز'' کی ہیروئن، گریگوری پیک کی جانب اپنا لپ سٹک سے لتھڑے ہوئے ہونٹوں میں دبا سگرٹ بڑھاتی ہوئی ''کیا تمہارے پاس کچھ آگ ہے؟''

ایوا گارڈنر..ایک ''بیئر فٹ کانٹیسا'' لاہور کی مال روڈ کے فٹ پاتھ پر چلی آئی..''بھوانی جنکشن'' کی شوٹنگ کے لیے وہ چلی آئی اور اُس کے آٹوگراف بُک اُس کی رانوں پر رکھی تو اُس کے اوراق میں سے ایک مدت اُس کے بدن کی خوشبو آئی..اُن زمانوں میں لاہور کی آبادی بھی کم تھی اور یوں بھی مال روڈ کسی حد تک ایک علاقہ غیر تھا، لاہوریئے اِدھر آنے سے جھجکتے تھے چنانچہ ایوا گارڈنر ہالی وڈ کی فلموں میں ننگے پاؤں راج کرنے والی اور بے شک تب میں ایک سکول بوائے تھا لیکن اتنا بوائے بھی نہ تھا کہ اُس کی خوبصورت لامبی ٹانگوں کی جاذبیت مجھ پر اثر نہ کرتی..وہ اکثر مال روڈ پر اپنے کوسٹارز بل ٹریواز اور سٹیورٹ گرینجر کے ساتھ بے دریغ اور بے خطر گھومتی رہتی..شاپنگ کرتی، خاص طور پر دیسی کُھسے خریدتی اور گول گپے کھاتی..تو وہ کیوں نہ لاہور کی ایک محبوب عورت ہوتی..

ہالی وڈ کی ایک اور مشہور عالم اداکارہ، اگرچہ وہ کبھی لاہور نہ آئی لیکن اپنی غیر موجودگی میں لاہوریوں کی بھابھی ہوگئی اور وہ ریٹا ہیورتھ تھی جو نہ صرف ایک مؤثر اور کشش سے نچڑتے چہرے کی مالک تھی بلکہ بے دریغ رقص میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا، فلم ''سلومی'' جو بائبل کی ایک کہانی پر بنائی گئی وہ رقاصہ سلومی تھی جس نے ایک ''پیغمبر'' کا سر کاٹ لیا..مشہور گانے SWAY WITH ME کی دُھن پر اُس کا ٹینگو ناچ ایک کلاسیک کی حیثیت اختیار کر گیا..وہ لاہوریوں کی بھابھی اور محبوب اس لیے ہوگئی کہ کھلنڈرے پرنس علی خان نے اُس کے ساتھ شادی کر لی، ایک مسلمان بھائی کی غالباً منکوحہ ہوگئی، اُس کے بطن سے شہزادی یاسمین نے جنم لیا..لاہور کے تب سب سے بڑے بین الاقوامی میلے ''ہارس اینڈ کیٹل شو'' میں شرکت کرنے کے لیے پرنس علی خان لاہور آئے، لیڈی وقار النساء نون کے ہمراہ ایئرپورٹ سے نکلے، گورے چٹے سچ مچ کے شہزادے، سر پر ایک داغستانی قراقلی ٹوپی پہنے، اور وہاں ایک بے وقوف سا اگرچہ نہایت پُراعتماد سکول بوائے آگے بڑھ کر انہیں سلام کرتا ہے اور پھر ریٹا ہیورتھ کی ایک نیم برہنہ رنگین تصویر فلم ''سلومی'' کی انہیں پیش کر کے کہتا ہے ''آٹوگراف پلیز..'' پرنس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے..میرا خیال ہے کہ انہوں نے اس بدتمیزی پر مجھے زدوکوب کرنے کے بارے میں سوچا ہوگا اور پھر درگزر کر دیا..بھلا پرنس علی خان، آغا خان کے بیٹے، مستقبل کے آغا خان پرنس کریم کے ابا جی لاہور ایئرپورٹ پر مجھ پھینٹی لگاتے اچھے لگتے..اگرچہ ایسا کر گزرتے تو بعد ازاں میرے لیے کیا ہی پُرفخر وقوعہ ہوتا کہ یہ میں ہوں جسے ایک آغا خان کے بیٹے اور ایک آغا خان کے والد صاحب نے ذاتی طور پر پھینٹی لگائی تھی..بہرطور انہوں نے اپنے غصے کو قابو کر لیا اور ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ میری آٹوگراف بُک پر دستخط کر دیئے اور یہ اب بھی مجھے اس ملاقات کی یاد دلاتے ہیں..

بے شک فلم کی دنیا جوان ہو رہی تھی لیکن یہ ریڈیو تھا جو راج کرتا تھا..اور یہ ہر گھر میں تو نہ ہوتا تھا..

جس گھر میں بھی ہوتا تھا، کارنس پر گھر کی سب سے خوبصورت آرائش، ہمیشہ کروشیے کے غلاف میں روپوش، اسے ٹیون کرنا بھی سانس روکنے کی ایک مشق تھی.. آپ اس کا لٹو سانس روک کر گھماتے، روشن ڈائل پر سُوئی تھرکتی، مسلسل کھڑکھڑاہٹ اور بلیوں کی چاؤں چاؤں کی آوازیں آتیں اور پھر یکدم کوئی ریڈیو سٹیشن قابو آ جاتا کہ یہ ریڈیو سیلون ہے.. یہ ریڈیو پاکستان، لاہور ہے.. آواز گرفت میں آ جاتی اور سب لوگ ہمہ تن گوش ہو کر گردنیں لامبی کر کے ڈائل کے قریب ہو کر ایک عجب جادوئی آواز کی دنیا میں چلے جاتے.. اور اس ریڈیو میں سے جہاں کبھی کبھار فلمی گانے صرف آدھ گھنٹے کے لیے نشر ہوتے، ڈرامے پیش کیے جاتے، رفیع پیرزادہ کا ڈرامہ ''اکھیاں'' نشر ہوتا وہاں اُس کے مختلف پروگراموں میں سے ایک من موہنی آواز والی کوئل کوکتی، ڈراموں میں جب وہ ہنستی تو پان سگرٹ کی دکانوں پر کھڑے لاہوریوں کے دل رُک جاتے وہ ایسی دل کو موہ لینے والی آواز تھی اور یہ موہنی حمید تھی... ہفتے میں دو مرتبہ نشر کیے جانے والے بچوں کے پروگرام میں وہ بھائی جان کے ساتھ آپا شمیم تھیں... ابا جی نے بمشکل اجازت دی اور میں اپنے چھوٹے بھائی زبیر کے ساتھ پرانے ریڈیو سٹیشن میں بچوں کے ایک پروگرام میں شرکت کرنے کے لیے چلا گیا، وہاں ایک ساؤنڈ پروف کمرے میں ایک مائک کے گرد کچھ بچے بیٹھے تھے، ایک بھائی جان سے شخص تھے قدرے چڑچڑے اور ایک ضرورت سے زیادہ گندمی رنگت اور بہت معمولی شکل والی ایک بیزار خاتون بیٹھی تھی.. آپا شمیم کہاں ہیں؟ میں نے ایک بچے سے پوچھا.. پتہ نہیں.. آ جائیں گی.. پروگرام شروع ہوا تو وہی خاتون چہکنے لگیں، وہ ایک کوئل کا روپ اختیار کر گئیں، یہ موہنی حمید تھیں.. البتہ ریڈیو سٹیشن پر ایک سانحہ سا ہو گیا.. زبیر میری انگلی تھامے ریڈیو سٹیشن کے برآمدے میں چلا آتا تھا جب سامنے سے ان زمانوں کی ایک نامور مغنیہ آ رہی تھی... وہ رک گئی.. میری گندمی رنگت اور معمولی شباہت کے برعکس چھوٹا زبیر ایک گورا چٹا کیوپڈ بچہ تھا، جیسے کلیساؤں میں ننھے منے فرشتوں کے مجسّمے ہوتے ہیں.. وہ مغنیہ رک گئی..

''یہ کون ہے؟'' اُس نے زبیر کے گال چھوتے ہوئے کہا..

میں نروس ہو گیا ''میرا چھوٹا بھائی ہے جی.''

''لگتا تو نہیں ہے... آؤ میں تمہیں بسکٹ کھلاؤں..''

وہ بی بی ہم دونوں کو اپنے کمرے میں لے گئی.. بسکٹ کھلائے اور اس کے ساتھ زبیر کو دبوچ کر ''ہائے میری جان'' اُسے خوب خوب چُوما.. ہم گھر واپس آئے تو امی جان نے مجھے نہیں زبیر کو دیکھ کر غصے سے کہا ''کہاں گئے تھے؟'' میں نے بتایا کہ پوچھ کر گئے تھے، ریڈیو سٹیشن گئے تھے بچوں کے پروگرام میں شریک ہونے کے لیے..'' ''پھر کہاں گئے تھے؟''

''کہیں نہیں.. پروگرام ختم ہوا تو سیدھے گھر آ رہے ہیں امی..''

امی حضور نے مجھے ایک خفیف سا تھپڑ رسید کیا ''جھوٹ بولتے ہو.. بہو کے گالوں پر یہ سُرخی کیسی ہے؟''

نہ میں اُن زمانوں میں لپ سٹک کے وجود سے آگاہ تھا اور نہ ہی اُس کی سرخی میں میرے لیے کوئی بھید تھا.. اُس مغنیہ کمبخت نے جب چھوٹے زبیر کو دبوچ کر خوب خوب چوما تو اُس کی لپ سٹک کی سرخی زبیر کے رخساروں پر ثبت ہو گئی اور بھید کھل گیا.. زبیر جب کینسر کے ہاتھوں مر رہا تھا تو مجھے اکثر اُس کے پژمردہ اور سکڑ چکے رخساروں پر لپ سٹک کی سرخی دکھائی دیتی، کبھی وہ بھی خوبصورت تھا..

ریڈیو کی ایک اور یادگار، نستعلیق اور گہری رنجیدگی والی آواز الطاف فاطمہ کی تھی.. اہل لاہور اس آواز پر جان چھڑکا کرتے تھے.. عہد حاضر میں مشتاق احمد یوسفی کے سوا وہ سب سے بڑی فکشن رائٹر ہیں اور نسبتاً گمنام ہیں، ناموری کی کبھی کچھ چاہت نہ کی اور ان دنوں جب اُن سے فون پر بات ہوتی ہے.. تو ایک بہکتی ہوئی بات ہوتی ہے، اُن کی آواز میں اب بھی وہی رچاؤ ہے اگرچہ ایک بہکتا ہوا رچاؤ ہے.. وہ کبھی لاہور کی ایک محبوب ناول نگار اور ریڈیو کی آواز ہوا کرتی تھیں..

لاہور کی طُوری بہنوں کی حیات کے قصے بیان کرنے، اُن کی تفصیل میں جانے کے لیے گنجائش نہیں، وہ میرے ایک قریبی دوست میاں طیب حسن کی سگی خالائیں تھیں جنہوں نے عمر بھر شادی نہ کی اس کے باوجود کہ وہ کشمیری نژاد ہونے کے ناتے سے خوبرو اور بہت خوش شکل تھیں، اپنے آپ کو خدمت خلق کے لیے وقف کر دیا.. میرے تینوں بچے مزنگ میں طُوری کلینک میں پیدا ہوئے.. اور جب سلجوق کی پیدائش پر اُسے گھر لے جاتے ہوئے میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ خالہ.. تو انہوں نے ڈانٹ کر کہا.. شرم کرو اپنی خالہ سے ہسپتال کے بل کا تقاضا کرتے ہو.. مار کھانی ہے..

اُن کی دوسری بہن نے مزنگ چوک میں ''ادبستان صُوفیہ'' قائم کیا جو لاہور کے اولین پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں سے تھا.. میں نے سلجوق کو اسی ادبستان میں داخل کیا..

ان بہنوں نے طُوری سسٹرز نے طب اور تعلیم کے شعبے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا.. تقریباً تنگ دستی میں گزار کیا کہ وہ اُن زمانوں کی مدر تھریسا تھیں جن کی زندگی کا مقصد رب کی مخلوق کے لیے آسانیاں پیدا کرنا تھا..

اور اب یاد آتا ہے کہ ایک اور باہمت خاتون نے سمن آباد میں ایک پرائیویٹ تعلیمی ادارہ قائم کیا تھا جو اپنی نوعیت کا لاہور میں پہلا باقاعدہ سکول تھا اور یہ مسرت پراچہ تھی..

نہایت پیاری شکل والی مسرت جو پولیو کا شکار ہو کر مفلوج ہو چکی تھی، وہیل چیئر پر ڈھیر وہ ہر ادبی محفل میں کسی مُلازم کی بانہوں میں، شریک ہوتی کہ اُس نے اپنے اپاہج پن کے حوالے سے ایک پراثر ناول

لکھا..کہانیاں لکھتی تھیں اور مجھ سے ایک اُلفت کا رشتہ رکھتی تھی، ہمیشہ کہتی ''میں تمہاری پاکستانی پاسکل ہوں..'' اُس نے ایک مضبوط کردار والے نڈر شخص سے شادی کی اور اُس کے بچوں کی ماں ہوئی..میں نہیں جانتا کہ اُس کے بچے اب کہاں ہیں..اگر وہ یہ تحریر پڑھیں تو مجھ سے رابطہ کریں تاکہ میں انہیں بتاسکوں کہ وہ کیسی باہمت عظیم ماں کے بچے ہیں..اور وہ شہر لاہور کی ایک محبوب ہیں..

شہر لاہور کی ایک اور محبوبہ تھی..

سفید بالوں والی، تیکھے نین نقش والی، اوور کوٹ میں ملبوس نازک اندام..فاطمہ جناح..

جب وہ اپنے بھائی کی مانند ناتواں خاتون، ایوب خان کے قہر کے خلاف کھڑی ہوگئی، ایک ایسے فیلڈ مارشل کے سامنے سینہ سپر ہوگئی جو کبھی کسی فیلڈ یا میدان جنگ میں نہ اُترا تھا، اُس کی پالتو کیبنٹ نے فیصلہ کیا تھا کہ حضور کیا یہ ضروری ہے کہ میدان جنگ میں اترنے والوں کے لیے یہ لقب مخصوص کیا جائے..ہم آپ کو بیٹھے بٹھائے، صدارت کی کرسی پر بیٹھے ہوئے آپ کو آپ کی ہدایت کے مطابق فیلڈ مارشل قرار دیتے ہیں..

فاطمہ جناح اسی جعلی فیلڈ مارشل کے سامنے اپنے بھائی کے پاکستان اور جمہوریت کے لیے اپنے ناتواں بدن کے ساتھ کھڑی ہوگئی..اور لاہوریوں کی محبوب ہوگئی، لاہوری لڑکیاں لکشمی مینشن کے مال روڈ والے رُخ پر واقع ''صوبہ خان ٹیلر'' سے فاطمہ جناح سٹائل لیڈیز کوٹ سلواتی تھیں اور انہیں زیب تن کرکے بالوں کو سفید دوپٹے سے ڈھانک کر فاطمہ جناح ایسی ''لُک'' دینا چاہتی تھیں..اگرچہ رعنا لیاقت علی خان کا غرارہ بھی بے حد مقبول ہوا لیکن اُن کی پیروی بالائی طبقے کی خواتین تک محدود تھی جو پاکستان کے پہلے فیشن میگزین ''مرر'' میں اپنی تصویر چھپوانے کے لیے مری جاتی تھیں..

1966ء میں خودساختہ فیلڈ مارشل ایوب خان کے مقابل وہ ڈینٹل ڈاکٹر، منحنی خاتون اپنے بھائی کی مانند ناتواں فاطمہ جناح صدارتی انتخاب کی مُہم میں لاہور کے گول باغ میں تشریف لائیں..یہ آج کی بات نہیں ہے کہ عورت کو نام نہاد علماء کرام نے مرد کی لونڈی قرار دیا ہے بلکہ اُس زدوکوب کرنے کا شرعی فیصلہ بھی کیا ہے اگرچہ بہت نرم دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ فتویٰ بھی دیا ہے کہ بیوی کو یوں ماریئے کہ نہ تو اُس کی ہڈی ٹوٹے اور نہ ہی اُس کی عزت نفس مجروح ہو..یعنی آپ اُس کو یوں تھپڑ ماریئے کہ اُس کی عزت نفس مجروح نہ ہو..سبحان اللہ..بلکہ احسن یہی ہے کہ ایک مسواک سے اُسے ضرب لگائیے...تو کیا ماؤں، بہنوں اور خالاؤں، بیٹیوں وغیرہ پر بھی اسی شرعی دستور کا اطلاق ہوتا ہے کہ وہ بھی تو عورتیں ہیں..بہرطور تب بھی علمائے کرام نے فتویٰ دیا کہ ایک عورت ملک کی صدر نہیں بن سکتی..صدارت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی..چنانچہ اس تناظر میں کہا کہ..

یہ کہتے ہیں کہ یہ نازک عورت ملک کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی، بوجھ میں نے اٹھانا ہے؟ یہ بوجھ تو آپ عوام اٹھائیں گے.. پھر کہا جاتا کہ میں سیاست نہیں جانتی (یعنی ہمارے لیے تو برصغیر کے سب سے عظیم سیاست دان محمد علی جناح کی ہمشیرہ اور ہر قدم پر رفیق، کیا وہ سیاست نہیں جانتی)......تو میں پوچھتی ہوں کہ فوج کو پریڈ کرانے والا سیاست کیا جانتا ہے...

محترمہ کو لاہور۔ سے بے حد محبت تھی..

وہ کنگ ایڈورڈز میڈیکل کالج لاہور کے پرنسپل کرنل الٰہی بخش کی خواہش پر سالانہ کھیلوں کے موقع پر مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئیں..اُن زمانوں کے ایک میڈیکل طالب علم کا کہنا ہے کہ میں نے اُنہیں دیکھا، پروقار اور باتمکن ایسا چہرہ کہ نظر نہ ٹھہرتی تھی..اسی شہر لاہور میں اُن کے بھائی کی راہنمائی میں قرارداد پاکستان تکمیل کو پہنچی تھی..یہ لاہور تھا جہاں پاکستان کے قیام کی بنیاد رکھی گئی..

فاطمہ جناح، شہر لاہور کی محبوب ترین عورتوں میں محبوب ترین تھیں..

اور ہاں میں سلور سکرین کی حشر ساماں اُن ایکٹرسوں کا تذکرہ کر چکا جنہوں نے اہل لاہور کے دلوں میں حشر برپا کر دیا لیکن میں یہاں کچھ اور حشر سامانیوں کا حوالہ بھول گیا کہ بڑھاپے میں حشر سامانیوں کے کچھ سامان یادداشت کے پلیٹ فارم پر پڑے رہ جاتے ہیں اور آپ جب گاڑی میں سوار ہو جاتے ہیں تو یکدم یاد آتا ہے کہ ہائے ہائے میں تو نمی، گیتا بالی، صبیحہ خانم، مسرت نذیر اور نیلو کو تو پلیٹ فارم پر ہی چھوڑ آیا..

فلم ''برسات'' ریوالی سینما میں ریلیز ہوئی اور اترنے کا نام نہ لیا. چپٹی ناک اور مُندھی آنکھوں والی نمی بائی کے سامنے نرگس بھی ماند پڑ گئی..میرا لال دوپٹہ ململ کا..جیا بے قرار ہے آئی بہار ہے اور برسات میں تم سے ملے ہم برسات میں دَھک دِنا دِن..یہ سب گیت شنکر جے کشن کے اگرچہ نمی نے راج کپور کے پکوڑا ناک والے سالے پریم ناتھ کے لیے مبینہ طور پر گائے لیکن لاہور کے ہر بالغ ہوتے نوجوان نے یقین کر لیا کہ نمی صرف اُس سے مخاطب ہو کر اُس کے نوخیز بدن میں دَھک دِنا دِن کر رہی ہے..رہی سہی کسر فلم ''داغ'' نے پوری کر دی جس میں نمی، شنکر یعنی دلیپ کمار کی پارو تھی..اے مرے دل کہیں اور چل..اور یہ وہی پارو تھی، شنکر گھر سے بیمار ماں کے لیے دوائی لینے کے لیے نکلتا ہے، دوائی کی رقم شراب پر اڑا دیتا ہے اور جھومتا ہوا واپس آتا ہے تو ماں مر چکی ہے اور وہ نمی سے کہتا ہے ''پارو میری ماں مر گئی..میری ماں مر گئی پارو..'' ہال میں بیٹھے ہر شخص کو محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کی ماں مر گئی ہو بلکہ میں لکھ چکا ہوں کہ در پردہ ہر لاہوری نوجوان نے اپنے آپ کو ملامت کرتا..پھر بھی تمنا کرتا تھا کہ کاش میری ماں مر جائے اور میں کہوں ''پارو، میری ماں مر گئی..''

گیتا بالی کمال کی اداکارہ تھی، مختصر سراپے کے باوجود اُس کے چہرے پر جنسی کشش کی جو بے اختیاری سسکیاں لیتی تھی، وہ لاہوریوں کے حواس میں ایک کھلبلی مچا دیتی تھی اور یہ سب پر کشش اظہار فلم

''جال'' کے گانے ''یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں'' میں کمال کو پہنچے..ازاں بعد فلم ''بازی'' میں لوگ دیو آنند اور کلپنا کارتک کو تو بھول گئے، وہ صرف گیتا بالی کو ''سنو گجر کیا گائے'' اور ''تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنا لے'' گاتے اور رقص کرتے دیکھنے کے لیے بار بار گئے..گیتا بالی نے شمی کپور سے شادی کی اور پھر شتابی سے مرگئی.. گیتا بالی، شمی کپور سے عمر میں بڑی تھی لیکن اپنے عروج پر تھی، شمی کپور نے ابھی ''چاہے مجھے کوئی جنگلی کہے'' وغیرہ نہیں گایا تھا، نسبتاً گمنام تھا تو اُس نے ناموری سے شادی کر لی..جیسے کشور کمار نے مدھوبالا سے، سنیل دت نے نرگس سے اور اعجاز نے نور جہاں سے شادی کر لی..خود بھی نامور ہوگئے..انہی زمانوں میں پاکستانی فلموں نے بھی اپنی شناخت کو لاہوریوں کے دلوں پر ثبت کر دیا۔سورن لتا ''رتن'' کی ہیروئن..ساون کے بادلو اُن سے یہ جا کہو..اپنے خاوند نذیر کے ساتھ پنجابی فلموں ''پھیرے'' اور ''لارے'' میں جلوہ گر ہوئی..''مینوں رب دی سونہہ تیرے نال پیار ہو گیا، چناں سچی مچی'' اور وہ آج کے اداکار نعمان اعجاز کی نانی جان لاہوریوں کی جان ہوگئی..

صرف ایک بار اسلام آباد سے لاہور آتے ہوئے فوکر فرینڈ شپ جہاز میں ان سے ملاقات ہوگئی، وہ میرے برابر کی نشست پر بیٹھی تھیں، ساڑھی میں ملبوس پرانی دنیا کے وقار اور تمکنت کی نشانی..وہ نہایت پر اشتیاق ہو کر مجھ سے باتیں کرنے لگیں، میری صبح کی نشریات کے حوالے سے پر توصیف گفتگو کرنے لگیں اور کہنے لگیں ''آپ تو مجھے نہیں جانتے ہوں گے..شوبز سے میرا بھی تعلق رہا ہے..''

میرا قدیم ترین دوست آسٹریلیا میں اپنے بڑھاپے سے عاجز آیا ہوا، مجھے اتنے برسوں بعد اپنے گھر کے باہر دیکھ کر کہتا ''چوہدری، تو میری جوانی کی شبنم ہے'' تو میں اُس پر وقار خاتون سے کیسے کہتا کہ آپ تو میری جوانی کی شبنم ہیں..اُس گئے زمانوں کی دھند میں آپ اپنی سکھیوں کے ہمراہ ''رتن'' میں جھولے جھولتی ہیں، رم جھم برسے بادل وا، مست ہوائیں آئیں، پیا گھر آ جا..اور آپ کے ہونٹوں سے ادا ہونے والا زہرہ بائی انبالے والی کا ترنم..جس دن سے جدا ہم ہیں، آنکھیں میری پرنم ہیں..آنکھیں مری پرنم ہیں..آج تک کوئی بھی مغنیہ زہرہ کے ''پُرنم'' کی ادائیگی کی قریب بھی نہیں پہنچی..محمد علی ماہیا اور بالو کی بیٹی صبیحہ خانم، اپنے پستہ قد کے باوجود لاہوریوں کی من پسند ہوئی..''پتن''، ''قاتل''، ''گمنام'' وغیرہ میں وہ کیسی چُلبلی اور موٹی سی گڑیا ہوا کرتی تھی..''لٹ اُلجھی، سُلجھا جا رے بالم'' یہ وہی گوری تھی جس کی پائل میں گیت تھے چھم چھم کے، بے شک وہ لاکھ چلے تھم تھم کے..

مسرت نذیر عام ہیروئنوں کی مانند ایک شرماتی، لجاتی، جعلی نخرے دکھائی ہیروئن نہ تھی، وہ اپنے ہیرو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے دھڑک بے باکی سے یوں بات کرتی تھی کہ ہیرو شرما کر ہیروئن ہو جاتا تھا..چلی رے چلی رے، میں تو دیس پیا کے چلی رے..

Scanned with CamScanner

نیلو نے رقص زنجیر پہن کے بھی کیا تھا..اور آئے موسم رنگیلے سُہانے ،تو چھٹی لے کے آجا بالما..
لاہور کے سب بالم اُس کی فلمیں دیکھنے کی خاطر چھٹی لے کر آجاتے..شبنم کے سیاہ بنگال کے سحر نے بھی لاہوریوں کو ایک مدت اپنا اسیر کیا..فردوس اگرچہ ڈائیلاگ ادا کرتے ہوئے یوں ہونکتی تھی، سینے کے مصنوعی ابھاریوں دھک دھک ابھرتے گرتے تھے جیسے اُس کے اندر دل نہ ہو چینی پیٹر پمپ نصب ہو،لیکن وہ اس کے باوجود ایسی ہیر تھی کہ وارث شاہ نے بھی جنڈیالہ شیر خان کے مدفن میں سبحان اللہ کی ایک کروٹ تو بدلی ہوگی..
ازاں بعد بہت سی اداکارائیں پردۂ سکرین پر نمودار نہ ہوئیں،دھم سے کُود کر اُس پر سوار ہوگئیں۔شیریں،ممتاز، انجمن، آسیہ،نغمہ..سُن وے بلوری اکھ والیا..اہل لاہور ان کی دھما چوکڑی سے خوب لطف اندوز ہوئے البتہ صائمہ ایک الگ داستان تھی،اُس میں اداکاری اور رقص کا ایک منفرد جوہر تھا اور ہے..شہرت سے خائف، بے حد شکل والی صائمہ اگر ہندوستان میں ہوتی تو کرینہ اور کترینہ اُس کے سامنے پانی بھرتیں..

ہر سویر ماڈل ٹاؤن پارک میں سیر کرتے ہوئے ملک سرفراز مجھ سے پوچھتا ہے''حاجی صاحب، لاہور والی کتاب کہاں تک پہنچی ہے''اور یہ سرفراز ہے جس نے مجھے''اُچکل'' دی تھی کہ حاجی صاحب،لاہور کو پنجاب والی کتاب سے الگ کر کے جدا لکھو..

''سرفراز..میں لاہور کے کسی بھی موضوع پر لکھنا شروع کرتا ہوں تو وہ پھیلتا چلا جاتا ہے،اس کے امکانات وسیع ہوتے چلے جاتے ہیں اور میں تو تنگ آ گیا ہوں..یوں تو میں عمر بھر لاہور کے قصے بیان کرتا رہوں گا، کتاب کبھی اختتام تک نہ پہنچے گی..میں سنگ میل کے افضال احمد سے کہوں گا کہ وہ میں نے جو کچھ اب تک لکھا ہے اسے چھین لے اور زبردستی شائع کر دے..''

یونہی لاہور نے جن عورتوں کو محبوب کیا ان کی داستان کبھی تکمیل تک نہ پہنچے گی اس لیے میں اپنے آپ پر جبر کرتا ہوں اور آخر میں صرف نور جہاں کا نام لیتا ہوں..

بلاشبہ آج تک اہل لاہور نے جن عورتوں سے پیار کیا، جن کی تعظیم کی جن پر مر مٹے، جوان کے خوابوں کی رانیاں ہوئیں وہ سب ایک طرف اور نور جہاں ایک طرف..پلڑا اِدھر کا پھر بھی سب پر بھاری..

جیسے شیکسپیئر کے ڈراموں، ہومر کی داستانوں، امراؤ القیس کی شاعری، حافظ اور خیام کی غزلوں، شاہ حسین، بلھے شاہ اور وارث شاہ کے زور بیان کو بیان کرنا ایک حماقت ہے ایسے ہی نور جہاں کی خوش شکلی اور گائیکی کی توصیف کرنا ایک بے وقوفی کے سوا اور کچھ نہیں..

نور جہاں جس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ مُنڈیا تیرا نام بڑا مُشکل ہے..سمجھ نہیں آتی کہ مستنصر کو''س'' سے لکھتے ہیں یا''ص'' سے..تو میں نے کہا تھا میڈم آپ''س'' سے لکھیں یا''ص'' سے ہمیں تو سواد آ جائے گا..
میں نے کراچی کے ایک قبرستان میں دفن نور جہاں کی قبر پر حاضری دی تو میرے ذہن میں ایک

ہی ملال گردش کرتا رہا کہ میڈم آپ کے جانے سے ہمارے سب ''سواد'' سب مزے جاتے رہے...آپ اس بے مہر شہر میں کیوں دفن ہوگئیں، اپنے آبائی شہر قصور میں بلھے شاہ کے قدموں میں دفن ہو جاتیں، لاہور کی خاک میں خاک ہوتیں تو آپ دیکھتیں کہ پروانے کدھر جاتے ہیں، بلھّے شاہ اور داتا صاحب کے بعد کدھر جاتے ہیں..

ے سب جگ سوئے ہم جاگیں، تاروں سے کریں باتیں، چاندنی راتیں..



''لاہور کے ادبی ''سیلون''

شنید ہے کہ دوسری جنگ عظیم سے پیشتر شہر پیرس میں علم وادب، مصوری، ڈرامہ اور دیگر فنونِ لطیفہ کی دلدادہ کچھ بہر طور متمول خواتین ایسی ہوتی تھیں، ذاتی طور پر بھی شاعری اور ادب سے شغف رکھتی تھیں اور ان کے شاندار گھروں میں مشہور ہو چکے اور مشہور ہونے کی خواہش کرنے والے ادیب اور مصور جمع ہوتے تھے، یونہی مُنہ اٹھائے نہیں چلے آتے تھے، خاتون کی خصوصی دعوت پر یا کسی ممتاز ادیب اور مصور کے ساتھ نتھی ہو کر چلے آتے تھے کہ جو کوئی بھی ایسی شاموں میں مہمان ہوتا تھا، پورے پیرس میں دُھوم مچ جاتی تھی کہ فلاں ڈرامہ نگار یا ناول نویس بھی پچھلی شب فلاں میڈم کی رہائش گاہ میں دیکھا گیا تھا.. ایسی رہائش گاہوں کو جہاں دنیا جہان کے سر پھرے تخلیقی لوگوں کا اجتماع ہوتا تھا اور کوئی ایک ڈھلتی عمر اور ڈھلتے بدن کی امیر میڈم اُن کی میزبانی کرتی تھی، خوب کھلاتی پلاتی تھی، نخرے دکھاتی تھی ایسے گھر کو ''سیلون'' کا نام دیا جاتا تھا، ارنسٹ ہیمنگوے نے اپنے پیرس کے قیام کے ایام ''اے موو ایبل فیسٹ'' میں بیان کیے ہیں اور اس میں ایسی بہت سی فرانسیسی خواتین کے تذکرے کیے ہیں جن کے گھروں میں پکاسو کے علاوہ وہ بھی آیا جایا کرتا تھا بلکہ پکاسو نے ایسی ادب نواز خواتین میں سے کچھ کی پورٹریٹ بھی بنائی تھیں.. اور یہ تصور ''سیلون'' کا کچھ نیا نہیں.. زمانہ جاہلیت میں بھی مکہ کی ایسی خواتین کے تذکرے ملتے ہیں جن کے گھروں میں شاعر اکٹھے ہوتے تھے اور سامعین کو اپنے تازہ ترین قصیدے سے نوازتے تھے.. اسی طور جب دمشق بنو امیہ سلطنت کا صدر مقام ہوا تو وہاں بھی ''اے ہسٹری آف اربز'' کے مصنّف فِلپ ہِتی کے بقول ہمارے نزدیک ایک محترم اور مقدس خاتون کے گھر میں بھی اسی نوعیت کی ادبی محفلیں برپا ہوا کرتی تھیں، چنانچہ ''سیلون'' کا تصور کچھ نیا نہیں.. یقیناً دنیا بھر کے تاریخی اور قدیمی ثقافت کے وارث شہروں میں ادب نوازی کی یہ روایت کسی نہ کسی صورت میں موجود رہی ہے.. اور یہ کیسے ممکن ہے کہ لاہور ایسا شہر ایسی ادب نوازی اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کی محفلوں سے محروم رہا ہو.. یہاں بھی ''سیلون'' کا ادارہ کبھی قائم تھا اگرچہ اس ادبی ترویج کی سرگرمی میں ملوّث سب خواتین متموّل نہ تھیں اور ان میں ایک آدھ مواِمرد بھی شامل تھا..

چلئے یادداشت کے لاغر اور قریب المرگ گھوڑے کو مہمیز دیتے ہیں کہ یہ چند دنوں کا مہمان ہے، کوئی

دن آتا ہے کہ یہ مر بھی سکتا ہے اور اسے گولی مار کر ہلاک بھی کیا جا سکتا ہے..اسی لیے کہتے ہیں کہ مرد اور گھوڑا کبھی بوڑھے نہیں ہوتے..اگرچہ گھوڑا ناکارہ ہو جائے تو اسے گولی مار دیتے ہیں اس لیے وہ کبھی بوڑھا نہیں ہوتا، مردوں کے ساتھ بھی اگر یہی سلوک ہو تو وہ بھی کبھی بوڑھے نہ ہوں..اس کے باوجود مرد ہیں کہ نہ ہاتھ میں اور نہ کہیں اور جنبش ہے اور اس کے باوجود یہ مقولہ اپنی مردانگی ثابت کرنے کے لیے جو کب کی جنبش کو ترس چکی، دوہراتے رہتے ہیں..

بہرطور..یادداشت کا بوڑھا گھوڑا..مہمیز دیتے ہیں..

آج سے تقریباً نصف صدی پیشتر ''من وسلویٰ'' نام کی ادبی تنظیم قائم ہوئی جس کی روحِ رواں حجاب امتیاز علی تھیں جن کے ناول رومان بھرے اور ارمان بھرے میرے ابا جی پڑھا کرتے تھے اور جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ اُن کی روح میری پیدائش سے پیشتر پرواز کر چکی ہوگی لیکن وہ موجود تھیں، میں جب کبھی انہیں دیکھتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے میں عالم ارواح میں ہوں وہ اتنی قدیم تھیں، وہ اپنے سُکڑ چکے ڈھانچے پر ایسی ایسی زرنگار اور زرافشاں شاندار ساڑھیاں زیب کرتیں جو آج تک کسی بھی روح کے نصیب میں نہ تھیں۔حجاب آپا ایسی ٹھسّے والی پروقار خاتون، برصغیر کی پہلی خاتون پائلٹ، ناول نگار اور پرتاثیر خاتون..جب میں نے ابّا جی سے کہا کہ میں آج حجاب امتیاز علی سے مل کر آیا ہوں تو انہیں یقین نہ آیا کہ میرے نالائق برخوردار کا یہ نصیب کہ وہ میری جوانی کی ''ہارٹ تھراب'' سے ملاقات کر کے آیا ہے، ان کی نظروں میں میں یکدم صاحب توقیر ہو گیا..وہ ایک کمان کی مانند سیدھی اور تب وہ جانے اسّی کے پیٹے میں تھیں یا اس کے پار جا چکی تھیں، محفل میں داخل ہوتیں..مجھے شک ہے کہ وہ نہ صرف میرے وجود بلکہ اُس محفل کے شرکاء کے وجود سے بھی مکمل طور پر آگاہ نہ تھیں، عجیب رُوح تھیں..اور یہ یوسف کامران تھا، اپنے کشمیری حسن پہ نازاں، سگرٹ پھونکتا، ایک ''پلے بوائے'' جو آپا حجاب سے باقاعدہ فلرٹ کرتا، ان کے لباس اور میک اپ کی توصیف کرتا اور حجاب آپا..شاید بہری بھی ہو چکی تھیں، مسکراتی رہتیں..

ساڑھیوں کے سوا اُن کی وِگوں میں بھی بہت تنوع تھا..

ایک شب یوسف کہنے لگا ''تارڑ تمہیں پتہ ہے کہ حجاب آپا کو مکھیاں تنگ نہیں کرتیں..ذرا غور کرو..وہ اُن کی وِگ کے بالوں پر بیٹھتی ہیں تو اُن کو کیسے خبر ہو..'' یوسف ایک کمینہ شخص تھا اور واقعی ان کی وِگ پر کم از کم دو مکھیاں براجمان تھیں..

میں پہلے بھی اعتراف کر چکا کہ میں بھٹک جاتا ہوں..ماضی کے سراب دھندلکوں میں سے کہانیاں، کردار اور داستانیں ظاہر ہوتے چلے جاتے ہیں، جنہیں تفصیل سے بیان کروں تو ہر کہانی، کردار، داستان،

ایک ضخیم کتاب ہو جائے اس لیے اے دل مختصر مختصر..

حجاب آپا کے گھر میں ان کی سالگرہ کے موقع پر ایک محفل کا اہتمام ہوا..اُن سے کون پوچھے کہ آج آپ کتنے برس کی ہو گئی ہیں..وہاں ظاہر ہے ان کی بیٹی یاسمین طاہر اور داماد نعیم طاہر موجود ہوتے..میری ٹیلیویژن زندگی کا سب سے پہلا ڈرامہ ''پرانی باتیں''نعیم طاہر کا لکھا ہوا تھا جس میں، میں نے ایک ڈاکٹر کا کردار ادا کیا تھا جو شاید یاسمین طاہر کا علاج کرتا ہے..

لاہور کا ایک ''سیلون'' ناول نگار ''آتشِ رفتہ'' اور ''دشت سُوس'' کی مصنفہ جمیلہ ہاشمی کا سینٹ جان پارک میں واقع گھر تھا..جمیلہ اُس عہد کی ایک نمایاں نثر نگار تھیں اور سچ پوچھئے میں ایک مدت اُن کے ادب کا قائل نہ ہو سکا..مجھے انعام یافتہ ''تلاش بہاراں'' کچھ زیادہ معتبر نہ لگا، وہ قرۃ العین حیدر کے اتنی قریب تھیں کہ انہی کے رنگ میں رنگی گئیں اور یہ حقیقت ہے کہ اُس عہد کی بیشتر خاتون نثر نگار اُن کے طرز نگارش سے بچ نہ سکیں، سوائے نثار عزیز بٹ کے، اگرچہ وہ بھی عینی کی نزدیکی سہیلیوں میں تھیں..اگرچہ میں ان سے بہت جونیئر تھا اور اس کے باوجود جب کبھی ان کا کوئی تازہ افسانہ ''نقوش'' وغیرہ میں شائع ہوتا وہ مجھے فون کر کے میری رائے دریافت کرتیں اور میں صرف تکریم کی خاطر کچھ توصیف کر دیتا..وہ فون پر بہت طویل گفتگوئیں کرتیں..پھر میں نے ''شاہکار کتابیں'' کے ایک شمارے میں اُن کا ناولٹ ''آتش رفتہ'' پڑھا تو دل وجان سے ان کے بیان کی شان کا قائل ہو گیا..اگرچہ وہ ''آتش رفتہ'' سے بہت بیزار تھیں، ان کے بقیہ کام کی جانب لوگ مائل نہ ہوتے تھے، صرف اسی ناولٹ کے سحر میں مبتلا رہتے تھے..انہوں نے مجھے خصوصی طور پر ''آتش رفتہ'' کے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ عطا کیا..انہوں نے قرۃ العین طاہرہ کی حیات کے بارے میں بھی ایک ناول لکھا لیکن میرے نزدیک وہ اتنے بڑے موضوع کے ساتھ انصاف نہ کر سکیں..البتہ منصور حلاج کے حوالے سے ان کا ناول ''دشت سُوس'' ایک پراثر داستان تھی..

جمیلہ کے ''سیلون'' میں نہایت باقاعدگی سے شہر بھر کے، اُن کی پسند کے ادیب شریک ہوئے..وہ ادبی رونق لگانے کے بہانے ڈھونڈتی رہتیں..دسترخوان کے تنوع کا کچھ حساب نہ تھا، آم کے موسم آتے تو ان کے باغوں کے آم آ جاتے..نور جہاں بھی میری طرح ایک دائمی مہمان ہوا کرتی تھیں..اور مجھے یاد ہے کہ وہ آم چھیلنے اور اُس کی زرد شیرینی کو پیش کرنے کی ایکسپرٹ تھیں، اگر ملکہ ترنم کسی شب میں اپنے مترنم ہاتھوں سے آم تراش کر آپ کو پیش کرے تو اُس شب کے سحر طراز اور سحر مٹھاس ہونے سے کون کافر شک کرے گا..

جمیلہ کے ہاں میں نے، اور وہ زمانے ضیاء الحق کے سیاہ زمانے تھے، میں نے اپنی ایک کہانی سنائی جس میں جبر اور تاریکی کے استعارے تھے..شاید یہ ''درخت'' تھی جو بعد ازاں ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے جریدے میں ایک نمائندہ پاکستانی افسانے کے طور پر درجن بھر زبانوں میں شائع ہوئی تو نور جہاں نے کہا اور پنجابی میں

کہا ''وے منڈیا.. ابھی ابھی تو احمد فراز جیل سے باہر آیا ہے، تو نے بھی جیل جانا ہے، ایسی کہانیاں نہ لکھا کر..''

جمیلہ کے ہاں جب میں پہلی بار نور جہاں سے ملا تو جس کسی نے بھی تعارف کروایا، میڈم نے اُسے ڈانٹ دیا کہ میں اسے جانتی ہوں.. اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں ''وے منڈیا، تیرے ساتھ میری ایک ہی پرابلم ہے.. سمجھ نہیں آتا کہ تیرا نام مستنصر ''س'' سے لکھا جاتا ہے یا ''ص'' سے.. سین اور صواد کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے کہا کہ میڈم آپ میرا نام سین سے لکھیں یا صواد سے.. بہر طور مجھے سواد آ جائے گا.. کہہ لیجئے کہ لطف آ جائے گا.. نور جہاں نے کچھ ایسی نوعیت کی بات کی کہ.. ہائے مرگئی.. تیرا تو منہ چومنے کو جی چاہتا ہے.. کاش کہ وہ اپنے جی کا چاہنا مان لیتیں.. بعد ازاں ان کے ساتھ دوستی اور احترام کا ایک سلسلہ اُن کی موت تک جاری رہا..

جمیلہ کی زندگی میں پیری فقیری، وراثت اور گدی نشینی کے بہت بکھیڑے تھے، وہ اپنے نومولود بیٹے کی موت کے صدمے سے دوچار ہوئی، اُس کی موت کے لیے سوکن کے جادو ٹونے کا نتیجہ قرار دیا اور پھر اپنی بیٹی عائشہ جسے ہم آشی کہتے تھے، ایک بیٹے کے طور پر پالا.. کٹے ہوئے بال، ملیشیا کی قمیص شلوار اور پاؤں میں ٹائر کے تلووں والی بھاری پٹھان چپل.. ان زمانوں میں آشی بین الاقوامی امور اور فوج کے منفی کردار کے حوالے سے ایک ایسی ادیبہ اور تجزیہ نگار ہے جس کی تحریریں دنیا بھر کے اخباروں میں شائع ہوتی ہیں.. ماشاء اللہ عائشہ صدیقہ ناموری میں، ہم سب سے آگے نکل گئی ہے..

''کسان اینڈ کمپنی'' میں جہاں ملکہ پکھراج اور جسٹس کیانی وغیرہ میرے ابا جی رحمت خان تارڑ سے باغبانی کے سلسلے میں مشوروں کے لیے آیا کرتے تھے وہاں ایک نہایت سادہ اور دھیمے مزاج والے زمیندار سردار صاحب بھی اکثر آتے تھے۔ جمیلہ کے ہاں ایک شام کی دعوت میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی سردار صاحب گھر کے باہر کھڑے ہیں، میں نے پوچھا ''سردار صاحب، آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

تو انہوں نے سر جھکا کر کہا ''میں جمیلہ ہاشمی کا خاوند ہوں..''

اُن کی وفات پر میں تو جمیلہ کے ہمراہ ان کے آبائی گاؤں نہ جا سکا لیکن کشور ناہید نے ہم سب کی نمائندگی کی..

عصمت چغتائی سے بھی میری پہلی اور آخری ملاقات جمیلہ کی ایک محفل میں ہوئی..

اب اگر ہم سینٹ جان پارک کے علاقے میں آ نکلے ہیں تو بہر طور ہمیں سائرہ ہاشمی کے گھر میں جو ادبی میلے برپا ہوتے تھے ان کا بھی مختصر تذکرہ کرنا ہے، سائرہ، جمیلہ کی چھوٹی بہن تھیں.. ان کا آپس میں کچھ خاندانی بیر تھا، بہت کم اِک دوجے کو برداشت کرتی تھیں.. جمیلہ، سادہ شکل کی تھیں، جمیل نہ تھیں، سائرہ کے جمال میں کچھ شک نہ تھا.. وہ بھی نہایت طویل کہانیاں لکھتیں اور جب حلقہ ارباب

ذوق میں پڑھتیں تو حاضرین آنکھیں جھپکائے بغیر انہیں دیکھتے رہتے، خواہش کرتے کہ یہ کہانی کبھی ختم نہ ہو، انہیں دیکھتے رہتے... سائرہ میں یقیناً تخلیق کا ایک جوہر تھا لیکن وہ جمیلہ کے مقابلے میں نمایاں نہ ہو سکا... اگر وہ جمیلہ کی بہن نہ ہوتیں تو شاید ادب کی تاریخ میں کہیں ان کا تذکرہ ہو جاتا، جو نہیں ہوا.. حجاب امتیاز علی اور جمیلہ ہاشمی کے گھروں کے بعد.. اب جگر تھام کے بیٹھ کہ میری باری آئی.. کشور ناہید کی باری آئی..

پہلے کرشن نگر کے قدیم مکان میں اور پھر اقبال ٹاؤن کے گھر میں، کشور ناہید اور کسی حد تک یوسف کامران کے گھر میں، شاید برصغیر بھر میں، سب سے زیادہ ادیبوں، شاعروں، مصوروں، نقادوں اور گلوکاروں کی باراتیں.. صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، فیض احمد فیض، احمد فراز، مجروح سلطانپوری، حبیب جالب، گوپی چند نارنگ، قرۃ العین حیدر، شہریار، قتیل شفائی، محسن احسان، ساقی فاروقی، عبید اللہ علیم.. جمید اختر، انتظار حسین، منو بھائی، زاہد ڈار.. غرض کہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ.... مصوروں میں علی امام اور مقبول فدا حسین..

قرۃ العین حیدر کی لاہور میں آخری دعوت.. کشور حسین شاد باد کے لان میں، ان محفلوں میں اقبال بانو تو بہر طور شریک ہوتیں.. ''دشت تنہائی میں'' کا الاپ شروع کرتیں تو سب لوگ جیسے دم روک لیتے اور سحر ہو جاتی.. نور جہاں کی مانند اقبال بانو سے بھی میرا احترام اور پسندیدگی کا ایک رشتہ عمر بھر رہا..

پھر کشور اسلام آباد چلی گئی اور اُس کے جانے سے بہت سے ادیب اور شاعر بے آسرا اور یتیم ہو گئے.. یہاں تک کہ انتظار حسین کو بھی کوئی پوچھتا نہ تھا.. جاوید شاہین، منو بھائی اور مسعود اشعر تو کشور کے بغیر باقاعدہ یتیم ہو گئے.. پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں..

انہی زمانوں میں، میں نے چند ہم خیال نثر نگاروں کے تعاون سے ''فکشن فرینڈز'' کے نام سے ایک ادبی تنظیم کی داغ بیل ڈالی.. اس کا منشور بہت سادہ تھا کہ.. یہاں شاعری شجر ممنوعہ تھی، ہم کسی بھی گھر میں اکٹھے ہوں گے، ناول اور افسانے کے بارے میں بات کریں گے اور کسی ایک تازہ ترین ناول کے بارے میں تنقیدی گفتگو کریں گے اور.. یہ بنیادی شرط ہے کہ ازاں بعد حاضرین کی تواضع، سادہ چائے اور دو چار بسکٹوں سے کی جائے گی.. مجھے یاد ہے کہ ''فکشن فرینڈز'' کا پہلا اجلاس میرے گلبرگ والے گھر میں ہوا اور وہاں جمیلہ ہاشمی کے ناول ''دشت سُوس'' کے بارے میں مضامین پڑھے گئے اور گفتگو ہوئی.... جمیلہ نے نہایت تحمل سے تنقید کو برداشت کیا اور میری بیگم میمونہ سے کہا.. ''تم کیسے اتنے ظالم شخص کے ساتھ رہتی ہو..'' میمونہ نے جواب میں جو کچھ کہا اسے درج کیسے کروں.. اس میں دوسری بیوی ہونے کے حوالے کچھ موہوم سے تھے..

''فکشن فرینڈز'' کے اجتماع چلتے رہے.. لیکن ہوا یہ کہ سادہ چائے اور بسکٹوں کی بجائے وسیع

دستر خوان سجنے لگے، فکشن پیچھے رہ گئی اور روسٹ مرغ اور سری پائے آگے نکل گئے..فرخندہ لودھی کے پرتکلف اہتمام نے ''فکشن فرینڈز'' کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی..

فکشن فرینڈز..تمام!

اُردو کی ایک بڑی ناول نگار نثار عزیز بٹ اور ان کے خاموش طبع میاں ڈرامہ نگار اصغر بٹ کے گھر میں بھی کچھ خصوصی ادبی نشستوں کا اگر چہ کبھی کبھار اہتمام ہوا کرتا تھا..ان میں بیشتر وہی ادیب شرکت کرتے جو کشور کے ہاں مسلسل مدعو رہا کرتے تھے، البتہ نثار اس معاملے میں ذرا ''چوُزی'' تھیں، ہما شما اُن کے گھر میں داخل نہیں ہوسکتا تھا، اگر چہ میں بھی کچھ کچھ ہما شما تھا لیکن میری خوش نصیبی کہ ان کے ہاں دعوت کا ہُما ہمیشہ میرے سر پر بیٹھ جاتا... جمیلہ ہاشمی، کشور ناہید، انور سجاد، شیخ منظور الٰہی اور زہرہ منظور الٰہی، مسعود اشعر، نعیم اور یاسمین طاہر، انتظار حسین اور عالیہ، زاہد ڈار، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ..وغیرہ نثار کی ایک ایسی دعوت میں شیخ منظور الٰہی صرف جرابوں میں چلے آئے، مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے جرابوں کے علاوہ کچھ اور زیب تن نہیں کیا تھا بلکہ ان کی کار کیچڑ میں پھنس گئی تھی اور وہ اسے دھکا لگاتے اپنے جوتے آلودہ کر چکے تھے چنانچہ صرف جرابوں میں تشریف لائے..

نثار کے ساتھ میرا ایک اور بھی واسطہ تھا..ان کی سگی بھتیجی فرہانہ عزیز، اکثر مرکزی وزیر رہنے والے سرتاج عزیز کی بیٹی میری صبح کی نشریات میں ایک ہفتہ وار پروگرام بخوبی کیا کرتی تھیں، جیسے کسی دل جلے نے کہا تھا کہ سرتاج عزیز نے یقیناً وہ امرت دھارا پیا ہوا ہے جس کی تلاش میں مقدونیہ کا سکندر نکلا تھا، وہ میرے دادا کے زمانوں سے چلے آتے ہیں اور اب جب کہ میں دادا ہو گیا ہوں وہ اب بھی جوں کے توں چلے آتے ہیں..

نثار کے گھر میں ہی ہاجرہ مستور سے میری پہلی اور آخری ملاقات ہوئی اور انہوں نے میری کچھ کتابوں کی فرمائش کی جو میرے لیے ایک اعزاز بہر طور تھا..میں نے انہیں بتایا کہ بہت مدت ہوگئی جب خالد احمد کے حلقہ ارباب غالب کی جانب سے میرے بدنام زمانہ ناول ''پیار کا پہلا شہر'' کی دیال سنگھ لائبریری میں رونمائی ہوئی جس کی صدارت خدیجہ مستور نے کی، ظہیر بابر بھی تشریف لائے..

شدید سردیوں کے زمانے تھے جب سانس برف ہوتا تھا، ہم گئی رات نثار کے گھر سے نکلے، برآمدے میں جمیلہ ہاشمی کی دو دیہاتی نوکرانیاں ننگے فرش پر سمٹی ہوئی سو چکی تھیں، آشی نے انہیں اپنی ٹائروں والی بھاری چپل سے ٹھڈے مار کر جگایا کہ وہ صرف آواز دینے سے کب جاگتی تھیں، اصغر بٹ صاحب شاید اس لیے کہ وہ مسلسل خاموش رہتے تھے، اپنی سنہری عینک کے پیچھے شرارتی آنکھوں سے مسکراتے رہتے تھے،

اپنی بیگم کے بے دریغ پٹھان قہقہوں سے بھی چونکتے نہ تھے، یکدم گویائی کھو بیٹھے..اب وہ مسکراتے نہ تھے، ہمیں دیکھتے رہتے تھے..

نثار کے ہاں کی دعوتوں کی تفصیل اس کی کلاسیک، میری پسندیدہ ترین خودنوشت ''گئے دنوں کا سراغ'' میں درج ہے..

شیخ منظور الٰہی..ایک سینئر بیوروکریٹ، پنجاب کے عارضی طور پر چیف منسٹر بھی مقرر ہوئے، اپنے دل کے اندر جو ایک دل ہوتا ہے اُس میں محض ایک جینوئن لکھاری تھے، ان کی کتابیں ''دردِل کشا'' اور اندلس کے بارے میں ایک داستان میرا خیال ہے کہ شاید زمانوں کے پار اتر جائیں گی...میں اُن کے گلبرگ والے گھر میں ان کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے گیا تو مختار مسعود صاحب میرے گلے لگ گئے ''میرا آخری یار چلا گیا''، شیخ صاحب کا گھر تب ''گرم'' ہوتا تھا جب کراچی سے مشتاق احمد یوسفی لاہور آتے اور شیخ صاحب کے ہاں ٹھہرتے، ان گرم محفلوں میں محدود چند لوگ ہی مدعو کیے جاتے..مختار مسعود صاحب ہمیشہ علی گڑھ کے قصے چھیڑ دیتے اور ہم بے حد بور ہوتے کہ انہوں نے علی گڑھ سے باہر آنے کی قسم کھا رکھی تھی اور اکثر کسی اِکّے، تانگے کی بجائے، کسی ٹم ٹم کا ذکر کرتے آبدیدہ ہوتے..

اِن زمانوں میں سب کے سب بیمار ہیں، آزاریں ہیں، زندگی سے رخصت چاہتے ہیں پر سکتے جاتے ہیں، امتحان میں ہیں..الطاف فاطمہ کو فون کرتا ہوں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کون ہوں، جو کچھ کہتی ہیں وہ میرے پلّے نہیں پڑتا..انور سجاد عجب خودفراموشی کے عالم میں ایک کمرے میں اکیلا پڑا ہے اور یوسفی صاحب..

کراچی آرٹس کونسل کی جانب سے ان کی تازہ ترین کتاب ''شامِ شہرِ یاراں'' ایک ایسی کتاب جو نہ شائع ہوتی تو اچھا تھا، ان کی خودفراموش کیفیت میں چھاپ دی گئی، اس کی تقریب رونمائی میں، میں بھی متعدد صدر حضرات میں سے ایک سٹیج پر بیٹھا تھا، یوسفی صاحب میرے برابر میں بیٹھے تھے اور وہ وہاں تھے جہاں سے اپنی خبر بھی نہیں آتی ایسی بے خبری تھی..مجھے شک ہے کہ میرے علاوہ انہوں نے سٹیج پر بیٹھے ہوئے عبداللہ حسین اور ضیاء محی الدین، زہرہ نگاہ کو بھی نہیں پہچانا..

چنانچہ شیخ منظور الٰہی کے ہاں ایک شب جب مختار مسعود علی گڑھ کی کسی ٹم ٹم کی یاد میں آہیں بھرتے تھے یوسفی صاحب نے ایک کھچری مسکراہٹ کے ساتھ انہیں مخاطب کر کے کہا ''مختار صاحب..اِن دنوں آپ کیا کر رہے ہیں؟'' مختار مسعود نے نہایت سنجیدگی سے کہا ''ان دنوں میں صوفیا کرام کی عائلی زندگی کے بارے میں تحقیق کر رہا ہوں..''

یوسفی صاحب نے نہایت متانت سے سر ہلا کر کہا "بری ہو گی.. تبھی تو صُوفی ہو گئے.." ایک ایسی ہی محفل کے اختتام پر جب ہم بھابھی زہرہ کے پکوانوں سے لطف اندوز ہو چکے انہوں نے نہایت بھولپن سے امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی سے کہا "اب آپ شروع ہو جائیے.."

ان دونوں نے حیرت کا اظہار کیا کہ کیسے شروع ہو جائیں تو زہرہ کہنے لگی "آپ کی لطیفہ بازی کی بہت دھوم ہے.. کھانے کے بعد کچھ ہنسنا ہنسانا بھی تو ہونا چاہیے.."

چنانچہ امجد اور عطا شروع ہو گئے.. اور محفل کو بقول کسے کشت زعفران وغیرہ کر دیا.. یہ دونوں یقیناً اپنے عہد کے امام ابولطیفہ تھے.. جیسے میاں محمد بخش نے کہا تھا کہ سدا نہ باغوں میں بلبل بولتی ہے، سدا نہ باغ بہاراں، سدا نہ حسن جوانی اور سدا نہ صحبت یاراں.. تو ادب کے باغوں میں جو بلبل بولتی تھی، وہ چپ ہو گئی، نہ وہ باغ رہے اور نہ وہ بہار رہی اور یوں صحبت یاراں بھی تمام ہوئی.. حجاب امتیاز علی ایک ایسی پرچھائیں ہو گئی جس کی وِگ پر اب کوئی مکھی نہ بیٹھتی تھی..

جمیلہ ہاشمی وقت سے پہلے ایک "آتش رفتہ" ہو گئی، کشور ناہید اسلام آباد میں زندہ جا دفن ہو گئیں.. شیخ منظور الٰہی بھی رخصت ہو گئے.. نثار عزیز بٹ جانے کن حالوں میں ہے.. اس دوران جب سب کچھ ماضی کی دھند میں دفن ہو چکا تھا، نیاز احمد کا ظہور ہوا "سنگ میل" کے شوروم میں وہ سب لوگ جو ابھی زندہ تھے، جمع ہونے لگے.. نیاز احمد کی مہربان میزبانی کے اسیر ہو کر آنے لگے.. کیا انتظار حسین، اعجاز بٹالوی، کشور ناہید، زاہد ڈار، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، شہریار، رفیق ڈوگر، جاپان کے یامانے، ڈاکٹر تبسم کاشمیری سب کے سب آنے لگے.. نیاز احمد ہر برس ایک لاہوری ناشتے کا اہتمام اپنے گھر کرتے.. اندرون شہر کے جتنے بھی قدیم پکوان تھے وہ ان کے لان میں سج جاتے اور وہاں پرندے بولتے.. پنجروں میں چہکتے پکھیرو گیت گاتے.. اور پھر ان کا بڑا بیٹا اعجاز یونہی بے وجہ یکدم مر گیا اور وہ بجھ گئے.. اور پھر خود بھی خاموشی سے اُس کی قبر کے پہلو میں جا لیٹے..

زمانے تمام ہوئے..
اور ہم بھی تمام ہونے کو ہیں....
سدا نہ صُحبت یاراں..



''کتابوں کا جہان، لاہور''

اگر ایران کا اصفہان، نصف جہان ہے..تو بقیہ نصف جہان لاہور ہے اور اس نصف جہان میں کئی جہان آباد ہیں، کچھ کبھی آباد تھے اور اب برباد ہیں چند ایک ابھی تک آباد ہیں.. جہاں کمانگروں، تیرگروں، گھنگرو سازوں اور چڑیوں کو مارنے والوں کے جن کے پَر نوچ کر، تیروں کو توازن کہنے کے لیے، اُنہیں پھر سے آزاد کر دیا جاتا تھا تاکہ آئندہ موسموں تک اُن کے بال و پر پھر سے اُگ آئیں اور انہیں پھر سے لاہور کی کمانوں کے تیروں کو توازن کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکے..اُس محلے کے لوگ چڑیاں مارتے نہیں تھے، اُن کے پَر نوچ کر پھر سے فضائے بسیط میں اڑان کرنے کے لیے چھوڑ دیتے تھے..اور جہاں ایسی منقش آبدار تلواریں تخلیق کرنے والوں کے کہ جن ہندی تلواروں کی صناعی کے حُسن اور آب و تاب کو رسول اللہ ﷺ کی شان میں کہے گئے ایک قصیدے میں مشابہت دی گئی۔ اگرچہ بعدازاں حضورؐ کی خواہش پر اس میں کچھ ردو بدل کیا گیا..دنیا بھر کے عجائب گھروں کے اسلحہ خانوں میں جن قدیم ہتھیاروں کو سجایا گیا اُن میں لاہوری کاریگروں اور نقاشوں کی تلواریں بھی شامل ہیں..

لاہوری تلوار، جاپان کی سمورائے تیز دھار تلواروں سے کم آب و تاب نہ رکھتی تھی، اور لاہور کے جہانوں کا کچھ شمار نہ تھا..خطاطوں، موسیقاروں، اداکاروں..شاعروں، رنڈیوں اور رقاصاؤں، فنِ تعمیر کے ماہروں جن میں احمد لاہوری تاج محل کے نقشوں کو تخلیق کرنے والوں میں سرفہرست تھا، پہلوانوں، صوفیاء کرام، شریف بدمعاشوں کا بھی ایک جہان..اور پھر دل عُشاق کی خبر لینے والوں کا، میلوں ٹھیلوں، مذہبی ہمسائیگی، مسجدوں، گوردواروں اور مندروں کا ایک جہان..

جہان اندر جہان..نصف جہان..کس کس جہان کا تذکرہ ہو کہ یہ جہان ایک کائنات کا روپ اختیار کرتے چلے جاتے ہیں..اور ان میں ایک کتابوں کا جہان تھا..اب بھی ہے..

لکھنؤ کے منشی نول کشور اور حیدر آباد کے مکتبہ عثمانیہ کے بعد اگر پورے ہندوستان میں کوئی شہر کتابوں کی اشاعت میں ممتاز تھا تو وہ لاہور تھا.. بلکہ ان زمانوں میں انتظار حسین نے سنگ میل پبلی کیشنز کے نیاز احمد کے بارے میں کہا کہ اگر ہم آواگان پر یقین رکھتے تو لکھنؤ کے منشی نول کشور نے لاہور میں نیاز احمد کی

صورت میں دوبارہ جنم لیا..

لاہور کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اول کتاب، آخر کتاب۔ میں آگاہ ہوں کہ دنیا بھر میں جتنے بھی تاریخی اور ایسے قدیم شہر ہیں جنہوں نے تہذیبوں کو جنم دیا، جہاں کے باشندے اپنی ثقافت اور پرانے رسوم سے جڑے ہوتے ہیں وہاں کے فٹ پاتھوں پر پرانی کتابوں کے میلے سجے ہوتے ہیں، استنبول، بارسلونا اور پیرس تو میرے ذاتی مشاہدے میں آئے، پیرس کی فلی مارکیٹ کے فٹ پاتھوں پر سجی پرانی کتابوں میں سے کسی ایک کتاب پر سارتر یا کامیو کے دستخط بھی ہو سکتے تھے..لیکن لاہور کے فٹ پاتھوں پر تقریباً ہر روز اور خصوصی طور پر اتوار کے دن، پاک ٹی ہاؤس کے سامنے اور انارکلی بازار میں پرانی کتابوں کی اوپن ایئر نمائش ہوتی ہے..شاید دنیا بھر میں اور کہیں نہیں ہوتی اور اس بیان میں میری کم علمی اور لاہوری تنگ نظری کا عمل دخل بھی ہو سکتا ہے...آپ کبھی اتوار کی سویر، صبح سویرے اُدھر کا رخ کیجئے، فٹ پاتھوں، بغلی سڑکوں اور راستوں پر کیسے اہتمام سے کتابیں بچھائی جاتی ہیں اور جب ذرا دھوپ بلند ہوتی ہے تو ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں پرانی کتابیں، میگزین، مسودے، دنیا بھر کے ادیبوں شاعروں کے نایاب نسخے ایک ایسے قالین کی مانند بچھے ہوتے ہیں جس کی بُنت میں دوستوفسکی سے لے کر، آرتھر کانن ڈائل کے علاوہ دت بھارتی اور وہی وہانوی کے تب فحش قرار دیئے جانے والے ناول بھی ہوتے ہیں، اس کتاب کے فٹ پاتھی عجائب گھر کا کوئی مذہب، کوئی نظریہ نہیں ہوتا....کمیونسٹ مینوفسٹو کے برابر میں ''موت کے بعد مرنے کا منظر'' برائے فروخت ہوتا ہے..

میں نے ''راکھ'' میں انارکلی کے ایک ایسے ہی فٹ پاتھ پر سجی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے اور ہائیڈل برگ یونیورسٹی کی اردو سکالر کرسٹینا آسٹن ہیلڈ نے اس ناول کو جنوب مشرقی ایشیا کا نمائندہ ترین ناول قرار دے کر اپنے مقالے میں خصوصی طور پر انارکلی کے فٹ پاتھوں پر بچھی پرانی کتابوں والے منظر کی تحسین کی ہے..

یہ تو پرانی کتابوں کا عارضی طور پر وجود میں آجانے والا ایک اوپن ایئر عجائب گھر ہے..

لیکن اس کے سوا لاہور کے جہان میں کتابوں کے اور بھی گھر تھے، ان میں سے ایک اور گھر جو عارضی نہ تھا، وہ بھی اوپن ایئر تھا، روزانہ آباد ہوتا تھا اور شام ڈھلے بوریوں میں بند ہو کر کتب فروش کی کوٹھڑی میں چلا جاتا تھا، شب بسری کے بعد اگلی سویر پھر سے، سیتلا مندر سے بھاٹی دروازے تک، سرکلر روڈ کے کناروں پر آباد ہو جاتا تھا..اور یہاں فٹ پاتھ پر سجی پرانی کتابوں کے علاوہ نئے نکور بچوں کے ناول بھی سجے ہوتے تھے، تازہ ترین اتنے کہ اُن کے سرورق کے رنگ ابھی گیلے ہوتے تھے..کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ اُن زمانوں میں بچوں کے ناول سینکڑوں کی تعداد میں شائع ہوتے تھے اور یہ سب کے سب پریوں، بھوتوں، جنات اور دیوجات کی داستانوں پر مشتمل ہوتے تھے..تقریباً سو صفحے کا ناول، رنگین سرورق سے آراستہ، قیمت

آٹھ آنے یا دس آنے.. ''کوہ قاف کی نیلی پری''، ''حبشی دیو کا انتقام''، ''سبز پری کی موت''، ''چڑیوں کی آندھی'' وغیرہ.. میں اکثر کڑی دھوپ میں پسینے میں شرابور، آنکھیں بھی نہ جھپکتا فٹ پاتھ سے کوئی نیا ناول اٹھا کر کھڑے کھڑے پڑھ جاتا اور جب دکاندار سرزنش کرتا تو کبھی کبھار ایک ناول خرید لیتا کہ آٹھ آنے ایک بڑی رقم ہوتی تھی، اور وہ شب میں کوہ قاف کے جنوں اور پریوں کے ساتھ گزارتا.. اگلے روز وہی ناول دکاندار مجھ سے چار آنے میں واپس خرید لیتا اور میں مزید چار آنے خرچ کر ایک اور ناول لے آتا.. سرکلر روڈ کے کناروں پر منعقد کردہ اس کتاب میلے میں اگرچہ بچوں کے ناولوں کی بہتات ہوتی تھی لیکن وہاں سے ''رموزِ صابن سازی'' سیاہی بنانے کے آسان نسخے ''گھریلو چٹنیاں اور اچار'' وغیرہ کے علاوہ منٹو، اے حمید، ساحر لدھیانوی اور جوش ملیح آبادی کی تازہ ترین کتابیں بھی مل جاتی تھیں..

سرکلر روڈ کا یہ فٹ پاتھ یا وسیع کنارا جو شتیلا مندر سے بھاٹی گیٹ تک چلا جاتا تھا دراصل لاہوری ثقافت کا ایک اوپن ایئر عجائب گھر تھا.. نگار سینما کے آس پاس دنیا کے سب سے چرب زبان مجمع باز اپنی ''مصنوعات'' فروخت کرنے کے لیے مجمع لگاتے تھے.. اپنے منجن کے استعمال سے دانتوں میں سے کلبلاتے کیڑے نکالتے تھے.. سلاجیت کی افادیت بیان کرنے سے پیشتر سانپ اور نیولے کی لڑائی سے عوام الناس کی توجہ حاصل کرتے تھے اور پھر باقاعدہ پیتل کے ایک گھڑیال پر لوہے کے ایک ڈنڈے سے ضرب دے کر کہتے تھے.. ایسے ٹن ٹن کرے گا.. بچہ لوگ سمجھے گا کہ سکول میں چھٹی ہوگئی ہے.. عجیب سے سانڈھے میدان میں چھوڑ دیئے جاتے تھے اور ان کے تیل کی افادیت بیان کرنے کے لیے پھر سے گھڑیال پر منادی کی جاتی تھی..

یہاں سرکس کے بازی گر بھی اپنے کمالات دکھاتے تھے.. بانسوں پر تنے ہوئے رسّوں پر چلتی لڑکیاں چھلانگ لگا کر دھم سے آپ کے سامنے کُود کر آ جاتی تھیں اور اپنے فن کی داد ایک آنہ ایک آنہ پکارتی طلب کرتی تھیں..

مجھے کم از کم ایک ایسا مجمع باز یاد ہے جس کی ملکیت میں ایک بُھس بھرا شیر ببر تھا.. سب سے زیادہ ہجوم اس کے گرد ہوتا تھا.. وہ منہ کھولے ہوئے حیرت اور ڈر میں گُم لوگوں سے کہتا ''شیر بن جاؤ گے..''

جیسے نیو یارک میں ایک ''میوزیم مائل'' نام کی ایک گلی ہے جس میں ایک میل کے دامن میں درجنوں نایاب عجائب گھر واقع ہیں، ایسے ہی سرکلر روڈ بھی دفن ہو چکے زمانوں میں ایک ایسی ہی ''اوپن ایئر میوزیم مائل''، تھی..

اور لوہاری دروازے اور انارکلی چوک کے آس پاس متعدد تاریخی کتاب گھر ہوا کرتے تھے، اور ان میں مکتبہ جدید سرفہرست تھا، جہاں محمد حنیف رامے، سیاست دان کم اور خطاط اور دانشور بہت بلند مقام کے بیٹھا کرتے تھے اور میں نے منٹو کی کتاب ''اوپر نیچے اور درمیان'' حاصل کرنے کے لیے انہیں شاید آٹھ آنے پیشگی

ادا کیے تھے..مکتبہ جدید وہ داستانوی، اشاعت اور ادب کا ادارہ ہے جہاں جو لوگ آتے ہیں وہ سب کے سب ایک داستان ہو چکے ہیں.. سعادت حسن منٹو، ساحر لدھیانوی، سیف الدین سیف، کرشن چندر، دیوندر ستیارتھی، شفیق الرحمٰن، راجندر سنگھ بیدی..

مکتبہ جدید کے آگے جو فٹ پاتھ تھا وہاں ساغر صدیقی اپنی درویشی کے رُوپ میں براجمان ہوا کرتا تھا..میں اور یوسف کامران کبھی کبھار لوہاری کی کھیر کھانے کے بعد اُس کے پاس جا بیٹھتے..وہ کالجوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کی فرمائش پر بے دریغ غزلیں کہہ کر، فی غزل دس روپے چارج کرتا اور وہ بچے کالج کے مشاعرے میں وہ غزل پڑھ کر اول انعام کے حقدار ہو جاتے..ساغر صدیقی ہرگز مجذوب اور درویش نہ تھا، ایک ہوشیار دیوانہ تھا، اس نے درویشی کا ایک ڈھونگ رچا رکھا تھا تا کہ وہ اُس معاشرے سے الگ ہو جائے جو اُس کے بھنگ، افیون، چرس وغیرہ کے نشوں میں حائل ہوتا ہے، بے شک اس جعلی مجذوب اور نشئی کے ایک شعر نے مجھ پر تب رقت طاری کر دی جب میں ایک شرمندگی کے سناٹے میں آیا ہوا روضۂ رسول ﷺ کی جانب بڑھتا تھا..

میں نے پلکوں سے درِ یار پر دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے حرفِ صدا یاد نہیں

لوہاری دروازے کی مسجد کے پہلو میں ایک ادارہ ''شعاع ادب'' نام کا ہوتا تھا، اور وہاں ایک بھولے سے چہرے والا، کم پڑھا لکھا ایک سیلز مین ہوا کرتا تھا، کیا تب کوئی بھی تصور کر سکتا تھا کہ یہ معصوم سا نوجوان آئندہ زمانوں میں پاکستان کے سب سے بڑے اشاعتی ادارے ''سنگ میل پبلی کیشنز'' کا بانی ہوگا... اپنی سحر انگیز شخصیت سے کُل جہان کو موہ لے گا اور منشی نول کشور کے ہم پلّہ ہو جائے گا..ادیبوں کو باقاعدہ رائلٹی ادا کرے گا اور انہیں خوش حال کر دے گا..

میرے لکشمی مینشن کے فلیٹ کے عین سامنے ہال روڈ کے بس سٹاپ کے فٹ پاتھ پر جب میں تیسری منزل پر واقع اپنی کھڑکی صبح سویرے کھولتا تو نیچے مقبول احمد مقبول اُس فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں کو بچھا رہا ہوتا..وہ میرا دوست تھا، بین الاقوامی ادب کے بارے میں مجھ سے کہیں زیادہ آگاہ تھا..بلکہ مجھے مشورے دیتا کہ تارڑ صاحب..ایک فرانسیسی ناول نگار ہے جس کا نام آندرے ژید ہے، اُس کی کتاب ''اِف اِٹ ڈائی'' پڑھیے، اس کی خودنوشت ہے..مقبول احمد مقبول نے شاعری بھی شروع کر دی اور عمر بھر ہال روڈ اور مال روڈ کے سنگم پر فٹ پاتھ پر بیٹھا پرانی کتابیں فروخت کرتا رہا اور پھر مر گیا..

چونکہ میں ہال روڈ اور مال روڈ کے سنگم پر واقع اپنے ٹھکانے لکشمی مینشن تک آ گیا ہوں تو کیوں نہ اُس کے آس پاس کتابوں کا جو جہان تھا، اُسے بیان کرتا چلوں..

میں اُن زمانوں میں اور اِن زمانوں میں بھی ایک ایسا پیٹو پانڈا ہوا کرتا تھا اور اب بھی ہوں جو بانس

کی کونپلیں مسلسل جگالی کرتا ہے اور جنگل کے جنگل کھا جاتا ہے اور پھر بھی اُس کا پیٹ نہیں بھرتا..انار کلی کے فٹ پاتھ اور بیڈن روڈ کی دو عدد آنہ لائبریریاں کتابوں کے ایسے جنگل تھے جو میری چراگاہ تھے..کم از کم آنہ لائبریریوں کے دونوں جنگل تو میں مکمل چر گیا.. میں ان کا تذکرہ ایک مرتبہ پھر اس لیے کر رہا ہوں کہ یہاں صرف کتابیں کرائے پر ہی نہیں ملتی تھیں بلکہ جرائد خاص طور پر بچوں کے رسالے اور تازہ ترین کتابیں برائے فروخت بھی ہوتی تھیں، ''شمع''، ''بیسویں صدی'' اور الٰہ آباد کا ابن صفی کا ''جاسوسی دنیا'' میں یہیں سے خریدتا تھا چنانچہ لاہور کی بُک شاپس کے تذکرے میں یہ دو لائبریریاں بھی شمولیت کی حقدار ٹھہرتی ہیں..

میرے فلیٹ کے سامنے حبیب بینک کی عمارت کے نیچے، ہال روڈ کے بس سٹاپ کے فٹ پاتھ پر تو مقبول احمد مقبول کا کتابی ڈیرہ تھا، اس عمارت کے پہلو میں ایک دو چار دکانوں کی ایک گلی تھی جو مال روڈ کے ریگل بس سٹاپ کے سامنے کھلتی تھی..اس گلی میں لاہور کی سب سے مشہور اور ایک وسیع ذخیرے والی ڈاک کے ٹکٹوں کی ایک نیم تاریک دکان ہوا کرتی تھی..اُس کے بہت مہربان مزاج والے مالک ہمہ وقت ایک محدّب شیشہ آنکھوں سے لگائے ڈاک کے کسی تاریخی اور پرانے ٹکٹ پر اُسے مرکوز کیے اُس کے اسرار و رموز میں کھوئے ہوئے ملتے..میں نے زندگی میں بہت شوق پالے اور بہت سے پاپڑ بیلے اور ان میں سے ایک پاپڑ ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا بھی ہوا کرتا تھا، میری ''سٹیمپ البم'' کم از کم مال روڈ کے خطّے کی سب سے گرانقدر البم تھی..چنانچہ میں پہروں اس نیم تاریک شاپ میں بیٹھا رہتا اور اُس کے مالک میری راہبری کرتے مجھے دنیا جہان کی ڈاک کے ٹکٹوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتے..مجھے یاد ہے کہ میں نے اس شاپ سے مصری تہذیب کی نمائندگی کرنے والے نہایت دیدہ زیب درجن بھر ٹکٹ خریدے تھے جو کسی گلفام سے جزیرے کی جانب سے ایشو ہوئے تھے..ٹکٹوں کے علاوہ میری ایک اور دیوانگی بھی تھی، فرسٹ ڈے کور جمع کرنا..جب کبھی پاکستان کے ڈاک کے محکمے کی جانب سے کسی خصوصی ٹکٹ کے اجراء کا اعلان ہوتا تو اُس کے اجرا کے پہلے دن جی پی او لاہور میں صرف ایک دن کے خصوصی لفافے بھی مہیا کیے جاتے جن پر اُس ٹکٹ کی تاریخی اہمیت درج ہوتی، آپ ایسے دو چار لفافے صبح سویرے جی پی او کی مرکزی عمارت کے برآمدوں میں قطار لگا کر کھڑکی سے خریدتے، پھر ایک اور کھڑکی سے اُس روز جاری کردہ نئے ٹکٹ خرید کر لفافوں پر چسپاں کرتے اور پھر ایک اور کھڑکی..جہاں ڈاک کا ایک بابو اُن ٹکٹوں پر مُہریں ثبت کر دیتا..اور مُہر ظاہر ہے ٹکٹ کے پہلے دن کی تاریخ کی ہوتی..ان لفافوں کو فرسٹ ڈے کور کہا جاتا تھا..

میں ذرا بھٹک گیا ہوں..

میں ستتر برس کا ہو چکا ہوں اور یہ سب برس تقریباً میں نے لاہور میں بسر کیے چنانچہ جہاں کہیں، کسی کوچے یا کسی دکان پر ٹھہرتا ہوں تو وہ میرے گلے پڑ جاتے ہیں، کہاں جاتے ہو، ذرا ٹھہرو..تم یہیں ٹھہرا

کرتے تھے... شہر لاہور کی ساری گلیاں، باغ، باغیچے اور گلزار، شاہراہیں اور کوچے سب بازار اور دکانیں.. اور ان میں ورق کوبوں کی اور پتنگ سازوں کی اور گھنگھروسازوں کی دکانیں بھی شامل ہیں یہاں تک کہ وہ بوڑھی انگریز عورت جو اپنی موٹر کار میں اپنے کُتے کے ساتھ دوپہر ڈھلتے ہی، جب مال روڈ پر چھڑکاؤ ہو رہا ہوتا، بھونپو بجاتی گزر جاتی، یہ سب وہ سیلن زدہ قدیم کنویں ہیں جن کی نانک شاہی اینٹوں کی گولائی کے رخنوں میں سے پیپل کے بوٗٹے پھوٹتے ہیں اور میں ان میں سے کسی ایک متروک شدہ کنویں کی چرخڑی ذرا دقت سے گھماتا ہوں تو اُس کی گہرائی میں سے میری یادوں کے پانیوں کے کچے کُوزے لبریز لبریز برآمد ہونے لگتے ہیں..

تو میں کیسے بھٹک نہ جاؤں..

ڈاک کے ٹکٹوں کی اس نیم اندھیاری شاپ کے برابر میں صُوفی صاحب کی بُک شاپ تھی.. دکان کے مختصر پن میں نئی اور پرانی کتابوں کے انبار تھے اور اس کے باہر گلی میں ایک تختے پر تازہ ترین میگزین، جرائد اور فلمی اخبار وغیرہ بچھے ہوتے.. صُوفی صاحب کی اس بُک شاپ سے میری کچھ شیریں اور کچھ شرمندگی بھری یادیں وابستہ ہیں..

اب اُن زمانوں میں ایک اور پاپڑ بھی تھا جو میں بیلتا رہتا تھا اور یہ پاپڑ ''کامک بُکس'' کا تھا.. اور صوفی صاحب کے ہاں تازہ ترین کامک بُکس، امریکہ اور یورپ میں شائع شدہ کامک بُکس لاہور بھر میں سب سے زیادہ نظرنواز ہوتی تھیں، آج کی تو کیا مجھ سے پچھلی نسل بھی کامک بُکس کے دیوانگی آمیز رومان سے آگاہ نہ ہوگی..

یوں کہہ لیجئے کہ یہ اُن زمانوں کے ہیروز کی باتصویر داستانیں ہوا کرتی تھیں، کارٹونوں، تصویروں پر مبنی، کہانیاں ہوا کرتی تھیں اور میرے پاس ان کا ایک وسیع ذخیرہ تھا اور میرے پسندیدہ ہیرو کونسے ہوا کرتے تھے.. ہاؤہُو کرتا ٹارزن.. آنکھوں پر سیاہ نقاب جمائے، لون رینجر، گیری کوُپر کاؤبوائے، ڈریکولا اور آسٹریلیا کے وحشی قبائل.. یہ سب کچھ صوفی صاحب کی دکان کے اندر میرے لیے ایک خزانہ ہوا کرتا تھا.. اب رہی شرمندگی کی بات.. یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس اقرار سے میری ادبی شہرت کو شدید دھچکا پہنچے گا، بہت لعن طعن ہوگی، مجھے مطعون کیا جائے گا، لیکن میں اپنے آپ کو معصومیت اور ایک بے گناہ زندگی بسر کرنے والا قرار نہ دوں گا، بلکہ اقرار کرتا ہوں کہ میں نے ایک چوری کی تھی.. زندگی بھر میں پہلی اور آخری چوری.. چُرا لیا ہے جو تم نے.. نوعیت کی چوریاں اس میں شامل نہیں.. بچوں کے کسی رسالے کا سالنامہ صوفی صاحب کی دکان کے باہر سجا تھا، دس آنے کا تھا اور میرے پاس دس آنے نہ تھے، میں دیر تک اُس کی ورق گردانی کرتا رہا.. اس میں شائع شدہ کہانیاں اور رنگین تصویریں، لطیفے اور کارٹون.. میں نے بچوں کا وہ دبیز میگزین چپکے سے اپنے کوٹ کی جیب میں روپوش کیا اور گھر چلا آیا... گھر کی عافیت میں پہنچ کر اُسے کھولا تو کہانیاں اور عبارتیں دھندلا گئیں، ہر حرف

ایک بچھو ہو گیا.. میرے بدن پر رینگتا مجھے ڈسنے لگا.. میں اُس شب سو نہ سکا.. اگلی سویر پورے دس بجے جب صوفی صاحب نے اپنی بُک شاپ کھولی تو میں نے ڈرتے ڈرتے بچوں کا وہ رسالہ واپس وہیں رکھ دیا جہاں سے میں نے اُسے اٹھایا تھا... کتنے برس بیت گئے، ساٹھ سے کہیں زائد، صوفی صاحب کی بک شاپ کب کی معدوم ہو چکی لیکن آج بھی اُدھر سے گزرتا ہوں تو شرمندہ ہو جاتا ہوں..

صُوفی صاحب سے آگے مال روڈ کی جانب رُخ کیے کچھ زمانوں بعد ''کلاسیک'' نے جنم لیا، آغا امیر حسین گانٹھ کے پکے شخص تھے لیکن اُن کی دکان پر ہر شام ''سُرخوں'' اور لبرل حضرات کا اجتماع ہوا کرتا تھا، اگرچہ کبھی کبھار مختار مسعود بھی آنکلتے تھے.. بابا ظہیر کاشمیری، منو بھائی، جاوید شاہین، ڈاکٹر مبشر حسن، عابد حسن منٹو، سیف الدین سیف، احمد راہی.. ''کلاسیک'' میں آ ہی نکلتے.. چونکہ ''کلاسیک'' میں نہ صرف سُرخے پائے جاتے تھے بلکہ سُرخوں کا لٹریچر بھی پایا جاتا تھا اور آپ جانئے یہ جو ہرے ہرے سبزے ہوتے تھے یعنی دائیں بازو کے پارسا حضرات یہ سُرخ رنگ سے اتنے الرجک تھے کہ دلہن کا سرخ لباس دیکھ کر بھی غش کھا جاتے تھے، چنانچہ جمعیت کے سرفروشوں نے ''کلاسیک'' پر ہلا بول دیا، توڑ پھوڑ کی اور بے دین لٹریچر کو نذر آتش بھی کیا.. بھٹو صاحب خصوصی طور پر تعزیت کے لیے گئے اور آغا صاحب نے خصوصی طور پر ایک تصویر کھنچوائی جس میں آتش زدہ کلاسیک کی راکھ کے درمیان آغا صاحب، بھٹو صاحب کو اس عظیم سانحے کی تفصیل بتا رہے ہیں.. یہ تصویر آغا صاحب کے بہت کام آئی، انہوں نے ''کلاسیک'' کی تعمیر نو کا بیڑہ اٹھایا تو اپنی کھوکھا نما دکان کو قدرے وسیع کر لیا، یوں وہ کچھ گھاٹے میں نہ رہے..

لکشمی مینشن جسے احمد مینشن کا نام دے کر متشرع کر لیا تھا، اُس کے مال روڈ پر کھلتے رخ پر کم از کم تین نہایت تاریخی دکانیں ہوا کرتی تھیں، بیڈن روڈ کے کونے پر ''رینکن اینڈ کمپنی ٹیلرز'' کا شوروم تھا جس کے نیم تاریک اندرون کے شیشے کے شوکیسوں اور نمائش شدہ سُوٹوں، ڈنر جیکٹوں اور ہیٹوں میں ابھی تک سرکارِ برطانیہ کا راج تھا، وہاں ابھی تک گورا لوگوں کے بدنوں کی بُو اور اُن پر چھڑکے ہوئے ٹیلکم پاؤڈر کی مہک ٹھہری ہوئی تھی.. میرے ابا جی اپنے تھری پیس سُوٹ رینکن سے سلواتے اور ناپ دے کر اپنے لیے ہیٹ بنواتے..

دوسرا شورُوم ''صوبہ خان ٹیلر'' کا تھا.. لاہور بھر کی فیشن ایبل مقامی لیڈیاں یہیں سے اپنے لیڈیز کوٹ بنواتی تھیں اور انہیں پہن کر اِتراتی پھرتی تھیں.. یاد رہے کہ اُن زمانوں میں جنٹل مین موسم سرما میں اوورکوٹ پہنتے تھے جسے ''چیسٹر'' کہا جاتا تھا.. اور یہ اتنا وزنی ہوتا تھا کہ اسے کھونٹی پر لٹکانے کے لیے اس کے ساتھ ایک آہنی زنجیر منسلک ہوتی تھی.. ہم بچے یعنی پورے چھ بچے جب چیسٹر اٹھا کر ابا جی کو پہنانے کی کوشش کرتے تو وہ ہم سے اٹھایا نہ جاتا اور ہم دھڑام دھڑام ایک دوسرے پر گرتے اسے سنبھال نہ سکتے تھے، موسم سرما کے اختتام پر امی جان اُسے فینائل کی سفید گولیوں کا کفن دے کر ایک جستی صندوق میں دفن کر دیتیں.. اپنے

طور ہر ماڈرن لاہوری لڑکی صوبہ خان کا ٹیلر شدہ لیڈیز کوٹ زیب تن کرنے کے خواب دیکھتی۔

صوبہ خان کے برابر میں ''سنٹرل بک شاپ'' کا شوروم ہوا کرتا تھا جس کے مینیجر نذیر صاحب ہوا کرتے تھے.. منحنی سے، مناسب مونچھوں والے نذیر صاحب سنجیدہ گفتگو کرنے کے رسیا تھے، وہ ہومر کی منظر نگاری سے گفتگو کا آغاز کرتے، یہ جاننے کے بغیر کہ ہم سن بھی رہے ہیں یا نہیں اور پھر ادب کے سمندروں میں غوطہ زنی کرتے اپنی تان مارکس اور کارلائل پر توڑ دیتے.. میں نے اپنی زندگی کے کچھ کیف آور لمحے اسی بک شاپ میں گزارے جب کہ نذیر صاحب اپنی دھن میں مگن قدیم ادب کا کوئی بربط بجا رہے ہوتے..اُن دنوں اگر کثرت زر نہ تھی تو کچھ تنگی بھی نہ تھی چنانچہ میرے ماہانہ بجٹ میں مبلغ دوسو روپے صرف اس بک شاپ سے غیر ملکی ادب کی کتابیں خریدنے کے لیے وقف ہوتے اور آپ یقین کر ہی لیجئے کہ دوسو روپے میں اتنی ڈھیر ساری کتابیں حاصل ہو جاتیں کہ ان کے ڈھونے کے لیے ایک خچر درکار رہتا، چونکہ مال روڈ پر بار برداری کے ایک خچر کا حصول قدرے ممکن نہ ہوتا تو میں خود ہی انہیں ڈھوتا.. ''پینگوئن'' کی پیپر بیک کتابوں کی عمومی قیمت سوا سے پونے دو روپے ہوتی اور میرے پاس اب بھی آ گاتھا کرسٹی کے جاسوسی ناول اور پی جے وُڈ ہاؤس کے مزاحیہ مجموعے موجود ہیں جن پر یہی قیمت درج ہے۔ چنانچہ آپ خود حساب کتاب کر لیجئے کہ دوسو روپوں میں بھلا کتنی کتابیں خریدی جاسکتی تھیں، شاید ڈیڑھ سو کے لگ بھگ.. میری لائبریری میں کبھی جھانکئے تو وہاں چند نہایت ضخیم اور شاہکار مجلّہ کتابیں اب بھی محفوظ ہیں، مثلاً کارل مارکس کی ''داس کیپیٹل'' کمیونسٹوں کی بائبل جو میرے سر پر سے گزر گئی، نطشے کی ''دَس سپوک زرتشترا'' کارلائل کی ''فرنچ ریوولوشن'' ٹالسٹائی کی ''وار اینڈ پیس'' جسے میکملن اینڈ کمپنی لنڈن نے شائع کیا تھا اور ان سب کی قیمت مبلغ بائیس روپے آٹھ آنے..یہ نہیں کہ میں جو اتنی ڈھیر ساری کتابیں خریدتا تھا، سب کی سب پڑھ جاتا تھا..آ گاتھا کرسٹی اور وُڈ ہاؤس کو تو چاٹ جاتا تھا جب کہ دیگر کتابیں بعد کے زمانوں میں رفیق ہوتی گئیں..جب گنتھر گراس کا شعری مجموعہ ''لیوز آف گراس''..

مال روڈ کے پار جہاں بہت زمانوں کے بعد ''لارڈز ہوٹل'' قیام میں آیا وہاں نقی مارکیٹ کے پہلو میں ''انٹرنیشنل بُک ڈپو'' ہوا کرتا تھا..ویسے لاہور کی کتابوں کی دکانوں اور بک سٹور کے بیشتر لوگ، اب غور کرتا ہوں تو عجیب نامعقول سے حضرات ہوا کرتے تھے..اپنے سٹور کی کتابیں خود ہی پڑھتے رہتے تھے اور انہیں فروخت کرنے میں چنداں دلچسپی نہ رکھتے تھے.. ''انٹرنیشنل بُک ڈپو'' کے مالک بھی اسی قبیل کے تھے..قدرے گھگھیائی ہوئی آواز میں گفتگو کرتے، سیاست سے ادب کی جانب جاتے، کہیں ڈوبتے، کہیں ابھرتے اور اکثر ڈوبے رہتے، زمرد ملک کو ہارٹ اٹیک اسی بُک ڈپو میں ہوا..

زمرد ملک، انگریزی کے پروفیسر، کتابوں کا مدفن، انگریزی میں شاعری کرتے کرتے یکدم پنجابی میں شعر کہنے لگے..میں نے سبب پوچھا تو کہنے لگے، میں نے کہیں پڑھا کہ انسانوں کو اُسی زبان میں شاعری

کرنی چاہیے جس میں وہ خواب دیکھتا ہے، مجھ پر آشکار ہوا کہ میں نے کبھی انگریزی میں کوئی خواب نہیں دیکھا، سب کے سب خواب پنجابی میں آتے ہیں چنانچہ میں نے اپنے خوابوں کی زبان میں شاعری شروع کر دی.. میں اپنے اصل کی جانب لوٹ آیا ہوں..

زمرد ملک کا ٹھکانہ ''انٹرنیشنل بک ڈپو'' تھا..وہ کسی کتاب کی ورق گردانی میں گُم تھے کہ سینے میں درد اٹھا جو سنبھالا نہ گیا، فرش پر گئے، انہیں ایمبولینس میں منتقل کیا جا رہا تھا تو وہ قدرے ہوش میں آ گئے، اِدھر اُدھر ہاتھ چلا کر کہنے لگے ''وہ کتاب کہاں ہے جو میں پڑھ رہا تھا'' وہ ہسپتال کے راستے میں ہی مر گئے اور وہ کتاب اُن کے سینے پر دھری کی دھری رہ گئی..

ریگل سینما کے قریب ''امپیریل بک ڈپو'' اگرچہ ہر نوعیت کی کتابوں کا ایک خزانہ تھا لیکن کچھ پراسرار اور میری پہنچ سے باہر تھا یہ سب بک شاپس اور کتابوں کے سٹور اپنے اپنے مقام پر ادب کی دیوی کے سنہری گہنے تھے لیکن اس کے ماتھے کا جھومر گینڈر سپورٹس اور کوڈک کے شوروم کے برابر میں واقع ''فیروز سنز'' کے سوا اور کون ہو سکتا تھا..نہایت بلند چھتوں والا، خاموشی اتنی کہ کتابوں کے اوراق پلٹتے ہوئے ان کی سرسراہٹ بھی ناگوار گزرتی..اور پھر شائع شدہ حرفوں اور جس کاغذ پر وہ حرف ثبت ہیں ان کی خوشبو..

ایک سادہ کاغذ سے جب ایک سیاہ رنگت کی سیاہی ملاپ کرتی ہے تو وہ وصلِ یار کی گیلی مہک سے کہیں بڑھ کر سرخوشی اور دیوانگی کے جھرنوں کا سبب بنتی ہے... ہر دیوانگی اور عشق کا آغاز سُونگھنے اور گیلاہٹ سے ہوتا ہے..

کسی بھی سفید کاغذ پر جب کسی چھاپہ خانے میں پرنٹنگ اِنک کی چھاپ ثبت ہوتی ہے اور وہ کاغذ باہر آتا ہے تو وہ ایک تازہ پُھول کی مانند ہوتا ہے، صرف گیلے ہوتے ہیں اور اُن میں ایک خاص مہک ہوتی ہے..اُن زمانوں میں صرف ہینڈ پریس پرنٹنگ مشینیں ہوا کرتی تھیں جن کے مسلسل کھلتے اور بند ہوتے جبڑوں میں مشین مین کاغذ جماتا تھا اور جب اُس کے جبڑے بند ہو کر دوبارہ کھلتے تھے تو وہ پُھرتی سے وہ پرنٹ ہو چکا کاغذ نکال لیتا..اکثر اوقات مشین مین کے ربط میں کچھ خلل پڑتا اور اُس کا ہاتھ اُن جبڑوں کی گرفت میں آ کر اپنی ایک آدھ انگلی کھو بیٹھتا..چونکہ ابھی آٹومیٹک کئی رنگ یک بار چھاپنے والی پرنٹنگ مشین ایجاد نہ ہوئی تھیں جن کے اندر ایک خودکار نظام ایسا ہوتا ہے کہ پرنٹ شدہ حروف فوراً خشک ہو جاتے تھے چنانچہ اکثر ان شائع شدہ کاغذوں کو دھوپ میں سکھایا جاتا..

چیمبرلین روڈ والے گھر کے برابر میں ایک مختصر سا پرنٹنگ پریس ہوا کرتا تھا..اور وہ بھی نیم تاریک اور قدرے پراسرار ہوا کرتا تھا.. وہاں نہ صرف گھٹیا رنگوں کے سستے عید کارڈ چھپتے بلکہ سو روپے کے نمائشی قائداعظم کی تصویر والے نوٹ بھی ہو بہو پرنٹ ہوتے اور ان پر ''عید مبارک'' لکھا ہوتا..عید کے موقع پر جب

کسی کو یہ نوٹ بھیجا جاتا تو وصول کنندہ کا دل دھک سے رہ جاتا کہ سو روپے کا نوٹ، ان زمانوں میں رنگین دُموں والے نایاب پرندے تو کبھی کبھار باغ جناح کے کسی قدیم شجر میں سے جھانکتے دکھائی دے جاتے، سو کا نوٹ کم ہی دکھائی دیتا.. میں اُس پرنٹنگ مشین کے پہلو میں ایک بنچ پر بیٹھا مشین مین کا چھوٹا، ایک معاون ہو جاتا اور ہر نمائشی نوٹ کو وصول کر کے اُسے پہلے سونگھتا، گیلے حروف کا نشہ کرتا اور پھر اسے ایک ترتیب سے ٹرے پر پھیلا دیتا..

ابا جی کبھی باقاعدگی اور اکثر بے قاعدگی سے زراعت کے بارے میں اپنا پرچہ ''کاشت کار جدید'' برسوں نکالتے رہے، اِس میں نہ صرف تازہ ترین بین الاقوامی زراعتی تحقیق کے بارے میں ابا جی کے تحریر کردہ مضامین ہوتے بلکہ ہماری فرم ''کسان اینڈ کمپنی'' کے منیجر مولوی ابراہیم عاصی اور حفیظ جالندھری کی شاعری بھی ہوتی، کبھی کبھار ابا جی اپنی زندگی کی ابتدائی جدوجہد کے بارے میں نہایت پراثر مضامین بھی تحریر کرتے ''کاشت کار جدید'' کے کاتب محمد صدیق جو کالوی تھے، جو ہمہ وقت ایک کیکڑا حالت میں ٹانگیں سکیڑے زرد کاغذ پر اس کی کتابت کرتے رہتے، اور جب بھی ''کاشت کار جدید'' کا تازہ شمارآتا میں ہمیشہ اُسے سونگھتا، سیاہ حرفوں میں سے جو خوشبوآتی وہ مجھے مسرتوں کے خبط سے شرابور کر دیتی..

میں پھر بھٹک گیا..

''فیروز سنز'' لاہور میں کتابوں کا سب سے وسیع اور پراسرار شوروم.. انگریزی محاورے کے مطابق ایک پن یا سوئی بھی گرے تو اُس کی خاموشی میں خلل آ جائے... میری ایک اور شکارگاہ.. ہمیشہ جو شے بہت نایاب اور پرکشش ہو اسے یا تو نظر لگ جاتی ہے یا آگ لگ جاتی ہے.. خود سے لگ جاتی ہے یا لگائی جاتی ہے.. ''فیروز سنز'' کو بھی نہ صرف نظر بلکہ آگ بھی لگ گئی، وہاں اب بھی ایک مختصر سا کتابوں کا شوروم تو ہے پر میں اس کے اندر نہیں جاتا.. ایک گھنا پرانی یادوں کا جنگل جل جائے اور اُس میں چہکتے کوکتے پرندے بھسم ہو جائیں تو اگر وہاں اُس کے کھنڈروں میں اگر ایک شجر رہ گیا ہو، صرف ایک پرندہ بچ گیا ہو تو اُس ایک شجر اور ایک پرندے کو کیا دیکھنا..

میں فیروز سنز کی بلند چھتوں والے شوروم میں اپنے گھر لکشمی مینشن سے اُس شام چلتا داخل ہوتا ہوں اور کتابوں کے اس معبد کی خاموشی میں شامل ہوتا ہوں.. اور تب سامنے سے کتابوں کے شیلفوں میں سے وہ یوں ظاہر ہوتی ہے جیسے جزیرہ میلو کی وینس پانیوں میں سے ظاہر ہوئی تھی.. سرو قامت، خوش نگاہ، خوش انداز، وارث شاہ کی جٹی ہیر کی تصویر، تفسیر.. ایک بے دھڑک صاحباں، ایک سوہنی کمہارن اور وہ میری جانب چلی آ رہی ہے..

''سوری، میں مخل ہوئی ہوں، میں رہ نہ سکی.. آپ میرے پسندیدہ اداکار ہیں، ''نواب سراج الدولہ''

میں آپ کی اداکاری نے مجھے بے حد متاثر کیا.."

اور یہ طاہرہ سیّد تھیں، جنہوں نے ابھی حال ہی میں اپنی ماں کے گائے ہوئے، حفیظ جالندھری کے گیت "ابھی تو میں جوان ہوں" ایک مختلف اور گہری آسودگی کے انداز میں گایا تھا، پی ٹی وی کے شہنشاہ نواب نے طاہرہ کو ایک سنہری فریم میں تصویر کیا اور وہ تصویر لوگوں کے دلوں میں تصویر ہوگئی.. جی ہاں یہ وہی شہنشاہ نواب ہیں، نستعلیق، کھلنڈرے، گورے چٹے، بھاری مونچھوں والے "ارے صاحب، ارے تارڑ صاحب" کہنے والے لکھنؤ کے کھنڈروں کی ایک اینٹ.. وہ پروگرام منیجر تھے جب ایک فون آتا ہے کہ "میں ملکہ پکھراج بول رہی ہوں.. آپ کون ہیں؟"

"میں شہنشاہ نواب بول رہا ہوں.."

ملکہ نے شدید خفا ہو کر فون بند کر دیا.. شکایت کی کہ وہاں ٹیلی ویژن پر کوئی بدتمیز اور ناہنجار شخص ہے، میں نے کہا کہ میں ملکہ بول رہی ہوں تو اُس نے کہا کہ میں شہنشاہ بول رہا ہوں..

شہنشاہ نواب نے ہاتھ باندھ کر معافی مانگی اور کہا کہ.. میں کیا کروں کہ میں واقعی شہنشاہ ہوں..

امریکہ میں طاہرہ سیّد کے لونگ آئے لینڈ والے پرفضا گھر میں ایک شب، گھر کے باہر جو جنگل اُمڈتے آتے تھے اور ان میں جگنوؤں کی ایک بارات اتری ہوئی تھی، میں اور میمونہ، طاہرہ کے مہمان تھے جب ہم نے اُن زمانوں کو یاد کیا، فیروز سنز میں پہلی ملاقات کو یاد کیا..

طاہرہ کا ملکوتی حسن اب بھی لشکارے مارتا ہے جیسے حیات کے کھنڈروں پر کبھی کبھار بجلی کوند جاتی ہے... کھنڈر تو فیروز سنز بھی ہو چکا.. انارکلی کے داخلے پر اورینٹل کالج کی جانب جاتی سڑک کی نکڑ پر "نسیم بک ڈپو" ہوا کرتا تھا، جہاں بہت کچھ آسانی سے دستیاب تھا، عورتوں کے ناول، ڈائجسٹ، فلمی رسالے، شمع کے معمے، بچوں کے ناول وغیرہ.. بہت بعد میں کھلا کہ مختصر قد کے نسیم کسی زمانے میں مسلم ماڈل ہائی سکول میں میرے ہم جماعت رہے ہیں.. وہ میرے پہلے سفرنامہ "نکلے تری تلاش میں" کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی تمنا رکھتے تھے لیکن میں خالد سیف اللہ کے "التحریر" کی جانب، اباجی کی سفارش پر چلا گیا..

"نسیم بک ڈپو" سے ایک دو دکانیں چھوڑ کر.. اورینٹل کالج کی جانب ایک بے نام دکان ہوا کرتی تھی جس کے تھڑے پر ہر نوعیت کے رسائل نمائش پر ہوتے تھے اور یہ ایک نہایت سیاہ خضاب زدہ مولانا جن کے سر پر ایک دھاری دار پگڑی ہوا کرتی تھی، کی دکان تھی.. میں سکول جاتے پھر آتے اس دکان پر ٹھہرتا.. یہ دکان اس لیے بھی میری یادداشت میں نقش ہو چکی ہے کہ میں نے بچوں کے رسالے "کھلونا" دہلی کو ایک بچوں کا افسانہ "آوارہ" نام کا ارسال کیا.. بہت منتظر رہا اور پھر ایک سویر مولانا کے تھڑے پر تازہ ترین "کھلونا" دھڑکتے دل سے کھولتا ہوں تو اُس میں میری کہانی چھپی ہوئی ہے اور اُس کے اوپر میرا نام لکھا ہوا ہے.. لکھا نہیں

پرنٹ شدہ ہے.. اور اپنے نام کو چھپا ہوا دیکھنا زندگی میں پہلی بار، کیسا خمار اندر خمار تھا.. بہت برسوں بعد جب میرے سفرنامے اور ناول چھپتے ہی گئے تو اُن کے سرورق پر درج میرا نام تو تھا پر پھر کبھی نہ میں اُس اولین خمار سے آشنا ہوا اور کوئی ایسی رات آئی جب مجھے نیند نہ آئی کہ کیا ''کھلونا'' کے ہزاروں رسالوں میں، ہزاروں مرتبہ میرا نام شائع ہوا ہوگا..

نہ کبھی کہیں زندگی میں پہلی مرتبہ ایک رسالے میں چھاپا گیا تمہارا نام بُھولتا ہے اور نہ ہی زندگی کا پہلا بوسہ..

''نسیم بک ڈپو'' اور مولانا کی دکان کے درمیان میں ''مکتبۂ کارواں'' ہوا کرتا تھا۔ فیض صاحب دوستی نبھانے والے ایک ملنگ بابے تھے، ان کے سب کلام ''مکتبۂ کارواں'' نے شائع کیے اور بہت بُرے شائع کیے.. بُری کتابت اور بُری اشاعت.. فیض صاحب کہیں اور نہ گئے ''مکتبۂ کارواں'' سے بے وفا نہ ہوئے..

ٹولنٹن مارکیٹ کے چوک سے جب آپ انارکلی کی جانب چلتے تھے تو اس بازار میں بھی چند تاریخی بک ڈپو سٹور تھے اور ان میں سرفہرست ''بائبل سوسائٹی'' تھا، اسے کوئی مشنری ادارہ چلاتا تھا اور اس کے اندر ترتیب اور آرائش میں ایک خاص یورپی تنظیم تھی، ظاہر ہے وہاں بائبل کے مختلف نسخے بھی نمائش پر ہوتے تھے، مسیحی دینی کتابیں بھی کثرت سے ہوتی تھیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پُرنور شبیہیں اور صلیبوں کے عکس دیواروں پر آویزاں ہوا کرتے تھے.. یہاں بائبل کے انگریزی نسخوں کے علاوہ اردو ترجمے بھی دستیاب تھے، بائبل کو پنجابی میں شاید پہلی بار جوشوا فضل الدین نے ترجمہ کیا اور وہ پنجابی زبان کے اہم ادیب تھے.. یہاں پر تاک کاشمیری کی نہایت اعلیٰ اردو شاعری کے مجموعے بھی دستیاب ہوتے تھے، یہ حضرت تاک ایک اعلیٰ ظرف پادری تھے، ان سے کچھ ملاقاتیں چرچ روڈ پر واقع ان کی پرفضا رہائش گاہ میں ہوئیں.. ''بائبل سوسائٹی'' میں صرف مسیحی لٹریچر ہی نہیں، دنیا بھر کے ادب کی کتابیں بھی نمائش پر ہوتیں..

اس بازار میں جہاں ''ویسٹ اینڈ واچ کمپنی'' اور ''پنجاب سٹیشنری مارٹ'' ایسے شاندار شوروم تھے وہاں ایک شوروم کتابوں کا ''آئیڈیل بک ڈپو'' نام کا بھی تھا اور اس کی قدیم چھتوں کی اونچائی اور پرسکون ماحول میں کتابوں کی مہک ''فیروز سنز'' سے کم نہ تھی.. اگرچہ یہ ایک نک چڑھی دکان تھی اور ہم ذرا جھجکتے ہوئے ہی اس میں داخل ہوتے..

میں نے اپنے ناول ''اے غزالِ شب'' میں میکلوڈ روڈ سے کیتھڈرل کے پہلو میں سے گزرتی مال روڈ کے ہائی کورٹ چوک تک جاتی اُس سڑک کا خصوصی تذکرہ کیا ہے جہاں ''پیپلز پبلشنگ ہاؤس'' کا کتابوں کے انباروں سے بھرا کتاب گھر تھا اور وہاں ہمیشہ رؤف ملک صاحب ہوا کرتے تھے، شُنید ہے کہ وہ اب بھی ہیں بلکہ یقیناً ہیں کہ پچھلے برس ایک ادبی محفل میں وہ میرے پاس آ گئے اور بے وجہ شکر گزار ہوئے کہ میں نے

اپنے ناول میں اُن کا اور ان کے کتاب گھر کا ذکر کیا تھا..

''پیپلز پبلشنگ ہاؤس'' نہ صرف مقامی سُرخوں کا ڈیرہ ہوا کرتا تھا بلکہ سرخ سماج کی ترویج کرنے والی ادبی اور نیم ادبی کتابوں کا ایک ایسا شہر ہوا کرتا تھا جہاں سے آپ روسی ادب کے اردو تراجم، نہایت اعلیٰ اشاعت کے، اتنی کم قیمت میں خرید سکتے تھے کہ آپ کو شرمندگی ہوتی تھی..ادب کے علاوہ آپ لینن کے افکار پر مشتمل درجنوں ضخیم جلدوں پر مشتمل پورا سیٹ کوڑیوں کے بھاؤ حاصل کر سکتے تھے..آپ نہایت آسانی سے لینن کے اس سیٹ کو دکان سے باہر آکر ردی میں فروخت کر کے معقول منافع کما سکتے تھے، میرے کچھ دوست اپنے آپ کو انقلابی ثابت کرنے کے لیے لینن کے اقوال اور تقریروں پر مشتمل یہ ضخیم سلسلہ اپنی لائبریری کی شیلفوں میں سجا کر لینن کے انداز میں اُفق کے پار سرخ سویرے کے طلوع کے منظر دیکھتے ہوئے تصویریں اُترواتے تھے اور حرام ہے ان میں سے کسی ایک نے بھی ان کتابوں کے سرورق دیکھنے کے بعد کوئی ایک ورق پلٹا ہو...ویسے میرے بیشتر دوست بدقسمتی سے سُرخے تھے، آج کے زمانوں کی بدزبانی میں انہیں کمبخت لعین، لبرل اور سیکولر وغیرہ کے القابات سے نوازا جاتا ہے...ظاہر ہے میں بھی کچھ کچھ سرخ رنگ میں رنگا گیا تھا، بقول شاہ حسین، اساں اندر باہر لال ہے، ساہنوں مرشد نال پیار ہے..لینن اگرچہ کب کا مسمار ہو چکا، اس کے ہم وطن اسے تیاگ چکے..اس کے مجسّموں کو پگھلا کر ان سے صلیبیں ڈھالنے کا دور آ چکا..لیکن ولاڈے میر لینن آج بھی ایک پسندیدہ ترین شخصیت میرے لیے ہے..کیوں ہے، اس کی تفصیل میں کیا جانا، کیا تاریخ میں کبھی ایک ایسا شخص ہوا جس نے روسی زاروں کے تخت گرا دیے، تاج اچھال دیئے اور ذلتوں کے مارے لوگوں، ظلم کی چکی میں پسے اور جانوروں کی مانند اپنے زاروں کی اطاعت کرتے لوگوں کے لیے ایک سرخ خواب کا خواب دیکھا، بے شک اس کا نظام دھڑام سے آ گرا لیکن اس نے کوشش تو کی..

ہم لوگ جو کتابوں کے دیمک تھے ہمارے لیے ''پیپلز پبلشنگ ہاؤس'' ایک ایسا گلزار تھا جہاں سے ہم چند ٹکوں میں لیوٹالسٹائی، دوستووسکی، پُشکن، چیخوف، گورکی، سرفتنوف، شولوخوف..اور ترگنوف کے ادب کے جہان حاصل کر لیتے تھے...

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے سامنے ''قومی کتب خانہ'' ہوا کرتا تھا جو نسیم حجازی کے ناول شائع کر کے نامور اور متمول ہوا..اُسی کتب خانے نے بچوں کا ایک باقاعدہ ناول ''پانی کے بچے'' انگریزی سے اردو میں منتقل کر کے شائع کیا..نہایت دل کش اشاعت اور باتصویر..ہم بھی تو اُن زمانوں میں بچے ہوا کرتے تھے، ہم اس ناول کے فریب میں ایسے مبتلا ہوئے کہ خوابوں میں زیرآب تیرتے پھرتے ''قومی کتب خانہ'' کی بالائی منزل پر بچوں کے فیورٹ میگزین ''ہدایت'' کا دفتر ہوا کرتا تھا..اُن دنوں نظر زیدی اس کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے اور میں اکثر اوٹ پٹانگ کہانیوں اور لطیفے وغیرہ لکھ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا..بہت

زمانوں بعد ایک بوڑھا اور لاچار شخص، زمانے کے ہاتھوں شکست خوردہ ایک محفل میں میرے پاس آتا ہے ''تارڑ صاحب.. آپ نے مجھے پہچانا نہیں.. میں نظر زیدی ہوں.. میں فخر سے کہتا ہوں کہ میں نے ''ہدایت'' میں تارڑ صاحب کی اولین تحریریں شائع کیں..''

شیخ مبارک علی اور شیخ غلام علی کے نام بھی کتابوں کی اشاعت اور ادب کی ترویج سے جدا نہیں ہو سکتے..

تب ''دین گارڈ'' جو شاید نجم سیٹھی کا بچہ تھا اور ''ماورا'' جسے خالد شریف نے جنم دیا تھا، ظہور میں آئے..

مزنگ کی ٹمپل روڈ پر واقع ''بک مارٹ'' اس لیے بھی لاہور کی نظر میں آیا کہ وہاں فارغ اوقات میں، محمد سلیم الرحمٰن، ذوالفقار احمد تابش اور گیلانی صاحب نشست کرتے تھے..

آج کے زمانوں میں دو ایسے شاندار اور روایت سے منحرف ہونے والے کتابوں کے شوروم قیام میں آئے جن کے خصوصی تذکرے کے بغیر لاہور کی کتابی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی..

اُن میں ایک تو گلبرگ کے مین بلیوارڈ پر قائم شدہ ڈاکٹر ناصر کا عجوبہ شوروم ''ریڈنگ'' ہے جس نے کتاب کی ثقافت کو ایک مرتبہ پھر رائج کر دیا.. ناصر کا کہنا ہے کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اگر کتابوں کا ایک ماحول تخلیق کیا جائے، جہاں لوگ ایک سہولت آمیز آب و ہوا میں کتابوں کے درمیان کچھ وقت گزار سکیں تو اہل لاہور کتابیں خریدیں گے.... ''ریڈنگ'' کے باہر کاروں کو پارک کرنے کے لیے جگہ نصیب نہیں ہوتی وہاں کتاب کیڑوں کا اتنا ہجوم ہوتا ہے..

اور دوسرا شوروم لوئر مال پر واقع ''سنگ میل پبلی کیشنز'' کا ہے جو وُسعت اور کتابوں کے تنوع میں فیروز سنز کی ہمسری کرتا ہے.. یہاں نہ صرف سنگ میل کی شائع کردہ کتابیں بلکہ دنیا بھر کی کتابیں قطار اندر قطار شیلفوں میں آراستہ نظر آتی ہیں.. بلاشبہ یہ شہر لاہور میں کتابوں کا سب سے بڑا عجائب گھر ہے، اس کی سب سے بڑی خامی بس یہی ہے کہ ایک پورا سیکشن میری کتابوں کے لیے مخصوص ہے.. جب وہ حیات تھے، سنگ میل کی بنیاد رکھنے والے نیاز احمد اور آج ان کے بیٹے افضال احمد، میری ادبی اور ذاتی حیات کو سہارا دینے والے ایسے ستون ہیں جن کے بغیر میں کب کا ڈھے چکا ہوتا..

بے شک لاہور میں ایسے بے شمار کتاب گھر ہوں گے جن کا تذکرہ نہیں ہوا، صرف اس لیے ''لاہور آوارگی'' میں، میں نہ صرف ان مقامات، تاریخی اہمیت کی عمارتوں، عورتوں، خوراک خانوں اور کتاب گھروں کی یادوں کی بادبانی کشتیوں کو یادداشت کے اداس سمندروں میں رواں کیا ہے جو میرے ذاتی تجربے میں آئیں ورنہ شہر لاہور کے سمندر بے شمار ہیں، اور وہاں کیسے کیسے رنگین بادبانوں والی کشتیاں تیرتی پھرتی ہیں تو اُن سب کا

بیان کیسے ممکن ہے...

لاہور شہر کی وہ کونسی گلی تھی، کونسا کوچہ اور محلہ تھا جہاں کتابوں کی کوئی دکان، کوئی لائبریری نہ ہوا کرتی تھی..

آج کا لاہور، ہلاکو خان کا شہر ہے..کتابیں آگ کے سپرد ہو گئیں، بک سٹور اور کتاب گھر دفن کر دیئے گئے اور باقی کیا بچا.صرف راکھ!



''فادر آف لاہور'' سر گنگا رام اور لاہور کے دیگر مُحسن''

میں نے اسی کتاب کے کسی مضمون میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ تاریخی شہروں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، البتہ اُس کے شہریوں کے مذہب بدلتے رہتے ہیں..ان شہروں کا اگر کوئی مذہب ہوتا ہے تو وہ ان کی تاریخ، تمدن اور روایات ہوتی ہیں..قرطبہ ایک زمانے میں ایک رومن شہر، پھر عیسائی، پھر مسلمان اور پھر عیسائی..شہر کی ایک نسبتاً بلند سطح پر دریائے وادی الکبیر کے کناروں پر کبھی ایک رومن معبد ہوا کرتا تھا، پھر اُسی کے کھنڈروں پر ایک عظیم کلیسا تعمیر کیا گیا، افریقہ سے مُور آئے تو انہوں نے اسی مقام پر ایک ذی شان مسجد تعمیر کی، مُور گئے تو اسی مسجد کے ایک حصے کو مسمار کر کے وہاں ایک پُرشکوہ چرچ کے درودیوار سر بلند ہوئے..لیکن ان تمام زمانوں میں قرطبہ کی روح وہی رہی جو روزِ ازل سے تھی اُس میں کچھ تبدیلی رونما نہ ہوئی اگرچہ اس شہر نے اپنے اوپر بیت چکے تمام ادوار کی ثقافت اور طرز تعمیر کو اپنے اندر جذب کر لیا..اسی طور دمشق، تبریز، استنبول، قاہرہ، ایتھنز اور روم وغیرہ کے بارے میں تاریخ کے اسی تسلسل کو دوہرایا جاسکتا ہے..

شہر لاہور کا بھی کوئی مذہب نہیں ہے..اس کے باسی مذہب بدلتے رہے لیکن لاہور کی روح بھی وہی رہی جو ازل سے تھی..اگرچہ یہ راجہ رام چندر کے بیٹے لوہ کے نام سے منسوب ہے لیکن اول اول یہ ایک جین شہر ہوا کرتا تھا..ہم نے کسی اورنج ٹرین کی روانی کے لیے اس شہر کے سب سے قدیم جین مندر کے بچے کھچے آثار بھی، کسی شرمندگی کے بغیر مسمار کر دیئے..صرف بھابھڑا کا علاقہ بلکہ اُس کا بس سٹاپ ہمیں لاہور کے جین عہد کی یاد دلاتا ہے..پھر ایک طویل عرصے تک اور یہ اُس کا قدیم ترین سنہری دور تھا، یہ شہر راجپوتوں کے زیرنگیں آیا..یعنی ہندو راجپوتوں کی شاندار سلطنت ہوا اور ان میں راجہ جے پال اور آنند پال جیسے حکمران تھے جو غزنی کے سلطان محمود کی سپاہ سے برسرپیکار رہے..آنند پال کو پشاور کے قریب کہ تخت لاہور وہاں تک بچھا ہوا تھا اس لیے شکست ہوئی کہ جب وہ یہ جنگ جیتنے کو تھا تو اُس کے حلیف ہندو راجوں نے جان بوجھ کر پسپائی اختیار کی، اُس کا ساتھ اس لیے چھوڑ گئے کہ اُنہیں خدشہ تھا کہ محمود غزنوی کے خلاف اگر وہ یہ جنگ جیت گیا تو وہ خطے کا سب سے طاقتور حکمران ہو جائے گا اور پھر اُن کے علاقوں پر بھی قابض ہو کر اُن کی مہاراجگی چھین لے گا..

آنند پال میدان جنگ سے جان بچا کر فرار ہو گیا..واپس لاہور آیا اپنی رعایا سے شکست کے لیے معافی کا

خواستگار ہوا کہ مجھے ایک راجپوت ہونے کے ناتے میدان جنگ میں مارا جانا قبول تھا لیکن میں صرف اس لیے وہاں سے فرار ہوا تا کہ آپ کے سامنے پیش ہو کر شکست کی شرمندگی کا اظہار کروں اور آپ کے سامنے اپنے آپ کو موت کے سپرد کر دوں.. آنند پال نے اپنا شاہانہ لباس زیب تن کیا، زیور پہنے اور لوہاری دروازے سے نکل کر پیپل کے ایک قدیم شجر تلے، اپنے بدن پر تیل چھڑک کر اپنے آپ کو سپردِ آتش کر دیا، جل مرا.. پیپل کے اُس پیڑ کے بہت سے بُوٹے اب بھی دروازے کے باہر موجود ہیں..

ظہیر الدین بابر اور شیر شاہ سوری کی مانند محمود غزنوی بھی لاہور سے بے پناہ نفرت کرتا تھا.. بلکہ سُوری نے دم مرگ یہ کہا تھا کہ میری آرزو تھی کہ میں شہر لاہور کو برباد کر دیتا، اس پر ہل چلوا دیتا. صرف اس لیے کہ باہر سے جتنے بھی حملہ آور ہندوستان کی سونے کی چڑیا پر حملہ آور ہوتے تھے وہ لاہور میں پڑاؤ کر کے اپنی تھکن اتارتے، یہاں کے تیر گروں، کمانگروں اور تلوار سازوں کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر سیدھے دلّی پہنچ کر اسے فتح کر لیتے.. محمود غزنوی، بابر اور سُوری سے پہلے آیا. محمود غزنوی نے بابر اور سُوری کی آرزو پوری کر دی اور لاہور پر ہل چلوا کر اسے تباہ کر دیا اور اس کے کھنڈروں پر اپنے محبوب ایاز کو حکمران کر دیا... ایاز جو شاہ عالمی دروازے کے اندر رنگ محل مشن ہائی سکول کے سامنے شیخ ایاز کے نام سے دفن ہے، وہ لاہور کے عشق میں مبتلا ہوا.. وہ ایک غلام تھا اُسے ایک شاندار شہر کی غلامی کی بربادی پسند نہ آئی چنانچہ اُس نے اس شہر کو دوبارہ تعمیر کیا.. گلی کوچے، کٹڑیاں، محلے، شاہانہ رہائش گاہیں اور حویلیاں جو خاک ہو چکی تھیں، انہیں اُن کی خاک میں سے دوبارہ سر بلند کیا.. وہ سب لاہوری جو اپنے شہر کے برباد ہونے پر آس پاس کے دیہات اور قصبوں میں منتقل ہو چکے تھے وہ سب ایاز کی درخواست پر اپنے شہر کو پھر سے آباد کرنے کے لیے لوٹ آئے اور لاہور پھر سے لاہور ہو گیا..

ایاز لاہور کے محسنوں میں سے ایک ہے.. اگر یہ غلام نہ ہوتا تو شاید آج کا لاہور بھی نہ ہوتا... بے شک حکمران مسلمان تھا لیکن لاہور کی غالب آبادی ہندو راجپوتوں کی تھی، جے پال اور آنند پال کی شجاعت کی وارث تھی.. لاہور مجموعی طور پر بیشتر اوقات ایک ہندو شہر رہا... تب یہ مغل سلطنت کا دلّی کے بعد سب سے اہم شہر ہوا یہاں تک کہ اکبر اعظم نے اسے بہت سے برس اپنی سلطنت کا صدر مقام قرار دے کر لاہور کے شاہی قلعے میں سکونت اختیار کی.. مغل اعظم اپنی سلطنت کے شمال میں جو بغاوتیں اٹھتی رہتی تھیں ان کی سرکوبی کی خاطر لاہور آ مقیم رہا.. اگرچہ اُس کا چہیتا بیربل، سوات میں یوسف زئی پٹھانوں کے خلاف لڑتا ہوا ہلاک ہو گیا. ہم زمانوں کو مختصر کرتے ہوئے پنجاب کے سب سے سنہری دور، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکمرانی تک آ جاتے ہیں، تب یہ ایک سِکھ شہر ہو گیا... سِکھ سرداروں نے لاہور میں درجنوں ذی شان حویلیاں تعمیر کیں اور ان میں حویلی دھیان سنگھ اور حویلی نونہال سنگھ ابھی تک اپنی شان و شوکت کے زوال میں موجود ہیں.. کھڑک سنگھ کی حویلی اور

باغ..لال حویلی جو میرے ناول ''راکھ'' میں تذکرہ ہوئی اُس کے درمیان میں شالیمار باغ جیسے فوارے اُبلتے تھے..سردار ہیرا سنگھ کی حویلی تعمیر ہوئی تو بعدازاں یہ علاقہ ہیرا منڈی کہلایا..

بنیادی طور پر لاہور ایک ہندو یا سِکھ شہر تھا..ایک دو کے سوا اس کی تمام یادگاریں اور عمارتیں ہندوؤں بلکہ سکھوں کی تعمیر کردہ تھیں..شنید ہے کہ یہ شہر محض اس لیے پاکستان کے حصے میں آیا کہ ایک تو پاکستان کے حصے میں کوئی شہر نہ آتا تھا.کراچی، مچھیروں کی ایک بستی تھی، کوئٹہ، پشاور یا حیدرآباد ہندوستان کے حصے میں آنے والے درجنوں بڑے شہروں کے سامنے نہایت معمولی تھے تو.شنید ہے کہ لاہور کو پاکستان میں شامل کرنے کے لیے صرف اس شہر میں آباد لوگوں کے مذہب کو ترجیح نہ دی گئی بلکہ اس کے نواح میں جتنی بھی آبادیاں تھیں ان کی رائے شماری لی گئی اور وہاں مسلمان آباد تھے..

لاہور کے ہندو، اب تک لاہور کے لیے روتے ہیں اور ہم گورداسپور اور امرتسر وغیرہ کو روتے ہیں..

ہم جب چیمبرلین روڈ پر واقع ایک شاندار بالکونیوں اور چھجوں اور بلند مٹیوں والے مکان میں 1947ء کے زمانوں میں رہا کرتے تھے تو ہمارے آس پاس، کرشن گلی، گاندھی سکوئر، نسبت روڈ اور گوروارجن نگر ایسے ہندو اور سِکھ محلے تھے اور ہم وہاں دو چار ہی تھے، اندرون شہر بھی ہندوؤں کی اکثریت تھی، صرف موچی دروازے کے اندر بہت جی دار مسلمانوں کے کچھ محلے تھے، اگرچہ غربت میں تھے، اس صورتحال میں اگر جتنے بھی لاہور کے محسن اور خلق خدا کی خدمت کرنے والے ہوئے اور وہ سب کے سب غلام رسول تارڑ کے سوا ہندو اور سِکھ ہوئے تو یہ ایک قدرتی وقوعہ تھا، انارکلی بازار میں جتنی بھی سودوسودکانیں تھیں اگر ان میں صرف تین چار مسلمانوں کی تھیں تو اس پر حیران ہونے کی کچھ گنجائش نہ تھی..مسلمانوں کی اسی زبوں حالی اور پسماندگی کے تسلسل کے باعث بابا جناح نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا کہ وہ متحدہ ہندوستان میں یونہی پسماندگی کا شکار رہیں گے، بھوکے مرتے رہیں گے، ہندوؤں کی فراست اور چالاکی کے مقابلے میں ہارتے چلے جائیں گے..

مجھے پوچھئے تو لاہور کے سب سے بڑے محسن، اس شہر کے عشق میں مبتلا دو شخص تھے، سر گنگا رام اور بھائی رام سنگھ.

جن گزر چکے زمانوں میں، میں صبح کی نشریات کی میزبانی کیا کرتا تھا، میرے پروگرام میں ایک مختصر ڈاکومنٹری دکھائی گئی..اور کیا دیکھا یا دکھایا گیا اسے بیان کرتا ہوں..

گندم کے کھیتوں کا ایک سنہری جہان تاحدِ نظر پھیلا ہوا ہے اور اُس کے سنہری پن میں نارتھ ویسٹرن ریلوے کے دو ڈبے، مسافروں سے بھرے حرکت کر رہے ہیں، گندم کے سنہری سِٹوں کو چیرتے ریلوے کے دو ڈبے..اور اُن کے آگے کوئی ریلوے انجن نہیں، گھوڑے ہیں..پٹڑی ریل کی ہے، ریل کے ڈبے ہیں پر اُنہیں کوئی چھک چھک کرتا انجن نہیں کھینچتا..متعدد گھوڑے اُس کے آگے بندھے اُسے کھینچتے ہیں، میں اپنی

آنکھوں پر اگر یقین نہ کر سکا تو اس میں کچھ دوش ہے؟.. یہ ایک انہونا سا منظر لگتا ہے، گندم کے سنہری سِٹوں کے لہلہاتے دریا کے درمیان ایک دو ڈبہ ریل گاڑی چلی جا رہی ہے، دو گھوڑے سونے کے اس ٹھاٹھیں مارتے دریا میں، ان کے بدن اس میں ڈوبے ہوئے ہیں، صرف اُن کے سر اور گردنیں دکھائی دے رہی ہیں اس ریل گاڑی کے آگے آگے چھک چھک چلے جا رہے ہیں..

یہ عجب ریل، کہانی رائے بہادر سر گنگا رام ''فادر آف ماڈرن لاہور'' کا ایک اور کرشمہ ہے..
انگریزوں نے اُن زمانوں میں ریل کی ایک نئی پٹڑی بچھانے کا منصوبہ بنایا جو شیخوپورہ اور اس کے نواحی علاقے کو لاہور شہر کے ساتھ منسلک کر دے..گنگا رام نے کوشش کی کہ یہ پٹڑی اُن کے گاؤں گنگا پور کے قریب سے گزرے تاکہ لاہور میں تعلیم حاصل کرنے کے شائق نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس پر سوار ہو کر آسانی سے لاہور آ جا سکیں، علاوہ ازیں گاؤں کے دیگر لوگوں کے لیے بھی لاہور پہنچنے کا مسئلہ حل ہو جائے..گنگا رام انگریز سرکار میں انتہائی اثر ورسوخ رکھنے کے باوجود اس کوشش میں ناکام ہو گئے اور ریل کی پٹڑی اُن کے گاؤں سے کئی کلومیٹر دور سے گزر گئی..اگرچہ جب سروس کا آغاز ہوا تو ریل گاڑی کے لیے وہاں ایک مختصر سٹیشن بھی تعمیر ہوا جہاں وہ باقاعدگی سے رُکتی تھی..گنگا رام پیشے کے لحاظ سے ایک نابغہ روزگار انجینئر انہوں نے اس مسئلے کا ایک ایسا حل نکالا جسے سب لوگوں نے ناقابل عمل قرار دیا..انہوں نے نارتھ ویسٹرن ریلوے کے لاہور کے گودام سے ناکارہ قرار دی جانے والی کئی کلومیٹر طویل آہنی پٹڑی خرید کر اُسے مرمت کروایا اور پھر ذاتی خرچ پر اسے گنگا پور سے اس نوتعمیر ریلوے سٹیشن تک بچھا دیا، اسی طور انہوں نے ریل کے دو ڈبے حاصل کیے چونکہ انجن کا حصول مشکل تھا چنانچہ یہ مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا اور پھر گنگا رام نے اس کا ایک حل نکال لیا..ڈبوں کے آگے انجن کی بجائے دو تنومند گھوڑے باندھے گئے جو پٹڑی کے درمیان چلتے تھے اور پھر یہ عجوبہ ریل گاڑی رواں ہو گئی..گنگا پور کا طالب علم اور دیگر مسافر اس پر سوار ہو کر کئی کلومیٹر دور ریلوے سٹیشن تک پہنچتے، وہاں سے سچ مچ کی انجن والی ریل گاڑی پر بیٹھ کر لاہور جاتے، شام کو واپس آتے تو یہ ''گھوڑا ریل گاڑی'' ہنہناتی انہیں گاؤں لے جاتی..

کیا آپ یقین کریں گے کہ گنگا رام کی تخلیق کردہ یہ عجوبہ گھوڑا ریلوے آج بھی باقاعدگی سے خلق خدا کی مسافتوں کو آسان کرتی ہے..

گنگا رام اپنے کارناموں اور دنیاوی بھلائی کے حوالے سے ایک داستانوی کردار لگتا ہے، آج کے دور میں یہ ممکن نہیں لگتا کہ کوئی ایک شخص لاہور ایسے شہر کو ایک جدید روپ میں تعمیر کر دے، ہزاروں ایکڑ بنجر اراضی کو انجینئرنگ کے کمال سے قابل کاشت بنا دے..نہ صرف گنگا رام ہسپتال بلکہ پنجاب کے پہلے کامرس کالج، ہیلی کالج آف کامرس کے قیام میں معاون ثابت ہو...برصغیر میں ہندو بیوہ عورتوں کے لیے پہلا امن کا

گھر تعمیر کرے..

گنگارام اگروال 1851ء میں لاہور کے قریب مانگاں والا میں پیدا ہوا۔ رڑکی کے مشہور تھامسن کالج آف سول انجینئرنگ سے ڈگری حاصل کی۔ ایک کاشت کار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا..اُس نے سرکار برطانیہ سے پٹے پر رینالہ خورد ضلع منٹگمری میں پچاس ہزار ایکڑ زمین جو دو سو مربع کلومیٹر پر محیط تھی، بنجر اور بیاباں تھی، حاصل کی..آس پاس کے نہری نظام کی سطح سے قدرے بلند ہونے کے باعث پانیوں سے سیراب نہ ہو سکتی تھی اس لیے بنجر پڑی تھی..گنگارام جدید ترین جرمن ٹیکنالوجی بروئے کار لایا، ایک ایسا تکنیکی نظام تعمیر کیا جو پانیوں کو بلند کرتا ویران زمینوں کی سطح پر لے آیا..آج رینالہ خورد کے اُس خطے میں جتنے بھی باغ بہار اور گلزار ہیں وہ گنگارام کے مرہون منت ہیں..اسی طور شیخوپورہ کی زمینیں بھی نہروں کی سطح سے قدرے بلند تھیں، بیاباں تھیں، اس نے یہی سسٹم وہاں متعارف کروایا..یہ سسٹم آج بھی رُکے نہیں، کام کر رہے ہیں..

گنگارام کے محیر العقول کارناموں کے بارے میں دبیز دستاویز تیار کی جا سکتی ہیں تو مختصر مختصر..گنگا رام نے نہ صرف نقش تخلیق کیے بلکہ ان عمارتوں کو اپنی زیرِ نگرانی تعمیر بھی کروایا اور ذرا جگر تھام کے بیٹھیے کہ لاہور کی کون کون سی تاریخی یادگاریں، لاہور کا جنرل پوسٹ آفس، لاہور عجائب گھر، ایچی سن کالج کا وسیع تعلیمی شہر میو سکول آف آرٹس جو ان دنوں نیشنل کالج آف آرٹس کہلاتا ہے، گنگارام ہسپتال لیڈی میکلیگن گرلز ہائی سکول (میمونہ بھی وہاں پڑھا کرتی تھی) گورنمنٹ کالج کا کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ، میو ہسپتال کا البرٹ وکٹر وارڈ اور لاہور ہائیکورٹ کی عمارت۔ گنگارام ہائی سکول جو ان دنوں لاہور کالج فار وومن ہو چکا ہے، ہیلی کالج آف کامرس، راوی روڈ پر معذوروں کا گھر، مال روڈ پر گنگارام ٹرسٹ بلڈنگ جسے اب فضل دین مینشن کا نام دیا گیا ہے، لاہور کی پہلی جدید رہائشی آبادی، ماڈل ٹاؤن، پٹھانکوٹ اور امرتسر کے درمیان ریل کی پٹڑی..اور دلّی میں ان کی یاد میں تعمیر کیا گیا ایک اور گنگارام ہسپتال..

گنگارام کو 1922 میں بکنگھم پیلس لنڈن میں جارج پنجم نے ذاتی طور ''سَر'' کے خطاب سے نوازا..سَر میلکوم ہیلی، گورنر پنجاب نے ان کی موت پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ''وہ ایک بہادر ہیرو کی مانند ہمیشہ فتح سے ہمکنار رہتا تھا اور ایک سینٹ کی مانند اپنی دولت لوگوں میں تقسیم کر دیتا تھا..''

اور ہاں ایک اور قصہ جس کا تذکرہ کم ہوتا ہے..گنگارام نے آج سے تقریباً ایک سو برس پیشتر محسوس کر لیا تھا کہ آئندہ زمانے اقتصادیات اور کاروبار کے ہیں چنانچہ انہوں نے انگریز سرکار کو مائل کیا کہ وہ پنجاب میں ایک کامرس کالج قائم کریں..اس سلسلے میں گورنر ہاؤس میں ایک میٹنگ منعقد ہوئی جس میں رپورٹ پیش کی گئی کہ حکومت نے ایک کامرس کالج قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور جونہی کوئی مناسب عمارت اس کالج کے

لیے میسر آ جائے گی اس کا آغاز کر دیا جائے گا.. سر گنگا رام نے گورنر کی میز پر اپنی رہائش گاہ کی چابیاں رکھ دیں، میں اپنا گھر اس کالج کے لیے وقف کرتا ہوں اور وہ اسی روز اپنے ایک اور گھر میں منتقل ہو گئے، اگلی سویر ہیلی کالج آف کامرس کی کلاسیں شروع ہو گئیں، کچھ عرصہ پہلے تک کامرس کا یہ واحد کالج گنگا رام کے ودیعت کردہ گھر میں ہی چلا آتا تھا..

اب ایک اور آخری کہانی گنگا رام کی سعادت حسن منٹو کی زبانی اُن کی کہانی میں سن لیجئے..

لاہور کے سب سے بڑے محسن، جدید لاہور کے باپ سر گنگا رام کا ایک مجسمہ مال روڈ کے ایک چوک میں نصب تھا، اور یہ ایک سچا واقعہ ہے.. ایک پر اشتعال ہجوم تقسیم کے فوراً بعد کچھ آبادیوں میں توڑ پھوڑ کرتا گنگا رام کے مجسمے پر حملہ آور ہو جاتا ہے.. پہلے تو اُس پر سنگ زنی کی جاتی ہے، پھر اُس کے چہرے پر تارکول مَل دی جاتی ہے کہ وہ ہندو تھا.. اس پر بھی تسلی نہ ہوتی تو ایک مذہبی جنونی گنگا رام کے گلے میں جوتوں کا ایک ہار ڈال دیتا ہے.. پولیس پہنچتی ہے، فائرنگ کرتی ہے کہ ہجوم بے قابو ہو رہا ہے اور وہ جنونی جو مجسمے کے گلے میں جوتوں کا ہار پہنا رہا ہوتا ہے، گولی لگنے سے شدید زخمی ہو جاتا ہے اور تب ہجوم شور مچا دیتا ہے.. اسے فوری طور پر گنگا رام ہسپتال لے چلو.. چلو چلو..

آج گنگا رام کا پڑپوتا ڈاکٹر آشون رام جارجیا کے ایک کالج میں پڑھاتا ہے، اس کی پڑپوتی شیلا ایک بیرونس برطانیہ میں سیاست کرتی ہے اور پڑھاتی ہے..

بابری مسجد کے مسمار کیے جانے پر جہاں پاکستان بھر میں یادگار زمانہ مندروں اور گوردواروں کو ڈھا دیا گیا وہاں لاہور کے سب سے بڑے محسن گنگا رام کی بھی شامت آ گئی، ان کی سمادھی کو برباد کر دیا گیا.. ہم اپنے محسنوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں.. ان کی پڑپوتی شیلا نے لاہور آ کر نہ صرف گنگا رام ہسپتال ٹرسٹ کے لیے ایک خطیر رقم وقف کی بلکہ اپنے پڑدادا کی برباد شدہ سمادھی کو بھی از سر نو تعمیر کروایا..

''وہ ایک بہادر ہیرو کی مانند ہمیشہ فتح سے ہمکنار ہوتا تھا اور ایک سینٹ کی مانند اپنی دولت لوگوں میں تقسیم کر دیتا تھا..''

لاہور کا دوسرا اہم ترین محسن گنگا رام کا ہم عصر ایک سِکھ ضلع گورداسپور کے گاؤں رسول پور میں 1858ء میں پیدا ہوا یعنی گنگا رام کی پیدائش کے سات برس بعد.. یعنی 1857ء کے غدر یا جنگ آزادی کے اگلے برس جب کہ ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کی غلامی سے نکل کر براہ راست تاجِ برطانیہ کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا، وہ ایک معمولی ترکھان یا بڑھئی کا بیٹا تھا اور یہ پیشہ ایسا نیچ بھی نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تو رندہ چلاتے تھے.. اُس نے نوعمری میں ہی اپنے آبائی پیشے میں کمال حاصل کر لیا.. وہ فرنیچر تیار کرنے اور

اُس فرنیچر کو گُل بوٹوں سے سنوارنے کا اتنا ماہر تھا کہ اس کی ہنرمندی دیکھ کر ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کی بیگم نے اسے طلب کیا، لکڑی کے کسی کام کے لیے نہیں بلکہ اس کا گرینڈ پیانو بے سُرا ہو گیا تھا اسے ٹھونک ٹھانک کے سُر میں لانے کے لیے.. یہ رام سنگھ کا شعبہ تو نہ تھا لیکن اس کے باوجود اس سولہ برس کے نوجوان نے پیانو کو اپنی ہنرمندی سے سُر میں کر دیا.. انہی زمانوں میں لاہور میں 1874ء کے لگ بھگ لاہور میں کارپینٹری یعنی ترکھانی کا ایک سکول وجود میں آیا اور رام سنگھ اُس کے اولین طالب علموں میں سے ایک تھا.. "جنگل بک" اور "کِم" کے مصنف اور شاعر رڈیارڈ کپلنگ کے والد جان کپلنگ نے میو سکول آف آرٹس کی بنیاد رکھی تو رام سنگھ اُس کا لائق شاگرد ہو گیا، رڈیارڈ کپلنگ ایک مصنف اور شاعر ہونے کے علاوہ لاہور کے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" اخبار میں ایک مدت صحافیانہ مضامین لکھتا رہا۔ مال روڈ پر جہاں ان دنوں پنوراما سنٹر کی بھدی عمارت آنکھوں کو آزار دیتی ہے وہاں "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کی زرد رنگت کی ایک خوش نظر عمارت ہوا کرتی تھی اور وہاں رڈیارڈ کپلنگ کا کمرہ اور اس کے لکھنے کی میز ایک عرصہ تک محفوظ رکھے گئے.. چونکہ میں لکشمی مینشن کا باسی تھا اس لیے یہ میری آوارگی کا علاقہ تھا.. مجھے موہوم سا یاد ہے کہ کپلنگ کا کمرہ دوسری منزل پر واقع تھا، اس کی کھڑکی سے تب کی ٹھنڈی سڑک کا منظر نواز ہوتا تھا.. مجھے یہ بھی خبر ملی کہ وہاں کوئی ایسا اہلکار ہے جو دنیا بھر سے کپلنگ کے جو شیدائی لاہور آتے تھے، وہ ان کے ہاتھوں کپلنگ کی متعدد لکھنے والی میزیں چوری چھپے فروخت کر چکا ہے..

رڈیارڈ کپلنگ بادشاہی مسجد کے مینار کی آخری منزل پر براجمان ہو کر شاعری کیا کرتا تھا اور جب کہ سب جانتے ہیں اس کے مشہور ناول "کِم" کا آغاز عجائب گھر کے سامنے نمائش شدہ بھنگیوں کی توپ سے ہوتا ہے جس پر کِم بیٹھا دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتا ہے.. کپلنگ نے آج کے کافرستان میں وادیٔ کالاش کے حوالے سے بھی ایک ناول "..............." نام کا لکھا..

ہم آسانی سے نہ صرف جان کپلنگ بلکہ رڈیارڈ کپلنگ کو بھی لاہوری شمار کر سکتے ہیں.. رام سنگھ اپنی وڈ کرافٹ کا ماسٹر تو تھا ہی لیکن اس کی نقشہ نویسی اور ڈرائنگ بھی جان کپلنگ کو حیران کرتی تھی، رام سنگھ نے اپنے مقدر کے ستارے کو اپنی حیرت انگیز کاریگری سے تب روشن کیا جب لاہور میں تعمیر کیے جانے والے ایک عظیم الشان کولونیئل شانداری کے مظہر تعلیمی ادارے تب کے چیفس کالج اور آج کے ایچی سن کالج کے ڈیزائن کے لیے ایک آل انڈیا مقابلہ منعقد ہوا اور رام سنگھ کے نقشے نے یہ مقابلہ ایک انگریز ماہر تعمیر کے ساتھ جیت لیا.. یہ اُس کی برطانوی سلطنت میں شہرت کا آغاز تھا.. ملکہ وکٹوریا جوان دنوں بچے مہاراجہ دلیپ سنگھ پر شفقت اور مہربانی کے ڈورے ڈال رہی تھی تا کہ وہ متاثر ہو کر سرنگوں ہو جائے اور کوہ نور ہیرا جو اُس کے عالی شان باپ

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ملکیت تھا، بغیر کسی دباؤ کے اسے پیش کر دے تو اسی ملکہ عالیہ نے جس کا بت کبھی چیئرنگ کراس کے پھلدار درختوں کے درمیان میں دنیا کا گلوب تھامے نصب تھا، بھائی رام سنگھ کو لنڈن طلب کیا اور اسے اپنا دربار ہال ڈیزائن کرنے کے لیے حکم دیا.. ملکہ وکٹوریا جوان دنوں اپنے اسی منشی اتالیق کے عشق میں مبتلا تھی جو اسے اردو پڑھاتا تھا، اتنی خوش ہوئی کہ اس نے اپنے کورٹ آرٹسٹ یا درباری مصوری روڈولف سوو بوڈا کو حکم دیا کہ وہ اس ہندوستانی جینئس کی ایک پورٹریٹ مصور کرے.. رام سنگھ کی یہ پورٹریٹ آزبرن ہاؤس کے دربار ہال میں آج بھی آویزاں ہے.. ساحلی شہر برائٹن میں ایک مسجد نما جو پیولین ہے اور مجھے اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ بھی رام سنگھ سے منسوب ہے، آج کے لاہور کی شکل کے سب پُرشکوہ کولونیل چہرے رام سنگھ نے تشکیل دیئے تھے، ان کی تکنیکی پیچیدگیوں کو انجینئر گنگا رام نے سلجھایا لیکن ان کے نقشے بھائی رام سنگھ کے ڈرائنگ بورڈ سے تخلیق ہوئے تھے..

ایچی سن کالج کے علاوہ آج کا نیشنل کالج آف آرٹس جس کے احاطے میں سنگ مرمر کا ایک ایسا فوارہ آج بھی اُبلتا ہے اور رام سنگھ کی صناعی کی داد دیتا ہے، لاہور کا جی پی او، عجائب گھر، گورنمنٹ کالج کا ہوسٹل، میو ہسپتال کا البرٹ وکٹر وارڈ، پنجاب یونیورسٹی کا سینٹ ہال اور امرتسر کا خالصہ کالج.. اُس کے بارے میں کہا گیا کہ اس نے کبھی ہندوستان کی ثقافتی روایت کو فراموش نہ کیا اور نہ ہی جدید زمانوں کی نئی صورتوں سے غفلت برتی، ان دونوں کا حسین امتزاج اُس کی نقش کردہ تمام عمارتوں میں نمایاں ہو کر انہیں ایک دائمی کشش سے ہمکنار کرتا ہے..

بہت کم لوگ آگاہ ہیں کہ وہ شخص جس نے آج کے لاہور کی شکل کو دیدہ زیب کیا، آج بھی نہ صرف ہندوستان سے بلکہ دنیا بھر سے فن تعمیر سے منسلک لوگ اور سکالر لاہور آتے ہیں اور بھائی رام سنگھ ترکھان کے نقشوں سے وجود میں آنے والی عمارتوں کی زیارت کرتے ہیں، تمام تو نہیں بیشتر سکھوں کی مانند بھائی رام سنگھ ایک وجیہہ اور رعب دار شخصیت کا مالک تھا.. ملکہ وکٹوریا کے درباری مصور کی پورٹریٹ کے علاہ 1911ء میں اس کی ایک تصویر کیمرے میں ساکت ہوئی، سفید ریش بھائی رام سنگھ، سفید پگڑی باندھے اپنے اوورکوٹ پر پانچ میڈل تفاخر سے سجائے.. القابات.. سردار صاحب، سردار بہادر، قیصرِ ہند، دلّی بازار میڈل وغیرہ..

اس کے فن تعمیر کی ایک خصوصیت بیان کی گئی کہ.. اس کی دیواریں سورج کی روشنی سے رنگ بدلتی ہیں، ابھی تیز روشنی میں نہائی ہوئی اور پھر غروب کے قریب سوچ بچار میں مبتلا ہوتیں، وہ کچھ پیغام دیتی ہیں.. میں تو بیشتر لاہوریوں کی مانند نہیں جانتا کہ یہ بھائی رام سنگھ کون ہے، نیشنل کالج آف آرٹس میں ان دنوں جو طالب علم آرکیٹکچر کی ڈگری حاصل کرتے ہیں تو ہر برس نہیں، جب کبھی ان میں سے کوئی ایک طالب علم ہر شعبے

میں ممتاز ہو جاتا ہے تو اسے ''بھائی رام سنگھ ایوارڈ'' سے نوازا جاتا ہے..سُمیر میرے چھوٹے بیٹے کو اسی نایاب ایوارڈ کا حقدار ٹھہرایا گیا. تب میں نے کھوج کی کہ آخر یہ بھائی رام سنگھ کون تھا..

بھائی رام سنگھ یہ تھا..

لاہور کی مال روڈ کی دل کشی کے بیشتر مظاہر اگرچہ سر گنگا رام اور بھائی رام سنگھ ایسے نابغۂ روزگار لوگوں کی مرہون منت ہیں لیکن ہم غلام رسول بلڈنگ اور شاہ دین بلڈنگ کو تعمیر کرنے والے چوہدری غلام رسول تارڑ اور سر شاہ دین کو بھی ہرگز فراموش نہیں کر سکتے..شاہ دین بلڈنگ جس کی از سر نو تزئین اور تعمیر کی جا رہی ہے دراصل چیئرنگ کراس کے ارد گرد تعمیر کی جانے والی عمارات کے مجموعی ڈیزائن کا ایک حصہ ہے.. اس کے عین سامنے لاہور کے فری میسن لاج جسے لاہوریئے جادو گھر کہتے تھے، کی نیم بیضوی عمارت بھی شاہ دین بلڈنگ کی مانند ایک نیم گولائی میں تعمیر کی گئی ہے..

شاہ دین بلڈنگ کے مال روڈ والے رخ پر پی آئی اے کا پہلا صدر دفتر تھا. تب مسافر یہاں جمع ہوتے اور پی آئی اے کی بس انہیں لاہور ایئرپورٹ لے جاتی..جب 1961ء میں میں پانچ چھ برس کے طویل قیام کے بعد پاکستان لوٹا تو ایئرپورٹ سے پی آئی اے کی بس پر سوار ہو کر اسی دفتر کے سامنے اترا.''میکو'' کا تب نہایت جدید کافی ہاؤس بھی اسی عمارت میں وجود میں آیا..''گولڈ سمتھ جیولرز'' کی کولونیل عہد کی ایک خوابناک، بلند چھتوں والی اور شیشے کے وسیع شوکیسوں سے سجی دکان بھی اسی عمارت کے کونے پر واقع تھی، بلکہ اب بھی شاید موجود ہے،''نوائے وقت'' کا ابتدائی دفتر بھی یہیں تھا..اس کی پہلی منزل پر برصغیر کی مشہور ترین ریکارڈنگ کمپنی''ای۔ایم۔آئی'' کے سٹوڈیو ہوا کرتے تھے اور ایک ذاتی یادداشت..میں عرض کر چکا ہوں کہ میرے والد صاحب چوہدری رحمت خان تارڑ ایک روشن خیال، نئے زمانے کی ایجادات اور کرشموں کو قبول کرنے والے ایک ایسے شخص تھے جو ہر نقش کہن کو مٹا دینا چاہتے تھے چنانچہ پورے برصغیر میں معروف اپنے کاروباری ادارے''کسان اینڈ کمپنی'' کو بھی جدید طریقوں سے متعارف کروانے میں یقین رکھتے تھے چنانچہ ہر برس میں موسم سرما اور پھر موسم گرما کا آغاز میں ملک بھر کے اخباروں میں''کسان اینڈ کمپنی'' کے سبزیوں اور پھولوں کے بیجوں، زرعی کتابوں اور درآمد شدہ گلاب کے پودوں کی وسیع پیمانے پر پبلسٹی کی جاتی..اور اس اشتہاری مہم کے انچارج''کریسنٹ پبلسٹی'' کے مالک قیوم صاحب ہوتے تھے اور ان کا دفتر بھی شاہ دین بلڈنگ میں واقع تھا، قیوم صاحب جہاں تک مجھے یاد ہے، ایک خوش شکل اگرچہ گندمی رنگت کے کشمیری تھے.. اگرچہ وہ کشمیر سے پاکستان چلے آئے تھے لیکن یہ ان کا فانی وجود تھا جو یہاں تھا، ان کی روح اب بھی وادیٔ کشمیر میں بھٹکتی ہوتی تھی، وہ پاکستان میں ایسے مجبوراً رہائش پذیر تھے جیسے ایک بے گھر کسی مہاجر کیمپ میں عارضی طور

پر مقیم ہو.. اُدھر میرے اباجی کی زبان پر بھی دن رات سرینگر اور جھیل ڈل کے تذکرے رہتے.. وہ جھیل ڈل کے کناروں پر پھیلے اپنے پھولوں کے فارم کو یاد کرتے، اپنی پھولوں والی پہاڑی کو دوبارہ دیکھنے کی آرزو میں آزردہ ہوتے رہتے، چنانچہ یہ دو دیوانے اکٹھے مل بیٹھتے اور ... تو ہائے گُل پکار میں پکاروں ہائے دل.. کے مصداق کشمیر کو پکارتے رہتے، ان دونوں کو دُکھڑے سانجھے تھے.. قیوم صاحب کو کشمیر کے آزاد ہونے کا اتنا یقین تھا کہ بقول اُن کے انہوں نے اپنی ضروریات کا ایک بیگ پیک کر رکھا تھا کہ جونہی کشمیر کی آزادی کی خوشخبری آئے گی، میں فوراً بیگ اٹھا کر نکل جاؤں گا، بال بچے بعد میں آتے رہیں گے، 1965ء کی جنگ کے آغاز میں انہوں نے اپنے دفتر میں وادئ کشمیر کا ایک تفصیلی نقشہ آویزاں کر رکھا تھا اور اُس پر پاکستانی فوج کی پیش قدمی سبز رنگ سے نشان کرتے جاتے تھے.. اباجی سے مسلسل فون پر رابطہ رکھتے.. چوہدری صاحب.. ہم چھمب جوڑیاں فتح کر چکے ہیں، آج دریائے توی کو عبور کر لیا ہے.. اکھنور ہماری زد میں ہے اور پھر جموں.. اور پھر درہ بانہیال کے پار میری وادئ کشمیر.. قیوم صاحب اپنی جنت میں نہ جا سکے، بجھ سے گئے.. اور شاید اسی بے گھر اداسی میں مر گئے.. اُن کا دفتر بھی تو شاہ دین بلڈنگ میں ہوا کرتا تھا..

شاہ دین بلڈنگ کے تقریباً سامنے مال روڈ کے پار غلام رسول بلڈنگ کی زرد رنگت کی انتہائی خوش نظر کولونیئل عمارت تھی.. جو ''فیروز سنز'' کے شوروم کی وجہ سے شہرت رکھتی تھی.. اسی عمارت میں نہ صرف ''گینڈر سپورٹس'' کی کھیلوں کی قدیم دکان تھی بلکہ کوڈک کمپنی کا بھی صدر دفتر تھا.. 1965ء میں جب سوئٹزرلینڈ سے جیپسی میرے لیے کینن کا مووی کیمرہ لے کر آئی تو اُس میں کوڈک کی فلم ڈلتی.. اور اس فلم کی کیسٹ یہی کوڈک کمپنی بذریعہ سمندری جہاز انگلستان پروسس کرنے کے لیے روانہ کی جاتی، تین چار ماہ بعد واپس آتی، سکرین پر یہ فلم صرف تین منٹ کی ہوتی اور وہ بھی اکثر آؤٹ آف فوکس..

غلام رسول تارڑ ایک متمول رئیس تھے، نہ صرف انگریز سرکار سے بلکہ مہاراجہ کشمیر کے ساتھ بھی اُن کے گہرے روابط تھے.. ان کے متعدد کاروبار تھے جن میں ایک نایاب کشمیری شالوں کی فراہمی تھا.. کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ کشمیر نے اپنے اُس دوست سے پوچھا کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں تو انہوں نے کہا کہ وادئ کشمیر میں جو جنگلی جڑی بوٹیاں اُگتی ہیں، مجھے ان کا ٹھیکہ دے دیجیے.. مہاراجہ نے اس معمولی درخواست کو ان کا بھولپن جانا کہ بھلا جڑی بوٹیوں کے گھاس پھونس سے کسی کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے.. غلام رسول تارڑ اتنے بھولے نہ تھے، وہ جانتے تھے کہ یورپ کی فارماسوٹیکل انڈسٹری میں ان جڑی بوٹیوں کی بہت مانگ ہے، جن سے جدید ترین دوائیاں تیار کی جاتی ہیں..

غلام رسول تارڑ ایک پرہیزگار اور خدا ترس شخص تھے، علی ہجویری کے مرید اور خادم تھے، انہوں نے

داتا صاحب کے مزار کے احاطے میں ایک مختصر مگر پرکشش مسجد تعمیر کروائی اور پھر داتا صاحب کے قدموں میں ہی دفن ہوئے..

اُن کی تعمیر کردہ مسجد تو داتا دربار کی وسعت تعمیر کی زد میں آ کر منہدم ہو چکی.. مجھے خبر نہیں کہ کیا ان کا مزار اب بھی علی ہجویری کے احاطے میں موجود ہے یا نہیں.. غلام رسول تارڑ کی اولاد میں سب سے زیادہ شہرت اسلم پرویز کے حصے میں آئی، پاکستانی فلموں کے اولین ہیرو اور کمال کے وِلن.. اپنی خوش پوشاکی اور فراخ دلی کی وجہ سے پرنس کہلاتے تھے.. باغ جناح میں سیر کرتے ہوئے ایک دو بار ان سے ملاقات ہوگئی، کہنے لگے ''مجھے بھی بہت شوق تھا کہ میں اپنے نام کے ساتھ ''تارڑ'' لکھوں لیکن ہمت نہ ہوئی کہ لوگ کیا کہیں گے.. فلموں کے ایک ہیرو کا نام اسلم پرویز تارڑ کیسے ہوسکتا ہے.. آپ نے تو نہ صرف جرأت کر لی بلکہ تارڑ نام کو واز بر کروادیا..''

میں نے اُنہیں بتایا کہ جب میں نے پہلی بار ''پرانی باتیں'' نام کے ایک ڈرامے میں اداکاری کی اور محمد نثار حسین نے ٹیلپ پر میرا نام مستنصر حسین تارڑ درج کرنے سے انکار کر دیا.. تارڑ کو حذف کر دیا، کہنے لگے ''یار کچھ تو خدا کا خوف کرو.. کسی اداکار کا نام یہ تارڑ وغیرہ کیسے ہوسکتا ہے..'' میں نے نثار کے درجنوں ڈراموں میں اداکاری کی لیکن اُس نے ہمیشہ تارڑ کو ٹیلپ پر حذف کر دیا..

چوہدری غلام رسول تارڑ.. نہ صرف اسلم پرویز کے بلکہ پاکستان میں جدید مصّوری کے بانیوں میں سے ایک، شاکر علی کے ہم پلّہ مصور معین نجمی کے بھی بزرگ بھی تھے، گورنر ہاؤس کے سامنے گولف روڈ کے بائیں جانب جو راستہ ''چنبہ ہاؤس'' کو جاتا ہے وہاں ایک وسیع وعریض رہائش گاہ میں معین نجمی کی آرٹ گیلری ہوا کرتی تھی، معین نجمی یقیناً مصوری کے ایک جینئس تھے لیکن الگ تھلگ رہتے تھے، شہرت کے تمنائی نہ تھے اور اس کے باوجود پاکستانی مصوری کو ایک جدید شکل دینے والے مصوروں میں سرفہرست تھے، انہوں نے اپنے نام کے ساتھ ''تارڑ'' لکھنے سے گریز کیا کہ بھلا معین نجمی تارڑ نام کا کوئی شخص ایک مصور کیسے ہوسکتا ہے..

دراصل ذاتوں کی پہچان سے شرمندہ نہ ہونے کا سلسلہ بُھٹو سے شروع ہوا.. کوئی اُسے بُھٹّو اور کوئی بَھٹو کہتا اور اس کے ساتھیوں میں جو لوگ تھے وہ بھی اپنی ذات سے شرماتے نہ تھے.. یہ کھَر ہے یا کھُر ہے... یہ گنڈاپور کیا ہے.. یہ شیر پاؤ کیا نام ہوا.. بھئی یہ جتوئی کیا ہوتا ہے..

لاہور کے محسنوں میں یہ کیسے ممکن ہے کہ سردار دیال سنگھ مجیٹھیا کا نام نہ آئے.. دیال سنگھ کالج اور برصغیر کی اہم ترین لائبریریوں میں شمار ہونے والی دیال سنگھ لائبریری، دیال سنگھ مینشن، مال روڈ کی ایک اور گھوڑے کی نعل ایسی نیم دائرہ عمارت جو آج بھی قائم ہے، پاکستان کمیونسٹ پارٹی کا مرکزی دفتر جہاں میرا خیال ہے کہ آج بھی ہتھوڑے اور درانتی سے مزین سرخ پرچم لہراتا ہے.. جہاں کبھی ''شیزان اورینٹل'' ہوا کرتا

تھا جسے کارٹون ہنگاموں میں نذرِ آتش کر دیا گیا..

دیال سنگھ بے اولاد تھے، انہوں نے نہ صرف مجیٹھیا ہال ایسی عمارت تعمیر کی بلکہ اپنی تمام تر دولت لاہور کے لیے وقف کر دی..اور جب مومنین نے طیش میں آ کر لاہور اور دیگر شہروں کو ختنے بٹھا کر مشرف بہ اسلام کیا..لائل پور کو فیصل آباد، چوہڑ کانے کو فاروق آباد، کرشن نگر کو اسلام پورہ وغیرہ کر دیا تو اُن کا عتاب دیال سنگھ کالج پر بھی نازل ہو گیا، لائبریری کے قریب اُن کا مجسمہ ڈھا دیا گیا، وہ اس سکھ نام کے کالج کو کوئی شرعی نام دینے کے درپے تھے جب اُنہیں مطلع کیا گیا کہ یہ کالج اور لائبریری ایک ٹرسٹ کے تحت اپنے اخراجات پورے کرتے ہیں، اگر آپ نام تبدیل کر دیں گے تو سرحد پار سے دیال سنگھ ٹرسٹ کے زیرِ انتظام روانہ کردہ امداد کے سرچشمے خشک ہو جائیں گے، چنانچہ مجبوراً کہ پیسے میں بہت قوت ہوتی ہے جو قوتِ ایمانی کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی ایک مفاہمت ہو گئی..دیال سنگھ کالج کی بجائے اسے ڈی ایس کالج کا نام دے دیا گیا..باقی رہے نام اللہ کا..ایک سکھ کا کیوں رہے..

لاہور پر احسان کرنے والوں کے تذکرے تو بہت ہیں..لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس سر شادی لال کی شادی لال بلڈنگ اور لالہ لاجپت رائے کی اہلیہ کے نام پر قائم کردہ گلاب دیوی ہسپتال اور پھر جانکی دیوی ہسپتال وغیرہ کے تذکرے تو بہت ہو سکتے ہیں، لیکن براہ کرم مختصر مختصر..

برصغیر کے ایک مشہور سیاسی راہنما لالہ لاجپت رائے تھے، سائمن کمشن کے خلاف لاہور میں ایک احتجاجی جلوس کی قیادت کر رہے تھے، پولیس نے راستہ روکا تو لالہ جی سینہ تان کر کھڑے ہو گئے، سینے پر کچھ لاٹھیاں کھائیں، زخمی ہوئے اور پھر انہی زخموں کے نتیجے میں جاں بحق ہو گئے..اُن کی ہلاکت کے خلاف جو مظاہرے ہوئے ان کا انجام جلیانوالہ باغ کے قتل عام کی صورت میں خون آلود ہوا..انہی لالہ لاجپت رائے نے لاہور میں اپنی اہلیہ گلاب دیوی کے نام پر ایک خصوصی ہسپتال تعمیر کروایا..ایک اور معروف ہسپتال جانکی دیوی جمعیت سنگھ نام کا ہے لیکن بدقسمتی سے میں یہ نہیں جان سکا کہ یہ خاتون جانکی دیوی کون تھیں جو آج بھی اہل لاہور کے دُکھوں کا مداوا کرتی ہیں اور ان کی دعائیں لیتی ہیں..یقیناً اپنے عقیدے کی جنت میں جگہ پا چکی ہوں گی..

لاہور کی قدیم مغل، سکھ اور انگریز عمارتوں کی شانداری کا کچھ شمار نہیں، بقیہ شہر کی تفصیل میں کیا جانا..اگر ہم اپنی توجہ صرف مال روڈ پر ہی مرکوز کر دیں تو اس شاہراہ پر ایسی ایسی پرشکوہ عمارتیں سربلند ہیں کہ دنیا کے کسی اور شہر کی کسی ایک شاہراہ پر شاید ہی اتنی شاندار عمارتی جلال و جمال کی حامل حیرتیں ہوں گی..ایچی سن کالج، گورنر ہاؤس، منٹگمری ہال، فری میسن ہال، پنجاب اسمبلی، شاہ دین بلڈنگ، غلام رسول بلڈنگ، لکشمی

مینشن، دیال سنگھ مینشن، گنگارام مینشن، لاہور ہائی کورٹ، جی پی او، سٹیٹ بینک آف انڈیا، وائی ایم سی اے بلڈنگ، کمرشل بلڈنگ، ٹولنٹن مارکیٹ، پنجاب یونیورسٹی، عجائب گھر، نیشنل کالج آف آرٹس اور لاہور کا ٹاؤن ہال..اور میں کچھ نام بھول بھی رہا ہوں..صرف ایک نام ہے جو میں بھولا نہیں، جان بوجھ کر اُسے پوشیدہ رکھا ہے..نہیں، آپ مجھ سے پوچھیں کہ مال روڈ پر واقع ان تمام عمارات میں سے وہ کونسی عمارت ہے، مجھ سے سوال کیا جائے کہ فرض کیجئے کہ کوئی ٹریڈر مافیا نازل ہوتا ہے اور وہ ان سب عمارتوں کو گرا کر ان کی جگہ شاندار پلازے اور سکائی سکریپر تعمیر کرنے کے درپے ہے، بے شک افلاطون نے یا ہو سکتا ہے سُقراط نے ایتھنز شہر کے نوجوانوں سے ڈائیلاگ کرتے ہوئے کہا تھا کہ کبھی کاروباری یا سوداگر لوگوں کو اپنا حکمران منتخب نہ کرو کہ انہیں ریاست سے نہیں اپنے کاروبار سے دلچسپی ہوگی۔اس کے باوجود ہم ہمیشہ ٹریڈرز کو ہی حکمرانی سونپتے ہیں..اگر ٹریڈر اقتدار میں آئے گا تو اسے تاریخی ورثہ، قدیم عمارتوں اور ماضی کی شانداریوں سے کیا غرض..وہ تو ان سب کو ڈھا کر اِن کے کھنڈروں پر اپنے حرص اور ہوس کی اینٹوں سے منافع بخش بھدی، بدشکل عمارتیں تعمیر کرے گا، تو اگر بہ فرضِ محال وہ مافیا مہربان ہو کر مجھ سے پوچھے کہ بتا تیری رضا کیا ہے، ہم سب کچھ مسمار کرنے والے ہیں، مال روڈ پر واقع کسی ایک عمارت کو چُن لو، ہم اسے ڈھانے سے گریز کریں گے، تو وہ عمارت کونسی ہوگی؟

مجھے اس چناؤ کے لیے کچھ ہچکچاہٹ لاحق نہ ہوگی..باواڈِ نگا سنگھ بلڈنگ..بیڈن روڈ اور مال روڈ کے سنگم پر واقع ڈِ نگا سنگھ بلڈنگ، جس کا عظیم گُنبد چاروں اور شہر لاہور پر وقت کی آنکھ رکھے ہوئے ہے..چار نہایت پُرشکوہ گھڑیال شہر پر نظر رکھے ہوئے ہیں...بے شک اس عمارت کی تعمیر کے بعد اس کے گنبد پر نصب کرنے والے گھڑیال انگریز سرکار کے شہر لنڈن سے ہی خصوصی طور پر منگوائے گئے ہوں گے..کہ ہمارے ہاں نہ تب نہ اب وہ تکنیکی مہارت ہے کہ ہم اتنے عظیم الشان گھڑیال مقامی طور پر تخلیق کر سکیں اور یوں بھی ہمارے ہاں وقت کے پیمانوں کو ناپنے کا کچھ رواج نہیں، ہمارے گھڑیالوں کی سوئیاں سینکڑوں برس پیشتر کے دھندلے ماضی کی بوسیدگی میں تھم چکیں، زنگ آلود ہو چکیں، ہمارے وقت کے سب گھڑیال حنوط ہو چکے..شاید اسی لیے تقسیم کے بعد کچھ عرصہ تو ڈ نگا سنگھ بلڈنگ کے چاروں گھڑیال حرکت کرتے رہے اور پھر اُن کی سوئیاں تھم گئیں، کسی نے کچھ پرواہ نہ کی، نگاہ نہ کی کہ ہمیں وقت سے کچھ سروکار نہ تھا، نانگا پربت کو مقامی زبان میں ''دشل مُکھی''، یعنی سو چہروں والا پہاڑ کہا جاتا ہے..ڈ نگا سنگھ بلڈنگ کے چار چہرے تھے اور وہ نابینا ہو گئے..ان میں سے دو گھڑیالوں کے چہرے ٹوٹ پھوٹ گئے، ان میں شگاف ہو گئے اور اُن کا اندرون چمگادڑوں کی آماجگاہ ہو گیا..پھر شاید یہ خوشنود لاشاری تھے جنہوں نے مال روڈ کی تاریخی عمارتوں کی دلکشی کو بحال کیا اور ڈ نگا

سنگھ بلڈنگ کے گھڑیالوں کی سوئیاں پھر سے حرکت کرنے لگیں..

بہت کم لوگوں نے اس کی دل کشی اور سجاوٹ آمیز عمارت پر غور کیا.. یہ عمارت صرف شیزان، کانٹینٹل اور بھٹی فوٹو گرافر کی موجودگی کے باعث نامور ہوئی.. باٹا اور فلپس کے شورومز کی وجہ سے اسے جانا گیا اور بہت کم لوگ اس کے نام سے بھی واقف نہ تھے..

آپ سے گزارش ہے کہ کبھی اُس بے پناہ بھگدڑ اور ہجوم کو برداشت کیجیے جو بیڈن روڈ میں سے اُبلتا ہے، اس عمارت کے گرد ایک گندے نالے کی مانند بہتا ہے اور ذرا ڈ نگا سنگھ بلڈنگ کو کچھ دیر غور سے دیکھئے.. آپ پر کھلے گا کہ یہ کسی تاج محل کی شانداری اور دل ربائی سے کم نہیں، اور آپ یقیناً اُن لوگوں کے لیے ہمدردی اور تاسف کے ایک جذبے میں ڈوب جائیں گے جنہوں نے اسے تعمیر کیا اور پھر مجبوراً اسے چھوڑ کر چلے گئے..

میرا اور آپ کا مذہبی تعصب اپنی جگہ..لیکن مجھے پلیز آگاہ کر دیجئے کہ کیا پاکستانی ہجرت کرنے والے مسلمانوں نے مغل عہد کی تاریخی عمارتوں کے سوا، کوئی ایسی عمارت ڈ نگا سنگھ بلڈنگ پیچھے چھوڑی ہے..

بابا ڈ نگا سنگھ کون تھے، لاہور کے ساتھ اُن کا کیا رشتہ تھا، انہوں نے کیوں مال روڈ پر ایسی شان و شوکت والی عمارت تعمیر کی اور اُس کے گنبد پر اتنے بڑے حجم کے گھڑیال نصب کروائے..اس عمارت کا آرکیٹیکٹ کون تھا، میں کھوج نہ سکا..

صرف ایک حوالہ دستیاب ہوا..اُن کے وسیع کاروبار کا حساب رکھنے والی ایک فرم کی دستاویزات میں کُچھ یوں درج ہے..

''باوا ڈ نگا سنگھ ایک ٹمبر مرچنٹ ہیں جن کی فرم لاہور میں ''سپیڈنگ ڈ نگا سنگھ اینڈ کمپنی'' کے نام سے رجسٹرڈ ہے.. یہ فرم کشمیر اور دیگر علاقوں میں ٹھیکے حاصل کرتی ہے. محکمہ جنگلات نے جن درختوں کی نشاندہی کی ہوتی ہے، انہیں کاٹتی ہے، فرم کا ہیڈ کوارٹر موسم سرما کے دوران لاہور میں ہوتا ہے کہ ان دنوں جنگلوں کی کٹائی کا موسم نہیں ہوتا...فرم کے حساب کتاب سرما میں لاہور میں برقرار رکھے جاتے ہیں اور پھر موسم گرما میں انہیں سرینگر کشمیر منتقل کر دیا جاتا ہے جہاں اس فرم کے دیگر حصے دار گرم موسموں سے فرار ہو کر زندگی کرتے ہیں، جولائی 1931ء سے جُون 19232ء کے سال میں فرم نے کشمیر میں تین لاکھ روپے اور برطانوی ہند میں 67,095 روپے منافع کمایا..''

کہیں نہ کہیں ہندوستان میں، انگلستان میں، بابا ڈ نگا سنگھ کا کوئی والی وارث ہوگا.. کیا اُسے خبر ہے

کہ اُس کے ایک بابا نے شہرِ لاہور کی مال روڈ پر ایک چار چہروں والے گھڑیال کا ایک لاہوری تاج محل تعمیر کروایا تھا جسے چھوڑ کر وہ جانے کہاں چلا گیا..

اے شہرِ بے مثال تیرے بام و در کی خیر..

تیرے مُحسنوں، سر گنگا رام، بھائی رام سنگھ، دیال سنگھ اور ڈونگا سنگھ کی خیر..

جیسے فیض نے کہا تھا کہ..

خیر ہو تیری لیلاؤں کی، اُن سب سے یہ کہہ دو
آج کی شب جب دیئے جلائیں، اونچی رکھیں لَو

تو شہرِ لاہور کی اِن لیلاؤں کی خیر.. میں نے اپنے تئیں اُن کی یادوں کے دیئے جلائے ہیں اور اُن کی لَو اونچی رکھی ہے..کیا آپ تک اُن کی روشنی پہنچی؟



''سینما گھروں کا گھر لاہور''

لاہور اس لیے بھی لاہور ہوا کرتا تھا کہ یہ سینما گھروں کا گھر تھا..

میں نے اپنی حیات میں، آوارگی میں، ہم نے زمانے کی سیر کی، تو اس دوران میں نے بے شک لنڈن کے ویسٹ اینڈ اور نیویارک کے براڈوے کے تھیئٹروں میں ''ورلڈ آف سوزی وانگ''، ''ویسٹ سائڈ سٹوری'' اور ''فینٹم آف دی آپرا'' جیسے کلاسیکل کھیل دیکھے.. ماسکو کے مشہور زمانہ بالشوئی تھیٹر میں اب تو ایک داستان ہوتی بیلے رینا گالینا اولانوا کو ''سورن لیک'' میں پرفارم کرتے اور رقص کے دوران اُڑان کرتے ہوئے ایک سفید راج ہنس کے روپ میں دیکھا.. اُسی شہر میں جب میں ماسکو یونیورسٹی کی دعوت پر لیکچر دینے کے لیے پورے پچاس برس بعد لوٹا تو ایک مقامی تھیئٹر میں دوستووسکی کے ناول ''برادرز کارمازوف'' پر مبنی ایک کھیل بھی دیکھا.. بہت کچھ دیکھا.. دنیا بھر کے سینماؤں کی تاریکی میں بیٹھ کر سکرین پر نمودار ہونے والی بے شمار کلاسیکی فلموں کو اپنی آنکھوں میں عکس کیا، یہاں تک دو تین معروف آپرا بھی مشہور آپرا ہاؤسز میں نہایت مہنگے داموں بہرطور دیکھے، اگرچہ گلوکاروں کی بلند آہنگی اور کلاسیکی صداؤں سے میرے کان بہرے ہو گئے اور میں جمائیاں بھی لیتا رہا لیکن ذوق سلیم کے لیے اتنی قربانی تو دینی ہی پڑتی ہے.. لیکن.. میں لاہور کے سینما گھروں کو لوٹتا ہوں.. لیکن جو ہیجان انگیز کیفیت.. کونسی ہیجان انگیز کیفیت؟ ابھی عرض کرتا ہوں..

آپ نے پہلے تو باقاعدہ جنگ وجدل کر کے.. مار دھاڑ کر کے، اپنے جیب خرچ سے آنہ آنہ جمع کر کے، گیلری کا ٹکٹ مبلغ سوا روپے میں حاصل کیا ہے.. اور یاد رہے لاہور کے سینما گھروں میں کسی ہٹ فلم کے لیے کھڑکی سے ٹکٹ خریدنا، اُسے حاصل کرنا اور دبوچنا، ایک خداداد آرٹ ہوتا تھا اور قدرت کی جانب سے صرف چند ایک افراد کو ہی یہ صلاحیت ودیعت ہوتی تھی، آپ نے کیسے ٹکٹوں کی کھڑکی پر ہجوم کرتے شائقین کو دھکیلنا ہے، پھر اکثر ان کے سروں پر گلائڈ کرتے، پھسلتے کھڑکی تک پہنچ کر اُس کی تنگنائے میں اپنی وہ مُٹھی گھسیڑ کر عین ٹکٹ فروخت کرنے والے کے سامنے کھول دینی ہے جس میں ٹکٹ کی رقم بند ہے..

اور اُن زمانوں میں معتبر ہونے کا ایک اور چیلنج ہوا کرتا تھا کہ کسی نئی فلم کے پہلے شو کے موقع پر آپ

گیلری وغیرہ نہیں بلکہ لوئر سٹال کی آخری لکڑی کی نشستوں پر دس آنے والی کلاس میں ایک فلم دیکھیں.. مجھے یاد ہے کہ ریگل سینما میں عید کے روز کسی نئی ٹارزن کی فلم کا افتتاح ہونا تھا اور اُن زمانوں میں آج کے جیمز بانڈ کی مانند ٹارزن بھی بدلتے رہتے تھے تو اُن دنوں مشہور باڈی بلڈرز اور تیراک جانی وزملر تازہ ترین ٹارزن تھا.. میں نے عید کی نماز پڑھنے کے فوراً بعد اپنے چند جگری دوستوں کے ہمراہ تقریباً صبح ساڑھے دس بجے ریگل سینما کی دس آنے والی کھڑکی کے آگے بسیرا کر لیا.. ساڑھے تین بجے پہلا شو تھا، عید کا پورا دن نہایت خوشی خوشی اور خوش اسلوبی سے اُس کھڑکی کے سامنے قطار بنائے گذار دیا.. اور عید کے روز نئی فلم کے پہلے شو کو دس آنے کی کلاس میں دیکھ کر سرخرو ہو گیا.. بعدازاں بہت سے مال روڈ اور لکشمی مینشن کے باسی مجھے ازحد رشک کی نظروں سے دیکھتے تھے کہ یہ ہے وہ شخص...

سینما گھر کے اندر داخل ہوئے تو گویا ایک جادونگری میں آ گئے.. دیواروں میں نصب سپیکروں میں سے اگر یہ ایک انگریزی فلموں کا سینما گھر ہے تو مغربی گیتوں کی دُھنیں ہال کی نیم تاریکی میں گونجتی ہیں اور اگر اردو فلم ہے تو تازہ ترین گیت سُریلے ہوتے ہیں.. اور تو اور گرمیوں میں دیواروں پر آویزاں پنکھے چل رہے ہیں اور ٹکٹ خریدنے کی جستجو میں جو پسینے بہہ رہے ہیں اُن کو سُکھاتے ہیں... موسیقی کے علاوہ ''ٹھنڈی بوتل'' کے نعرے لگاتے حضرات بوتلوں کی شیشہ گری کو چابیوں کے ساتھ جل ترنگ بجاتے آپ کو متوجہ کرتے ہیں اور اگر فلم انگریزی ہے تو ''چپس، پوٹیٹو چپس'' کی صدائیں آتی ہیں اور تب ہال کی روشنیاں دھیرے دھیرے مدّھم ہوتی ہیں اور سکرین کے آگے تنا ہوا ریشمی پردہ ہولے ہولے سرکنے لگتا ہے اور یہ عجب سحر انگیز، دل کو دھڑکانے والا نظارہ ہوتا تھا، پردہ سرکتا جاتا ہے اور سفید سکرین نمایاں ہوتی جاتی ہے.. اور تب اُس سکرین پر کوہ قاف کی جادوگری عکس ہونے لگتی ہے اور آپ تقریباً مدہوش ہو جاتے ہیں کہ وہاں ٹارزن ہے جو لکڑی کے مگر مچھ سے کُشتیاں لڑ رہا ہے.. ایستھر ولیم کا متناسب بدن پانیوں میں تیر رہا ہے.. سفید قلموں والا سٹیورٹ گرینجر ''سکاراموش'' میں تلوار بازی کرتا ہے اور کبھی ''وائلڈ نارتھ'' کی برفوں میں سفید ہوتا ہے.. ماہی مُنڈا ڈورس ڈے ''کے سرا سرا'' گا رہی ہے.. (ڈورس ڈے ابھی کچھ روز پہلے شدید بوڑھی ہو کر مر گئی ہے) ''سنوز آف کلی منجاروز'' میں ایوا گارڈنر، گریگوری پیک سے ایک آگ مانگتی ہے اپنا سگریٹ سلگانے کے لیے، وغیرہ وغیرہ.. اور اگر یہ ایک دیسی سینما گھر ہے تو سکرین پر کبھی راج کپور آوارہ ہوتا ہے، کبھی دلیپ کمار خمار کی حالت میں ''اے مرے دل کہیں اور چل'' گاتا اپنی ماں کی موت پر کہتا ہے ''پارو، میری ماں مر گئی'' اور اُن زمانوں میں کئی شائقین صرف یہ ڈائیلاگ سننے کی خاطر ریوالی سینما کے گیٹ کیپر کو ایک چونّی تھما کر سینما ہال میں جاتے تھے اور ''پارو، میری ماں مر گئی'' کی ڈلیوری سُن کر باہر آ جاتے تھے..

اور تب اُن میں سے کچھ نوجوانوں کی در پردہ آرزو ہوتی کہ کاش میری ماں مر جائے اور میں بھی گلوگیر ہو کر کہوں "پارو، میری ماں مر گئی.."

سنیما کا ایسا طلسم تھا کہ ہم اپنی ماؤں کی موت کے منتظر ہوتے تھے..

اُن دنوں ہم چیمبرلین روڈ پر واقع ایک خوش نظر تین منزلہ گھر میں رہتے تھے، جس کی دل کش گیلریاں سڑک پر کھلتی تھیں، سرشام میرے ماموں جان جنہیں بچہ لوگ کو اُن زمانوں کی طریقت کے مطابق، بے وجہ زدوکوب کرنے کی عادت تھی، گھر میں داخل ہوتے تو جو بھی بچہ میسر آ جاتا اُس کی گوشمالی کرتے اور پھر رات کا کھانا کھاتے.. اگرچہ وہ ہم سے محبّت بھی اُسی شدّت سے کرتے جس شدّت سے وہ ہمیں زدوکوب کرتے.. سب سے بڑے اور اولین بھانجے ہونے کی فخریہ پوزیشن ایسی تھی کہ ماموں جان کا دستِ شفقت اور دستِ زدوکوبی ہمیشہ مجھ پہ سایہ فگن رہا..

یہ پس منظر بیان کرنے کے بعد میں آپ کو باٹا کے سلیپر کی ایک ناقابل فراموش داستانِ الم سناتا ہوں..

جی ہاں یہ وہی زمانے ہیں جب ہم چیمبرلین روڈ پر واقع، محلّہ قادر بخش کی قربت میں ایک دل کش بالکونیوں والے سہ منزلہ مکان میں رہا کرتے تھے اور قبلہ ماموں جان بھی ہمارے ساتھ اپنی تیسری بیوی کے ہمراہ رہا کرتے تھے یا شاید ہم اُن کے ساتھ رہا کرتے تھے.. اُن دنوں سردیوں کی شامیں ہمیشہ دھند بھری ہوتی تھیں اور اُس ہلکی دھند میں گوالمنڈی چوک کی مٹھائی اور فالودے کی دکانیں اور پان سگریٹ کے کھوکھے ایک عجب صورت کبھی ظاہر ہوتے اور کبھی ملفوف ہو جاتے، چوک میں متعدد چھابڑیوں والے پھل فروٹ اور مونگ پھلی گرما گرم بیچتے.. شام کے کھانے کے بعد قبلہ ماموں جان مجھے ایک چوّنی تھما کر میرے کان کھینچ کر کہتے.. جاؤ کچھ پھل فروٹ کھا آؤ.. اور دھیان سے جلدی لوٹ آنا.. یہ میرے لیے اور تب ابھی ابھی پاکستان بنا تھا اور میری عمر تقریباً نو برس تھی.. اور یہ میرے لیے آزادی اور سرخوشی کا سب سے بیش قیمت لمحہ ہوتا، مٹھی میں پوری ایک چوّنی، جسے میں اپنی مرضی سے خرچ سکتا تھا، گوالمنڈی چوک کی رونقیں اور دُھندلی سردیوں کی ایک شام.. میں اپنی پسند کا کوئی موسمی پھل خریدتا، منہ اٹھائے مٹھائی کی دکانوں کو تکتا، چوک میں بیٹھے چرسی اور ملنگ حضرات سے خوفزدہ بھی، وہ پھل کھاتا اور اُلٹے قدموں لوٹ آتا.. ایک شام مجھے اب تک یاد ہے کہ میں نے چوّنی کے انگور خریدے اور وہ بہت سارے تھے تو میں اُن کی شیرینی سے لطف اندوز ہوتا، گوالمنڈی چوک سے دائیں ہاتھ پر اترتی ریلوے روڈ پر انگور ٹھونگتا روز سنیما تک پہنچ گیا.. یہ میری اُس بچگانہ زندگی میں پہلا سنیما تھا.. کبھی کبھار دن کے وقت میں چوری چھپے وہاں پہنچتا اور اُس کا ایک دروازہ قدرے شکستہ ہو رہا تھا اُس میں ایک

چھوٹا سا سوراخ تھا جو کسی میرے جیسے بچے نے ہی تخلیق کیا تھا.. اُس سوراخ پر ایک آنکھ جما کر آپ روز سینما کے پہلے شو میں دکھائی جانے والی فلم کی جھلکیاں دیکھ سکتے تھے، چنانچہ میں نے یوں بہت سی فلموں کے ''ٹوٹے'' دیکھے.. کبھی کبھار کوئی دربان ہمیں دبوچ لیتا اور ہم اُسے ایک اکنی دے کر گلوخلاصی کرواتے.. مجھے یاد ہے کہ اُن دنوں کسی تلوار باز خاتون کی فلمیں بہت پاپولر تھیں، اُس کا نام واڈیا کاؤس قسم کا تھا. اُس نے امریکی لون رینجر کی مانند آنکھوں پر ایک سیاہ نقاب چسپاں کیا ہوتا تھا.. بہر حال میں انگور ٹھونگتا پہلی بار شام کے وقت روز سینما تک پہنچ گیا.. عجب جادوئی نظارے تھے.. خوب بھیڑ بھاڑ اور روشنیاں.. سینما کے داخلے پر دکھائی جانے والی فلم کا ''فوٹو سیشن'' نمائش پر تھا جسے تماشائی مُنہ اٹھائے نہایت رغبت سے دیکھ رہے تھے اور میں بھی اِک عالم سرمستی میں انگور کھاتا مُنہ اٹھائے اُنہیں دیکھنے میں ایسا گُم ہوا کہ کچھ ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں، فلم کی تصویروں نے مجھ پر جادو کر دیا، بھول گیا کہ میں نے گھر بھی لوٹنا ہے.. اور میں تماشائیوں کے ہجوم میں واحد بچہ تماشائی تھا.. میں مُنہ اٹھائے انگور کے دانے مُنہ میں ڈالتا کسی اور جہان میں تھا جب.. میرے سر پر ایک ایٹم بم گرا، پورا کوہ ہمالیہ، اے فصیلِ کشور ہندوستان میرے سر پر کریش کر گیا اور میں اُس کی شدت کی تاب نہ لا کر درد سے دوہرا ہو تا زمین پر گر گیا.. جب ذرا ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ قبلہ ماموں جان ہاتھ میں اپنا باٹا کا سلیپر یعنی چھتّر تھامے میرے سر پر کھڑے ہیں اور میرے سر میں درد کی پُھل جھڑیاں چُھوٹ رہی ہیں..

دراصل ماموں جان نے ٹائمنگ کر رکھی تھی کہ مستنصر چوّنی تھام کر گوالمنڈی چوک جائے گا، کوئی پھل فروٹ کھا کر اتنی دیر بعد گھر لوٹ آئے گا اور جب میں متعینہ وقت میں نہ لوٹا تو کچھ انتظار کرنے کے بعد وہ ''نکلے تری تلاش میں'' گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور جب گوالمنڈی چوک میں میرا نام و نشان نہ ملا تو مجھے تلاش کرتے روز سینما تک آ پہنچے جہاں میں اِک عالم سرخوشی میں انگور کھاتا مُنہ اٹھائے فلمی تصویروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا.. اُنہوں نے ڈانٹ ڈپٹ میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہ ہمیشہ باٹا کے سلیپر پہنتے تھے، ایک سلیپر پاؤں سے اتار کر جب میں مکمل بے خبری کی حالت میں اِک عالمِ کیف میں تھا، پوری قوت سے میرے سر پر رسید تو نہ کیا، دے مارا.. وہ مجھے گھر لے گئے اور جو ہم پہ گذری سو گذری، لیکن ہمارے آنسو ماموں جان کی عاقبت سنوار چلے.. وہ دن، تقریباً ستر برس پیشتر کا وہ دن اور آج کا دن.. میں روز سینما کے سامنے ایک پل نہیں ٹھہرتا، شتابی سے گذر جاتا ہوں مبادا ماموں جان کی رُوح آس پاس منڈلاتی ہو اور مجھے ایک روحانی چھتّر رسید کر دے.. یہاں تک کہ ابھی پچھلے دنوں میں اپنے دوست ملک سرفراز گُجر کے گھر ایک دعوت پر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ کُرتے اور تہبند میں ملبوس ہے اور پاؤں میں باٹا کے وُہی سلیپر ہیں، میں نہیں جانتا تھا کہ باٹا شو کمپنی ابھی تک وہ بھاری سلیپر پروڈیوس کرتی چلی آ رہی ہے چنانچہ میں نے اُس سے گذارش کی کہ ملک جی اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے گھر میرا آنا جانا لگا رہے تو براہ کرم کم از کم میری آمد کے موقع پر آپ

نے باٹا کے سلیپر نہیں پہنے.. ان سے کچھ دردناک یادیں وابستہ ہیں..

چنانچہ یہ لاہور کے ایک نامور سینما روز سے وابستہ کچھ یادیں تھیں، یہ سینما اب بھی موجود ہے اور ماموں جان کی رُوح اب بھی وہاں منڈلاتی پھرتی ہے..

پاکستان کی تخلیق سے پیشتر لاہور کے سینما گھروں کی کشش ایسی تھی کہ گرد ونواح کے قصبوں اور شہروں سے نوجوان صرف فلمیں دیکھنے کے لیے دور دراز کے سفر کرتے یہاں پہنچ جاتے اور ان میں گوجرانوالا، سیالکوٹ کے علاوہ امرتسر اور لدھیانہ کے نوجوان اور اُن میں سے بیشتر سکھ ہوا کرتے تھے، کشاں کشاں وارد ہوا کرتے تھے، امرتسر سے آنے والے سکھ لڑکے اکثر ٹکٹ کے بغیر ٹرین پر سفر کرتے اور لاہور سٹیشن پر اتر کر ٹکٹ چیکر کو جُل دے کر نکل جاتے اور یہ وہی زمانے تھے جب ایک حقیقی واقعہ رونما ہوا جس نے بعدازاں ایک لطیفے کا روپ اختیار کر لیا.. چند سکھ نوجوان امرتسر سے آنے والی ٹرین سے اترے اور وہ سب ''بے ٹکٹے'' تھے، ٹکٹ چیکر جو مسافروں کے ہجوم میں گھرا ہوا تھا اُس کی نظروں سے اِدھر اُدھر ہو کر باہر نکل گئے.. سٹیشن کے سامنے تانگہ سٹینڈ ہوا کرتا تھا، وہ میکلوڈ روڈ وغیرہ جانے کے لیے بھاؤ تاؤ کرنے لگے، تب ایک سکھ جو پیچھے رہ گیا تھا وہ ٹکٹ چیکر کے قابو میں آ گیا تو اُس نے نعرہ لگا کر چیکر کی گرفت سے آزاد ہو چکے یاروں کو پکارا کہ.. اوئے واپس آ جاؤ، ہم سب پکڑے گئے ہیں..

ہم چیمبر لین روڈ پر واقع خوشنما گیلریوں والے مکان سے جب مال روڈ کے لکشمی مینشن میں منتقل ہوئے تو دنیا ہی بدل گئی.. یہاں ابھی تک کولونیل عہد کی پرچھائیاں تھیں، سٹینڈرڈ کی چھت پر اینجلا رقص کرتی تھی جس کے عشق میں مبتلا ہو کر میرے ایک پٹھان دوست نے سب کچھ لٹا دیا. فلیٹیز، پارک ہوٹل اور باغ جناح کے اور جنل جم خانہ کلب میں نیو ایئر نائٹ کے ہنگامے ہوتے تھے.. مال روڈ کی مختصر سڑک کے دائیں بائیں باغیچے اور گھاس کے قطعے تھے اور ایک بوڑھی انگریز عورت اپنی موٹر کار میں سوار اپنے کتے کے ہمراہ روزانہ گذر جاتی تھی، روزانہ سڑک پر چھڑکاؤ ہوتا تھا تا کہ وہ ٹھنڈی رہے، مال روڈ اسی لیے ٹھنڈی سڑک بھی کہلاتی تھی تو دنیا بدل گئی.. اور اس دنیا میں تین سینما جہاں صرف انگریزی فلمیں سکرین کی جاتی تھیں دھڑکتے تھے، میرے فلیٹ کے پار ریگل اور کوئنز روڈ پر پلازا، میکلوڈ روڈ کا اوڈین... ان تینوں سینماؤں کے روشن اندھیروں میں میری ابتدائی حیات بہت گذری.... روٹین یہ تھی کہ ہفتے میں دو بار فلم تبدیل ہوتی اور اگر وہ ہٹ ہو جاتی تو کچھ ہفتے اور ٹھہر جاتی، نمائش شدہ فلم کے پوسٹر یا پمفلٹ براہ راست ولایت یا ہالی وڈ سے آتے اور ہم انہیں جمع کرتے..

میرے ابا جی اگرچہ بہت لبرل اور روشن خیال تھے، میں منٹو کے افسانے اس لیے بھی پڑھ سکتا تھا کہ ہمارے ہمسائے تھے اور وہ میرے ''یار'' تھے لیکن ابا جی اتنے لبرل بھی نہ تھے کہ اپنے کراؤن پرنس کو انگریزی فلموں کی عریانی اور فحاشی کے پلے باندھ دیتے، چنانچہ کراؤن پرنس نے فلمی بے راہ روی کی ایک راہ

ڈھونڈھ لی..ریگل سینما، لکشمی مینشن کے پار تھا، میں وہاں کوئی فلم دیکھتا، انٹرول ہوتا تو بھاگم بھاگ اپنے فلیٹ نمبر 17 کی پوری باون سیڑھیاں پھلانگ اپنے گھر میں آ جاتا اور.. قطعی طور پر ظاہر نہ ہونے دیتا کہ میں ہانپ رہا ہوں، ہونک رہا ہوں کہ باون سیڑھیاں بہرطور باون ہوتی ہیں، اکیاون نہیں ہو سکتیں..میں ایک معصوم سی شکل بنائے گھر کے ہر فرد کے ساتھ ہیلو ہائے کرتا، اپنی موجودگی ثابت کرتا، دس منٹ بعد رفو چکر ہوتا، وہی باون سیڑھیاں اترتا، لکشمی مینشن سے نکل کر ریگل چوک کراس کر کے ریگل سینما کے اندر جا پہنچتا جہاں انٹرول کا اختتام ہو رہا ہوتا اور ہال کی روشنیاں مدھم ہونے لگتیں..یہ سلسلہ نہایت خوش اسلوبی سے چلتا رہا اور پھر ایک سانحہ ہو گیا..

ریگل سینما میں دکھائی جانے والی فلم تھی ''کوواڈس''..قدیم روم کی ایک داستان، جس کے آخر میں روم جل رہا ہے اور نیرو بانسری بجا رہا ہے..نیرو کا کردار ان زمانوں کے بہت اثر انگیز اداکار..ایک موٹے اداکار پیٹر اسٹینوف نے ادا کیا تھا..انٹرول ہوا اور میں حسب منصوبہ سینما سے نکل کر بھاگتا ہوا، باون سیڑھیاں طے کر کے اپنے فلیٹ کے صحن میں نمودار ہو گیا..اپنی موجودگی ثابت کر کے واپس سیڑھیوں کے دروازے کی جانب لپکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری گوری چٹی، سوہنی پُھپھی رحمت بی بی چلی آ رہی ہیں، انہوں نے مجھے دیکھ کر فرط جذبات سے مغلوب ہو کر ''جپھا'' مار لیا کہ..وے مستنصر..میں تم سے اداس ہو گئی تھی، میں صرف تمہیں دیکھنے کی خاطر اپنے منڈی بہاؤالدین کے چک سے چلی آئی ہوں..مجھے دیکھنے دو..اُن کی گرفت سے آزاد ہونا ممکن ہی نہ تھا..اگرچہ مجھے اُن کے بالوں سے لسّی کی مہک آتی تھی پر وہ میری بہت پیاری پھوپھی تھیں اور یوں میں لوٹ نہ سکا..جب وہ رخصت ہو گئیں تب میں نے ''کوواڈلیس'' کا بقیہ نصف حصّہ اور انجام دیکھا..

بس یہی سانحہ ہو گیا..

علاوہ ازیں ایک اور سانحہ بھی ہوا کہ میں آج بھی اُسے یاد کرتا ہوں تو شرمندگی سے بھیگ جاتا ہوں..

جب میں نے اپنے کنوارپن کا پہلا بوسہ دیکھا تھا..

اُن دنوں ہیڈی لامار اور وِکٹر میچور کی کلاسیک فلم ''سیمسن اینڈ ڈیلائلہ'' کا افتتاح ہوا اور ریگل سینما میں ہوا..اور کھڑکی توڑ افتتاح ہوا..یعنی شائقین نے ٹکٹوں کے حصول کے لیے ٹکٹوں کی کھڑکیاں توڑ ڈالیں..اباجی مجھے ''ایجوکیٹ'' کرنے کی خاطر، بائبل میں بیان کردہ پیغمبر شمعون کے بارے میں ایک فلم دکھانے کے لیے لے گئے اگرچہ اُس فلم کا سب سے ہیجان خیز وہ منظر تھا جب سیمسن ایک ببر شیر کے ساتھ کشتی کرتا اُس کا ٹینٹوا دبا کر اُسے ہلاک کر دیتا ہے..ڈیلائلہ اُسے مدہوش کر کے اُس کے وہ دراز گیسو کاٹ دیتی ہے جن میں اُس کی قوت پوشیدہ ہوتی ہے اور اُسے اندھا کر دیا جاتا ہے اور بالآخر یہی ڈیلائلہ پشیمان ہو کر

اُس اندھے سیمسن کا ہاتھ تھام کر اُسے رومی معبد کے ستونوں تک لے جاتی ہے اور وہ اُن ستونوں کو ڈھا کر پورے معبد کو مسمار کر دیتا ہے لیکن..اس دوران ایک منظر میں یکدم اینجلا لانسبری بے وجہ یکدم عُریاں ہو جاتی ہے اور پھر فوراً بعد سیمسن صاحب ہیڈی لامار یعنی ڈیلائلہ کے ہونٹوں پر اپنے گرم ہونٹ یوں ثبت کرتے ہیں کہ بس ثبت ہی رہتے ہیں تو..میرے پسینے چھوٹ گئے..

برابر میں اباجی بیٹھے ہیں اور سکرین پر ایک شدّت آمیز بوسہ چل رہا ہے اور چلا ہی جا رہا ہے..اباجی اپنی جگہ شرمندہ عرقِ انفعال پونچھ رہے ہیں کہ برخوردار کو کیا دکھانے لے آیا ہوں اور میں یوں شرمندہ جیسے سکرین پر وکٹر میچور نہیں میں ہیڈی لامار کے ساتھ بوسہ بازی کر رہا ہوں اور اباجی نے دیکھ لیا ہے..اور واضح رہے کہ یہ آج کے زمانے نہ تھے کہ لونگ روم کے ٹیلی ویژن پر شکیرا، کترینہ کیف اور کرینہ کپور کے پُس ہمہ وقت چکّی کے دو پاٹوں کی مانند حرکت میں ہیں اور موقع غنیمت جان کر ہیرو اور ہیروئن بوسہ بازی میں بھی گاہے بہ گاہے ملوث ہو جاتے ہیں..اُن زمانوں میں تو لڑکی کے صرف ٹخنے دیکھ کر اُس پر عاشق ہو جانے کا رواج تھا..پوری لڑکی صرف قسمت والے ہی دیکھتے تھے اور بوسے صرف دت بھارتی اور منٹو کی تحریروں میں ہی میسر ہوتے تھے چنانچہ وہ لمحہ ہم دونوں پر، مجھ پر اور اباجی پر بہت گراں گذرا..بمشکل اُن دونوں کے ہونٹ الگ ہوئے اور ہم نے اطمینان کا سانس بھرا، میں نے بھی اور اباجی نے بھی..

لاہور کے اِن تین انگریزی سنیماؤں کے ماحول ہی نرالے تھے، یہاں پر آنے والا کراؤڈ زیادہ تر اینگلو انڈین، پارسی اور صاحب ہو چکے مسلمانوں پر مشتمل ہوتا تھا جو منہ بگاڑ کر انگریزی بولتے اور مال روڈ پر ایک کباب ایک نان میں لپیٹ کر اُسے برگر کے طور پر کھاتے ایک ہاتھ پتلون کی ہپ پاکٹ میں اڑس کر کاؤبوائز کی مانند سیر کرتے..

کسی بھی فلم کے آخری دن یہ سہولت تھی کہ آپ اپنا سٹوڈنٹ کارڈ دکھا کر دس آنے کے ٹکٹ کو سوا روپے میں اور سوا روپے کے ٹکٹ کو گیلری کی دو روپے بارہ آنے کی کلاس میں منتقل کروا سکتے تھے..مجھے یاد ہے جب میں نے، کمال اثر اور خاور زمان نے بمشکل اردو بازار سے یہ سٹوڈنٹ شناختی کارڈ حاصل کیے، اُن پر اپنی تصویریں چسپاں کر کے اُنہیں مسلم ماڈل ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر عزیز صاحب کی خدمت میں پیش کیا تا کہ وہ اُس پر اپنے دستخط اور مہر ثبت کر دیں تو عزیز صاحب نے چمڑے سے مڑا مختصر بید ہمارے سامنے لہرا کر کہا ”یہ تمہیں شناختی کارڈ کی ضرورت کیوں پڑ گئی ہے..باقی تو کسی طالب علم نے ایسی حرکت نہیں کی“

تو ہم نے اپنی لرزش پر قابو پاتے ہوئے کہا ”سر..وہ بس میں رعایت مل جاتی ہے..پنجاب پبلک لائبریری میں بھی وہ سٹوڈنٹ کارڈ چیک کر کے کتابیں ایشو کرتے ہیں اور ہمیں کتابیں پڑھنے کا بہت ہی شوق ہے..“

عزیز صاحب جو کہ ڈاکٹر محبوب الحق کے والد تھے اور محبوب بھی اُس سکول میں ہم سے دو جماعتیں آگے تھے، کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوئے تھے، کہنے لگے "تم نے کارڈ دکھا کر دس آنے کا ٹکٹ سوا روپے کا تو نہیں کروانا؟"

ہم نے کانوں کو ہاتھ لگایا کہ توبہ جی.. ہم تو فلمیں دیکھتے ہی نہیں، بس کتابیں پڑھنے کا شوق ہے..

اب اسے شاید شومیٔ قسمت کہا جاتا ہے تو ہمارے ساتھ وہی ہوگئی.. عزیز صاحب نے ایک شب مجھے اور خاور کو اوڈین سینما میں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا، یعنی ہمارے ہاتھوں میں نہ صرف کنسیشن شدہ ٹکٹ تھے بلکہ شناختی کارڈ بھی تھے، انہوں نے ہلکی سی گوشمالی کی اور مسکرا کر کہنے لگے "اچھا تو تمہیں کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے"

ریگل سینما میں دکھائی جانے والی یادگار انگریزی فلموں کی فہرست بہت طویل ہے اور میں اسے ذرا مختصر کرتا ہوں.. "سیمسن اینڈ ڈیلائلہ" کی بہت دھوم ہوئی، ایک عرصہ چلی.. پھر وہی "کو واڈیس".. کرک ڈگلس اور کِم ناوک کی فلم "پکنک" نے بھی ہماری جوانی کی اُمنگوں کو خوب مشتعل کیا کہ کِم ناوک کیا ہی طرح دار اور دل میں جا کرنے والی اداکارہ ہوا کرتی تھی، بلکہ اُن دنوں ہم گورنمنٹ کالج کے طالب علم ہوا کرتے تھے جب ایک روز معاشیات کے پروفیسر عطاء الرحمٰن نے کلاس میں اعلان کیا کہ لڑکو اگلے اتوار ہم پکنک پر جائیں گے تو خاور نے کھڑے ہو کر نہایت معصومیت سے پوچھا کہ "سَر.. کیا وہاں کِم ناوک بھی ہوگی.." پروفیسر صاحب نے اس بدتمیزی پر ہم دونوں کو کلاس سے نکال دیا.. اور یہ ایک روایت تھی، میں اور خاور اس نوعیت کی بدتمیزیاں کرتے ہی رہتے تھے۔ چنانچہ اگر میں کبھی مرتکب ہوتا تو صرف مجھے نہیں خاور کو بھی اس کی سزا ملتی اور ہم دونوں کو کلاس بدر کر دیا جاتا..

اسی ریگل سینما میں "سلومی" نام کی فلم سکرین پر جلوہ گر ہوئی اور اُس میں مشہور اداکارہ ریٹا ہیورتھ کا ایک اشتعال انگیز رقص تھا جس کے دوران وہ بائبل کے ایک پیغمبر کا سر کاٹ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتی ہے.. یعنی اُس کی کہانی بھی بائبل سے ماخوذ تھی.. "سلومی" کا کردار ادا کرنے والی اس اداکارہ کو اپنے پرنس علی خان نے اپنی منکوحہ کر لیا.. پرنس علی خان جو یو این او میں پاکستان کی نمائندگی کرتے تھے اور اُن کی نہایت شاندار اور مہنگی دعوتوں میں نہ صرف امریکہ کے صفِ اول کے سیاستدان بلکہ ہالی وڈ کے معروف سٹار بھی شرکت کرتے تھے اور یوں پاکستان کی جے جے ہوا کرتی تھی.. بلکہ ان دنوں نیویارک میں پاکستانی مِشن کی جو عمارت ہے، اور وہ ایک محل نما عمارت ہے، پرنس علی خان کی تحفہ کردہ ہے اور مُجھے سلجوق کے ابا جی ہونے کی حیثیت سے وہاں چائے کی ایک دعوت میں شرکت کا اتفاق ہو چکا ہے..

بہر طور قصہ مختصر.. پرنس علی خان لاہور کے تب کے مشہورِ زمانہ "ہارس اینڈ کیٹل شو" میں شرکت کے لیے لاہور آئے، ایئرپورٹ سے باہر آئے تو اُن کا استقبال کرنے والی خاتون وقار النساء نُون تھیں اور میں بھی

تھا، ہاتھ میں آٹوگراف بک تھامے کہ ''آٹوگراف پلیز''۔۔ پرنس نے، جو کہ ایک داغستانی قراقلی ٹوپی پہنے ہوئے تھے نہ صرف مجھے اپنے دستخط سے نوازا بلکہ میرے سر پر ایک تھپکی بھی دی اور تب مجھ سے ایک نادانستہ حماقت ہوگئی، انہیں دنوں انڈیا کے ''فلم فیئر'' میگزین نے ریٹا ہیورتھ کی وہ رنگین تصویر شائع کی، جو کہ پورے شمارے کی واحد رنگین تصویر تھی، جس میں وہ ''سلومی'' کے روپ میں ایک نیم برہنہ رقص کے انداز میں ہیں، آٹوگراف حاصل کرنے کے بعد میں نے پرنس علی خان کے سامنے وہی فلم فیئر کی رنگین تصویر پیش کر کے کہا ''اس پر بھی آٹوگراف کر دیجئے۔۔ ہم مسلمانوں کے لیے یہ فخر کا مقام ہے کہ وہ آپ کی بیگم ہیں۔۔''

پرنس علی خان نے وہ تصویر جھٹک کر مجھ پر ایک قہر انگیز نظر ڈالی اور آگے بڑھ گئے۔۔

ویسے پرنس علی خان کے آٹوگراف اب بھی میری آٹوگراف بک میں محفوظ ہیں۔۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ان انگریزی سینماؤں میں خالص دیسی اور لاہوری لوگ کم ہی آتے تھے۔۔ جب تک کہ دھوم نہ مچ جائے کہ۔۔اوئے ''سیمسن اینڈ ڈیلائلہ'' میں ایک پہلوان اکھاڑے میں اتر کر ایک شیر کو دھوبی پٹڑہ دے کر مار ڈالتا ہے۔۔ جانِ جگر۔۔ بھائی جان فلاں فلم میں نامہ نیم ہیروئن کپڑے اتار دیتی ہے وغیرہ چنانچہ یہ محض ایک لطیفہ نہیں ایک حقیقت ہے کہ دو لاہوری ایک انگریزی سینما میں فلم دیکھنے کے لیے آئے تو آغاز میں ایم جی ایم فلمز کا امتیازی نشان ایک شیر دھاڑا۔ تو ایک لاہوری نے دوسرے سے کہا ''اُٹھ اوئے مہاجے، یہ شیر والی فلم تو ہم نے پہلے بھی دیکھی ہوئی ہے۔۔''

راک ہڈسن اور جینا لولو برجیڈا کی ''کم سپٹمبر'' نے تو لاہور شہر کی ساری کھڑکیاں توڑ دیں۔۔ خصوصی طور پر ہڈسن اور جینا کے رقص نے۔۔ میں جب اطالیہ کے شہر میلان گیا تو خاص طور پر ان مقامات پر گیا جن میں میلان کیتھڈرل بھی شامل تھا، جہاں اس فلم کی شوٹنگ ہوئی تھی۔۔ بعد ازاں راک ہڈسن جو کہ ایک ٹرک ڈرائیور ہوا کرتا تھا، بوڑھا ہوا اور ایڈز کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گیا اور جینا کے وحشی ہوتے ہوئے ابھار ڈھلک گئے۔۔

سٹیو میکوئن کا ''گریٹ اسکیپ'' یُل برینز کی فلم ''دے مکنفیی سنٹ سیون'' کرک ڈگلس کی ''سپارٹاکس'' فرینک سناٹرا اور برٹ لنکاسٹر کی ''فرام ہیئر ٹو اٹرنٹی''......ڈیبرا کر اور انتھونی پرکن کی ''ٹی اینڈ سمپتھی''، جیمز ڈین کی ''ایبل وِد آؤٹ اے کاز'' جینا لولو برجیڈا، ٹونی کرٹس اور برٹ لنکاٹر کی سرکس کی ''ٹرے پنیز'' مارلن برانڈو کی ''ڈیزری'' اور ''اے سٹریٹ کار نیمڈ ڈیزائر'' ایوا گارڈز کی ''بیئر فٹ کانٹیسا'' وغیرہ وغیرہ۔۔سب کی سب ریگل سینما کی سکرین پر پرچھائیاں ہوئیں اور ان فلموں نے ہمارے دل موہ لیے، یوں کہ وہ اب تک ہمارے بوڑھے بدنوں کے اندر ہمارے ٹھہر ٹھہر جانے والے دلوں کی سکرین پر چلتی ہیں۔۔

چیئرنگ کراس جہاں ایک زمانے میں ''ملکہ کا بُت'' ہوا کرتا تھا، ملکہ وکٹوریا کا مجسمہ براجمان تھا

اور اب وہاں بُت شکن حضرات نے اُس کا بت لاہور عجائب گھر کے تہہ خانے میں پہنچا دیا اور اُس کی جگہ ایک پتھر کا قرآن پاک آویزاں کر دیا۔ تو وہاں سے ''گولڈ سمتھ'' کی کولونیئل دکان سے آگے پلازا سینما ہوا کرتا تھا.. ڈبلیوز یڈ احمد کی کوٹھی کے برابر میں..اور بلھے شاہ کے مُرشد شاہ عنایت کی مسجد سے ذرا اِدھر..اور یہ وہی مسجد ہے جہاں شاہ عنایت نماز ادا کر کے باہر آئے تو بلھے شاہ اپنے روٹھے ہوئے مرشد کو منانے کی خاطر پاؤں میں گھنگھرو باندھے، زنانہ لباس پہنے رقص کرتے تھے..ترے عشق نچایا، کر تھیا تھیا..

تو ذرا اِدھر پلازا سینما ہوا کرتا تھا، اب بھی شاید ہوگا..اس سینما کے ساتھ بھی بہت یادیں اور فلمیں وابستہ ہیں..مثلاً یہاں ''فال آف برلن'' نامی رُوسی فلم بہت مقبول ہوئی جس کا ترجمہ ''برلن کی تباہی'' ہوا اور لاہور کی دیواروں پر جگہ جگہ اس کی پبلسٹی پینٹ کی گئی اور لاہوریوں نے اپنی ''زندہ دلی'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے فلم کے نام کا ایک حصّہ ''بر'' راتوں رات مٹا کر اُسے کسی اور چیز کی تباہی میں بدل دیا جسے دیکھ کر بہو بیٹیوں نے بہت ''ہاہائے'' کیا چنانچہ دیواروں پر لکھے گئے اس نام کو فوری طور پر فسادِ خلق کے ڈر سے مکمل طور پر سیاہ پینٹ سے ملیامیٹ کر دیا گیا..

اور ہاں اُن زمانوں میں فلموں کی پبلسٹی کے بھی عجیب انداز تھے، ایک صاحب ایک بڑی سی گھنٹی کھڑکاتے لوگوں کو متوجہ کر رہے ہیں، اُن کے پیچھے درجن بھر دہاڑی دار مزدور کاندھوں پر فلم کے پوسٹروں سے مزّین لکڑی کے فریم اٹھائے چلے آ رہے ہیں اور ایک حضرت پہیوں والے دورُخ کے ہاتھ سے پینٹ کردہ فلم کے قدرے ہیجان انگیز کینوس کے فریم دھکیلتے ہوئے چل رہے ہیں...اس نوعیت کے فلمی جلوسوں کے پیچھے متجسّس بچہ لوگ تالیاں بجا رہے ہیں..یہ جدید پبلسٹی کے ذریعے تھے کہ کچھ مدت پیشتر یہ بھی رواج تھا کہ ایک ریڑھے پر نہ صرف ڈھول بج رہے ہیں بلکہ اکثر ایک بچّی رقص بھی کر رہی ہے..

فلموں کے افتتاح کے موقع پر شہر کی دیواروں پر پوسٹر چسپاں کرنے کا بھی رواج تھا..اور میں قدرے شرمندگی سے اقرار کرتا ہوں کہ مجھے یہ پوسٹر جمع کرنے کا بھی شوق تھا اور میں نے اکثر جان جوکھوں میں ڈال کر ایسے پوسٹر دیواروں سے اتارے اور اپنی کولیکشن میں گراں بہا اضافہ کیا..البتہ ایک قباحت ہوتی تھی کہ اگر پوسٹر چسپاں کیے ہوئے ایک آدھ دن گذر چکا ہے تو اُنہیں نہایت احتیاط سے اتارتے ہوئے بھی وہ اکثر پھٹ جاتے تھے، چنانچہ اس تکنیکی مسئلے کا حل میں نے یہ نکالا کہ چوکنا رہتا تھا، جہاں کہیں دیکھا کہ دیواروں پر فلمی پوسٹر چسپاں کیے جا رہے ہیں تو اُنہیں چسپاں کرنے والی گوند کے خشک ہونے سے پیشتر ہی اُنہیں اتار لیا جائے...اور وہ اتنی آسانی سے اترتے جیسے اُبلے ہوئے انڈے کے گرد جو سفید جھلی ہوتی ہے، وہ اترتی ہے..

پلازہ سینما کی سکرین پر کچھ بہت کلاسیک فلموں کی نمائش بھی ہوئی اور اُن میں سے ایک اطالوی فلم "بائیسکل تھیف" تھی اور دوسری سویڈش اداکارہ انیتا ایکبرگ کی فلم "لاڈو لچے وِیتے" یعنی "سویٹ لائف" بھی تھی۔ انیتا ایکبرگ کی مقبولیت کا ایک سبب اُس کے بدنی آئس برگ تھے جن کا حجم کچھ زیادہ ہی تھا.. مجھے یاد ہے کہ میں اور فخر زماں یہ مشہور زمانہ آرٹ فلم دیکھنے کے لیے گئے، پہلے تو چپ چاپ اس کی بوریت کو برداشت کرتے رہے، اگر میں اُکتا کر اقرار کرتا کہ یار یہ تو سمجھ میں نہیں آ رہی، چلتے ہیں تو بدذوق کہلاتا اور اگر فخر اپنی جمائیوں پر قابو نہ پا سکنے پر کہتا کہ یار.. تو ہم دونوں اپنی دانشوری کے زعم میں بوریت اور اکتاہٹ کے گھونٹ بھرتے رہے اور تب.. جب کہ فلم کو شروع ہوئے صرف تیس منٹ ہوئے تھے، دس آنے کی کلاس میں براجمان ایک لاہوری نے بور ہو کر نعرہ لگایا "کُرسیاں بھن دیو بھئی" یعنی "برادران کُرسیوں کو توڑ دو.." اس پکار پر وہ سب دس آنے والے باجماعت اٹھے اور اپنی لکڑی کی کُرسیوں کو پٹختے واک آؤٹ کر گئے.. چنانچہ ہم بھی وہاں سے نکل لیے.. بعدازاں جب میں اور فخر عمر رسیدہ ہو گئے تو ہمیشہ فخر سے اعلان کرتے کہ واہ واہ "لاڈو لچے ویٹا" تو ایک شاہکار فلم تھی، اتنی خیال انگیز کہ پورے دو گھنٹے اتنے مگن رہے کہ نہ ہم نے پہلو بدلا اور نہ ہی سانس لیا، دم بخود رہے.. ہم دانشور ایسے ہی ہوتے ہیں..

پلازہ سینما میں دکھائی جانے والی ایک اور فلم شاید "وائلڈ رِور" تھی جس کا ہیرو چُندّی آنکھوں والا رابرٹ مچم تھا اور اس میں مارلن منرو بھی تھی..اوہو، اوہو.. میں تو مارلن منرو کی فلم "نیاگرہ" تو بھول ہی گیا تھا.. یاد نہیں آ رہا کہ یہ ریگل میں نمائش ہوئی تھی یا پلازہ میں.. لیکن ہم نے اسے متعدد بار دیکھا اور مارلن منرو کے معصوم جنسی حسن کے اسیر ہوئے..اُن زمانوں میں اگرچہ فراخ اور پُرحجم سینے کی مالک جین مانسفیلڈ بھی منظورِ نظر تھی لیکن یہ مارلن منرو تھی جو ہمارے گیلے خوابوں کے شبستانوں میں راج کرتی تھی اور جب میں ایک کھولت زدہ بوڑھے کے روپ میں کینیڈا کی جانب سے نیاگرہ آبشار کی دید کے لیے گیا تو وہاں ہر جانب مارلن منرو ایک پھوار میں بھیگتی تھی.. جیک کینیڈی بے شک امریکہ کا صدر تھا پر اُس سے حسد ہم نے اس لیے کیا کہ وہ مارلن منرو کے عشق کی پھوار میں بھیگا... ڈزنی لینڈ سٹریٹ میں جہاں دنیا بھر کے سائنس دانوں، سیاست دانوں، گلوکاروں اور اداکاروں کی دستخط شدہ تصاویر، ذاتی لباس اور پوسٹر برائے فروخت تھے، یہاں تک کہ البرٹ آئن سٹائن کی ایک دستخط شدہ تصویر بھی خریدی جا سکتی تھی وہاں میرا دل پہلے تو جولیا رابرٹس کے اس مختصر لباس پر آیا جو اُس نے ایک فراخ دہن طوائف کے روپ میں زیب تن کیا تھا اور پھر مارلن منرو کی وہ قدِ آدم تصویر جس میں اُس کا سفید لباس ہوا کے زور سے اڑا جاتا ہے اور وہ مسکراتی ہوئی، جھک کر اُسے قابو کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور اُس کے باوجود اُس کی متناسب ٹانگیں عریاں ہو چلی ہیں.. اس تصویر پر مارلن منرو کے دستخط ثبت تھے.. میں نے بہت حساب کتاب کیا، اُن سب ڈالروں کا حساب کتاب کیا جو میرے پاس تھے یا میں ادھار لے سکتا

تھا پر وہ سب مارلن منرو کو خریدنے کے لیے کافی نہ تھے اور یہاں شمشاد بیگم کا وہ گیت یاد آیا کہ.. مُل وِکدا سجن مِل جاوے، لے لواں میں جِند ویچ کے.. اگر سجن برائے فروخت ہوتو میں اپنی جِند جان بیچ کر اُسے خریدلوں.. جِند جان بیچنے سے بھی مارلن منرو کی وہ قدِ آدم تصویر میں افورڈ نہ کرسکتا تھا..

ریگل، مال روڈ پر، پلازہ کوئنز روڈ پر اور تیسرا انگریزی سینما.. میکلوڈ روڈ پر.. ریجنٹ سینما، ٹکا ٹِک دال کی نکیوں کے تھال اور اُس کے عقب میں واقع ایک پگوڈا نما عمارت، ایک بے آباد ہو چکے گھر، جس میں کبھی ابن انشاء، اے حمید اور ساحر لدھیانوی نے بسیرا کیا تھا، ان کے سامنے اوڈین سنیما تھا.. اسی سنیما میں ہیڈ ماسٹر عزیز صاحب نے ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا اور اسی کی سکرین پر ہم پہلی بار ایوا گارڈنر سے ملے تھے اور فلم تھی ''سنوز آف کلی منجارو''.. ارنسٹ ہیمنگوے کی ایک کہانی کی فلمی شکل.. ہم نے اسے ایک بار دیکھا اور پھر بار بار دیکھا..

گریگوری پیک ایک مُہم جو شخص افریقہ میں ایک خیمے میں زخمی حالت میں پڑا، ایک ایسے ہوائی جہاز کا منتظر ہے جو اُسے تہذیب یافتہ دنیا میں لے جائے گا اور وہ کسی ہسپتال میں داخل ہو کر صحت مند ہو جائے گا.. وہ جہاز نہیں آ رہا، سوزن ہیورڈ اُس کی تیمارداری کر رہی ہے جس نے ''آئی وانٹ ٹو لو'' میں ایک ناقابل فراموش کردار ادا کیا تھا.. کیمپ کے قریب ایک افریقی درخت کی سوکھی ہوئی ٹہنیوں پر گِدھ بیٹھ رہے ہیں، انہوں نے موت کی بُوسُونگھ لی ہے.. گریگوری پیک خیمے میں لاچار پڑا، موت کا منتظر اپنی گذشتہ حیات کو یاد کرتا ہے... پیرس کے ایک نائٹ کلب کے نیم اندھیارے میں دیوار سے ٹیک لگائے وہ بیٹھا ہے اور اُس کے چہرے کے سامنے ایک نسوانی ہاتھ آتا ہے جس کی انگلیوں میں دبا ایک سگرٹ ہے.. ''تمہارے پاس کچھ آگ ہے'' اور یہ ایوا گارڈنر ہے جو گریگوری پیک سے سگرٹ سلگانے کے لیے ایک شعلے کی تمنائی ہوئی ہے..

ہم نے بار بار اس فلم کو صرف اس منظر کی خاطر دیکھا ''تمہارے پاس آگ ہے'' اور تب میں کہاں جانتا تھا، کیسے تصور بھی کرسکتا تھا کہ آئندہ زمانوں میں، یہی ایوا گارڈنر یہی ''بیئر فٹ کانٹیسا'' ''ہیمنگوے کے ناول ''فی اسٹا'' یا ''سَن آلسو رائزز'' کی ہیروئن کبھی میرے لکشمی مینشن کے فلیٹ کے عین سامنے ریگل کے فٹ پاتھ پر چلتی نظر آئے گی.. ''بھوانی جنکشن'' کی شوٹنگ کے لیے اسی شہر لاہور کے فلیٹیز ہوٹل میں قیام کرے گی اور اُس کے آٹو گراف لیتے ہوئے میری آٹو گراف بک اُس کی رانوں پر یوں دھری ہوگی کہ اُن کی مہک میری نوخیزی کی راتوں میں گیلی دھومیں مچا دے گی۔

اور تب میں یہ کہاں جانتا تھا..

کچھ حرج نہیں کہ اگر ہم انگریز کے کولونیئل زمانوں کے سحر سے آزاد ہو کر اپنے دیسی، اردو، پنجابی

زمانوں میں آجائیں۔

لاہور کے اُن سنیماؤں کے بارے میں کچھ یادیں تازہ کرلیں جن میں سے بیشتر معدوم ہو چکے ہیں..

چلئے میکلوڈ روڈ کے سنیماؤں سے آغاز کرتے ہیں..

ریجنٹ سنیما سے آغاز کرتے ہیں..

میرے دوست سردار سمیع اس سنیما کے برابر میں ایک گلی میں رہتے تھے اور اُن کا کہنا تھا کہ ہم رات کے بارہ بجے سے پہلے سونہ سکتے تھے، ہم انتظار کرتے تھے کہ کب ریجنٹ سنیما کا آخری شو ختم ہونا ہے اور اُس میں سے نکلنے والے تماشائی پیدل یا تانگوں پر رخصت ہوتے ہیں اور تب ہم سوتے ہیں..

ویسے ان زمانوں میں لکشمی مینشن کے 17 نمبر فلیٹ کی تیسری منزل پر واقع میرے چھوٹے سے کمرے کے اندر بھی دور کی آوازیں سنائی دیتی تھیں..ریجنٹ سنیما میں سے برآمد ہونے والے ہجوم کی آوازیں سنائی دیتی تھیں..

یہ ریجنٹ سنیما تھا جہاں ''آوارہ'' نمائش کی گئی..اس فلم کے بارے میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں کہ یہ ایک کلاسیک کی حیثیت اختیار کر چکی ہے..راج کپور اداکار جیسا کیسا بھی تھا، چارلی چپلن کا ایک دیسی روپ تھا لیکن وہ ہدایت کار کمال کا تھا..اس فلم میں چند ایسے تجربے کیے گئے جنہوں نے بس دھوم مچا دی دھوم..اور ان میں سے ایک ''گھر آیا میرا پردیسی'' کا خوابناک دھند میں ڈوبا ہوا سیٹ تھا.شنکر جے کشن کی موسیقی میں جو سُریلی جھنکاریں اور صدائیں تھیں، کبھی خوشی سے ابلتی ہوئی آبشاریں اور کبھی اداسی کی خاموش جھیلیں..''دم بھر جو اُدھر مُنہ پھیرے او چندا''، ''اٹھائے جا اُن کے ستم'' اور پھر وہ نغمہ جو شاید آج تک ترتیب دیئے فلمی گانوں میں سب سے پسندیدہ ہوا..میں سوویت یونین کے آہنی پردے کے پار ماسکو جاتا ہوں تو ریڈ سکوائر کی راتوں میں روسی گلے میں اکارڈین ڈالے کورس میں ''آوارہ ہوں'' گا رہے ہیں..ترکی، شام اور ایران میں لوگ اس کی دھن پر آوارہ ہوئے جاتے تھے بلکہ میں تو سوویت یونین میں تیار کیے گئے ''آوارہ'' کے گیت ریکارڈوں کی صورت اپنے ساتھ لایا.. پرتھوی راج کپور جس کی گہری بھید بھری آواز شیکسپیئر کے معروف اداکار جان گلگو سے تو کم نہ تھی ''آوارہ'' میں سب سے جاندار اداکار تھا..میں نے اُسے ''رستم وسہراب'' میں رستم کے روپ میں دیکھا اور مجھے موہوم سا یاد ہے کہ جب وہ اپنی گونج دار آواز میں اپنے گھوڑے ''رخش'' کو پکارتا ہے تو محل کے فانوس لرزنے لگتے ہیں اور آخری بار ''مغل اعظم'' میں جب وہ ایک طیش کے عالم میں اپنے انارکلی کی آوارگی میں مبتلا بیٹے کو ''شیخو'' کہہ کر پکارتا ہے تو شیخو صاحب جو عرف عام میں جہانگیر کہلاتے تھے، اُن کی سٹی گم ہو جاتی ہے بلکہ کچھ نہ کچھ خطا ہو جاتا ہے..میدان جنگ میں اپنے ہاتھی پر سوار مغل اعظم کہاں اتنا بارعب اور شاندار ہوگا، پرتھوی راج حملے کا حکم دیتے ہوئے گرجتا ہے ''یلغار ہو'' تو مغل سلطنت کی سپاہ یلغار کر دیتی ہے..

میں پچھلے برس سندھ یاترا کے دوران راجپوت شہر امرکوٹ تک جا پہنچا جو تھر پارکر کے صحرا کی ریت میں دمکتا ایک تاریخی شہر ہے اور اُس مقام پر گیا جہاں اکبراعظم کی پیدائش ہوئی تو بھی اُس صحرائی سناٹے میں مجھے پرتھوی راج کی ''یلغار ہو'' سنائی دی.. اگر امرکوٹ کے راجپوت راجے ہمایوں کو پناہ نہ دیتے تو ہمایوں مغل سلطنت کا آخری تاجدار ہوتا.. یہاں میں ایک تاریخی مغالطے کی جانب توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں.. اگرچہ سرزمین پختون خواہ نے جتنے نامور اداکاروں، موسیقاروں اور مصوروں کو جنم دیا، برصغیر میں اُن کی مثال ملنی مشکل ہے لیکن.. دلیپ کمار، شاہ رخ خان اور پرتھوی راج کپور خاندان ہرگز پٹھان نہ تھے..پشتون نہ تھے، اُن کی مادری زبان پشتو نہ تھی.. دلیپ کمار اور شاہ رخ خان ہندکو سپیکنگ تھے اور یہ زبان جان لیجیے کہ پنجابی کی ایک سوتیلی بہن ہے جب کہ پرتھوی راج کپور خاندان خالص پنجابی تھا جو بہتر مستقبل کی تلاش میں لائلپور کے ایک چک سے پشاور منتقل ہوا.. دلیپ کمار اور راج کپور جب خمار میں ہوتے تو ہمیشہ ہندکو میں یا پنجابی میں گفتگو کرتے.. اور تو اور اپنے قوی خان بھی پٹھان نہیں اردو سپیکنگ پشاوری ہیں..

میکلوڈ روڈ کے اسی سنیما میں ''جال'' کی داستان پردۂ سیمیں پر دکھائی گئی.. میرا خیال ہے کہ گورودت کی ہدایت کاری تھی، ایس ڈی برمن کی موسیقی اور دیو آنند کی دیوانگی اور گیتا بالی کا بالی پن اور ''یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں، سُن جا دل کی داستاں''.. اس گیت کی فلم کاری میں ایک ایسا سحر تھا جس نے اُن زمانوں کی جوانیوں کو مسحور کر دیا... دیو آنند، ہیمنت کمار کی آواز میں چاند بھری رات میں گٹار بجاتا پکارتا ہے اور جس طور گیتا بالی ایک جنسی انداز میں بےخود ہوتی ہے یہ گورودت کا کمال تھا..

مجھے یاد ہے جب ابھی ابھی بچپنے کا اختتام ہوا تھا اور جوانی کے بخار کے اولین دن تھے تو میری ایک رشتے دار لڑکی نے جسے میں آپا کہتا تھا، اُس نے مجھ سے فرمائش کی کہ.. وے مستنصر.. مجھے وہ گانا تو سنا دو.. جو دیو آنند، گیتا بالی کو سناتا ہے.. یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں.. اور میں نے زندگی میں پہلی اور آخری بار یہ گانا گایا.. گھگھیائی ہوئی بےسُری آواز میں جس کے نتیجے میں آپا ازاں بعد کسی اور کے عشق میں مبتلا ہوگئی کہ شاید وہ مجھ سے بہتر گانے والا تھا.. اُنہی زمانوں میں ہندوستانی فلموں کی نمائش روکنے کے لیے ''جال'' کی نمائش روکنے کے لیے اداکاروں اور ہدایت کاروں نے جلوس نکالے، گرفتاریاں پیش کیں اور یہ ''جال ایجی ٹیشن'' کہلائی.. اور میں سمجھتا ہوں کہ جب ہندوستانی فلموں پر پابندی عائد کی گئی تو اُسی لمحے پاکستانی فلموں کا زوال شروع ہو گیا.. اس سے پیشتر ہندوستانی فلموں کے مقابلے میں نہایت شاندار اور موسیقی بھری پاکستانی فلموں نے ''دوپٹہ''، ''چن وے''، ''انتظار'' وغیرہ نے انہیں مات کر دیا.. یہاں تک جب ''دوپٹہ'' کی نمائش کلکتہ میں ہوئی تو اس فلم نے سب ریکارڈ توڑ دیئے ''میں بن پتنگ اُڑ جاؤں رے'' نے نور جہاں کی آواز میں سب پتنگوں کو بوکاٹا کر دیا یہاں تک کہ متعصب ہندوستانیوں نے اُس سنیما گھر کو نذر آتش کر دیا.. اور جب ہندوستانی فلموں

سے مقابلہ نہ رہا، تو اول اول پاکستانی فلموں نے بہت کاروبار کیا کہ لوگوں کے پاس متبادل نہ تھا، کچھ بہت کمال کی فلمیں بھی منظر عام پر آئیں اور بالآخر.. مولا جٹ.. وحشی گجر.. پتر شاہیا دا.. وحشی جٹ.. جٹ دا کھڑاک.. گجر دا خون وغیرہ نے پاکستانی فلموں کی لٹیا ہی ڈبو دی.. سلطان راہی پاکستانی فلم انڈسٹری کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا..

میں لاہور کے سب سنیماؤں کا تفصیلی تذکرہ نہیں کرسکتا کہ اس کے لیے بہت تحقیق درکار ہے، کم از کم ایک کتاب درکار ہے..

ہیرامنڈی میں جہاں عزیز تھیٹر ہوا کرتا تھا، اُس کی عمارت میں پاکستان ٹاکیز ہوا کرتا تھا اور اب بھی ہے، اگرچہ اب وہاں پشتو فلموں کے ''ٹوٹے'' چلتے ہیں اور اُس کی شکستہ کرسیوں میں لاہور کے سب سے بزرگ کھٹمل قیام کرتے ہیں.. مجھے پاکستان ٹاکیز میں کبھی فلم دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا کہ بقول ابا جی، اچھے لوگ اُس علاقے میں نہیں جاتے، البتہ ہمارے دوست ملک تنویر کا کہنا ہے کہ ہیرامنڈی کے بچے بہت غدر مچاتے تھے، سنیما کے شیشے توڑ دیتے تھے تو منیجر صاحب اُنہیں بھولا کہہ لیجئے انہیں سنیما کے مالک نے جو ایک بہت معتبر علاقائی شخصیت تھے اور اُنہیں میاں صاحب کہنے میں ہی عافیت ہے تو انہوں نے سرزنش کی ''بھولے، تو اِن بچوں کو منع کیوں نہیں کرتا.. انہیں تھپڑ رسید کیوں نہیں کرتا'' تو بھولے نے بصد ادب عرض کیا کہ ''میاں صاحب میں جس بھی ہیرامنڈی کے بچے کو تھپڑ مارنے لگتا ہوں تو وہ آپ کی شکل کا ہوتا ہے..''

سرکلر روڈ پر جو سنیما ہوا کرتا تھا، شاید وہ نگار سنیما تھا، اس کے سامنے جو وسیع فٹ پاتھ تھا وہاں مجمع باز، سانڈھے کا تیل، ریچھ کی چربی کا تیل، شیر کی آنتیں اور دیگر مقوی دوائیاں بیچتے تھے، نیولے اور سانپ کی لڑائیاں دکھا کر سلاجیت فروخت کرتے تھے..

اب ہم میکلوڈ روڈ پر واپس آکر ریجنٹ سنیما سے آگے قیصر سنیما تک پہنچتے ہیں جو تقسیم سے پیشتر شاید پربھات سنیما کہلاتا تھا.. بیڈن روڈ کی ایک شاخ اور میکلوڈ روڈ کے سنگم پر یہ ایک تکونا سا سنیما تھا جس کے اندر کبھی مکمل تاریکی نہ ہوتی تھی اور اس کی وجۂ شہرت فلم ''کرتار سنگھ'' تھی.. سیف الدین سیف کی، علاؤ الدین اور سُدھیر کی اور اُس گیت کی فلم، جو اب ہماری داستانوی ثقافت کا ایک حصّہ ہو چکا ہے.. ''دیساں دا راجہ، میرے بابل دا پیارا.. وِیر میرا گھوڑی چڑھیا..'' آج بے شک بارات کا آغاز ایک فارم ہاؤس سے ہو، دولہا، بی ایم ڈبلیو کی سیون سیریز کی ایک کروڑوں کی کار میں سوار ہو، یہ ممکن ہی نہیں کہ وہاں ''وِیر میرا گھوڑی چڑھیا'' کی دُھن نہ بجائی جائے... وِیر ایک مرسیڈس یا پورشے میں سوار ہے لیکن ''دے جاوے وِیرا واگ پھڑائی'' کے مصداق بہنیں اب بھی مرسیڈس اور پورشے کی باگ تھام کر اپنے وِیر سے باگ پھڑائی کی رقم کا تقاضا کرتی

ہیں..اس گیت سے پیشتر دو نغمے تھے جو ہر بارات کا ٹریڈ مارک تھے "راجہ کی آئے گی بارات، رنگیلی ہو گی رات، مگن میں ناچوں گی" اور "چھوڑ بابل کا گھر، مجھے پی کے نگر آج جانا پڑا" لیکن "ویر میرا گھوڑی چڑھیا" ان دونوں سے زیادہ تأثر انگیز اس لیے ہو گیا کہ اسے سیف الدین سیف نے لکھا تھا..

قیصر سینما کے سامنے رِٹز سینما تھا..

رِٹز سینما کی سب سے سہانی یاد فلم "دل لگی" ہے..

آج کی سائرہ کاظمی کے مبینہ باپ شیام اور ثریا کی "دُلاری" میں بھول بھی سکتا ہوں لیکن "دل لگی" نہیں بھول سکتی، شاید موسیقی نوشاد کی تھی اور "تُو میرا چاند میں تیری چاندنی، نہیں دل کا لگانا کوئی دل لگی، کوئی دل لگی" ایک ایسا پُر بہار چھنکتا اور مدھر گیت تھا کہ میں آج بھی اُسے اپنے دل کے تاروں پر دستک دیتے سُن سکتا ہوں..پچھلے ساٹھ برس کے دوران میں نے جتنے بھی فلمی گیت سُنے، ان میں کچھ گیت ایسے تھے جن کے آغاز کی موسیقی، درمیان میں، وقفے کے دوران جو کچھ چھنکتا تھا، وہ آج بھی میرے بدن میں یوں چھنکتا جاتا ہے کہ میں ایک مجذوب ہو جاتا ہوں..مثلاً "جب اُس نے گیسو بکھرائے بادل آیا جھوم کے" کا آغاز.."ساون کے بادلو اُن سے یہ جا کہو".."جب دل ہی ٹوٹ گیا ہم جی کے کیا کریں گے"، "کلی کلی منڈلائے بھنورا، کہیں بھی چین نہ پائے بھنورا"، "جا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سوجا" کے آغاز کے الاپ..سب اپنی جگہ..لیکن "میں ترا چاند، تو مری چاندنی" وقفوں کے دوران کی شُدھ جھنکار بھی اپنی جگہ..نہیں دل کا لگانا کوئی دل لگی..

اور فلم "دُلاری" کا گیت "سُہانی رات ڈھل چکی، نہ جانے تم کب آؤ گے" لاہور کے محمد رفیع کے لاہوری دِل سے ایک تیر کی مانند نکلا اور ہم سب کے دلوں میں پیوست ہو گیا..

میکلوڈ روڈ کے رائل پارک سے ذرا آگے تین سینما لاہور کی راتوں میں جگمگاتے تھے..

اوڈین سینما جس کا تذکرہ ہو چکا..اُس کے سامنے کیپٹل سینما تھا اور پھر وہاں نشاط سینما ہوا کرتا تھا..

کیپٹل کے برابر میں ٹکا ٹن ٹکیوں کا تھال ہوا کرتا تھا، تکے کی ٹکّی..جہاں سے ٹکا ٹک یا ٹکا ٹن کا آغاز ہوا..

اس دال اور قیمے کی ٹکیوں کے کھوکھے کے عقب میں وہ پگوڈا نما آسیب زدہ سا مکان اندھیرے میں ظاہر ہوتا تھا جہاں کبھی ابن انشاء، اے حمید اور ساحر لدھیانوی قیام کرتے تھے..

کیپٹل سینما میں نمائش شدہ فلموں کی خبر مجھ سے فراموش ہوتی ہے سوائے ایک بہت پُرانی یاد کے جب "ڈاکٹر کٹنس کی امر کہانی، نام کی ایک فلم یہاں نمائش ہوئی تھی اور یہ میرے اباجی کی پسندیدہ فلم تھی اور مجھے صرف پاکستانی فلم "ملنگی" یاد رہ گئی ہے..ہیر رانجھا کا یادگار اداکار اجمل جس نے کیدو کا روپ دھارا تھا، اُس کا

بھائی اکمل اس فلم کا ہیرو تھا لیکن یہ مظہر شاہ تھا جس نے ''بڑھک'' ایجاد کی. شریکوں پر حملہ آور ہوتے ہوئے منہ پر مٹھی رکھ کر انہیں للکارا.... اور وہ عوام میں بہت دل پسند ہوا..

یہ محض اتفاق تھا کہ میں وہاں موجود تھا..

کیپٹل سنیما میں انٹرول ہو چکا تھا. ''ملنگی'' فلم کے درمیان وقفہ ہو چکا تھا..

تماشائی، بوتلیں پی رہے تھے، آلو کے قتلے کھا رہے تھے جب.. گیلری کی جانب سے مظہر شاہ کُرتے لاچے میں ملبوس، گلے میں کینٹھا، اپنے چند حواریوں کے ہمراہ شراب سے کہیں بڑھ کر شہرت کے نشے میں چُور داخل ہوا اور اُس نے سنیما کے درمیان میں پہنچ کر منہ پر مُٹھی جما کر ایک زوردار ''بڑھک'' لگائی جسے سن کر تمام تماشائی متوجہ ہو گئے.. وہ یقین نہ کر سکے کہ ابھی ابھی وہ جس مظہر شاہ کو فلم ''ملنگی'' میں سکرین پر بڑھکیں لگاتے دیکھ کر جوشیلے ہو گئے تھے وہ سچ مچ اُن کے درمیان موجود ہے اور وہ پاگل ہو گئے.. اُن میں سے کچھ نے نشستوں پر کھڑے ہو کر جوابی بڑھکیں لگائیں.. مظہر شاہ نے ایک فاتح کی مانند آس پاس خمار میں دیکھا، ایک دو فرمائشی بڑھکیں مزید لگا کر وہ چلا گیا..

اب ہم وقت کے پیمانوں کو فاسٹ فارورڈ کر کے پچیس تیس سال آگے لے جاتے ہیں.. اُسی سنیما میں وہی پرانی فلم ''ملنگی'' دوبارہ نمائش پر ہے.. زمانہ بدل چکا ہے.. ہال میں بہت کم تماشائی ہیں، صرف وہ جنہیں میکلوڈ روڈ پر دکھائی جانے والی ایک اور فلم کے ٹکٹ نہیں مل سکے اور وہ مجبوراً ادھر چلے آئے ہیں، انٹرول ہوتا ہے اور ہاں اس بار میں وہاں موجود نہ تھا، کسی اور عینی شاہد نے یہ قصہ بیان کیا ہے.. انٹرول ہوتا ہے اور ایک مرتبہ پھر مظہر شاہ، ایک بوڑھا ہوتا شخص، جس کی شہرت ایک قصۂ پارینہ ہے.. ہال میں داخل ہوتا ہے اور وہ اکیلا ہے کہ شہرت کے حواری اب اُسے چھوڑ چکے ہیں.. وہ ہال میں کھڑے ہو کر ایک ناتواں سی آواز میں بڑھک مارنے کی کوشش کرتا ہے.. چند لوگ اُسے پہچان لیتے ہیں جب کہ بقیہ تماشائی اس بوڑھے کی بڑھک سے بیزار ہو جاتے ہیں.. یہ کون ہے.. پاگل لگتا ہے.. گیٹ کیپر اُسے بازو سے پکڑ کر باہر نکال دیتا ہے..

فلمیں اُن زمانوں میں تازہ ترین فیشن، لباس، زیور، گفتگو کے اسلوب اور رومان کے خزانے ہوا کرتی تھیں، تب نہ فیشن میگزین تھے، نہ کیٹ واکس نہ ٹیلی ویژن اور نہ ہی راک کانسرٹ.. نوجوان لڑکے اپنے پسندیدہ اداکاروں کے لہجے اپنا لیتے. لڑکیاں اپنی من پسند ہیروئنوں کی مانند ڈریس کرتیں اور لاہور کے درزی اپنی لیڈی گاہکوں سے پوچھتے، بہن جی، کونسا سٹائل بنادوں.. ''ترانہ'' کی مدھوبالا ''داغ'' کی نمی.. ''ضدی'' کی کامنی کوشل یا ''کالی گھٹا'' کی بینا رائے کا.. میرے بہت ہی پیارے چچا سلیم تارڑ اور میں اُن کا بغل بچہ ہوا کرتا تھا.. ایسا ہینڈسم شخص کہ جب ہاتھ میں کریون اے کے سگرٹوں کا ڈبہ تھامے، بوسکی کی کھلے گلے کی قمیص اور مکھن

زین کی سفید پتلون میں سالم ٹانگے پر سوار نکلتا تھا تو بیڈن روڈ اور میکلوڈ روڈ کی بالکونیوں کے آگے تنی چلمنوں کی اوٹ میں کھڑی لڑکیاں اُن پر فدا ہو جاتی تھیں.. چچا سلیم ہیرو بننے کے لیے چوری چھپے بمبئی بھی گئے پر قسمت نے یاوری نہ کی..وہ اشوک کمار کے انداز میں سگریٹ پیتے، دھوئیں کے مرغولے چھوڑتے ہوئے بہت مہک آور ہوتے..اشوک کے انداز میں باتیں کرتے...ہم غریبوں کی کُٹیا میں اندھیارے ہیں پر ماتما..

اور وہاں اسی کیپٹل سنیما میں فلم ''محل'' بھی پردہ سیمیں کی زینت بنی تھی، مجھے اب یاد آیا..

سلیم تارڑ کو ہمیشہ ''پرنس'' کے نام سے پکارا جاتا..وہ انشورنس سے جو کماتے اپنے گاؤں پیر کوٹ میں قائم کردہ ڈسپنسری اور ناداروں اور بیواؤں پر خرچ کر دیتے..وہ حقیقی معنوں میں ایک شہزادے تھے، بعدازاں اُن کے چھوٹے بھائی محمد رفیق تارڑ صدر پاکستان ہوئے..عینی کی شادی پر یہ دونوں بھائی رفیق تارڑ، صدر مملکت کی حیثیت سے اور سلیم تارڑ میرے فیورٹ چچا پرنس کی حیثیت سے شامل ہوئے..

کمال امروہوی کی فلم ''محل'' کا کیا بیان ہو..ایک خوابناک، محبت کی دھند میں ڈوبی ہوئی، یقین اور بے یقینی کے سحر سے آراستہ..لتا منگیشکر نے ''آئے گا آنے والا'' گایا تو آنے والا سب موسیقی کا زمانہ اُس کا ہو گیا..بے شک ''ترانہ'' میں مدھو بالا پورے برصغیر کے دِلوں کی رانی ہو گئی تھی لیکن ''محل'' میں اُس کے جادوئی حسن نے دماغوں کو بھی اسیر کر لیا..معصوم حسن کی اگر کوئی دیوی ہوتی تو مدھو بالا کے سوا اور کون تھی جو ہو سکتی..

بہت مدت بعد ہیما مالینی کے چرچے ہوئے پر اُس میں بھی مولوی مدن والی بات تو نہ تھی..

نہ جانے دل کی کشتی کب تک لگے کنارے..کوئی نہیں چلاتا اور تیر چل رہے ہیں..تڑپے گا کوئی کب تک بے آس بے سہارے..لیکن یہ کہہ رہے ہیں دل کے مرے اشارے..آئے گا آئے گا آنے والا..

میرے اکلوتے ماموں جان جنہوں نے روز سنیما میں مجھے باٹا کے سلیپر سے سرفراز کیا تھا، ایک رومان انگیز ذوق جمال کے بھی مالک تھے..انہوں نے اولاد کی خواہش میں متعدد شادیاں کیں لیکن ان کے نصیب میں سب کچھ تھا، اولاد نہ تھی..میری تیسری ممانی رضیہ اور چوتھی ممانی عذرا نے مجھے یاد ہے کہ اُن کا آپس میں سلوک بہت بہنوں والا تھا بظاہر..ظاہر ہے ماموں جان، اپنی کم سِن بیوی عذرا پر ریشہ خطمی ہوا ہی کرتے تھے..اُنہیں اگر کسی فلم کی ہیروئن کے زیور پسند آجاتے تو وہ اپنے ذاتی سُنیار کو اپنے ساتھ لے جا کر وہ فلم دکھاتے کہ..گہنا اگر ہو تو ایسا ہو..سنیار جونہی مدھو بالا یا نرگس سکرین پر نمودار ہوتی، زیورات سے آراستہ تو وہ اندھیرے میں بمشکل اُس کا ڈیزائن کاغذ پر اتارتا..اکثر وہ فلم متعدد بار دیکھنے کے بعد زیور کا ڈیزائن مکمل ہوتا..

اور جب یہ زیور تیار ہو جاتا، اور اکثر دونوں بیویوں کے لیے بنوایا جاتا تو ماموں جان اُنہیں وہ فلمی زیور پہنا کر بھٹی فوٹو گرافر سے ایک تصویر اُترواتے، درمیان میں قبلہ ماموں جان اور وہ خاصے خوش شکل بھی تھے، بائیں جانب ممانی رضیہ اور دائیں جانب ممانی عذرا..دونوں مدھو بالا یا نرگسی سٹائل کے زیوروں سے آراستہ..

میرا خیال ہے کہ مجھ میں حسن پرستی کی جو بے خودی ہے، وہ قبلہ ماموں جان کی ودیعت ہے ورنہ ابا جی تو ان معاملات میں یکسر کورے تھے..

اُنہی دنوں ضیا سرحدی کی کلاسیک فلم ''ہم لوگ'' نمائش کی گئی.. شاید روز سینما میں، مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں آ رہا، اس فلم کے گیت بہرطور بہت یادگار ہوئے ''چھن چھن باجے پائل موری.. آ جا چوری چوری'' شیاما نے بھی جلوے دکھائے لیکن یہ فلم صرف بلراج ساہنی کی تھی.. بلراج کمیونسٹ پارٹی کا ممبر، ایک ٹھیٹھ پنجابی، اپنے کردار میں یوں ڈھل گیا کہ کب گمان ہوتا تھا کہ وہ اداکاری کر رہا ہے اور ''ہم لوگ'' کے ڈائیلاگ آج تک فلم کے جنوں میں مبتلا لوگوں کو یاد ہیں.. جس دیئے میں تیل نہ ہو اُسے جلنے کا کیا ادھیکار..

کیپٹل سنیما کے عین سامنے تو اوڈین تھا اور ذرا اِدھر نشاط سنیما کی خوبصورت پرانی طرز کی عمارت تھی..

مسلم ماڈل سکول میں ہمارے دو ڈرائنگ ماسٹر ہوا کرتے تھے.. ایک تنومند ماسٹر سہیل جو طالب علموں کی مالی معاونت سے ہمیں ''سٹل لائف'' کی تصویر بنانے کے لیے میز پر درجن بھر کیلے اور چند سیب ترتیب سے رکھ دیتے کہ ہاں جی اس کی ڈرائنگ کرو.. ہم نہایت انہماک سے پھلوں کی ڈرائنگ کرتے رہتے اور وہ بھی انہماک سے نہایت خاموشی سے ایک ایک کر کے کیلے اور سیب نوش کرتے رہتے، یہاں تک کہ صرف خالی میز بھائیں بھائیں کرنے لگتی..

دوسرے ڈرائنگ ماسٹر، اسلم صاحب تھے.. خوش شکل، ہمیشہ خوش لباس، سیاہ سُوٹ کے ساتھ سیاہ بوٹائی باندھے ہوئے..

ماسٹر اسلم، نشاط سنیما میں پارٹ ٹائم منیجر اور کبھی کبھار ٹکٹوں کی کھڑکی میں بھی براجمان ہو جایا کرتے تھے.. ہم پر بہت عنایت کرتے.. ہم دس آنے پیش کرتے تو وہ ہمیں گیلری کا سوا روپے کا ٹکٹ عطا کر دیتے.. اُن کا بیٹا محمود اسلم ان دنوں ایک معروف اور منجھا ہوا ٹیلی ویژن کا اداکار ہے.. ان دنوں کامیڈی سیریل ''بُلبلے'' میں دل پذیر کے ہمراہ محمود کا ہی کردار ادا کر رہا ہے..

نشاط سنیما کم از کم میرے لیے ''یہ ہوا یہ رات یہ چاندنی تیری اِک ادا پہ نثار ہے'' کا معبد ہے.. فلم ''سنگدل'' اور نایاب موسیقار سجاد کی موسیقی.. دلیپ کمار اور مدھو بالا.. ''سنگدل'' سے پہلے کشور ساہو کی ''کالی گھٹا'' نئی اداکارہ بینا رائے کا بے مثال حسن، جس نے بعد از اں چپٹی ناک والے، راج کپور کے سالے پریم ناتھ سے

شادی کی..اس فلم کا نغمہ ''کالی گھٹا'' بھی ہمارے دلوں کی دھڑکن میں شامل ہو گیا...یہیں پر ''دیا اور طوفان'' کی نمائش ہوئی اور بہت بعد میں انور کمال پاشا کی دو ہٹ فلمیں ''قاتل'' اور ''گمنام'' بھی دکھائی گئیں..

''رتن'' لاہور کا اکلوتا جاٹ سنیما تھا کہ چوہدری عید محمد اس سنیما کے مالک تھے..

رتن سنیما کی سب سے قدیم اور ایک خواب لگتی یاد..فلم ''رتن'' تھی..سورن لتا، نذیر اداکار سے بیاہی گئی اور غالباً مسلمان ہو گئیں..آج کے مؤثر اداکار نعمان مسعود کی نانی جان..صرف ایک بار اسلام آباد سے لاہور آتے ہوئے جہاز کے اندر میں اُن کے قریب سے گذرا تو انہوں نے کہا ''تارڑ صاحب..آپ مجھے نہیں پہچانتے..آپ مجھے نہیں جانتے، میں آپ کو جانتی ہوں..'' اور جب پہچان آ گئی تو میں مؤدب ہو گیا..''رتن'' کی ہیروئن..''ساون کے بادلو اُن سے یہ جا کہو..تقدیر میں یہی تھا ساجن مرے نہ رو''....جس دن سے جدا ہم ہیں آنکھ مری پُرنم ہیں..اور زہرہ بائی انبالے والی جس طور ''پُرنم'' کی ادائیگی کرتی تھیں ہماری آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں..یہ ''رتن'' کا ہی گیت تھا ''رم جھم رم جھم برسے بادل وا..مست گھٹائیں آئیں، پیا گھر آ جا، پیا گھر آ جا'' مجھے یاد نہیں..

رتن سنیما کی سکرین پر ہی ''پرچھائیاں'' تھی جو چھا گئی..کٹتے ہیں دُکھ میں یہ دن پہلو بدل بدل کے..

لیکن رتن سنیما پر جوبن تب آیا جب برصغیر کی پہلی رنگین فلم ''آن'' کی نمائش ہوئی..مجھے یاد ہے کہ ہم سارا دن کوشش کرتے رہے کہ کسی طور کسی بھی شو کے ٹکٹ حاصل ہو جائیں لیکن ہم ناکام رہے اور رات گئے گھر واپس آ گئے..لوگ پورے لاہور میں سفارشیں تلاش کرتے رہے کہ کوئی تو ہمیں اس فلم کے ٹکٹ حاصل کرنے میں معاون ثابت ہو..

کئی ماہ کی کوششوں کے بعد ہم ''آن'' دیکھنے میں سرخرو ہوئے..دلیپ کمار..نمّی، پارسی نادرہ، مُکری، پریم ناتھ اور نوشاد کے نغمے..آج کوئی من میں بانسری بجائے..ٹکرا گیا تم سے دل ہی تو ہے..روئے نہ یہ کیوں قاتل ہی تو ہے..دل میں چُھپا کے پیار کا..طوفان لے چلے..ہم آج اپنی موت کا سامان لے چلے..

رتن سے ذرا آگے قلعہ گوجر سنگھ سے ذرا اِدھر..لاہور کے سب سے مشہور مصور اور پینٹر ''راکا'' کے اوپن ایئر سٹوڈیو کے سامنے..اور یہ راکا صاحب، میرے ابا جی کے بہت گہرے دوست تھے..انہوں نے ہماری بیجوں کی دکان کے لیے جو بورڈ تخلیق کیا اسے دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آیا کرتے تھے..بس انہی زمانوں میں مجھ پر کھلا کہ راکا میرے عزیز از جان گوجر دوست سرفراز کے سُسر تھے..تو قلعہ گوجر سنگھ چوک سے

ذرا اِدھر صنوبر سنیما ہوا کرتا تھا..

صنوبر ایک مختصر اور کوزی سنیما ہوا کرتا تھا.... مجھے گمان ہے کہ میں نے ''پکار'' فلم اسی کے ہال میں دیکھی جس میں چندر موہن نے شاہجہان یا جہانگیر کا کردار ادا کیا تھا.. موٹی اور بھوری بلّی آنکھوں والا چندر موہن مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا.. اُس نے جہانگیر کا کردار ہی کیا ہوگا کہ اس میں عدل کی وہ زنجیر دکھائی گئی تھی جو مبینہ طور پر مغل شہنشاہ کے محل کی کھڑکی سے لٹکتی عوام الناس کے آس پاس رہتی تھی کہ جو بھی انصاف کا طالب ہو وہ زنجیر ہلا دے چنانچہ ایک دھوبی یا دھوبن اس زنجیر کو ہلا کر فریاد ہے فریاد ہے کی پکار کرتے ہیں اور ملکہ نور جہاں کو مجرم ٹھہراتے ہیں.. مجھے یہ بھی واہمہ ہے کہ محبوب کی انقلابی فلم ''روٹی'' بھی میں نے اسی سنیما میں دیکھی تھی جس میں لمبے تڑنگے صحت مند اداکار شیخ مختار نے مرکزی کردار ادا کیا تھا.. اور نہ گمان ہے اور نہ واہمہ میں نے بہر طور راج کپور کی ''آگ'' یقینی طور پر یہیں دیکھی تھی.. کیا ''زندہ ہوں اس طرح کہ غمِ زندگی نہیں، جلتا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں'' اسی فلم کا گانا تھا؟ یہ بھی طے ہے کہ پاکستانی فلم ''شہری بابو'' صنوبر کی سکرین پر چلی تھی.. بھاگاں والیو نام جپو، مولا نام.. مولا نام نام.. لوگ بیوپاری حسن دے وَیری.. اور پاکستان کی پہلی جاسوسی فلم جس کا نام ذہن سے اترتا ہے، یہیں چلی تھی جس میں ایک اداکار رفیق انور نام کے تھے اور وہ کلاسیکی رقص میں بھی نامور تھے..

میں نے لاہور کے سنیما گھروں کے قصے چھیڑتے ہوئے یہی گمان کیا تھا کہ یہ قصّے چند اوراق میں سمٹ جائیں گے لیکن یہ تذکرہ تو شیطان کی مبینہ آنت کی طرح طویل ہوتا جاتا ہے، میرے قابو سے باہر ہوا جاتا ہے کہ بھولی بسری یادیں جانے کن کن پوشیدہ آشیانوں سے پھڑ پھڑاتی نکلتی یلغار کرتی چلی جاتی ہیں.. کہ ہمیں ایک مختصر مضمون میں تم کہاں محدود کر سکتے ہو تو میں مجبوراً یادوں کی چادر کو سمیٹ لیتا ہوں.. اختصار کی کوشش کرتا ہوں.. اور یہ بھی خیال رہے کہ میں صرف موہوم پرچھائیاں ہوتی یادوں پر انحصار کر رہا ہوں.. تحقیق کے عمیق کنویں میں اتر کر سو فیصد درست حقائق کی کھوج نہیں کر رہا، اس لیے موہوم پرچھائیاں ایک سراب اور فریب بھی ہو سکتی ہیں، سنیماؤں کے ناموں اور فلموں کے بارے میں اِدھر اُدھر بھٹک بھی سکتا ہوں، جو دانائے راز ہیں، وہ میری درستگی بھی کر سکتے ہیں اور گوشمالی بھی.. مثلاً میں بھول گیا کہ ریٹز سنیما میں ہی فلم ''پوستی'' کی نمائش ہوئی تھی جس میں ''ہم لوگ'' والی شیاما نے اپنی بے دھڑک ہنسی سے ہمارے دل موہ لیے تھے.. تُوں پینگ تے میں پرچھاواں تیرے نال... کدی ناں لاواں، بھیڑا پوستی... رتن میں پاکستانی ''امراؤ جان ادا'' دکھائی گئی تھی جس میں رانی نے ایسے دل کش اور دل ربا اور دل گرفت رقص کیے کہ لکھنؤ کی امراؤ بھی ''کیا کہنے.. سبحان اللہ'' کہنے پر مجبور ہو گئی... اداکار شاہد ذاتی زندگی میں بھی ایک نوعیت کے نواب تھے، اس فلم میں بھی وہ ایسے خوش شکل نواب ہوئے کہ لکھنؤ والے دھان پان نواب بھی پان کی پیکیں تھوکنے لگے..

شاہد کیا ہی لااُبالی اور کھلنڈرا شخص تھا.. مجھے یاد ہے کہ ایک شام مال روڈ پر سیر کرتا میں الفلاح سنیما تک جا پہنچا.. وہاں ایک کار کے گرد کچھ ہجوم تھا، ایک پُرمسرت اور زندگی سے بھرپور ہجوم تھا، درمیان میں شاہد صاحب اپنی کار کے بانٹ پر بیئر کی بوتلیں سجائے اِک حالتِ خمار میں ہیں اور لاہوریوں سے کہہ رہے ہیں کہ پیو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید اور چند لوگ اس پیشکش سے فائدہ اٹھا کر کشید کی بوتلیں منہ سے لگاتے ہیں، کبھی یہ حضرت میانی صاحب کے قبرستان میں رات گئے شنید ہے کہ یا تو فردوس کی ماں کی قبر پر یا پھر اپنی والدہ کی قبر پر روتے چلے جاتے ہیں.. دونوں بے چارے ایک دوسرے کے آنسو پونچھ رہے ہیں.. شنید ہے.. جیو تو ایسے جیو.. شاہد پاکستان فلم انڈسٹری کا سب سے رنگ رنگیلا، سوہنا اور انوکھا لاڈلا اداکار ہوا کرتا تھا.. جو مصطفےٰ کھر کی مانند گناہ نہ کرتا تھا، شادیاں کرتا تھا..

ویسے آپس کی بات ہے، ہم لوگ اپنی امراؤ جان کو ہندوستان کی امراؤ جان پر فوقیت دیتے ہیں، جانے کیوں دیتے ہیں.. چہ نسبت!

اور ہاں میں نے کیپٹل سنیما میں جے شری کی ''ڈاکٹر کٹنس کی امر کہانی'' بھی دیکھی تھی جو میرے ابا جی کی ''روٹی'' کے بعد سب سے پسندیدہ فلم تھی.. فلم ''البیلا'' بھی اسی کی سکرین پر چلی تھی جس میں موٹا اداکار بھگوان رقص کرتا گیتا بالی کے گرد گھومتا تھا.. شام ڈھلے، کھڑکی تلے، تم سیٹی بجانا چھوڑ دو.. تم آنا جانا چھوڑ دو..

میں اپنے آپ کو مختصر کرتا، بہت سارے سنیماؤں کا تذکرہ موقوف کرتا میکلوڈ روڈ سے ترکِ تعلق کرتا ریلوے سٹیشن کی قربت میں واقع ریوالی سنیما تک آ جاتا ہوں.. یہاں دلیپ کمار کی میرے نزدیک سب سے شاہکار فلم ''داغ'' ریلیز ہوئی اور میں ''پارومیری ماں مر گئی'' کا تذکرہ کر چکا ہوں.. اے مرے دل کہیں اور چل، غم کی دنیا سے جی بھر گیا، میں جیتے جی مر گیا اور ہم درد کے ماروں کا اتنا ہی فسانہ ہے.. اس فلم کا سب سے یادگار، انقلابی اور عقیدے کی زنجیریں توڑ دینے والا وہ منظر تھا جب دلیپ کمار اپنی ماں کو بھگوان کے بُت کے سامنے گڑگڑاتے دیکھ کر حالتِ خمار میں کچھ اس نوعیت کے ڈائیلاگ بولتا ہے کہ ماں تم اس بھگوان کی پوجا کر رہی ہو جو صرف سیٹھ حضرات پر نظر کرم کرتا ہے، ہم غریبوں پر نظر نہیں کرتا.. اسے اٹھا کر گلی میں پھینک دو.. ''داغ'' کے ہدایت کار، موسیقار اور مصنف سب کے سب ہندو.. کیا کوئی بھی مسلمان ہدایت کار یا مصنف یہ جرأت یا خودکشی کر سکتا ہے کہ وہ اپنے اللہ کے بارے میں یہ کلمات کہے.. ہندو پھر بھی اپنے تعصب سے بغاوت کر سکتا ہے، ہم نہیں کر سکتے اور نواز شریف کے پاکستان اور مودی کے ہندوستان میں تو ہرگز نہیں.. اور تب ریوالی سنیما میں ''برسات'' کی جھڑی لگی اور برسوں لگی ہی رہی.. اس کے چھم چھم کرتے گیت شہر لاہور پر بارشوں کی مانند برستے ہی رہے.. برسات میں ہم سے ملے تم، برسات میں.. دھک دِناں دِن.. میرا لال دوپٹہ ململ کا، ہو جی ہو جی.. ہو ہو مجھے کسی سے پیار ہو گیا.. چھوڑ گئے بالم مجھے ہائے اکیلا چھوڑ گئے.. پتلی کمر ہے، ترچھی نظر ہے..

کہا جاتا ہے کہ ''برسات'' کے ایک منظر میں جب راج کپور اور اس کا سالا موٹی ناک والا پریم ناتھ کشمیر میں ایک شب الاؤ کی قربت میں بیٹھے ہیں تو ہوا میں اُڑتا ہوا ایک کاغذ آتا ہے اور اُس پر قائداعظم کی تصویر ہے تو وہ دونوں اُسے آگ میں جھونک دیتے ہیں، اس منظر کو پاکستان میں حذف کر دیا گیا..اور یہ ممکن بھی ہوسکتا ہے کہ راج کپور اور پریم ناتھ پاکستان سے بُغض رکھتے تھے، یہاں تک کہ راج کپور نے ہمیشہ اپنی فلموں کے لیے ہندو مکیش کو چُنا اگرچہ وہ ایک محدود آواز کا گلوکار تھا، محمد رفیع سے ہمیشہ اجتناب کیا اگرچہ وہ لامحدود تھا..البتہ ''سنگم'' میں جب آواز کی بلند آہنگی درکار تھی تو مجبوراً محمد رفیع کو بلایا گیا..

قاہرہ، استنبول، دمشق، روم اور پیرس کی مانند شہر لاہور کی بھی بہت دنیائیں اور کائناتیں ہیں..قدیم گلی کوچے، بازار، دروازے، معبد، مندر اور مسجدیں، شعراء، خوش نویس، مصوری کے اُستاد، خطاطی کے ماہر، بزرگانِ دین کے مزار، گورستان، شاہی مقابر، حویلیاں... میلے ٹھیلے اور لوک گیت، اور کسی بھی شہر کے سینماؤں کی حیثیت تو ان کے مقابلے میں بہت کمتر ہے لیکن سینماؤں کو حقیر نہ جانئے..ان کی سکرینوں پر جو کچھ عکس ہوتا ہے وہ پورے شہر کے مزاج پر اثر انداز ہوتا ہے..

میری طوائف مرشد نے اپنے ایک شعر میں میری حیات کو بیان کر دیا..

کس کو سنائیں حالِ دلِ زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

تو میں نے گئے زمانوں میں آوارگی کی، زمانے کی سیر کی، لاہور کے سینما گھروں کو اپنی حیات کی دھند کے گذر چکے زمانوں میں کھوج کیا..کبھی بھٹک گیا اور کبھی یادوں کے راستوں کا مسافر ہو گیا، یارو مجھے معاف کرو، میں نشے میں ہوں، ماضی کی دھندلی شرابوں کے خمار میں ہوں، کم ناوک، مارلن منرو، ایوا گارڈنر، مدھوبالا، نرگس، گیتا بالی، کامنی کوشل کے خمار میں ہوں..

؎ یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں، سُن جا دل کی داستاں



''کسان اینڈ کمپنی..لاہور کا ایک لینڈ مارک''

یہ پچھلے برس کی بات ہے کہ مجھے اعجاز انور کا فون آیا، بُوٹے سے قد والا، اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو چرس کے نشے میں گم ملنگوں کی مانند گھمانے والا اور اس بوٹے کے سر پر گھنگھریالے اور گھنے سفید بالوں کا ایک جمگھٹا ایسا ہے کہ کوئی بھی پرندہ اسے ایک آشیانہ بنا کر اس میں درجن بھر انڈے دے سکتا ہے اور اعجاز انور کو کچھ خبر نہ ہو جب تک کہ اُن انڈوں میں بچے برآمد کر کے چوں چوں نہ کرنے لگیں، بلکہ تب بھی شاید اسے خبر نہ ہو، انور علی نھا کا بیٹا، ایک مخدوش سا جینئس، واٹر کلر میں مصوری کے کمال کی انتہا کو پہنچا ہوا جس نے معدوم ہوتے شہر لاہور کے گلی کوچوں، حویلیوں، جھروکوں، تہواروں، شکستگی سے دوچار فصیلوں، دیواروں، محرابوں اور مزاروں کو پانی کے رنگوں سے کینوس پر منتقل کر کے انہیں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے تا کہ اگر کل جو آنے والا ہے اس میں کوئی بچّہ اپنے باپ سے کہے کہ ابّا، یہ آپ کیا ہر وقت لاہور لاہور کُوکتے رہتے ہو..کیا یہی لاہور ہے، اندرون شہر غلاظت سے بھرا ہوا، حبس آلود گلیاں..اُن گلیوں میں بھیانک پلازے، جوتیوں کے گودام، دکانیں، ورکشاپیں، مارکیٹیں اور..تو کیا یہی لاہور ہے تو وہ باپ اُس بچے کو اعجاز انور کی آرٹ گیلری میں لے جائے اور کہے ''لاہور یہ تھا..''

یہ نھا اعجاز انور نہ صرف لاہور کو مصور کرتا ہے بلکہ لاہور کی قدامت اور دل کشی کی امین تاریخی عمارتوں کے دفاع کے لیے حکمران طبقے کی ترقی کے نام پر ان نشانیوں کی بربادی اور توسیع پسندی کے خلاف احتجاج کی ایک ڈھال بن جاتا ہے..تو اُسی اعجاز انور نے پچھلے برس مجھے فون کیا ''تارڑ صاحب، یہ جو آپ کی دکان ہوا کرتی تھی بیجوں والی، گوالمنڈی چوک کے قریب، چیمبرلین روڈ پر، تو اس کا نام کیا تھا، کچھ کسان تھا..''

بھلا اس مخبوط الحواس لگتے مصوّر کو میری آبائی دکان کی یاد کیسے آ گئی..

''میں اِن دنوں لاہور کے اس حصّے کو کینوس پر مصور کر رہا ہوں..چیمبرلین روڈ کی سب سے بڑی پہچان آپ کی یہ دکان تھی تو میں اپنی تصویر میں اس کا بورڈ پینٹ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ لاہور کا ایک لینڈ مارک تھی..پورا نام کیا تھا؟''

''کسان اینڈ کمپنی''، میرے لہجے میں ایک رنج تھا..

ان دنوں جب میرے روز و شب لاہور آوارگی میں مبتلا ہیں اور میں وہ اندھا ہوں جسے دن رات صرف لاہور لاہور ہی سوجھتا ہے اور میں اس شہر میں در بدر ہوتا اس کے وہ نقش تلاش کرتا ہوں جو ابھی موجود ہیں، اُن کے آثار کو قلم میں بند کرتا ہوں تو مجھے اعجاز انور کے فون کا خیال آ گیا۔ اُس نے کہا تھا کہ کسان اینڈ کمپنی، لاہور کا ایک لینڈ مارک ہے اور یہ ایک ایسے شخص کا بیان ہے جو اس شہر کی گہنائی ہوئی عظمتوں کا مصور ہے، آگاہ ہے کہ لاہور کی تصویر میں کون کون سے رنگ اس کی پہچان تھے تو اگر وہ کسان اینڈ کمپنی کو ایک لینڈ مارک قرار دیتا ہے تو کم از کم مجھے یقین کر لینا چاہیے، بے شک یہ ایک ذاتی حوالہ ہے لیکن کچھ حرج نہیں اگر میں خودنمائی سے گریز کرتا کسان اینڈ کمپنی کی ایک مختصر تاریخ بیان کر دوں..

آج سے تقریباً اسی برس پیشتر میرے ابا جی چوہدری رحمت خان تارڑ، انہوں نے، ایک پڑھے لکھے اگرچہ دیہاتی نوجوان نے اس شہر میں رزق روزگار کے ہر دروازے پر دستک دی، اور کوئی دروازہ نہ کھلا، انہوں نے مزدوری کی مشقت کی، بچوں کو پڑھایا، صابن بنا کر ایک صندوق سر پر اٹھا کر اس کی گلیوں میں در بدر ہوئے، کتابت سیکھی، اخبار ''زمیندار'' میں ملازمت کی، پولیس میں بھرتی ہوئے، یہاں تک کہ ایک مسجد میں امام بھی ہوئے..اور تب جب کہ کوئی دروازہ بھی وا نہ ہوا تو انہوں نے سوچا کہ میں ایک ہل چلانے والے کسان کا اکلوتا بیٹا ہوں، میں نے خود بھی ہل کی ہتھی پر ہاتھ رکھ کر اس کے پھالے کو زمین کے سینے میں اتارا ہے، میں مٹی میں سے پھوٹنے والے ہر بوٹے کے بارے میں جانتا ہوں کہ اُس بوٹے کی کونپلیں کب پھوٹتی ہیں اور کب وہ ہریاول کی ایک فصل کو جنم دیتا ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اُس مٹی میں کونسے موسموں میں کونسے بیج بوئے جائیں، انہیں کیسے سینچا جائے، نگہداشت کیسی ہو تو کیوں نہ میں ان بیجوں کو اپنے رزق کا وسیلہ بناؤں، ان کا کاروبار کروں..شاید یہ دروازہ کھل جائے..

ابا جی نے چیمبرلین روڈ پر سبزی منڈی کے محرابی دروازے کے سامنے ایک دکان کرائے پر حاصل کی..جانے وہ کونسا ترکھان تھا جس نے خالص شیشم کی لکڑی سے ایک میز تخلیق کی جس کے بائیں جانب تین دراز تھے، ابا جی نے وہ میز اس دکان میں سجائی اور اُس کے پیچھے ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور یہ تقریباً 1936ء کے زمانے تھے جب بقول اُن کے، اُس دکان کے پار سبزی منڈی کے علاوہ سب ویرانے تھے، اُس کے تھڑے پر کھڑے ہو کر ریلوے روڈ کی شاندار ہندو حویلیاں نظر آتی تھیں، وہاں ان سے پہلے بیج فروشوں کی دو چار دکانیں اور بھی تھیں اور وہاں بیجوں کی بوریوں کے درمیان ایک ٹاٹ پر براجمان دکانداروں نے اس دراز قامت نیلی آنکھوں والے گورے چٹے نئے دکاندار کا خوب ٹھٹھا اڑایا..یہ بیج بیچنے آیا ہے اور انگریزی صاحبوں کی مانند کرسی پر بیٹھ گیا ہے..اور ستم یہ کہ ہماری طرح آرائیں نہیں ہے، جاٹ ہے، یہ جاٹ اکھڑ اور ان پڑھ کیا

جانیں کہ سبزیوں اور پھولوں کے بیج کیا ہوتے ہیں، کرسی میز پر بیٹھ کر ایک بیج فروش ہونا چاہتا ہے..

ابا جی اس نوعیت کے دشنام اور طنز کے عادی تھے، تب سے جب وہ سکول جایا کرتے تھے اور برادری کے لوگ ٹچکریں کرتے تھے کہ دیکھو یہ ایک جاٹ لونڈا پڑھنے جا رہا ہے.. پڑھ لکھ کر کیا کرے گا، ہٹی کرے گا یا لوگوں کے خط پڑھے گا..تو انہیں عادت تھی..

وہ ایک کسان کے بیٹے تھے، کسان تھے اور انہوں نے اپنی دکان کا نام ''کسان اینڈ کمپنی'' رکھا.. راکا پینٹر سے اس کا بورڈ لکھوا کر دکان کے ماتھے پر آویزاں کیا..اور یہ نام بہت مبارک ثابت ہوا..پھر وہ زمانے آئے جب پورے برصغیر میں کلکتہ کے سیڈ ہاؤس سٹن کے بعد ''کسان اینڈ کمپنی'' سبزیوں اور پھولوں کے بیجوں کا سب سے بڑا ادارہ ہو گیا..اس کی تجارت، سری لنکا، برما اور جزائر انڈیمان تک پھیل گئی، دوسری جنگ عظیم کے دوران کسان اینڈ کمپنی نے برما میں اتحادی فوجوں کو سبزیوں اور پھولوں کے بیجوں کے کریٹ سپلائی کیے..اس دوران ابا جی مسلسل زراعت کے رموز کے بارے میں کتابیں لکھتے رہے.. ''کسان ڈائری''، ''پھولوں کی دنیا''، ''گنے کی کاشت''، ''کاشت تمباکو''، ''کاشت پھل'' وغیرہ اور وہ مسلسل چالیس برس تک زراعت کے حوالے سے ایک رسالہ ''کاشت کار جدید'' نام کا بھی شائع کرتے رہے..سرینگر کے نواح میں ایک وسیع رقبے پر ان کا ایک سیڈ فارم تھا..قیام پاکستان کے بعد انہوں نے میرے ننھیال کے قصبے گکھڑ منڈی میں ریلوے سٹیشن کے قریب ''رچنا نرسری فارم'' قائم کیا جہاں میں نے ایک بسنت پتنگ اڑائی تھی اور نادان کوّے اُسے ایک پرندہ جان کر اُس پر حملہ آور ہو گئے۔

یہاں تک کہ چیمبر لین روڈ، کسان روڈ کہلانے لگی..حکومت کی جانب سے پیشکش ہوئی کہ ہم موچی دروازے کے ڈاک خانے کو ''کسان پوسٹ آفس'' کا نام دے سکتے ہیں کہ اس ڈاک خانے سے آپ کی کمپنی کے پارسل اور پیکٹ پورے ہندوستان کو جاتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ اپنا مال کسی اور ڈاک خانے سے نہ بھجوائیں گے، یہ شرط ابا جی کو قبول نہ ہوئی..

اور ہاں اس دوران میرے اکلوتے ماموں نذیر حسین چیمہ بھی اس کاروبار میں شریک ہو گئے..

اگرچہ پاکستان کی تخلیق سب مسلمانوں کے لیے ثمر آور ہوئی لیکن کسان اینڈ کمپنی کا کاروبار برصغیر کی تقسیم کے نتیجے میں سمٹ گیا..

ابا جی کو سرکار نے آل انڈیا سیڈ کونسل کا ممبر منتخب کیا تھا، وہ اس کے اجلاسوں میں زیادہ تر دہلی میں منعقد کردہ اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے، یہ بھی سمٹ گئے..

پاکستان کے قیام کے بعد یہ مشرقی پاکستان کے سادہ اور ایماندار بنگالی لوگ تھے جو اس کسان اینڈ کمپنی کے سپلائی کردہ بیجوں کی تازگی اور روئیدگی کے گرویدہ ہو گئے اور وہ اسے ''کشن اینڈ کمپنی'' کے نام سے

پکارتے تھے..ابا جی نہایت باقاعدگی سے مشرقی پاکستان کے کاروباری دورے کرتے اور مجھے یاد ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ جب کبھی ہمیں بیجوں کی روئیدگی کے حوالے سے شکایت وصول ہوتی تو اگر یہ شکایت مغربی پاکستان کے کسی گاہک کی جانب سے وصول ہوتی تو ہم شک کرتے اور جب کوئی بنگالی کاشتکار گلہ کرتا تو ہم فوری طور پر بلا معاوضہ اسے دوبارہ بیج فراہم کر دیتے کہ بنگالی جھوٹ نہیں بولتے تھے..

ایک بار ابا جی شاید کھلنا جانے والی مسافروں کی ایک کشتی میں بیٹھے تھے اور وہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں بہت دراز قامت، گورے چٹے اور تنومند شخص تھے تو وہ دیگر بنگالیوں کی موجودگی میں کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوتے تھے تو ان کے برابر میں براجمان ایک معصوم بنگالی نے اُن کو ہاتھ لگا کر کہا تھا ''آپ بھینس کا دودھ پیتے ہو؟''

ڈھاکا، نواکھلی، کھلنا اور سلہٹ وغیرہ میں ہمارے ایجنٹ تھے جو اپنی دکانوں کے باہر بورڈ آویزاں کرتے تھے ''یہاں کشن کے بیج ملتے ہیں.''

ایک بار ابا جی حسب معمول کاروباری دورے پر مشرقی پاکستان گئے تو سلہٹ کے نواح میں ایک ناریل اور سپاری کے درختوں کے گھنے جنگل میں انگریزوں کے زمانے کا کوئی قدیم ریسٹ ہاؤس یا ڈاک بنگلہ تھا جس میں ان کا قیام تھا..اُس خطے میں خلیج بنگال سے جو ہوائیں آتیں پانیوں سے بوجھل اور لبریز آتیں، رم جھم ایک معمول تھا لیکن اُن دنوں غیر متوقع طور پر مون سون کی بارشوں کا آغاز ہو گیا، اتنا پانی برسا، ابر کرم اتنا برسا کہ ابا جی اُن ویران بنگلے میں قید ہو کر رہ گئے، ان جنگلوں میں بارش بھری ہوائیں چنگھاڑتی تھیں، شجر دوہرے ہو کر گیلی زمین کو چھونے آتے اور دن رات کہاں ہر جانب ہمہ وقت بادلوں کی سیاہی سے ڈھکی ایک مسلسل رات ہوتی جس میں عجیب عجیب سیٹیاں بجاتی، شور کرتی، کبھی قہقہے لگاتی اور کبھی بین کرتی آوازیں شرابور شرابور سنائی دیتیں..ابا جی ایک نڈر شخص تھے، بھوت پریت، بلاؤں، بدروحوں وغیرہ پر نہ یقین رکھتے تھے اور نہ ہی ویرانوں اور قبرستانوں میں سفر کرنے اور گذرنے سے ڈرتے تھے، وہ تب بھی نہ ڈرے، تقریباً ایک ہفتہ جنگل میں دفن اُس ریسٹ ہاؤس میں قید رہے..

ہاں، میں نے ایک بار اُن سے پوچھا تھا کہ ابا جی کیا واقعی زندگی بھر آپ کبھی خوف یا ڈر سے دوچار نہیں ہوئے کہ میں ان کا سپوت تو حد درجے کا ڈراکل ڈرپوک شخص تھا، کہنے لگے ''ہاں ایک مرتبہ میں کچھ لمحوں کے لیے ڈر گیا تھا، رزق کی تلاش میں اُن زمانوں میں، میں نے پولیس کی ملازمت اختیار کی..میانوالی میں تعینات تھا، ایک شب مجھے حکم ملا کہ ابھی سفر اختیار کرو اور فلاں پولیس سٹیشن پر پہنچ کر رپورٹ درج کرواؤ، ابھی روانہ ہو جاؤ..وہ ایک اندھیری اور نہایت چپ رات تھی، میں ایک گھنے جنگل کی تاریکی میں نہایت اعتماد سے چلا جاتا تھا جب یکدم میرے کانوں میں ایک ایسی پتہ پانی کر دینے والی ڈکراتی ہوئی ہول سے بھری آواز آئی

کہ میں لرز گیا..وہ آواز نہ کسی انسان کی تھی اور نہ حیوان کی، وہ اُس شب سیاہ میں ڈوبے جنگل کے اندھیروں میں گونجتی اور بھٹکتی تھی، میں رُک گیا..میں جو کبھی ڈرا نہ تھا ڈر گیا..میرے روئیں روئیں میں وہ ڈر بھر گیا، انگلیوں کے پوروں میں وہ ڈکراہٹ یوں سرایت کی کہ میں اپاہج ہونے لگا اور تب میں نے اپنے آپ کو ڈھارس دی کہ یہ جو کچھ ہے اس کا سامنا کرنا چاہیے..بے شک یہ آواز مجھے کھا جائے، چنانچہ میں نے پھر سے چلنا شروع کر دیا..وہ ہولناک آواز قریب ہوتی گئی..جیسے کوئی ازمنہ قدیم کا نابود ہو چکا حیوان یکدم بیدار ہو کر زندہ ہو گیا ہو..تب میں جنگل کی گھنی تاریکی میں سے باہر آیا تو درختوں کے درمیان اُس گھپ اندھیری رات میں ایک کھلی جگہ مکمل تاریکی میں سے نیم تاریک ہوئی اور وہ آواز اسی جنگل کے درمیان میں واقع اسی مقام سے جنم لے رہی تھی اور میں نے اپنے ڈر پر قابو پاتے ہوئے اپنی گرجدار آواز میں للکارا ''خبردار..کون ہے..میرا نام رحمت خاں ہے، تم کون ہو نام بتاؤ..''

اس پر رات کے ہول میں ایک جواب آیا ''مجھ پر حملہ نہ کرنا..''

''پر تم کون ہو، یہ کون ڈکراتا ہے؟''

''مسافر ہوں، اپنی ڈاچی پر سوار اپنے گاؤں کو چلا جاتا تھا، یہ گر گئی..اس کا وقت آ گیا ہے، مر رہی ہے، آخری سانسوں پر ہے۔ پر اس کی جان نہیں نکل رہی، ڈکراتی اور فریاد کرتی ہے، میں اس کے پاس بیٹھا اس کی گردن تھپکتا ہوں تا کہ اسے مرنے میں آسانی ہو..مجھ پر حملہ نہ کرنا..''

''کل حیات میں، میں صرف تب کچھ لمحوں کے لیے ڈر کے شکنجے میں آیا تھا..صرف ایک بار..''

چنانچہ ابا جی اُس گرجتے، شوکتے، چنگھاڑتے، طوفانِ بادوباراں سے کہاں ڈرنے والے تھے، بیکار وہ بیٹھ نہ سکتے تھے، چنانچہ انہوں نے مون سون کی بارشوں کی بوچھاڑ میں وقت گذاری کے لیے اپنی آپ بیتی لکھنی شروع کر دی..ڈاک بنگلے کا ایک انگریزوں کے زمانے کا بنگالی چوکیدار اپنے کوارٹر میں اُن کے لیے دال بھات یا مچھلی چاول، ناریل کے تیل میں بگھار کر دے جاتا، سلہٹ کے باغوں کی چائے کا ایک پیالہ اُن کے سرہانے دھر جاتا اور وہ ایک لالٹین کی روشنی میں ان پر جو بیتی تھی اسے رقم کرتے تھے، اور انہیں رقم کرنے کے ہنر آتے تھے، اظہار اور الفاظ پر انہیں قدرت حاصل تھی ایسی کہ لوگ اُن کی زراعت کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں کو بھی ناولوں کی مانند دلچسپی سے پڑھتے تھے...ایک ہفتے کے بعد جب بارشوں کا زور کم ہوا اور ندی نالوں اور دریاؤں کا شور بڑھ گیا تو اُن کی آپ بیتی بھی اُسی لمحے مکمل ہو گئی، وہ مغربی پاکستان واپس آئے تو اُن کے سوٹ کیس میں ایک ضخیم مسودہ تھا..اگرچہ مجھے ان زمانوں میں کچھ زیادہ سوجھ بوجھ نہ تھی لیکن میں نے اُن کی بے خبری میں ان کی سلہٹ کے جنگلوں کی بارشوں میں لکھی گئی سوانح کے کچھ باب پڑھے..کبھی میں مسکرانے لگتا تھا اور کبھی میری آنکھیں مون سون کی بارشیں ہونے لگتی تھیں..خاص طور پر وہ باب جب انہیں میری

پیدائش کی خبر ملتی ہے..

''کاروبار مندا ہے..دووقت کی روٹی کے لیے بھی بندوبست نہیں ہوتے..بھوک مجھے نڈھال کرتی ہے..پر مجھے بھوک کی کیا پرواہ..میرے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے..''

انہوں نے اپنی آپ بیتی کا مسّودہ اپنے عزیز دوست ملک محمد رفیع کے سپرد کیا جو کسان اینڈ کمپنی کے برابر میں 'نیو ماڈرن پریس'' چلاتے تھے، ہمیشہ ایک تھری پیس سُوٹ میں ملبوس اندرون شہر کے ''محلّہ ککّے زئیاں'' کے باسی ایک ککّے زئی تھے..اور میں پھر سے تذکرہ کردوں کہ ابا جی نے جہاں رزق کے لیے بہت سے پاپڑ بیلے اُن میں خطاطی سیکھنے کا بھی ایک پاپڑ تھا تاکہ انہیں کسی اخبار میں ایک کاتب کی ملازمت ہی میسر آجائے چنانچہ وہ ایک نہایت دل کش خوش خط شخص تھے چنانچہ ملک صاحب نے وہ مسّودہ آسانی سے پڑھا اور فوری طور پر میری امی جان سے رابطہ کیا، ''بہن جی، چوہدری صاحب کی خواہش ہے کہ میں اپنے پریس پر اُن کی یہ سرگذشت شائع کروں..وہ میرے عزیز ترین دوست ہیں، پر بہت بھولے ہیں، نہیں جانتے کہ سچ اس بے دریغ انداز میں نہیں لکھا جاتا، کل کلاں آپ نے اپنے بچوں کے رشتے کرنے ہیں، اگر یہ آپ بیتی چھپ گئی تو رشتے نہیں ہوسکیں گے..''

مجھے لکشمی مینشن کے بالائی فلیٹ کا صحن ایک کونے میں واقع کچن کا وہ کچا چولہا یاد ہے، جس میں امی جان نے اُس مسّودے کو ورق ورق جلا دیا تھا..تاکہ ہم بچوں کا مستقبل ہمارے باپ کی بے دریغ سچائیوں کا شکار نہ ہوجائے..

یہ صرف روسو تھا جس نے ''اعترافات'' کیے، جب میں اپنے خالق کے حضور پیش ہوں گا تو مجھ میں لاکھ برائیاں ہیں، میں اقرار کروں گا لیکن کیا آج تک کسی نے اپنے بارے میں اتنا سچ لکھا ہے، اس کی توصیف تو کردے..

آپ بیتی کے نام پر کیسے کیسے جھوٹ کے پلندے ہم نادان اونٹوں کے کوہانوں پر لاد دیئے جاتے ہیں، اور ہم کیوں آہ بھریں، کیوں بدنام ہوجائیں..

رحمت خاں تارڑ، رُوسو نہ تھے، ان کے ''اعترافات'' ایک چولہے میں ان کی اہلیہ نے جلا ڈالے..

جیسے الف لیلیٰ کے مترجم رچرڈ برٹن کے مسودے ان کی اہلیہ نے جلا ڈالے..کہ اگر یہ شائع ہوگئے تو ہم بدنام ہو جائیں گے..ابا جی کو اگرچہ فوٹوگرافی سے کچھ رغبت نہ تھی پر مجھے تھی..ایک بار جب وہ مشرقی پاکستان جارہے تھے تو میں نے اپنا بوکس کیمرہ ان کے سامان میں سامان کردیا..بہت مشکل نہیں ہے، ویوفائنڈر میں اگر کوئی منظر اچھا لگے تو یہ بٹن دبا دیجئے گا..

تب تو ہم لاعلم تھے کہ یہ مشرقی پاکستان کہاں ہے، کیوں ہے..اُن لوگوں کی بودوباش کیا ہے، وہاں

کے منظر کیسے ہیں، ان کی موسیقی کیا ہے..اور وہ سندر بن کے جنگلوں میں جب اپنی ناؤ کھیتے ہیں تو کونسے گیت گاتے ہیں..اور ہم ہمیشہ لاعلم اور بے خبر رہے اور پھر پلٹن میدان میں ہتھیار ڈالتے ہوئے ہمیں خبر ہوئی کہ ہم نے کیا کھو دیا..

ابا جی نے میرے کیمرے سے جو بلیک اینڈ وہائٹ تصویریں اتاریں وہ سب بہت مدھم اور آؤٹ آف فوکس تھیں، میری یادداشت پر ان تصویروں کے سائے نقشے ہوتے ہیں، بلند و بالا پیڑ، ہواؤں کے زور سے جھکتے ہوئے، سمندر ایسا ایک دریا جس میں بادبانی کشتیاں ساکت تھیں، بانس کے گھروندے اور تالاب...

وہ ہمیشہ مسکراتے ہوئے ایک قصہ بیان کرتے ''مستنصر، نواکھلی میں ہمارے ایک نمائندہ مولوی صاحب تھے جو مقامی مسجد میں امامت کرواتے تھے، انہوں نے مجھے اپنے جھونپڑے میں کھانے کے لیے مدعو کیا..کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے ہارمونیم سنبھالا اور ان کی ایک دس برس کی بیٹی اُس کی لے پر کلاسیکی رقص کرنے لگی..''

شفیق الرحمٰن جن کی تحریروں کا میں شیدائی تھا اور میں نے اپنے ایک انٹرویو میں اقرار کیا تھا کہ میرے پہلے سفرنامے ''نکلے تری تلاش میں'' کی ماں اُن کا سفرنامہ ''برساتی'' ہے تو جب ایک عرصے کی ''قلمی دوستی'' کے بعد ان سے پنڈی کلب میں پہلی ملاقات ہوئی تو کہنے لگے ''میں ایک مدت سے آپ کے والد صاحب، چوہدری رحمت خان تارڑ کا مداح ہوں، میرے بڑے بھائی ریاض الرحمٰن کی لائبریری میں اُن کی تمام زرعی کتابوں کا ایک سیٹ موجود تھا اور انہوں نے انہی کتابوں کی راہنمائی حاصل کی اور فصلیں کاشت کیں، باغات لگائے، جب میں نے اپنا اولین سفرنامہ اپنے ایک اور محبوب مصنف ابن انشاء کو روانہ کیا تو انہوں نے نہ صرف میری اس ابتدائی کاوش کی، میرا حوصلہ بڑھانے کی خاطر توصیف کی بلکہ لکھتے ہیں کہ اس سے پیشتر میں صرف ایک اور تارڑ سے واقف تھا، جن کا نام رحمت خاں تارڑ ہے جو زراعت کے موضوع پر کتابیں لکھتے ہیں..کیا آپ کی ان سے کچھ عزیز داری ہے؟''

ملکہ پکھراج اکثر ''کسان اینڈ کمپنی'' پر آیا کرتیں، بیٹھی رہتیں اور ابا جی سے اپنے باغوں کے بارے میں راہنمائی حاصل کرتیں..

اُن کے ایک اور بڑے مداح جسٹس رُستم کیانی تھے..کیانی صاحب، ایوب کی آمریت میں اپنے لازوال طنز اور بے مثال مزاح سے شگفتگی کے نشتروں سے شگاف ڈالنے والے پہلے شخص تھے ''افکارِ پریشاں'' کے خالق تھے..کم از کم ایک بار تو وہ بھی ابا جی سے ملاقات کی خاطر آئے اور پھر انہوں نے ایک خط لکھا کہ.. آپ سے مل کر میرا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ انسان ہمدردی کے دُودھ کے سوتے ابھی خشک نہیں ہوئے، خط انگریزی میں تھا اور انہوں نے ''مِلک آف ہیومن کائنڈنیس'' کی اصطلاح استعمال کی تھی..

اُن زمانوں کے مغربی پاکستان کے قاہر بھی اور موثر بھی گورنر نواب محمد امیر خان آف کالا باغ بھی اُن کی زراعتی تحقیق اور تصنیف کے مداح تھے اور انہوں نے ایک خط میں ان کی خدمات کا اعتراف کیا تھا.. جسٹس کیانی نے اسی حوالے سے وہ تاریخی فقرہ کہا تھا کہ پچھلی حکومتیں عوام کو سبز باغ دکھاتی تھیں، اور یہ حکومت اُنہیں کالا باغ دکھاتی ہے..

ایک طویل فہرست ہے ان معروف اور غیر معروف لوگوں کی جو اباجی زراعتی تحریروں اور اس مٹی سے محبت کی معترف تھیں..

آج بھی کبھی کبھار مجھے کوئی ایسا عمر رسیدہ شخص مل جاتا ہے جو مجھے صرف میرے اباجی کے حوالے سے پہچانتا ہے، اور میرے لیے سب سے پرفخر یہی لمحہ ہوتا ہے.. میں نے اپنی کہانی ''پھولوں والی پہاڑی'' میں اُن کی حیات کا جو قصہ بیان کیا ہے وہ سو سفید سراسر سچ کی بنیاد رکھتا ہے.. اگر مٹی کا کوئی پیغمبر ہوتا تو وہ میرا باپ ہوتا..

ان کا مجھ پر اعتماد اور اعتبار اتنا تھا کہ اگر میں بھری دوپہر میں یہ کہہ دیتا کہ اباجی رات ہے تو وہ فوراً مان لیتے کہ ایسا ہی ہوگا، یہ میری نظروں کا دھوکا ہے کہ مجھے یہ دن دکھائی دیتا ہے، مستنصر تو مجھے دھوکا نہیں دے سکتا اور ان کے مجھ پر اس اعتماد اور اعتبار نے مجھے ایسا مفلوج کر دیا کہ جب.. مجھے برطانوی شہریت حاصل ہوگئی تو ان کے کہنے پر.. کہ مجھے قبول نہیں کہ تم میرے بیٹے ہونے سے انکاری ہو کر اپنے پاکستانی ہونے کو ترک کردو.. تو میں نے وہ شہریت ترک کر دی.. اور جب میں نے جینس ہیزل کو ایک انگوٹھی پہنا دی، لنڈن میں ایک فلیٹ اور معقول ملازمت اور وہیں رہ جانے کا ارادہ کر لیا تو انہوں نے ایک خط کے آخر میں سرسری طور پر لکھا ''میں بوڑھا ہو رہا ہوں، تم سب بہن بھائیوں میں بڑے ہو، اگر تم واپس آ جاؤ تو میرا ہاتھ بٹا سکو گے.. مجھ میں سکت کم ہوتی جا رہی ہے..'' تو میں سب کچھ تیاگ کر 1961ء میں واپس آ گیا اور گوالمنڈی کی ''کسان اینڈ کمپنی'' پر آ بیٹھا.. اور مجھے کچھ قلق نہیں کہ میں اپنے باپ کی آرزو کی خاطر.. بظاہر ایک آسودگی سے بھری مغربی حیات کو ترک کر کے گوالمنڈی میں آ بیٹھا.. اگر میں ایسا نہ کرتا تو آج میں بلاشبہ کسی شاندار گھر میں، شہر لنڈن کے کسی پوش علاقے میں مقیم ہوتا پر بے آسرا اور تنہا ہوتا.. میرے بچے، آدھے انگریز، اپنے بقیہ آدھے پاکستانی تشخص سے بے خبر مجھے کب کے چھوڑ کر جا چکے ہوتے، میں ایک گمنام، موت کی دستک کا منتظر بوڑھا ہوتا، آج وہ نہ ہوتا جو کہ میں ہوں.. میری ادبی شہرت اور مقبولیت کے سب کرشمے صرف اس لیے ظہور پذیر ہوئے کہ میں اباجی کی خواہش پر واپس وطن آ گیا اور گوالمنڈی میں آ بیٹھا..

''کسان اینڈ کمپنی'' پر بیٹھ کر میں نے کاروبار تو کیا کرنا تھا.. آوارگی، کتابیں، فلمیں، خواب اور سراب میرے عشق تھے.. میں لکھنے میں مگن ہو گیا، میں نے اپنی مقبول ترین کتابیں اسی دکان کے کاؤنٹر پر بیٹھ کر

لکھیں، گوالمنڈی کے شور اور خوانچہ فروشوں کی پکاروں اور شدید گرمیوں، برستی برساتوں اور موسم سرما کی ٹھٹھرتی شاموں میں۔۔ ''نکلے تری تلاش میں''، ''اُندلس میں اجنبی''، ''خانہ بدوش''، ''فاختہ''، ''پکھیرو''، ''پیار کا پہلا شہر'' کے ابتدائی باب۔۔

ہماری دکان کے برابر میں اباجی کے عزیز ترین دوست ملک محمد رفیع کا ''نیو ماڈرن پریس'' دن رات کچھ نہ کچھ چھاپا رہتا تھا۔۔ چاچا رفیع جب کبھی تھری پیس سیاہ سوٹ میں ملبوس گپ لگانے کی خاطر دکان میں جھانکتے تو میں سر جھکائے کاغذوں کو سیاہ کرنے میں مگن ہوتا۔۔ ایک روز کہنے لگے ''مستنصر۔۔ یہ جو تم اتنی مشقت کرتے ہو۔۔ مجھے تم پر بڑا ترس آتا ہے تو اس لکھنے پڑھنے سے تمہیں کچھ آمدنی بھی ہوتی ہے۔۔''

مجھے آمدنی تو کیا خاک ہونی تھی بلکہ دکان پر آنے والے بیشتر گاہک مجھے یوں مستغرق پا کر لوٹ جایا کرتے تھے لیکن میں نے ان کا دل رکھنے کی خاطر کہا ''ہاں جی۔۔ چاچا جی۔۔ کتابیں لکھنے سے بہت آمدنی ہو جاتی ہے۔۔''

''کتنی ہو جاتی ہے؟''

''بس چاچا جی۔۔'' میں نے ذہن میں کچھ حساب کتاب کر کے کہا ''تقریباً تین ہزار روپے کی آمدنی ہو ہی جاتی ہے۔۔''

''ماہانہ؟''

''نہیں جی سالانہ۔۔''

ملک صاحب نے چاچا نے کچھ دیر جمع تفریق کرنے کے بعد کہا ''یہ تو ڈھائی سو روپے کے قریب بنتے ہیں، ماہانہ!''

''جی شاید۔۔''

چاچا ملک میرے لیے بہت فکر مند ہو کر کہنے لگے ''دیکھو۔۔ اگر تم اضافی آمدنی کی خاطر اپنے آپ کو یوں ہلکان کرتے ہو تو میرے ایک سگے زئی عزیز کے پاس شاہ عالمی مارکیٹ میں کپڑے دھونے کے ایک صابن کی ایجنسی ہے، میں سفارش کر کے تمہیں اُس کا ایجنٹ بنوا سکتا ہوں۔۔ یہ لکھنے پڑھنے کا دھندہ چھوڑو۔۔ صابن فروخت کرنا زیادہ منافع بخش کاروبار ہے۔۔ ڈھائی سو روپے کی بجائے آسانی سے چھ سات سو روپے کما لو گے۔۔''

ویسے میں دعویٰ تو نہیں کر سکتا لیکن کچھ لوگ گواہی دے سکتے ہیں کہ لاہور میں پاک ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس کے بعد یہ ''کسان اینڈ کمپنی'' تھی جہاں ہر نوعیت کے دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کی بیٹھک ہوتی تھی۔۔ اور یہاں انہیں چائے، سموسوں، کبابوں، تلی ہوئی مچھلی، آلو اور بینگن کے پکوڑوں اور فالودہ وغیرہ

کے لیے بل پیش نہیں کیے جاتے تھے..

اور کیسے کیسے لوگ وہاں آتے تھے..

بہت نامور، بہت پریشاں اور تنگ دست اور بہت ایسے جو آئندہ زمانوں میں نامور ہوئے..

ویسے یہ جو درد کی زنجیر کا سلسلہ ہے اُس کی پہلی کڑی میں نہ تھا..

ابا جی کی حکیم نیّر واسطی سے بہت دوستی تھی اور اُن زمانوں میں شاعرِ رومان اختر شیرانی ان کے ہاں پناہ گزیں تھے..

''وہ ایک نہایت پیارا اور معصوم شخص تھا اگرچہ شراب کا رسیا تھا..'' ابا جی مجھے بتایا کرتے تھے،''اُس کی شاعری کی اُن زمانوں میں بہت دھوم تھی، ایک روز یہی کسان اینڈ کمپنی پر آیا اور اُس کا چہرہ جذبات سے دمکتا تھا، ہاتھوں میں ایک رومال تھا، اسے کھول کر مجھے دکھایا اور رومال میں کیا تھا.. گنے کی گنڈیریوں کا پھوک تھا..''

''چوہدری صاحب..'' اختر شیرانی نے کہا تھا، لاہور کے ریلوے سٹیشن پر ایک ٹرین کھڑی تھی، ایک ڈبے کی کھڑکی میں ایک چہرہ تھا، وہ نازنین گنڈیریاں چوس رہی تھی اور اُن کا پھوک پلیٹ فارم پر پھینک رہی تھی جسے میں اٹھا لایا تھا.. چوہدری صاحب، اس پھوک پر اُس کے ہونٹ تھے..

اختر شیرانی، کبھار کبھار کسان اینڈ کمپنی پر آجاتے اور ابا جی اُن کی طلب کے احترام میں کچھ نذرانہ پیش کر دیتے.. ایک روز وہ آئے اور ابا جی نے طے شدہ نذرانہ بصد ادب پیش کر دیا تو اختر شیرانی کہنے لگے ''تارڑ صاحب.. شراب کی دو دکان ہے میں وہاں ایک مقروض ہوں.. اگر میں وہاں آپ کے نذرانے کے ساتھ گیا تو وہ دکاندار کمینہ مجھے شراب نہیں دے گا.. پچھلے قرض کو صاف کر دے گا تو.. آپ مہربانی کیجئے..''

ابا جی، بے شک اپنے زمانوں کے ایک روشن خیال اور معاشرے کی روایتوں سے بغاوت کرنے والے شخص تھے پر انہیں کسی بھی نوعیت کے نشے سے کچھ سروکار نہ تھا.. اس کے باوجود وہ ایک شاعر کو انکار نہ کر سکے.. انہوں نے مجھے بتایا ''میں زندگی میں پہلی بار شراب کے ایک ٹھیکے پر گیا.. صرف اس لیے کہ اختر شیرانی ایسے شاعر کی پیاس بجھ جائے.. مجھے نہیں معلوم کہ بھورے رنگ کے لفافے میں وہ کونسی بوتل کی کیا شراب تھی..''

میرا باپ ایسا تھا.. ایک شاعر کے لیے شراب خرید کر لے آتا تھا.. یعنی اس ''کسان اینڈ کمپنی'' میں کبھی سلمٰی کے عشق میں غرق ایک شاعر اختر شیرانی نام کا آیا کرتا تھا...

؎ سلمٰی سے دل لگا کر بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں..

پھر وہ سلمٰی کی مانند موہوم حقیقت تھی یا ایک شاعر کا تصور، کوئی ریحانہ بھی تھی..

؎ یہ بستی ہے، وہ بستی جہاں ریحانہ رہتی تھی..

یہ معاملہ بحث طلب ہے کہ گلوکار اور شاعر میں سے وہ کون ہے جو اولیت رکھتا ہے.. اگر کوئی گلوکار کسی شاعر کو اپنے سُروں میں نہ ڈھالتا تو کیا وہ پھر بھی پسندیدہ کم از کم شاعری کے راج سنگھاسن پر نہ بیٹھ سکتا اور کیا وہ گلوکار صرف اس لیے قبولیت کی معراج پر پہنچا کہ اُس نے گانے کے لیے کوئی پُراثر کلام انتخاب کیا تھا.. میرا خیال ہے کہ شاعر کو عوام کے دلوں میں گوشہ نشیں کرنے میں گلوکار کے گلے کی اثریت میں کچھ شبہ نہیں اور مثالوں اور حوالوں کی کچھ کمی نہیں.. بلکہ کچھ شاعروں کے کلام کو دوام صرف گلوکاروں نے عطا کیا ہے.. محض چند مثالیں..

چراغ حسن حسرت کا کلام ''باغوں میں پڑے جھولے'' استاد برکت علی خان اور مومن کی غزل ''کبھی ہم میں تم بھی چاہ تھی، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو..''

حسرت موہانی ''وہ تیرا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے'' غلام علی.. ''میرے شوق دا نئیں اعتبار تینوں''.. صوفی تبسم غالب کی فارسی غزل کو پنجابی روپ دیتے ہیں.. ساحر لدھیانوی کی ''کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے'' اور یہاں گلوکار کی بجائے موسیقار خیام ایسے جینئس کو ہم داد دے سکتے ہیں..

بہت مدت ہوئی جب گوپی چند نارنگ اور شہریار ناشتے کے لیے میرے گھر آئے تو شہریار کو بہت شکایت تھی کہ لوگ میری سنجیدہ شاعری کی جانب متوجہ نہیں ہوتے.. مجھے صرف ''امراؤ جان ادا'' کے گیتوں کے حوالے سے پہچانتے ہیں اور یہاں بھی میرے دیرینہ مرحوم ہو چکے دوست مشتاق ہاشمی کے بڑے بھائی خیام کی سحر طراز موسیقی تھی، آشا بھونسلے کی گہری اور پُراثر آواز تھی کہ ''اِس شہر میں تم جیسے دیوانے ہزاروں ہیں.. پروانے ہزاروں ہیں.. امانت علی خان جیسا گلوکار کہاں نصیب ہو سکتا ہے، ہر لفظ کو الگ الگ کر کے ادا کرنے والا، سُروں کی مالا میں لفظوں کے موتی پرونے والا.. ''انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو''، ظہیر کاشمیری کا کلام ''موسم بدلا رُت گدرائی'' ادا جعفری کی غزل ''ہونٹوں پہ کبھی اُن کے مرا نام تو آئے''

اور پھر مہدی حسن نے فیض کی شاعری کو ''گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے'' یوں گایا کہ پروین شاکر کی شاعری بھی رسوا ہونے لگی ''کو بہ کو بہ پھیل گئی..'' فراز کی شہرت کی تصویروں میں بھی نور جہاں، مہدی حسن وغیرہ کے سُروں کی رنگینیاں رنگ دکھاتی ہیں..

خاطر غزنوی بے شک بے مثل شاعر تھے لیکن ذرا تصور کیجئے کہ اگر فریدہ خانم ''گو ذرا سی بات پہ برسوں کے یارانے گئے'' نہ گاتیں تو کیا خاطر کی اتنی خاطر ہوتی ہے..

بات نکلی ہے تو دور تلک جائے گی.. تو دور نہیں جاتے مختصر کرتے ہیں.. احمد شمیم، ایک اور بڑے نظم گو جنہوں نے اردو کے علاوہ کشمیری زبان میں بھی شاعری کی تقریباً گمنام رہتے اگر نیرہ نور کا سوز انہیں نصیب نہ ہوتا ''کبھی ہم خوبصورت تھے..''

اگرچہ اختر شیرانی کی رومان پرور، پُراثر اور بڑی شاعری کو کسی بھی گلوکار کی آواز کی بیساکھیوں کی

حاجت نہ تھی اور اس کے باوجود یہ نیرہ نور ہے، ایک مشکل پسند گلوکارہ جو گایا نہ جاسکتا ہو اسے گانے والی گلوکارہ جس نے اختر شیرانی کو گایا اور ہم سب کو برباد کر دیا، ناشاد کر دیا، ظلم کر دیا، ہم گھبرائے ہوئے سے رہتے ہیں.. اے عشق نہ چھیڑ آ آ کے ہمیں، ہم بھولوں ہوؤں کو یاد نہ کر، پہلے ہی بہت ناشاد ہیں ہم، تُو اور ہمیں ناشاد نہ کر.. قسمت کا ستم ہی کم نہیں کچھ، یہ تازہ ستم ایجاد نہ کر، یوں ظلم نہ کر، بیداد نہ کر، اے عشق ہمیں برباد نہ کر.. اے عشق! یہ کیا روگ لگا، جیتے ہیں نہ ظالم مرتے ہیں.. یہ ظلم تو اے جلاد نہ کر.. دنیا میں خوشی کو یاد نہ کر.. اے عشق ہمیں برباد نہ کر..

تو یہ وہی شاعرِ رومان اختر شیرانی ہے جو ''کسان اینڈ کمپنی'' میں آیا کرتا تھا جسے ابا جی اتنا عزیز جانتے تھے کہ اپنی پاک دامنی کو داؤ پر لگا کر شراب کی ایک دکان میں چلے گئے..

آپ بھولے تو نہ ہوں گے مجھ کو
آپ کا اختر شیرانی ہوں میں

ہمارا کاروباری معمول کچھ یوں تھا کہ ابا جی صبح سویرے لکشمی مینشن والی رہائش گاہ سے ہمیشہ پیدل چیمبر لین روڈ تک جاتے، منتظر بابا نذیر کو چابی تھماتے، وہ دکان کھول کر صفائی ستھرائی کرتا، اس دوران ہمارے منیجر ابراہیم عاصی اور ٹائپسٹ صدیق یا مبارک بھی پہنچ جاتے اور کاروبارِ تخم وغیرہ شروع ہو جاتا.. اُن دنوں اکثر بیج فروخت کرنے والے اپنے آپ کو تخم فروش کہلانے میں فخر محسوس کرتے.. میں ذرا تاخیر سے بیدار ہوتا اور اپنے تیسرے سکوٹر پر سوار ہو کر، میں بچپن میں جس باقاعدگی سے ریلے سائیکلیں چوری کروا لیتا تھا اُسی باقاعدگی سے میرے سکوٹر بھی چوری ہوتے رہتے تھے چنانچہ تیسرے سکوٹر پر سوار میں دوپہر کے قریب دکان پر پہنچ جاتا، ابا جی گھر واپس چلے جاتے اور میں راج کرنے لگتا..

ابا جی کا کہنا تھا کہ مستنصر کے ادیب دوست اِدھر اُدھر منڈلاتے رہتے ہیں، جھانک کر چلے جاتے ہیں اور منتظر رہتے ہیں کہ کب میں جاؤں اور پھر کونوں کھدروں میں سے برآمد ہو کر یلغار کر دیتے ہیں، وہ شکایت نہیں کرتے تھے، مسکرا کر امی جان کو بتایا کرتے تھے..

اور کیسے کیسے پیارے اور زرخیز ذہنوں کے مالک یلغار کیا کرتے تھے، مرزا ادیب، جس نے صحرا دیکھے بغیر اندرون شہر کی تاریکی میں ایک مٹی کا دِلا جلا کر ''صحرا نورد کے خطوط'' ایسے لکھے کہ صحراؤں میں ہولے سے چلنے والی بادِ نسیم اُن کے جادوئی قلم کو چھونے آ گئی.. وہ آخری عمر میں ذرا ایک بائرن چال سے چلتے تھے اور صحرا انہیں سہارا دینے کے لیے چلا آیا..

انہوں نے ایک بار پھر ''نکلے تری تلاش میں'' درج اوڈیسیس کی کشتی کے نام کے حوالے سے میری تصحیح کی کہ کشتی کا نام ''آرگو'' تھا اور پھر اپنی ترچھی ناک کو سکیڑ کر مکمل غیر سنجیدگی سے مسکراتے ہوئے کہنے لگے

''اس شہر میں صرف دو شخص ہیں جن کے یونانی نقش ونگار ہیں..ایک میں اور ایک تم..''
اور وہ جو بھدّے اور مکروہ چہروں اور خیالوں والے لوگ تھے انہوں نے اس شگفتہ بیان کو ان کی تضحیک کے لیے لطیفہ بنا دیا کہ ان کے دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے ادب کی بنیاد ہی لطیفوں پر تھی..

مرزا ادیب ایک معصوم اور شاندار شخص تھے، وہ جب کبھی کسان اینڈ کمپنی میں آ بیٹھتے تو چائے کے ساتھ سموسموں کی فرمائش کرتے..

ہندوستان سے شمیم حنفی آتے..

مجھے وہ زمانے بھولے جاتے ہیں اور اُن زمانوں میں میرا ٹیلی ویژن سیریل ''ایک حقیقت ایک فسانہ'' بہت مقبول تھا جس میں، امجد صحافی کے طور پر میرا مرکزی کردار بہت شہرت ور ثابت ہوا..شمیم حنفی نے ایک محفل میں مجھے یاد دلایا ''مجھے کچھ شاپنگ کرنی تھی اور تارڑ مجھے اپنے سرخ ہونڈا موٹر سائیکل پر بٹھا کر مال روڈ کے ''پینو راما سنٹر'' میں لے گئے، شاپنگ کے بعد باہر آئے ہیں تو ان کے ہونڈا کی نشست پر کم از کم تین پرچیاں چسپاں تھیں جن پر کچھ فون نمبر درج تھے اور ان میں سے ایک پرچی پر نمبر کے علاوہ لپ سٹک کی مہر تھی..''

شمیم حنفی نے مجھے یاد دلایا تب بھی کچھ موہوم سی یاد ہی آئی..

شکاگو سے سی ایم نعیم آتے اور اپنی کتابوں کو پیک کر کے بابا نذیر کے ہاتھوں پوسٹ آفس بھیجتے..

گوالمنڈی چوک میں پان سگریٹ کی دکان پر اکثر ساغر صدیقی سے ملاقات ہو جاتی ''تارڑ جی، خوش ہو؟''

حسین شاہد..پنجابی ادب کا ایک ستون، جس کے تذکرے کے بغیر پنجابی نثر اور شاعری کا بیان کھوکھلا ہو جاتا ہے..جس نے نہ صرف مجھے بلکہ فخر زمان کو پنجابی میں لکھنے پر مائل کیا، کسٹم کے محکمے میں ناخوش، گوالمنڈی چوک سے ذرا ادھر ریلوے روڈ پر دودھ دہی کی ایک دکان کے پچھواڑے میں، جہاں شہنائی نواز عالمگیر کا بینڈ ایک تاریک کمرے میں کلاسیکی موسیقی کے راگ چھیڑتا تھا..حسین شاہد، وہاں ایک سیلن زدہ، تنگ اور اندھیاری کوٹھڑی میں رہتا تھا اور مجھے یاد ہے کہ اُس کی کوٹھڑی کے آگے جو کھنڈر ہوتا صحن تھا وہاں ایک بکرا بندھا ہوتا تھا اور وہ نہ صرف اپنی مینگنیاں فرش پر بکھیرتا تھا بلکہ مسلسل باآں باآں بھی کرتا رہتا تھا اور حسین شاہد نے اپنی حیات کی کلاسیک کہانیاں اُسی ماحول میں لکھیں، حسین شاہد، مجھے پہلی بار ''فنون'' کے دفتر لے گیا اور احمد ندیم قاسمی سے میرا تعارف کروایا..

حسین شاہد، کسٹم کی انسپکٹری ترک کر کے ایران سے ہوتا ہوا جرمنی کے راستے ہالینڈ پہنچا اور گوشہ نشین ہو گیا، اس کی ڈچ بیوی اور سوتیلے بیٹے نے اپنے آپ کو اُس کے لیے وقف کر دیا...وہ ڈچ خاتون پچھلے

دنوں کینسر کا شکار ہوئی تو اس نے حسین شاہد سے منت کی کہ تم اپنے وطن لوٹ جاؤ، میں مرنے والی ہوں، میرے بعد تمہاری دیکھ بھال کون کرے گا.. حسین شاہد کے پاکستان پہنچنے کے کچھ روز بعد وہ مرگئی..

حسین شاہد کی آنکھوں میں اندھیرے کے سیاہ پکھیرو آشیانے بنانے لگے ہیں، نہ وہ پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی کچھ لکھنے کے لیے کوئی بینائی کی کرن ہے..

''یہ تم ہو؟'' وہ میری جانب چلا آتا ہے..قریب آتا ہے''ہاں یہ تم ہو..میرے نمبڑوَن..میں جانے والا ہوں..حمید اختر..شفقت تنویر مرزا..شریف کنجاہی،عزیز اثری..احمد راہی..سب کے سب چلے گئے..اشک رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو..''

ایک جھینپے ہوئے، ذرا شرمندہ شرمندہ، حفیظ تائب نے ریلوے روڈ پر ایک تنگ کمرے میں ایک ابتدائی پرنٹنگ مشین لگا کر اپنے رزق کا بندوبست کیا اور ان کا چھاپہ خانہ کچھ زیادہ متحرک نہ ہوتا تھا اور وہ اکثر بلکہ روزانہ میرے دکان پر آ بیٹھتے، مجھے اپنی غزلیں سناتے اور کہتے'' کیوں جی تارڑ صاحب..ٹھیک ہے؟'' پھر انہوں نے اپنے آپ کو نعت گوئی کے لیے وقف کر دیا اور درخشندہ اور تابندہ ہو گئے..وہ حفیظ تائب تھے، رسول اللہؐ کے غلام اور تائب ہو گئے..کسان اینڈ کمپنی پر نشست کرنے والوں اور مجھ سے الفت کرنے والوں کا اگر میں تفصیلی تذکرہ کروں تو وہ داستانِ امیر حمزہ سے زیادہ طوالانی ہو جائے تو میں بمشکل اختصار کرتا ہوں..

ملکہ پکھراج کا ذکر ہو چکا، وہ مجھ سے نہیں ابا جی سے ملنے اور مشورے کرنے کے لیے آیا کرتی تھیں..

فخر زمان، احمد سلیم، آصف شاہکار، مصور موجد، بشیر منذر، شریف کنجاہی، پروفیسر فضل حسین، اختر کاظمی اور ان کے والد کاظمی، محمود قاضی، رشید امجد، مظہر السلام، منشا یاد، خالد احمد، نجیب احمد، راشد حسن رانا، اداکار محمد شفیع..مسعود منور..حال مقیم ناروے..جس کی خفیہ شادی میں، میں شریک ہوا..

تلمیذ حقانی، اگر وہ نہ ہوتا تو آج میں جو کچھ بھی ہوں، یہ نہ ہوتا..

مقبول جہانگیر..جس نے ''سیارہ ڈائجسٹ'' میں ''جائیو نہ بدیس'' کے عنوان سے میرا پہلا سفرنامہ بغیر پڑھے شائع کر دیا کہ سفارش تلمیذ حقانی کی تھی..

مقبول مجھے ملنے آتا، شکار کی کہانیوں کا شاہکار مصنف اگر چہ اُس نے زندگی بھر کوئی شیر تو کیا، ایک چڑیا کا شکار بھی نہ کیا تھا، بندوق کیا کبھی ایک غلیل کو بھی نہ کھینچا تھا، بازار کے پار قصاب کی دکان پر نمائش شدہ بکرے کی رانوں پر نظر رکھتا..حضور، اپنے ملازم سے کہیے کہ وہ جو دائیں جانب سے تیسری ران کُنڈے میں پروئی بے آسرا لٹک رہی ہے، اسے تُلوا لائے..بھون کر کھائیں گے، بالآخر شوگر اسے کھا گئی..

اگر چہ میں ایک نادان، بے خبر شخص تھا جسے کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ ادیب لوگ کونسے ٹی ہاؤس میں بسیرا

کرتے ہیں ''فنون'' اور ''اوراق'' کی مخاصمت میں کس کا ساتھ دینا ہے، لیکن میری خوش بختی ایسی تھی کہ '' نکلے تری تلاش میں'' کی اشاعت نے مجھے ناگہانی طور پر نامور کر دیا اور لوگ مجھے تلاش کرتے کسان اینڈ کمپنی تک آ پہنچے..

دکان کے باہر فٹ پاتھ پر ایک نوجوان، اگرچہ فارغ البال، معنک اور مسکراتا ہوا نوجوان اپنا سکوٹر پارک کر کے آتا ہے.. اپنا تعارف کرواتا ہے.. اپنے چُنیدہ چند بالوں کو سنوارتا کہتا ہے، ''میں ایم اے او کالج میں پڑھاتا ہوں، شاعر ہوں.. میں نے آپ کے سفرنامے کے بارے میں ایک تنقیدی مضمون تحریر کیا ہے.. مقبول جہانگیر نے کہا ہے کہ اگر آپ پسند کریں تو شائع ہو جائے گا.. ذرا دیکھ لیجئے..''

مجھے تو یقین نہ آیا.. یعنی '' نکلے تری تلاش میں'' کی یوں پذیرائی ہو رہی ہے.. امجد اسلام امجد نے مجھ پر پہلا تنقیدی تجزیہ لکھا..

ایک دوپہر.. ایک اور لمبرٹیا سکوٹر فٹ پاتھ پر پارک ہوتا ہے.. یہ کوئی گھنگھریالے بالوں والا، گورا چٹا، یہودیوں ایسی ناک والا نوجوان ہے.. وہ بھی '' نکلے تری تلاش میں'' کا سحر گرفتہ، ایم اے او کالج میں پڑھاتا ہے، مجھ سے ملنے کے لیے چلا آیا ہے.. اپنا تعارف کرواتا ہے کہ میں ''نوائے وقت'' میں ''روزن دیوار سے'' کے نام سے کالم لکھتا ہوں اور میرا نام عطاء الحق قاسمی ہے..

یہ ایک الگ کہانی ہے کہ میں نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ یہ مولویانہ نام عطاء الحق ترک کر کے صرف عطاء قاسمی کے نام سے کالم لکھے اور اس نے کچھ عرصہ یہی نام اختیار کیا.. جب اُس کا سکوٹر چوری ہو گیا تو سبزی منڈی کے ایک آڑھتی کی مدد سے ہم اس کے سکوٹر تک جا پہنچے جو لاہور شہر کے اندرون میں کہیں پوشیدہ تھا.. مجھے اب عطاء سے کوئی شکایت نہیں..

عارف وقار سے میری دوستی تھی، اس کے ہمراہ مرزا اطہر بیگ بھی آ گیا.. وہ جب کبھی شرقپور سے لاہور آتا، تو پہلا سٹاپ لاہوری کے باہر نیشنل بینک میں راشد جاوید کے ہاں ہوتا اور پھر وہ میرے پاس چلا آتا.. یہ سلسلہ برسوں جاری رہا.. وہ ان دنوں شرقپور کے کسی سکول میں پڑھاتا تھا اور پرائیویٹ طور پر فلسفے میں ایم اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا.. دوپہر کا کھانا لانے کے لیے بابا نذیر گھر جاتا تو امی جان آج کے مہمانوں کے بارے میں استفسار کرتیں کہ دکان پر اور کون کون ہے تو وہ کہتا، چار دوست ہیں چوہدری صاحب کے اور ان میں وہ گھنگھریالے حبشی بالوں والا مرزا شرقپوری بھی ہے..

اطہر بنیادی طور پر ایک ''میں نہیں مانتا.. میں نہیں مانتا'' نوعیت کا مذہب، معاشرتی اقدار اور دیگر مروجہ اخلاقیات سے انکاری شخص تھا چنانچہ وہ شادی سے بھی انکاری ہو گیا.. اُس کے نہایت نفیس طبع کے دھیمے مزاج کے سکول ٹیچر والد صاحب نے میرے ذمے یہ ناگوار فرض سونپا کہ میں اُسے شادی کے لیے قائل کروں

کہ ان کے بقول وہ عارف وقار کے علاوہ صرف میری بات مانتا تھا..

اطہر بالآخر جب قائل ہوا تو اس کے گلے میں نوٹوں کا ایک قیمتی ہار تھا اور میں اُس کے برابر میں چلتا اپنے مشن کی کامیابی پر خوش تھا، اطہر بعد ازاں گورنمنٹ کالج میں فلسفے کا لیکچرر تعینات ہوا اور پھر اس شعبے کا سربراہ ہو گیا، اس دوران شاید وہ بالغ ہو گیا اور میرے مدار سے نکل گیا..

میرے ابا جی کشور ناہید کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتے تھے، کہتے تھے ''مستنصر، تمہارے ادیب دوستوں میں سے سب سے تمیزدار اور مودب یہ کشور ہے.. ہمیشہ میرا حال پوچھتی ہے اور مجھے ابا جی کہتی ہے..'' کبھی کبھی سگرٹ پھونکتا یوسف کامران بھی چلا آتا..

اور پھر وہ اپنے آپ میں گم، گوالمنڈی کے بازاری عشق میں گُم، نواز تھا.. پنجابی کا کہانی کار، شام رنگی کُڑی، ڈرامہ نگار اور لاہور کی ثقافت میں رنگا ہوا بے نیاز شخص.. سرِشام، اپنی لے پالک بیٹی کو اٹھائے، ساغر صدیقی والے پان فروش سے میٹھا پان حاصل کر کے، اُسے کلّے میں دبا کر، سگرٹ کے کش لگاتا وہ کچھ دیر تو میرے پاس آ بیٹھتا..

ایک روز کہنے لگا اور وہ ایک بچے کی مانند خوش ہو رہا تھا ''تارڑ صاحب، میں دو تین ماہ کے لیے امریکہ جا رہا ہوں، وہاں میرا قدیمی یار اکمل علیمی وائس آف امریکہ میں کوئی توپ شے ہو گیا ہے اُس نے بلایا ہے.. تین ماہ بعد ملیں گے..''

ابھی تین ہفتے بھی نہ ہوئے تھے کہ مجھے شک گذرا کہ ایک بچی کو سینے سے لگائے، گوالمنڈی کی سیر کرتا پان کھاتا جو شخص ابھی ابھی گذرا ہے وہ نواز کی شکل کا ہے.. اور وہ نواز ہی تھا..

''تارڑ، میں امریکہ پہنچا تو اکمل علیمی نے میری خاطریں کر کر کے میرا حشر کر ڈالا.. بڑے بڑے عجیب اطالوی اور فرانسیسی کھانے، ان کے ساتھ سفید اور سرخ انگوروں کی شرابیں.. فلیٹ میں واپس آتا تو فریج میں بیئر کی بوتلیں سرد ہو رہی ہوتیں.. اُس نے مجھے سیریں بھی بہت کروائیں لیکن.. یکدم میں لاہور کے لیے، گوالمنڈی کے لیے اداس ہو گیا.. تارڑ میں ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھتا ہوں، ڈرامے کر نہیں سکتا اور وہاں مجھے ڈرامے کرنے پڑتے تھے.. ہر ایک کا شکر گزار ہونا پڑتا تھا.. تو میں نے اکمل سے کہا، تم نے یاری کا حق ادا کر دیا.. لیکن.. میں نے لاہور جانا ہے اور ابھی جانا ہے.. اکمل بہت پریشان ہو گیا.. کہنے لگا ''نواز.. ابھی تو تم نے نیویارک کے عجائب گھر دیکھنے ہیں، واشنگٹن کی یادگاریں دیکھنی ہیں، دنیا کے بہترین نائٹ کلبوں میں جانا ہے تو میں نے کہا، میں نے کہیں نہیں جانا، لاہور جانا ہے.. تو اُس نے کہا ''ٹھیک ہے.. لنڈن کے دوست بار بار مجھے فون کرتے ہیں کہ اگر نواز لاہور سے نکل ہی آیا ہے تو اسے چند روز کے لیے ہمارے پاس بھیج دو، ہم اُس کے لیے ترس گئے ہیں.. تو تم میرا کہا مان لو اور کچھ دن لنڈن میں گذار لو.. اُس نے مجھے لنڈن جانے والی پرواز پر بٹھا

دیا کہ وہاں کچھ دن رہو اور پھر واپس واشنگٹن آ ؤ.. پھر بے شک واپس چلے جانا..''

یہاں سے آگے یہ نواز داستان عجیب راستے اختیار کرتی ہے.. اکمل نے نواز کو لندن جانے والی پرواز میں بہ نفسِ نفیس سوار کروایا اور پھر اُس شام نواز کے لندن کے دوستوں کو فون کیا کہ گیا نواز خیر خیریت سے پہنچ گیا ہے.. اُدھر سے جواب آیا کہ ہم اُس کے استقبال کے لیے ایئرپورٹ گئے، انتظار بہت کیا لیکن.. نواز نہ آیا..

اکمل نے بھنّا کر کہا، میں نے تو اسے خود لندن جانے والی فلائٹ میں بٹھایا تھا اور لندن کے دوست کہہ رہے ہیں کہ وہ یہاں نہیں پہنچا.. تو نواز کدھر گیا..

''تارڑ، میں بے شک لندن لینڈ کر گیا.. ایئرپورٹ سے باہر جانے کو تھا کہ ایک اعلان لاؤڈ سپیکر پر گونجا.. فلاں ایئر لائن کی پرواز کراچی جانے کے لیے تیار ہے، مسافروں سے التماس ہے کہ.. تو مجھے کراچی کے نام پر رونا آ گیا، دل بھر آیا.. کہ کراچی سے سیدھے لاہور گوالمنڈی کی شام، حاجی حرامدے کے چنے، ساغر صدیقی والے پان، گوالمنڈی کا ربڑی والا فالودہ.. اور میری بیٹی.. میں نے اُس ایئر لائن کے کاؤنٹر پر جا کر اپنا ٹکٹ پیش کیا کہ مجھے واشنگٹن واپس نہیں جانا، کیا میں یہاں سے کراچی جا سکتا ہوں.. کرائے میں جو بھی فرق ہے میں اس کی ادائیگی کرنے کو تیار ہوں.. تو میں آج صبح ہی پہنچا ہوں.. اور پھر سے گوالمنڈی کی شام میں ہوں..''

نواز کی شکل کا وہ نواز ہی تھا..

نواز ایسے جواہر اب کہاں ملتے ہیں، وہ آخری ہیرے تھے جو لاہور کی اُلفت کی کانوں میں سے نکلے، اب تو اگر کچھ نکلتا ہے تو کوئلہ نکلتا ہے اور وہ بھی سلگتا نہیں، دھواں دیتا رہتا ہے..

چیمبرلین روڈ پر ہمارے علاوہ بھی کچھ قدیمی بیجوں کے بیوپاری تھے.. آرائیں سیڈ سٹور.. غلام رسول بیج فروش، چراغ دین سیڈ مرچنٹ..

چراغ دین صرف اپنی بوسیدہ دکان کے ماتھے پر آویزاں بورڈ پر چراغ دین تھا ورنہ وہ ''چاگھا'' تھا..

وہ ایک نہایت متمول شخص تھا، سمن آباد کی ایک وسیع کوٹھی میں رہائش رکھتا تھا لیکن.. اُس کی دکان میں پھٹی ہوئی بوریاں، موٹے موٹے چوہے، فرش اکھڑا ہوا.. وہ ہر سویر دکان کھولتا اور نہایت دل جمعی سے فرش پر جمی یا اینٹوں میں سے پھوٹتی دھول پر ایک گنجا ہو چکا جھاڑو پھیرنے لگتا.. دھول کا ایک غبار اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتا اور تب ابا جی مجھے کہتے ''مستنصر، دیکھا اب چاگھا کیا کرتا ہے..''

جھاڑو دیتے ہوئے چاگھے کو خیال آتا کہ دھول اُس کے کوٹ پر اتر رہی ہے تو وہ فوراً ہی اُسی جھاڑو

سے کوٹ کو جھاڑنے لگتا..ابا جی کے لیے یہ ایک پُر مسرت لمحہ ہوتا اور وہ مسکراتے جاتے..اپنی مسکراہٹ کو قابو میں نہ رکھ سکتے..

چراغ دین دوپہر کے کھانے کے لیے تنور میں گر جانے والی سیاہ جلی ہوئی روٹیاں کم قیمت پر حاصل کرتا اور چکڑ چھولوں کی آدھی پلیٹ خرید کر ایک شاندار پرتکلف لنچ کرتا..جس روز وہ چھولوں کے علاوہ اُن میں ڈوبی ہوئی ایک بوٹی خریدتا تو وہ بازار میں چلتا، اپنی دکان کی جانب جاتا، وہ ایک بوٹی انگلیوں میں گرفت کر کے چھولوں کی پلیٹ سے ذرا بلند کر کے پورے بازار میں سے فخریہ گذرتا کہ دیکھو..آج میں عیاشی کے موڈ میں ہوں..

چاگھا ایک عبادت گذار شخص تھا، اپنی بیشتر نمازیں مسجد تاجے شاہ میں ادا کرتا، باقاعدگی سے روزے رکھتا..اور پھر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اسے مختلف بیماریوں نے آلیا..ایک مدت ہسپتال میں داخل رہا اور ایک آپریشن کے دوران کہا جاتا ہے کہ دل کے علاوہ اُس کے دیگر اعضائے رئیسہ ناکارہ جان کر نکال دیئے گئے..چاگھا جب تقریباً صحت مند ہوا تو اس نے سب روزے اور نمازیں ترک کر دیں..کہ میں تو اللہ کے آگے جھکتا رہتا تھا، دیکھو اس نے مجھے کیا انعام دیا...اب نہیں جھکنا..

گوالمنڈی کا ایک تاریخی اور کلاسیکی کردار حاجی حرام دا تھا..کبھی آلو چھولے فروخت کرنے لگتا اور کبھی کھیر کا خوانچہ لگا لیتا..یک چشم تھا اور میں نہیں جانتا کہ وہ سچ مچ کا حاجی تھا یا اسے اعزازی طور پر یہ رتبہ عطا کر دیا گیا تھا، البتہ دوسرا لقب ایسا تھا کہ وہ بجا طور پر اس کا حقدار تھا کہ وہ کمال کا فقرے باز اور کائیاں شخص تھا..وہ قصہ ایک تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے جب ایک شب کچھ لکھنے پڑھنے والے لوگ، کچھ شاعر..اور ان میں اے حمید بھی شامل تھے، قدرے خمار میں گم خوراک کی تلاش میں ناکام ہوئے تو گوالمنڈی میں حاجی صاحب کے ٹھیلے پر آ نکلے جو ان دنوں قیمے کی ٹکیاں فروخت کرتے تھے..وہ اپنا ٹھیلا اور اس کے سامان سمیٹ رہے تھے جب یہ دوست آ نکلے..

''حاجی، کچھ کھانے کو ہے..؟''

''سو بسم اللہ..میرے یار آ گئے..ابھی حاضر..قیمے کی ٹکیاں ابھی فرائی کر کے یاروں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں..''

حاجی نے توے پر کچھ اُنڈیلا، مکھن کی تین ٹکیاں اس میں پھینک کر اسے بھونا، پیاز اور ہری مرچوں کی دھونی دی اور بھاپ اڑاتی اشتہا آمیز خوراک قلچوں کے ہمراہ یاروں کو پیش کر دی..

یار بہت شکر گزار ہوئے، خمار کے لطف اور خوراک کے ذائقے سے سرشار ہوئے ''حاجی تو یاروں کا یار ہے..کتنے پیسے ہیں؟''

''کونسے پیسے.. مکھن کی تین ٹکیوں کے پیسے کیا لینے .تم یہ زنگ آلود خالی بالٹی دیکھ رہے ہو، گاہکوں کی پلیٹوں میں چھوڑی ہوئی خوراک میں اس بالٹی میں پھینک دیتا تھا اور بعد میں کتوں کے آگے ڈال دیتا تھا.. میں نے اسی بالٹی کی بچی کھچی خوراک کو توے پر انڈیلا اور مکھن ڈال کر بھون بھان کر یاروں کو پیش کر دیا تو کونسے پیسے..''

کسان اینڈ کمپنی سے منسلک گوالمنڈی کے یادگار کرداروں کا کچھ انت نہیں..اور ہر کردار ایک کتاب..ایک داستان..لیکن سب کا تذکرہ کیسے کروں..اپنے تقریباً سگے تایا جان..''علامہ انڈیاں والے'' کا ذکر کیسے نہ کروں..گنجے سر کے، مہاتما بدھا ایسے بڑے بڑے خبردار کانوں والے، بہت گورے چٹے کشمیری، توندیلے اور صحت مند، علامہ صاحب ابا جی کے آبائی گاؤں جوکالیاں کی پیدائش تھے...بچپن میں ہی انہیں ستارہ شناسی، علم نجوم اور ستاروں کے حوالے سے انسان کی حیات پر ان کی اثر انگیزی کی لت پڑ گئی..وہ کائنات کے رموز جاننے کے لیے بے خود ایسے ہوئے کہ نوعمری میں گھر سے فرار ہو گئے..

میں اپنے گاؤں جوکالیاں سے نکلا، گجرات سٹیشن پر جو بھی ٹرین پلیٹ فارم پر رُکی میں اُس پر سوار ہو گیا..ایک مدت بھٹکتا پھرا..اور پھر ایک سادھو نے راہنمائی کی کہ اگر ستاروں کے علم کے تمنائی ہو..اس کائنات کے بھید میں اترنا چاہتے ہو تو مدراس کے فلاں مندر میں جاؤ جہاں پچھلے دو ہزار برس سے سنت سادھو، ستاروں اور سیاروں کی کھوج میں مگن ہیں..مدراس پہنچا..اُس قدیم مندر تک گیا..وہاں ایک پرابلم ہو گئی..اُس دو ہزار برس قدیم ستاروں کی درس گاہ میں صرف ہندو مذہب کے پیروکار ہی داخل ہو سکتے تھے..میں نے اپنے آپ کو ہندومت کی جانکاری، اس کی مقدس کتابوں، تاریخ اور فلسفے کے لیے وقف کر دیا..کبھی کسی گیان دھیان میں گم کسی گپھا میں مدت سے براجمان، نیم خوابیدہ، بمشکل سانس لیتے سادھو کے چرنوں میں جا بیٹھا اور بیٹھا ہی رہتا اور کبھی کسی پرانے مندر یا آشرم میں بسیرا کرنے لگتا..دو برس بعد میں نے دوبارہ مدراس کے اُس قدیم بُت خانے میں قدم رکھا اور اُس کے مہا پروہت کو قائل کر لیا کہ مجھ ایسا گیانی اور پہنچا ہوا ہندو اور کون ہو گا..میں تقریباً پانچ برس اُس درسگاہ میں ستارہ شناسی، قسمت کی لکیروں، سیاروں کی گردش اور اس کے انسانی زندگی پر اثرات اور کائنات کے رموز کے بھید جانتا رہا..بیشتر نصابی کتابیں سنسکرت میں تھیں جو ہزاروں برس پیشتر لکھی گئی تھیں..اُن میں سے ایک قدیم کتاب کے لکھاری نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اُس نے ستاروں کے بارے میں یہ کتاب سورج میں بیٹھ کر لکھی ہے..اُس پر بہت اعتراض ہوئے کہ سورج جو آگ کا بھنور ہے بھلا اُس میں بیٹھ کر کوئی مخطوطہ کیسے تحریر کیا جا سکتا ہے..اور پھر کھلا کہ وہ کسی حد تک سچ کہتا تھا..اُس نے ستاروں اور سیاروں کے فاصلے زمین سے دوری کے حساب سے نہیں ناپے تھے، سورج کو مرکز اور محور بنا کر وہاں سے فاصلوں کا تعین کیا تھا..

علامہ صاحب کی زندگی کے وہ برس جو اُس مندر سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اُن پر گذرے

اُن کے بارے میں نہ تو وہ بات کرتے تھے اور نہ ہی میں نے پوچھنے کی جرأت کی.. میں نے جب انہیں دیکھا تو وہ ڈھل چکی عمر میں اپنے بدھا کانوں اور بدھا توند کے ساتھ گوالمنڈی میں مٹرگشت کرتے دیکھا..

اُن کے پاس گوالمنڈی چوک کی نکڑ پر ایک کھوکھا تھا، ان کے پاس شاید کسی مرغی خانے میں سے جنم لینے والے انڈوں کی ایجنسی تھی.. صبح سویرے اُن کے ہاں درجنوں کریٹ انڈوں کے وارد ہوجاتے اور وہ انہیں تھوک کے بھاؤ پندرہ بیس منٹ میں گاہکوں کو فروخت کر کے دن بھر کے لیے فارغ ہو جاتے.. اسی لیے وہ علامہ انڈیاں والا کہلاتے تھے..

ہفتے میں صرف دو دن صرف دو گھنٹوں کے لیے وہ دست شناسی کا کاروبار کرتے.. اُن کی فیس مبلغ دس روپے تھے.. اگر کوئی قسمت کا مارا اُس طے شدہ وقت کے ایک منٹ بعد بھی پہنچتا تو وہ اسے دھتکار دیتے کہ شبھ گھڑی تو گذر گئی، اکثر کوئی نہ کوئی دور سے آنے والا غرض مند، کوئی بوڑھی عورت میرے ابا جی کو سفارش کرنے کی التجا کرتی کہ میں خانیوال یا میر پور خاص سے صرف علامہ صاحب کو اپنا ہاتھ دکھانے کے لیے آئی ہوں، پردیسی ہوں، مدد کیجئے، سنا ہے وہ صرف آپ کی بات نہیں ٹالتے تو ابا جی سفارش کر دیتے..

اور ہاں میں بھولا جا تا تھا کہ مدراس کے اُس قدیم معبد میں جہاں علامہ صاحب دن بھر بھجن گاتے، گھنٹیاں بجاتے، انواع واقسام کے دیوی دیوتاؤں کو سجدے کرتے وہاں وہ اپنی کوٹھڑی میں چوری چھپے پانچ وقت کی نمازیں بھی باقاعدگی سے ادا کرتے، روزے رکھتے کہ علامہ صاحب ایک کھرے اور نہایت ایمان والے مسلمان شخص تھے..

بلھے شاہ کی مانند وہ مولوی حضرات سے شدید بیر رکھتے تھے..

مجھے یاد ہے کہ وہ کسان اینڈ کمپنی میں بیٹھے ہوئے بازار میں سے گذرتے مسجد تاج شاہ کے امام کو پکارتے کہ.. مولوی جی ایک شرعی مسئلہ آن پڑا ہے ذرا اس کا حل تو بتا دیجئے.. اور امام صاحب مسکراتے ہوئے، کان لپیٹ کر اپنا چلنا موقوف نہ کرتے کہ علامہ صاحب قرآن پاک اور احادیث کا وسیع علم رکھتے تھے، اور ان سے بحث میں ملوث ہونا خطرے سے خالی نہ تھا..

بلکہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ مولوی حضرات تو منکرِ قرآن ہیں، اس مقدس کتاب کو غور سے کبھی نہیں پڑھتے.. سال میں ایک مرتبہ وہ ہمیشہ طیش میں آجاتے جب رمضان کے بعد درجنوں علماء کرام دوربینوں میں آنکھیں جما کر یا جہازوں میں پرواز کرتے چاند کی تلاش میں سرگرداں ہوجاتے.. علامہ صاحب کہتے، اگر قرآن پاک میں یہ درج ہے کہ یہ کائنات اور سیارے اللہ تعالیٰ کے ایک طے شدہ نظام کے تحت حرکت کرتے ہیں تو یہ مولوی حضرات اسے نہیں مانتے، یعنی یہ طے شدہ نہیں کہ چاند کب طلوع ہوگا، انحراف کرتے ہیں، اپنے حلوے مانڈے کے لیے ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں.. سب کچھ طے شدہ ہے..

میں کہتا ''علامہ صاحب..امریکی خلائی ادارے ناسا سے بھی تو رجوع کیا جا سکتا ہے کہ چاند کب اور کون سے لمحے دنیا کے کس خطے میں اُبھرے گا..'' تو وہ ناگواری سے کہتے..ناسا تو آج کی بات ہے..یہ سب کچھ تو ہزاروں برس پیشتر ہندوستان کے قدیم علوم کی کتابوں میں درج ہو چکا ہے کہ آئندہ زمانوں میں کب اور کس لمحے چاند دکھائی دے گا..

ایک بار جب بہت ہی طیش میں آئے تو کہنے لگے ''مجھے ایک کاغذ اور قلم دو..''

انہوں نے میرے مہیا کردہ کاغذ پر حساب کتاب کر کے کچھ تاریخیں درج کیں ''آئندہ دس برسوں میں ان تاریخوں پر عید کا چاند نمودار ہوگا، کہاں کہاں کب دکھائی دے گا، یہ میں نے لکھ دیا ہے..اگر میں غلط ثابت ہوا تو مجھے ''دُرفِٹے مُنہ'' کہنا، میں مر گیا تو میری قبر پر سو جُوتے مارنا..''

اور یہ ''دُرفٹے مُنہ'' کہنے اور جوتے مارنے کی نوبت کبھی نہ آئی کہ چاند اُنہی تاریخوں میں نمودار ہوا جو علامہ صاحب نے اس کاغذ پر درج کی تھیں..وہ انڈوں کی تجارت سے فارغ ہو کر اپنی توند پر سے کھسکتی لُنگی سنبھالتے کسان اینڈ کمپنی میں جھانکتے..اگر اباجی موجود ہوتے تو اپنی توند سہلاتے جو سفیدی کا ایک تھل تھل کرتا پہاڑ تھی اُن کے سامنے کرسی پر آ بیٹھے اور اُن سے راز و نیاز میں مشغول ہو جاتے، اگر اباجی گھر جا چکے ہوتے تو وہ بھی جھانک کر چلے جاتے..کبھی کبھار میں اُنہیں روک لینے کی خاطر..کہ وہ ایک نایاب اور سحر انگیز شخص تھے، جان بوجھ کر کوئی ایسا سوال کرتا کہ وہ ٹھہر جاتے..مثلاً ایک بار سردیوں کی ایک دھند بھری سویر میں جب کہ وہ دکان میں جھانک کر جانے والے تھے تو میں نے کہا ''علامہ صاحب..کیا خدا ہے؟..یہ ایک گورکھ دھندا یا بکھیڑا تو نہیں، اگر ہوتا تو دکھائی دے جاتا..''

علامہ صاحب رُک گئے..کسان اینڈ کمپنی کے تھڑے پر کھڑے ہو گئے ''اِدھر آؤ..'' میں آ گیا، چیمبرلین روڈ ایک سرمائی دھند میں ڈوبی ہوئی، چمڑہ مارکیٹ سے بل کھا کر مُردوں کی گھاٹی کی جانب رخ کرتی تھی..انہوں نے اُدھر اشارہ کیا ''کیا تمہیں یہاں سے گوجرانوالہ دکھائی دیتا ہے؟'' مجھے شک ہوا کہ یہ اُن کی مجذوبیت کا کرشمہ ہے کہ میں خدا کے وجود کے بارے میں شک کر رہا ہوں اور وہ مجھے گوجرانوالہ دکھا رہے ہیں..

''علامہ صاحب..یہ گوجرانوالہ کہاں سے آ گیا..''

ڈانٹ کر بولے ''دکھائی دے رہا ہے یا نہیں''

''نہیں..''

''کیوں نہیں؟''

''راستے میں درجنوں قصبے اور ان کے درو دیوار اور مکان اور اونچ نیچ کے ٹیلے ہیں، کیسے دکھائی دے..''

Scanned with CamScanner

''فرض کرو کہ یہاں سے گوجرانوالہ تک کوئی آبادی، کوئی قصبہ نہیں، چٹیل اور سپاٹ میدان ہے تو کیا اُس صورت میں تمہیں گوجرانوالہ دکھائی دے گا؟''

''نہیں..''

''کیوں نہیں..''

میں نے تنگ آ کر کہا'' تایا جی..انسان کی نظر ایک محدود فاصلے تک جا سکتی ہے..اُس سے پرے تو نہیں دیکھ سکتی..''

''بس..خدا بھی یہی ہے..تمہاری نظر محدود فاصلوں تک جا کر دھندلا جاتی ہے..تم اُسے دیکھ نہیں سکتے..گوجرانوالہ ہے ناں، نظر نہیں آتا، خدا بھی ہے..''

خدا کے وجود کی ایسی دلیل آج تک کسی سنت صُوفی نے اگر پیش کی ہے تو مجھے خبر کر دیجئے گا..

کسان اینڈ کمپنی کے برابر میں نیو ماڈرن پریس ہوا کرتا تھا مُلاں نائی کا حمام اور ذرا پرے ٹُنڈے بازو والے حکیم چنن دین کا دواخانہ ہوا کرتا تھا..وہ صرف شربت نہیں مقوی کُشتوں کے ماہر ایسے تھے کہ دور دور سے لوگ اپنی مُردگی کو زندگی سے ایستادہ کرنے کے تمنائی آیا کرتے تھے..کہا کرتے تھے'' ہفتے میں ایک ہی نامراد آ جائے تو میرے گھر کے مہینے کا کاروبار چل جاتا ہے..''

حکیم چنن دین کو شعر و شاعری سے بہت شغف تھا..

''میں اُن دنوں لاہور کی لوکو ورکشاپ میں ملازمت کرتا تھا، روزانہ میورو ڈ پر واقع علامہ اقبال کی رہائش گاہ کے قریب سے گذر کر ورکشاپ جاتا تھا..اور ہمیشہ جھانکتا تھا تا کہ اقبال کا چہرہ نظر آ جائے..اور ایک روز میں نے دیکھا کہ ایک مجذوب فقیر گھر کی باڑھ کے باہر کھڑا ہے اور اقبال اُسی سے گفتگو کر رہے ہیں..اگلے روز صبح سویرے جھانکتا ہوں تو وہ مجذوب اور اقبال'' بہ نوکِ خارے رقصم'' الاپتے بے خود رقص کر رہے ہیں..''

شہر لاہور میں مسلمانوں کی گنی چُنی دکانیں تھیں..انارکلی کی سینکڑوں دکانوں میں سے'' کرنال شاپ''،'' عنایت اللہ''،'' سٹینڈرڈ لیدر ورکس''،'' بمبے کلاتھ ہاؤس'' وغیرہ مسلمانوں کی ملکیت تھیں اور انارکلی سے باہر شہر لاہور کی سب سے قدیم مسلمان دکان'' کسان اینڈ کمپنی'' تھی...جس کے زوال کا آغاز تب ہوا جب برصغیر تقسیم ہوا اور اس کی مارکیٹ صرف پاکستانی علاقوں تک محدود ہو گئی..اور پھر مشرقی پاکستان الگ ہوا تو یہ اپنے آخری سانسوں پر آ گئی..

اگرچہ بنگال کے لوگوں نے اِس'' کشن اینڈ کمپنی'' کو یوں سینے سے لگائے رکھا، اس کی ایماندار تجارت سے اس قدر وفا کی کہ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد جب بنگالی کاشت کاروں کو کلکتہ کی'' سٹن'' فرم کے بیج مہیا کیے گئے تو انہوں نے انہیں اپنے کھیتوں میں بونے سے انکار کر دیا'' ہمیں کشن کے بیج درکار ہیں..''

چنانچہ بنگلہ دیشی حکومت نے مجبور ہو کر ہم نے رابطہ کیا، بچھڑ چکے مشرقی پاکستان کی جانب سب سے اول درآمد "کشن سیڈز" کی تھی..... وہ جو کہتے ہیں کہ بنگال غدار اور سازشی ہیں، میں اُن کے چہروں پر کالک ملنا چاہتا ہوں، وہ غدار نہیں خود دار اور وفادار ہیں..

ابا جی اسّی برس کی عمر کے پار ہونے سے پیشتر تک باقاعدگی سے کسان اینڈ کمپنی کے قفل کھول کر وہاں بیٹھے رہے..

میں میڈیا اور ادب کے صحراؤں میں ایک غزال شب کی مانند بھٹکنے لگا.. مبشر فوج میں چلا گیا اور زبیر نیشنل بینک کے حساب کتاب میں مگن ہو گیا..

ہم تینوں بھائیوں نے "کسان اینڈ کمپنی" سے غفلت اختیار کر لی..

ابا جی نے جب اپنے آخری سانس لیے تو کسان اینڈ کمپنی، لاہور کا ایک لینڈ مارک اُس نے بھی ایک ہچکی بھری اور مر گیا..

میں اِس لمحۂ موجود میں اپنی سٹڈی ٹیبل پر بیٹھا "کسان اینڈ کمپنی" کی داستان رقم کر رہا ہوں تو یہ ٹیبل، یہ میز وہی ہے جس پر آج سے اسّی برس پیشتر میرے ابا جی نئی نئی دکان کھولے بیٹھا کرتے تھے، شاید یہ اسی پرانی اگرچہ اپنے پایوں پر مستحکم میز کا کرشمہ ہے.. جہاں آج میں جھکا ہوا لکھتا ہوں، یہیں میرے ابا جی جھک کر زراعت کی کتابیں تحریر کرتے تھے، وہ دراز قامت، سرخ وسفید، سوہنے نیلی آنکھوں والے ابا جی...

ابا جی کی مانند کسان اینڈ کمپنی بھی کب کی رزق خاک ہوئی..

البتہ اعجاز انور کی واٹر کلر پینٹنگ میں، چیمبرلین روڈ کی مصوّری میں شاید.. سب کہاں، کچھ لالہ وگُل میں نمایاں ہو گئیں.. خاک میں جو صورتیں تھیں.. اور اُن میں ایک صورت "کسان اینڈ کمپنی" کی تھی..



''لاہور کا ماڈل ٹاؤن پارک''

جناح باغ اور ماڈل ٹاؤن سنٹرل پارک کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا.. کہ یہ دونوں سراسر الگ جہان ہیں، ان دونوں میں اگرچہ قافلہ ہائے رنگ و بُو اترتے ہیں، لیکن قافلے والے بھی، رنگ و بُو والے بھی جُدا.. وہاں سینکڑوں برس قدیم شجر اس طور گھنے ہوتے ہیں کہ اُن میں پوشیدہ پرندوں کی موجودگی کی خبر تب ہوتی ہے جب وہ موسم کی موج میں آتے ہیں یا محبت کے زمانے آتے ہیں تو وہ کوکنے لگتے ہیں، اُن کی چہکار سے یہ جنگل گونجنے لگتے ہیں.. جناح باغ کی سویروں میں جہاں شبنم آلود گھاس کے ہر قطرے میں سے نئے سورج طلوع ہوتے ہیں وہاں سانس لیجئے تو سویر کی کنواری ہوا کی تازگی کے علاوہ آپ کے نتھنوں میں پتوں کی بوسیدگی، کھوکھے ہو چکے تنوں میں بسیرا کرنے والے پرندوں کی بیٹ اور چڑیا گھر سے آنے والی ریچھ کی باڑی کی بُو بھی اترے گی اور وہ ناگوار نہیں لگتی، قدرت کے نظام کی ایک مخصوص مہک ہوتی ہے، جب کہ ماڈل ٹاؤن پارک کے بیشتر درخت میری نظروں کے سامنے جوان ہوئے ہیں، اُن کا گھنا پن ایسا نہیں کہ وہاں اجنبی پرندے بسیرا کرتے ہوں..

لیکن ماڈل ٹاؤن پارک میں ایک خوش نظر خوبی یہ ہے کہ یہاں آپ کے سامنے منظر وسیع ہوتا چلا جاتا ہے، اس کے گھاس بھرے تاحدِ نظر ہرے ہوتے میدانوں پر منگولیا کے گھاس کے میدانوں کا شائبہ ہوتا ہے.. آپ ان میں سچ مچ کے گھوڑے تو نہیں دوڑا سکتے اس لیے بھی کہ ان دنوں ہارس ٹریڈنگ کی وجہ سے گھوڑوں کی قیمتیں ڈالروں سے باتیں کرنے لگی ہیں، البتہ تصور کے گھوڑے بے دریغ دوڑائے جا سکتے ہیں.. اور جب کبھی بارشیں کسی گوری کی پائل کی مانند چھم چھم برستی ہی چلی جائیں تو ان میدانوں کے نشیب میں پانی ٹھہر جاتے ہیں اور اُن پر جھیلوں کا گمان ہونے لگتا ہے، ایسی خواب ناک جھیلیں جن کے پانیوں میں سے اگر بقول ایلیٹ سال کا سب سے ظالم مہینہ اپریل ہو تو سُنبل کے درخت ظاہر ہوتے ہیں اور ذرا سی ہوا کے چلنے سے اُن درختوں میں سے سفید روئی کے برف گالے گرنے لگتے ہیں اور اگر کوئی پرندہ کسی شاخ پر آن بیٹھے تو شاخ کی لرزش سے بھی سُنبل کے سفید پھول، سفید پتنگوں کی مانند ڈولتے ہوئے گرنے لگتے ہیں، پانیوں کی سطح پر گرتے ہیں اور اُن پر روئی کے راج ہنسوں کی مانند تیرنے لگتے ہیں اور اگر مئی کا وہ مہینہ آ جائے جب چوٹی

سے ایڑھی تک پسینہ بہتا ہے تو بارش کے پانیوں میں گھرے ہوئے املتاس کے درختوں سے زرد رنگت کی چینی لالٹینیں جُدا ہوتی ہیں اور گھمن گھیریاں کھاتی پانیوں پر اتر جاتی ہیں.. زرد رُو چینی شہزادیوں کی مانند سطح آب پر ہلکورے لینے لگتی ہیں.. ایسے کمال کے منظر جن میں برف کی سفیدی اور شہزادیوں کی زردی پانیوں پر تیرتی ہے باغ جناح میں تو نہ ہوتے تھے..

جیسے مصطفےٰ زیدی نے شہناز گُل کے بارے میں کہا تھا کہ وہ بستر کی ہر شکن میں شریک تھی تو یہ ماڈل ٹاؤن پارک ہے جو پچھلے بیس برسوں سے میری ہر سویر کی تھکن میں شریک تھا..

جناح باغ میری جوانی کا معاشقہ ہے.. جہاں میں ننگے پاؤں بھی چلا جاتا تھا اور یہ پارک میرے بڑھاپے کا عشق ہے اور یہ عشق بُرا ہوتا ہے.. ماڈل ٹاؤن پارک اور جناح باغ میں اور کچھ نہ سہی کم از کم شیر مشترک ہیں، وہاں ترت مُراد کے مزار کی جانب سے تقریباً ہر سویر شیر کے دھاڑنے کی آواز آتی تھی اور دل دہلنے کی بجائے خوش ہو جاتا تھا اور یہاں اس پارک کی قربت میں اگرچہ کچھ شریف شیر رہتے ہیں پر وہ دھاڑتے نہیں، بُھس بھرے نمائشی سے شیر ہیں..

میں نے ابھی مئی کے مہینوں میں املتاس کے زرد جوبن کا تذکرہ کیا ہے اور حضور میں کیا بیان کروں کہ جب املتاس کے درخت پر یُوں جوبن آتا ہے کہ اُس کے پتے جھڑ جاتے ہیں اور اُس کا پورا وجود ایک زرد بن میں بدل جاتا ہے.. ایک زرد قیامت آنکھوں میں بھڑکنے لگتی ہے.. اب میں مبالغہ تو نہیں کر رہا اور نہ ہی میں توصیف کے تذکروں میں بے ایمان ہو رہا ہوں لیکن.. میں نے بہت سے مُلکوں کے بہت موسموں میں بہت سے پُھولوں سے لدے شجر دیکھے ہیں.. سنٹرل پارک میں کھلنے والے چیری کے شگوفے، سنکیانگ کی ''جنت کی جھیل'' کے کناروں پر گلابی رنگت کے پُھولوں کے بوجھ سے دوہرے ہوتے ہوئے شجر.. لیکن یہ سب کے سب لاہور کے مئی، جُون کے مہینوں میں املتاس کے زرد پُھولوں کے انبار کے سامنے، سرنگوں اور شرمندہ! یوں جانئے کہ ان مہینوں میں املتاس کے پیڑوں پر زرد آگ لگ جاتی ہے، یہی موسم تھے، اشفاق صاحب کو بچھڑے ہوئے زیادہ دن نہ ہوئے تھے جب ماڈل ٹاؤن پارک کی روش پر اپنے رانجھے کے بچھڑ جانے کی سوگواری میں گُم، بانو قدسیہ، ایک ہیر، سر جھکائے ہولے ہولے قدم دھرتی چلتی تھی اور ہوا میں املتاس کے پُھول اڑتے پھرتے تھے.. بانو آپا کا سُندر سپنا بیت گیا تھا.. اشفاق احمد کو ماڈل ٹاؤن قبرستان کی خاک میں پیوند ہوئے کچھ دِن بیت چکے تھے.. میں پریم میں سب کچھ ہار گئی بے درد زمانہ جیت گیا، میرا سُندر سپنا بیت گیا... ایک آوارہ املتاس کا پیلا زرد پُھول ہوا میں گھومتا ہوا آیا اور بانو آپا کے سفید بالوں پر اتر گیا.. اُنہیں تو کچھ خبر نہ ہوئی پر یہ منظر میرے دل کے کینوس پر نقش ہو گیا.. ایک بوڑھی ہیر، اپنے رانجھے کی جُدائی میں گُم، اور اُس کے سفید بالوں میں املتاس کا ایک زرد پتیوں والا پُھول سجا ہوا.. جدائی کی کشتی کے زرد بادبان سفید بالوں پر کُھلے ہوئے.. میں

نے ایک کالم لکھا.. بانو آپا نے پڑھ لیا اور مجھے ایک خط لکھا.. ماڈل ٹاؤن پارک کے مرکزی داخلے کے عین سامنے سیر کے بعد میں کچھ دوستوں کے ہمراہ ایک مدت بیٹھا.. مجید بھٹی ایک بینکر اور لاہور کی تاریخ کے شناسا، انہوں نے اس بیٹھک کو "تکیہ تارڑ" کا نام دیا اور یہ چل نکلا.. کچھ برسوں بعد اس تکیے میں طرح طرح کے مخدوش لوگ بن بلائے آ کر بیٹھنے لگے، تکیہ کمرشل ہو گیا تو میں چپکے سے ہجرت کر گیا، منتقل ہو گیا، وہاں سے دور ایک گھنے شجر کی چھاؤں میں تکیہ کر لیا.. میں متعدد تحریروں میں سیر کے ساتھیوں کے بارے میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں لیکن مجھ پر کچھ مہربانیوں اور محبتوں کے قرض ہیں.. اُن کا تذکرہ برحق ہے.. کہ وہ مجھ سے بچھڑ چکے ہیں.. سردار سمیع اور شیخ اشرف..

پچھلے دنوں سویر کی ایک محفل میں گناہ اور ثواب کے تذکرے چھڑ گئے کہ کون ہے جو جنت کا حقدار ہو گا اور کون جہنم کی آگ میں بھسم ہو جائے گا.. سردار سمیع مشترکہ طور پر جنت کے حقدار ٹھہرے اگرچہ وہ آئین کے مطابق ایک ایسے فرقے سے منسلک تھے جنہیں ہم مسلمان تسلیم نہیں کرتے.. اُدھر شیخ اشرف، بدنی زوال سے لاچار، کُبڑے ہو کر چلتے ہوئے، مجھ سے اس لیے بھی اُلفت رکھتے تھے کہ اُن کی گڑیا شکل کی بیٹی، قدرے معذور، ہمہ وقت میرے سفرنامے پڑھتی تھی اور اُس کی آنکھیں نیلے کانچ کی تھیں.. شیخ صاحب نے نہ صرف ماڈل ٹاؤن پارک میں اپنی نگرانی میں اپنے خرچے پر خوش رنگ پُھول لگائے بلکہ بہار کا موسم آتا تو وہ میرے گھر بہار کے جتنے بھی پُھول کھلتے اُن کے درجنوں گملے سجا دیتے..

اس پارک میں بھانت بھانت کے لوگ آتے ہیں، میں اگر اُن سب کی کردار نگاری پر توجہ مرکوز کروں تو خاکوں کا ایک ضخیم مجموعہ تیار ہو جائے گا.. ویسے مجموعی طور پر وہ لوگ جو کچی نیند سے بیدار ہو کر کسی بھی پارک میں صبح کی سیر کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں، بھلے لوگ ہوتے ہیں.. ان بھلے لوگوں میں سے ایک بہت ہی بھلے قدرے معصوم تنگ نظری والے مولانا تھے جنہیں پارک کی ہر جھاڑی اور گوشہ غیر اخلاقی سرگرمیوں کی ممکنہ آماجگاہ لگتا تھا چنانچہ انہوں نے فحاشی اور بدمعاشی کا قلع قمع کرنے کی خاطر سردھڑ کی بازی لگا دی اور انتظامیہ کو مجبور کر دیا اور تمام گھنی جھاڑیاں، پوشیدہ جُھنڈ اور بیلوں کے انبار کاٹ دیئے گئے تاکہ اُن کی آڑ میں غیر اخلاقی سرگرمیوں کا خاتمہ بالخیر ہو جائے.. آپس کی بات ہے کہ میں نے آج تک اتنے برسوں میں کم از کم صبح کے وقت کسی بھی جھاڑی یا گھنے پن کی اوٹ میں کسی بھی جوڑے کو نازیبا حالت میں نہیں دیکھا۔ اگرچہ میری شدید خواہش تھی کہ دیکھوں تو سہی کہ یہ نازیبا حالتیں کس نوعیت کی ہوتی ہیں.. اگر ہوتی ہیں تو کاش کبھی ہم بھی ایسی حالتوں میں پائے جاتے.. مولانا کے پاس ایک ڈبیہ میں محفوظ ایک سکڑی ہوئی ربڑ نما شے تھی جو بقول اُن کے کسی جھاڑی میں سے دستیاب ہوئی تھی، وہ اسے عوام الناس کو دکھاتے کہ یہ دیکھئے گناہ کے شواہد پیش خدمت ہیں.. کچھ ناہنجار لوگوں کا خیال تھا کہ مولانا یہ "شے" گھریلو استعمال کے بعد ڈبیا میں بند کر کے پارک

میں لے آتے ہیں.. ایک روز کیا دیکھتے ہیں کہ پارک کے تمام دروازوں پر ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک وارننگ چسپاں ہے "خبردار پارک میں نیکر پہن کر آنا منع ہے"..یہ حضرت مولانا کا پارک سُدھار پروگرام تھا.کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اُسی روز میں برمیوڈا شارٹس پہن کر پارک میں چلا گیا جو میرے گھٹنوں سے نیچے تک جاتے تھے اور ٹخنوں سے اوپر تک رہ جاتے تھے..مولانا نے مجھے دیکھا تو طیش میں گئے..جہاں کہیں گھات لگائے بیٹھے تھے میرا نام پکارتے گرجتے چلے آئے..

"تارڑ صاحب..آپ نے نیکر پہنی ہوئی ہے۔"

"کیوں،نہ پہنوں؟ اُتار دوں؟"

وہ گڑبڑا گئے..

میں بھی طیش میں آچکا تھا.."اس لیے اتار دوں کہ شاید آپ بہ نفس نفیس یہ بھی چیک کرنا چاہیں کہ میں ختنہ شدہ بھی ہوں کہ نہیں.."

کچھ لوگ اس صورت حال سے لطف اندوز ہونے لگے تو میں نے مولانا سے کہا "یہ جانگیہ نہیں ہے، برمیوڈا شارٹس ہیں، گھٹنے سے نیچے تک ہیں اوران کے ساتھ نماز پڑھنا بھی جائز ہے..آپ جانتے ہیں؟..آئندہ آپ نے یُوں میرا تعاقب کیا اور لفنگوں کی مانند مجھے پکارا تو.."

ویسے وہ کچھ عرصہ پہلے فوت ہوگئے اور میں اُن کی کمی ہر اُس روز محسوس کرتا ہوں جب میں نیکر پہنے پارک میں داخل ہوتا ہوں..اُن کے دم سے رونق بہت تھی، ایک سویر میں حسب معمول ٹریک پر دائیں ہاتھ چلتا جارہا تھا،ٹریفک کے اصولوں کے تحت سامنے سے آنے والے حضرات بائیں جانب چلے آرہے تھے تو یکدم ایک نوجوان مولانا میرے سامنے آگئے "تارڑ صاحب..آپ دائیں ہاتھ چل رہے ہیں، شرعی اصولوں کے تحت آپ گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں"..میں فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا کہ نوجوان تازہ تازہ مشرف بہ اسلام ہوا ہے، ایسے نوجوان سب سے پہلے گھر کا ٹیلی ویژن سیٹ پاش پاش کرتے ہیں۔ بڑے بھائی کا کُرتہ اور چھوٹے بھائی کی شلوار پہن کر متشرع لباس اختیار کرتے ہیں اور پھر تبلیغ کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں.. چنانچہ میں نے مسکرا کر کہا "دائیں ہاتھ چلنے میں کونسی شرعی خلاف ورزی ہے؟" نوجوان نے نہایت سنجیدگی سے کہا "چونکہ بایاں ہاتھ ناپاک ہوتا ہے، اس لیے استنجا کیا جاتا ہے اس لیے بائیں ہاتھ چلنا بھی ناپاک ہوتا ہے."

"آپ بالکل درست کہتے ہیں..لیکن ہم دعا تو دونوں ہاتھوں سے مانگتے ہیں تو کیا دعا بھی صرف بائیں ہاتھ سے مانگنی چاہیے؟"

نوجوان مولانا نے جھلا کر کہا تھا "آپ ادیب لوگ دین سے واقف نہیں ہیں اور پھر بحث بھی

کرتے ہیں.."

میں آج بھی ٹریک پر چلتا ہوں اور مجبوراً دائیں ہاتھ چلتا ہوں تو قدرے مجرم محسوس کرتا ہوں.. شرعی پابندی کروں بائیں ہاتھ چلنا شروع کر دوں تو سامنے سے جتنے بھی حضرات آ رہے ہیں، خواتین چلی آ رہی ہیں اُن سے ٹکراتا پھروں...

مجھے یہاں منیر نیازی یاد آنے لگا ہے..وہ ؎ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے..کی ایک عملی تصویر تھا..بغیر وجہ کے چلنا پھرنا گناہ سمجھتا تھا، تصورِ جاناں کیے ہوئے گھر میں بیٹھا رہتا تھا..اُس نے زندگی بھر مشاعرہ کے لیے مجبوراً اپنی نشست سے اٹھ کر مائیک تک جانے کے سوا اور کوئی ورزش نہ کی..ایک بار میں نے تجویز پیش کی کہ خاں صاحب آپ تو قدرتی مناظر، گھنے شجروں، موسموں اور اُن موسموں میں بہار پر آتی لڑکیوں کے شاعر ہیں تو کبھی صبح کے وقت سیر کے لیے نکل جائیے، صحت بہتر ہو جائے گی..منیر کہنے لگا "تارڑ، میرے ایک معالج نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا تھا،..وہ تو مجھے مروانے لگا تھا، میں ایک سویر پارک میں سیر کرنے کے لیے گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اُس کی ہوا میں فی مربع انچ جتنے انواع و اقسام کے جراثیم پائے جاتے ہیں وہ پارک کی باہر کی ہوا میں نہیں ہوتے کہ وہاں جتنے لوگ آتے ہیں ڈاکٹر کے مشورے کے تحت آتے ہیں، سب کے سب بیمار ہوتے ہیں، پارک میں سانس لیتے ہیں تو سینکڑوں جراثیم خارج کرتے ہیں تو میں نے اپنی صحت کی خاطر پارک میں سیر کرنا ترک کر دیا.." ویسے پارک میں سیر کرنے والا کوئی ایک مجھ ایسا بابا کبھی کبھار سال میں کم از کم ایک بار ابھی اچھا بھلا ہوتا ہے، فحش لطیفے سُنا رہا ہوتا ہے اور ابھی دھڑام سے گر جاتا ہے۔1122 ریسکیو کی گاڑی آتی ہے، اُسے اٹھا کر لے جاتی ہے..کبھی وہ اگلی سویر پارک میں موجود ہوتا ہے اور کبھی نہیں بھی ہوتا.. ہمارے ایک سیر سے شدید اجتناب کرنے والے دوست اسی موقف پر قائم ہیں کہ صبح کی سیر کرنے والے لوگوں کا بھی تو دھڑن تختہ ہو جاتا ہے تو اگر ایسا ہونا ہے تو کیوں نہ اپنے گھر میں انسان تختہ ہو جائے..جیسے پوٹھوہاری میں کہا جاتا ہے کہ شالا تیرا تختہ ہو جائے، مر جائے..تخت یا تختہ والا تختہ..

پچھلے برس جولائی کے مہینے میں جب میرا تختہ ہو جانے والا تھا، متعدد طویل آپریشنوں کے دوران میرا دھڑن تختہ ہو جانے کو تھا اور پھر میں سرجن محمود ایاز کے معجزے اور اپنے بچوں کی فریادوں اور دنیا بھر میں میرے لیے مسجدوں اور کلیساؤں میں کی جانے والی دعاؤں کی تاثیر سے اُس تختے سے اٹھ بیٹھا اور صحت یابی پر پہلے روز، ذرا نا تواں حالت میں پارک میں داخل ہوا تو..میں ابھی ابھی پیدا ہوا تھا...میں ہر شجر اور اُس میں سے اڑان کرتے ہوئے کسی پرندے کو پہلی بار چہکتے اور پرواز کرتے دیکھتا تھا..سبز گھاس کی پتیوں کی نوک پر معلق شبنم کے لرزتے قطروں کو پہلی بار حیرت سے تکتا تھا...اگرچہ موسم بیت چکے تھے لیکن اب بھی املتاس کے اگرچہ مُرجھائے ہوئے کچھ پھول تھے جو چینی لالٹینوں کی مانند ہوا میں جھولتے تھے..اور تب املتاس کے

ایک درخت کے زرد چہروں میں سے ایک پرندہ اڑا اور میں نے آج تک ایسا خوش رنگ اور خوش نظر پرندہ دیکھا نہ تھا اور وہ پھڑ پھڑاتا ہوا میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا اور میں نے رب کا شکر ادا کیا جس نے مجھے تختے سے اٹھایا، مجھے پھر سے سانس کی ڈور عطا کی تا کہ میں اپنی زندگی کی پتنگ اس ڈور سے باندھ کر پھر سے اسے آسمانوں پر اڑائے چلا جاؤں..تھینک یوں اللہ میاں!..یہ میری دوسری پیدائش کا پہلا دن تھا..

پارک کے ایک شناسا ہیں کرنل عامر..کچھ برس پہلے وہ آپریشن ٹیبل پر لیٹے تو بس لیٹے ہی رہے، تقریباً نو گھنٹے سرجن حضرات نے ان کے بدن میں جتنے بھی آلات تھے اور ان میں سے بیشتر زنگ آلودہ ہو کر تھم جانے کو تھے، اُن کی حیات کی گھڑی کی ٹِک ٹِک رُک رُک جاتی تھی، تو سرجن حضرات نے اِن کل پرزدوں کو رواں کرنے کی پوری کوشش کی، جو چیرا تو وہاں بہت کام رفو کا نکلا..لیکن رفو کرتے ہی ٹانکے ادھڑ ادھڑ جاتے یہاں تک کہ گھر والوں سے کہا گیا کہ اب دعاؤں سے بھی کچھ حاصل حصول نہیں، صداؤں سے بھی کچھ فائدہ نہیں، انہیں لے جائیے اور پھر کرنل صاحب کی حیات کی گھڑی معجزانہ طور پر پھر سے ٹک ٹھک کرنے لگی، سوئیاں پھر سے حرکت میں آ گئیں اور وہ جی اٹھے..اور اب ان کے بال بچے ان کی سالگرہ اُس روز مناتے ہیں جس تاریخ کو وہ نو گھنٹے بے ہوش رہنے اور سرجن حضرات کی تگ و دو سے پھر سے زندہ ہو گئے تھے..اگرچہ ان کی نسبت میرے آپریشن تو محض کھیل تماشے تھے لیکن..یہ میری بھی دوسری پیدائش کا دن تھا جب میں صحت یاب ہونے پر ماڈل ٹاؤن پارک میں تقریباً دو ماہ کے وقفے کے بعد داخل ہوا اور پھر میں نے اپنی زندگی کا پہلا پرندہ دیکھا املتاس کا پہلا زرد پھول دیکھا جو ایک بھنبھیری کی مانند گھومتا، جیسے وہ بانو قدسیہ کے سفید بالوں میں زرد سنگھار ہو گیا تھا، ایسے میرے سفید بالوں میں اٹک گیا تھیک یو اللہ میاں..اگرچہ جناح باغ اور ماڈل ٹاؤن پارک کے سوا میں متعدد بار ریس کورس پارک میں بھی سویر کی سیر کے لیے جا چکا ہوں اور اس پارک کی دلفریبی اور دلکشی کا کچھ حساب نہیں اور اِن میں ایک دھند میں دھندلاتی سویر ایسی تھی کہ اس کی سیال سفیدی میں سے شاندار بدنوں والے، جن کی کنوتیاں چوکنی تھیں اور وہ اپنی گھنی دُموں کو مور چھلوں کی مانند جھلاتے تھرتھراتے تھے، درجنوں گھوڑے ظاہر ہوتے چلے گئے تھے اور میں نے نیلی خانہ بدوش آنکھوں میں اُنہیں عکس ہوتے دیکھا تھا..اس کے باوجود ریس کورس پارک میرے لیے بقیہ دونوں باغوں کی نسبت ایک عشق خاص نہیں ہو سکتا..جناح باغ اور ماڈل ٹاؤن پارک میرے دائمی محبوب ہیں اور ریس کورس پارک..ایک عارضی نوعیت کی، کبھی کبھار ملاقات کرنے والی ہری بھری پھولوں بھری، گھوڑوں والی مٹیار ہے..

ماڈل ٹاؤن پارک کے باغ بہاراں چہرے کے گرد سیر کرنے والوں کے لیے جوٹریک یا راستہ ہے، ڈھائی کلومیٹر پر محیط ہے..میں ہمیشہ مرکزی دروازے میں سے داخل ہو کر بائیں جانب کے راستے پر رواں ہو جاتا ہوں..اور اس راستے میں بہت سے خوش نظر اور خوشبودار مقام آتے ہیں..گلاب کے پھولوں کے وہ تختے

جو سارا سال ٹنڈ منڈ اور بدنما ہوتے ہیں یکدم چند روز کے لیے کھل اٹھتے ہیں اور میں اکثر اپنا راستہ بدل کر ان کی گلابی مہکار کے درمیان چلنے لگتا ہوں..اور پھر کسی ایسی جھاڑی کے قریب رُک جاتا ہوں جو پھولوں کے بوجھ سے دوہری یوں ہوئی جاتی ہے جیسے کسی بجی سے اپنے جوبناں کا بھار سنبھل نہیں پاتا..میں کن اکھیوں سے ادھر اُدھر دیکھتا ہوں کو کوئی دیکھ تو نہیں رہا اور پھر اپنے ہونٹ کسی زرد گلاب کے چہرے پر رکھ دیتا ہوں جو اوس سے بھیگا ہوتا ہے اور اُس کی تراوٹ میرے ہونٹوں کی پژمردگی کو تروتازگی سے سرشار کر دیتی ہے..میں اُس گلاب کی چند پتیاں ہونٹوں سے نوچ کر اُنہیں گل قند کی مانند باقاعدہ کھا جاتا ہوں..اور پھر کسی اور پھول پر اپنی آنکھوں رکھ کر اُس پر لرزتی شبنم کو اپنے پپوٹوں پر محسوس کرتا بے وجہ مسکرانے لگتا ہوں..یہ جنوں کے آثار نہیں تو اور کیا ہے..

ان گلاب کیاریوں کے جُھرمٹ کے پہلو میں شرینہہ کا ایک بہت قد آور اور وسیع گھیرے والا شجر کھڑا ہے..اکثر ٹنڈ منڈ کھڑا رہتا ہے اور پھر اُس کے سوکھے پن میں سے کونپلیں پھُوٹتی ہیں، پتے نمودار ہوتے ہیں اور پھر وہ زرد رنگت کے نازک پھول کھلتے ہیں، باریک دھاگوں سے کاڑھے ہوئے، اتنے نازک کہ پل دو پل میں مرجھا جائیں اور اُن کی مہک ایسی کہ جس میں پنجاب کی مٹی اور اس کے دریاؤں کے بہاؤ کی روانی گھلتی جاتی ہو..

میاں محمد صاحب نے اس شجر شرینہہ کے بارے میں ایک زرد رنگت کی تصویر، شعر کی صورت میں پینٹ کی ہے..

وِچھڑ گیاں دی کیہہ اے نشانی۔ جویں ڈیگر رنگ شرینہاں۔

اپنے محبوب سے بچھڑ جانے والوں کو پہچان جانے کی نشانی کیا ہے، ان کے چہرے ایسے زرد ہوتے ہیں جیسے بہ وقت غروب شرینہہ کے شجر کے پتے ہوتے ہیں..

ذرا چلتے جائیے..

موتیے کی جھاڑیوں کا ایک انبار ہے..خواتین پھول توڑ کر انہیں اپنے کانوں اور بالوں میں سجاتی ہیں..میری امی جب کبھی لبرٹی پارک میں سیر کر کے گھر آتیں تو ان کے ساتھ موتیے کی مہک چلی آتی..ان کے کانوں میں ہمیشہ موتیے کے پھول سجے ہوتے..

ذرا آگے ''بیلے'' کی جھاڑیوں کی سرسبز دیواریں ہیں..اور یہ اپنے موسموں میں سفید اگرچہ بے مہک پھولوں سے ڈھک جاتیں، دور سے گمان ہوتا کہ وہ برف کی سفیدی میں روپوش ہیں..

میں ماڈل ٹاؤن پارک کے موروں کا تذکرہ بہت کر چکا جو گھٹا گھنگھور ہونے لگے شور مچانے لگتے ہیں..

ایک درخت کے زرد چہروں میں سے ایک پرندہ اڑا اور میں نے آج تک ایسا خوش رنگ اور خوش نظر پرندہ دیکھا نہ تھا اور وہ پھڑ پھڑاتا ہوا میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا اور میں نے رب کا شکر ادا کیا جس نے مجھے تختے سے اٹھایا، مجھے پھر سے سانس کی ڈور عطا کی تا کہ میں اپنی زندگی کی پتنگ اس ڈور سے باندھ کر پھر سے اسے آسمانوں پر اڑائے چلا جاؤں.. تھینک یوں اللہ میاں!.. یہ میری دوسری پیدائش کا پہلا دن تھا..

پارک کے ایک شناسا ہیں کرنل عامر.. کچھ برس پہلے وہ آپریشن ٹیبل پر لیٹے تو بس لیٹے ہی رہے، تقریباً نو گھنٹے سرجن حضرات نے ان کے بدن میں جتنے بھی آلات تھے اور ان میں سے بیشتر زنگ آلود ہو کر ختم جانے کو تھے، اُن کی حیات کی گھڑی کی ٹِک ٹِک رُک رُک جاتی تھی، تو سرجن حضرات نے اِن کل پرزدوں کو رواں کرنے کی پوری کوشش کی، جو چیرا تو وہاں بہت کام رفو کا نکلا.. لیکن رفو کرتے ہی ٹانکے ادھڑ ادھڑ جاتے یہاں تک کہ گھر والوں سے کہا گیا کہ اب دعاؤں سے بھی کچھ حاصل حصول نہیں، صداؤں سے بھی کچھ فائدہ نہیں، انہیں لے جائیے اور پھر کرنل صاحب کی حیات کی گھڑی معجزانہ طور پر پھر سے ٹک ٹھک کرنے لگی، سوئیاں پھر سے حرکت میں آ گئیں اور وہ جی اٹھے.. اور اب ان کے بال بچے ان کی سالگرہ اُس روز مناتے ہیں جس تاریخ کو وہ نو گھنٹے بے ہوش رہنے اور سرجن حضرات کی تگ و دو سے پھر سے زندہ ہو گئے تھے.. اگرچہ ان کی نسبت میرے آپریشن تو محض کھیل تماشے تھے لیکن.. یہ میری بھی دوسری پیدائش کا دن تھا جب میں صحت یاب ہونے پر ماڈل ٹاؤن پارک میں تقریباً دو ماہ کے وقفے کے بعد داخل ہوا اور پھر میں نے اپنی زندگی کا پہلا پرندہ دیکھا املتاس کا پہلا زرد پھول دیکھا جو ایک بھنبھیری کی مانند گھومتا، جیسے وہ بانو قدسیہ کے سفید بالوں میں زرد سنگھار ہو گیا تھا، ایسے میرے سفید بالوں میں اٹک گیا، تھینک یو اللہ میاں.. اگرچہ جناح باغ اور ماڈل ٹاؤن پارک کے سوا میں متعدد بار ریس کورس پارک میں بھی سویر کی سیر کے لیے جا چکا ہوں اور اس پارک کی دلفریبی اور دلکشی کا کچھ حساب نہیں اور اِن میں ایک دھند میں دھندلاتی سویر ایسی تھی کہ اس کی سیال سفیدی میں سے شاندار بدنوں والے، جن کی کنوتیاں چوکنی تھیں اور وہ اپنی گھنی دُموں کو مور چھلوں کی کی مانند جھلاتے تھرتھراتے تھے، درجنوں گھوڑے ظاہر ہوتے چلے گئے تھے اور میں نے نیلی خانہ بدوش آنکھوں میں اُنہیں عکس ہوتے دیکھا تھا.. اس کے باوجود ریس کورس پارک میرے لیے بقیہ دونوں باغوں کی نسبت ایک عشق خاص نہیں ہو سکتا.. جناح باغ اور ماڈل ٹاؤن پارک میرے دائمی محبوب ہیں اور ریس کورس پارک.. ایک عارضی نوعیت کی، کبھی کبھار ملاقات کرنے والی ہری بھری پھولوں بھری، گھوڑوں والی مٹیار ہے..

ماڈل ٹاؤن پارک کے باغ بہاراں چہرے کے گرد سیر کرنے والوں کے لیے جوگر یک یا راستہ ہے، ڈھائی کلومیٹر پر محیط ہے.. میں ہمیشہ مرکزی دروازے میں سے داخل ہو کر بائیں جانب کے راستے پر رواں ہو جاتا ہوں.. اور اس راستے میں بہت سے خوش نظر اور خوشبودار مقام آتے ہیں.. گلاب کے پھولوں کے وہ تختے

جو سارا سال ٹنڈ منڈ اور بدنما ہوتے ہیں یکدم چند روز کے لیے کھل اٹھتے ہیں اور میں اکثر اپنا راستہ بدل کر ان کی گلابی مہکار کے درمیان چلنے لگتا ہوں..اور پھر کسی ایسی جھاڑی کے قریب رُک جاتا ہوں جو پھولوں کے بوجھ سے دوہری یوں ہوئی جاتی ہے جیسے کسی بجنی سے اپنے جوبناں کا بھار سنبھل نہیں پاتا..میں کن اکھیوں سے ادھر اُدھر دیکھتا ہوں کو کوئی دیکھ تو نہیں رہا اور پھر اپنے ہونٹ کسی زرد گلاب کے چہرے پر رکھ دیتا ہوں جو اوس سے بھیگا ہوتا ہے اور اُس کی تراوٹ میرے ہونٹوں کی پژمردگی کو تروتازگی سے سرشار کر دیتی ہے..میں اُس گلاب کی چند پتیاں ہونٹوں سے نوچ کر اُنہیں گل قند کی مانند باقاعدہ کھا جاتا ہوں..اور پھر کسی اور پھول پر اپنی آنکھوں رکھ کر اُس پر لرزتی شبنم کو اپنے پپوٹوں پر محسوس کرتا بے وجہ مسکرانے لگتا ہوں..یہ جنوں کے آثار نہیں تو اور کیا ہے..

ان گلاب کیاریوں کے جُھرمٹ کے پہلو میں شرینہہ کا ایک بہت قدآور اور وسیع گھیرے والا شجر کھڑا ہے..اکثر ٹنڈ منڈ کھڑا رہتا ہے اور پھر اُس کے سوکھے پن میں سے کونپلیں پُھوٹتی ہیں، پتے نمودار ہوتے ہیں اور پھر وہ زرد رنگت کے نازک پھول کھلتے ہیں، باریک دھاگوں سے کاڑھے ہوئے، اتنے نازک کہ پل دو پل میں مرجھا جائیں اور اُن کی مہک ایسی کہ جس میں پنجاب کی مٹی اور اس کے دریاؤں کے بہاؤ کی روانی گھلتی جاتی ہو..

میاں محمد صاحب نے اس شجر شرینہہ کے بارے میں ایک زرد رنگت کی تصویر، شعر کی صورت میں پینٹ کی ہے..

وچھڑ گیاں دی کیہہ اے نشانی۔ جویں ڈیگر رنگ شرینہاں۔

اپنے محبوب سے بچھڑ جانے والوں کو پہچان جانے کی نشانی کیا ہے، ان کے چہرے ایسے زرد ہوتے ہیں جیسے بہ وقت غروب شرینہہ کے شجر کے پتے ہوتے ہیں..

ذرا چلتے جائیے..

موتیے کی جھاڑیوں کا ایک انبار ہے..خواتین پھول توڑ کر انہیں اپنے کانوں اور بالوں میں سجاتی ہیں..میری امی جب کبھی لبرٹی پارک میں سیر کر کے گھر آتیں تو ان کے ساتھ موتیے کی مہک چلی آتی..ان کے کانوں میں ہمیشہ موتیے کے پھول سجے ہوتے..

ذرا آگے ''بیلے'' کی جھاڑیوں کی سرسبز دیواریں ہیں..اور یہ اپنے موسموں میں سفید اگرچہ بے مہک پھولوں سے ڈھک جاتیں، دور سے گمان ہوتا کہ وہ برف کی سفیدی میں روپوش ہیں..

میں ماڈل ٹاؤن پارک کے موروں کا تذکرہ بہت کر چکا جو گھٹا گھنگھور ہونے لگے شور مچانے لگتے ہیں..

مُجھ سے پوچھیے کہ میں صبح کی سیر کے دوران اس ٹریک پر چلتا کس کا منتظر رہتا ہوں، نہ کسی گلشن کے پُھولوں کا نہ کسی گُل وگلزار کا، نہ کسی متناسب بدن کی جوگنگ کرتی مقامی یا چینی دوشیزہ کا.. میں منتظر رہتا ہوں چار عدد اُلوؤں کا.. ٹریک کے کناروں پر ایک بے نام سا سُوکھی ٹہنیوں والا ایک شجر ہے، اُس کی جانب کوئی نگاہ نہیں کرتا، صرف میں کرتا ہوں کہ اُس میں میرے اُلّو رہتے ہیں اور شاید وہ بھی میرے منتظر رہتے ہیں، میں رُک جاتا ہوں اور ہر شاخ پر اُلّو نہیں بیٹھا ہوتا بلکہ ایک ہی شاخ پر پورے چار اُلّو بیٹھے ہوتے ہیں، وہ دلّی کے ایک قدیم مُغل کھنڈر میں بسیرا کرنے والے اُلّو کی مانند سنہری نہیں ہیں، بھورے رنگ کے عام سے "فارم آ وَل" ہیں لیکن وہ مجھے خوش کر دیتے ہیں، مجھے دیکھ کر وہ بھی خوش تو ہوتے ہیں لیکن کچھ ہراساں بھی ہوتے ہیں اور آنکھیں گھمانے کے علاوہ کچھ اٹھک بیٹھک کرتے ہیں یعنی پرواز کر جانے کی دھمکیاں دیتے ہیں..

ویسے اُلّو ایسا شاندار، شاہی وجاہت والا اور کوئی پرندہ نہیں.. کبھی کسی برفانی اُلّو کا سفید سراپا اور نیلی آنکھیں دیکھیے آپ شاہین وغیرہ کو بُھول جائیں گے.. یوں بھی یہ شاہین، ایک چیل یا گِدھ کی ذرا گلوری فائڈ شکل ہے.. یعنی ایک چیل کی چونچ تیکھی کر دو، پروں کو ذرا فراخ اور چمکیلے کر دو تو وہ شاہین ہو جائے گی، آپ کبھی غور کیجیے گا کہ چیل اور گدھ کی آنکھوں اور عقاب کی آنکھوں میں کچھ فرق نہیں ہوتا.. صرف علامہ اقبال کی شاعری کا فرق ہوتا ہے۔

اُلّو شاید اس لیے بھی مجھے پیارے لگتے ہیں کہ میرے کالموں کے ایک مجموعے کا نام "اُلّو ہمارے بھائی ہیں" ہے.. تو اپنے بھائیوں کو صبح سویرے ایک شاخ پر بیٹھا دیکھ کر کسے خوشی نہ ہو گی.. اور وہ بھی یک مشت چار اُلّو بھائی.. ویسے اس پارک میں جتنے بھی گل وگلزار ہیں اور اُلّو ہیں وہ اپنی جگہ.. لیکن اس پارک میں اگر گلبرگ سے منتقل ہو کر ڈیفنس میں چلا آیا ہوں اور ایک طویل فاصلہ طے کر کے ہر سویر پہنچ جاتا ہوں تو نہ املتاس، گلاب، موتیے اور بیلے کے پھولوں کے لیے، نہ موروں کی چاہت میں اور نہ ہی چار اُلّوؤں کے لیے اتنے کشٹ کاٹتا ہوں، میں یہاں اپنے یاروں کے لیے آتا ہوں..

؎ باغ بہاراں تے گلزاراں بِن یاراں کس کاری



''تکیہ تارڑ..اور موروں والی آسیب زدہ حویلی''

جیسے امیر خسرو کو خبر ملی تھی کہ آج شب اُن کا محبوب آ رہا ہے..خبرم رسید امشب کہ نگار خواہی آمد..
ایسے ہی مجھے بھی خبر ملی کہ میرے جو نگار ہیں، میرے جو محبوب ہیں، میرے جو پڑھنے والے اور مجھ سے الفت کرنے والے متاثرین ہیں وہ سب شہر لاہور کی ایک قدیم حویلی میں جمع ہو رہے ہیں، لاہور کے علاوہ دیگر دور دراز کے شہروں سے آنے والے نگار ''تکیہ تارڑ'' کا اہتمام کر رہے ہیں..زندگی کی سب سویروں میں ماڈل ٹاؤن پارک میں سیر کے بعد میں ایک سایہ دار گوشے میں چند دوستوں کے ہمراہ کچھ دیر بیٹھتا تھا، زمانں کے ستم اور جہانوں کے غم ان دوستوں کی رفاقت میں کچھ دیر کے لیے بھولتا تھا تو ایک خالص لاہوری بابے مجید بھٹی حال مقیم کینیڈا نے اس بیٹھک مقام کو ''تکیہ تارڑ'' کا نام دیا..جیسے شہر لاہور میں..تکیہ تاجے شاہ، تکیہ شاہ ولی..تکیہ پہلواناں یا تکیہ میراثیاں وغیرہ ہوا کرتے تھے..اس تکیے میں بھی پہلوان، شاہ، میراثی وغیرہ اپنی اپنی خصلت، مزاج اور فراخدلی کے حوالے سے پائے جاتے تھے..یہ نام چل نکلا..جب اس بیٹھک میں بھیڑ بہت ہونے لگی، ناروا نوعیت کے لوگ آنے لگے، پیار کی بجائے کاروبار کی باتیں ہونے لگیں تو میں نے ذرا دُوری اختیار کی، پارک کے ایک گھنے شجر تلے منتقل ہو گیا اور اُسے اپنا تکیہ کر لیا..

چند برس پیشتر امریکہ میں مقیم عاتف فرید نے میری بے خبری میں باقاعدہ قانونی تقاضے پورے کر کے میرے نام کی ایک ویب سائٹ..''ریڈرز ورلڈ'' قائم کی اور مجھے تب خبر ہوئی جب اس کے اراکین کی تعداد دس ہزار سے تجاوز کر گئی اور یہ سب لوگ اپنا تعارف متاثرین تارڑ کے طور پر کرواتے تھے..انہی لوگوں نے ''تکیہ تارڑ'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور نہایت باقاعدگی سے اس کے اجلاس منعقد ہونے لگے۔ ٹی ہاؤسوں، بند کمروں یا ریستورانوں میں نہیں کہ وہ سب بھی میری طرح آوارگی کے منشور پر یقین رکھتے تھے.... وہ قدرتی مناظر کی قربت میں، کبھی سمندر میں پنہاں کسی جزیرے میں، کبھی ہڑپہ کے کھنڈروں اور کبھی کسی بلند برفانی پہاڑ کی چوٹی پر اور کبھی کسی پرانی حویلی، حویلی نونہال سنگھ میں اور کبھی دریائے راوی کے کناروں پر کامران کی بارہ دری میں جمع ہوتے اور میری باتیں کرتے، میری تحریروں کے اقتباس پڑھتے یہاں تک کہ وہ ایک خاندان ہو گئے....اور یہ ایک انوکھا خاندان تھا جو میری کتابوں کے بندھنوں میں بندھا ہوا تھا..یہ رسم چل

نکلی تو پاکستان سے باہر نکل گئی۔ کینیڈا کے شہر کیلگری میں، وہاں کی پبلک لائبریری میں، جس کی شیلفوں پر میری بہت کتابیں سجی ہیں، وہاں ''تکیہ تارڑ'' کا اہتمام ہوا۔ یہاں تک کہ ٹورنٹو میں ایک خاتون نعمانہ نے بیسویں منزل پر واقع اپنے وسیع فلیٹ میں اپنے خاوند اور میری کتابوں کی رفاقت میں ''تکیہ تارڑ'' کی محفل سجائی اور یوں سجائی کہ انہوں نے ریڈرز ورلڈ کے اراکین کی بڑی بڑی تصویریں ایک آرٹ گیلری کی مانند اپنے فلیٹ میں آویزاں کیں، ظاہر ہے انہوں نے میری تصویروں کی نمائش بھی کی اور یوں صرف تصویروں کی رفاقت میں، میری تحریریں پڑھتے ہوئے تکیہ تارڑ کا میلہ لگا لیا۔ خبر یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں بھی آئندہ ماہ ایک افسانہ فورم کے تحت ''تکیہ تارڑ'' کا ایک بین الاقوامی اجلاس کیا جا رہا ہے۔۔

میری اس تحریر میں خودنمائی کا شائبہ تو ہوگا، شک تو ہوگا کہ میں اپنی ڈفلی خود ہی بجا رہا ہوں اور اس میں کچھ صداقت بھی ہے کہ اگر اس نوعیت کی بے خود اور بے لوث پذیرائی میرے نصیب میں آئی ہے تو میں کیوں اس کا چرچا نہ کروں۔۔ اور میں یہ چرچا اس لیے بھی کرتا ہوں تاکہ اُن ہزاروں لوگوں کو خراج تحسین پیش کر سکوں جنہوں نے ایک ادیب کی پذیرائی کی، اُن کا شکریہ تو ادا کرنا چاہیے....اور یُوں ہمارے ہاں جو ادبی مغالطے ہیں کہ اس ملک میں ادیب کی قدر نہیں ہوتی، ایک تخلیق کار کی زندگی میں اُس کی کاوشوں کی توصیف نہیں ہوتی تو میں ان مغالطوں کی نفی کر سکوں....میری قدر تو میری اوقات سے بڑھ کر ہوئی، مجھے تو ناقدری کی کُچھ شکایت نہیں بلکہ شکایت ہے کہ بے جا قدر بہت ہوئی۔۔ اتنی قدر ہوئی کہ میں ان دنوں شرمندہ شرمندہ سا رہتا ہوں۔۔

تو جب مجھے امیر خسرو کی مانند خبر ملی کہ میرے محبوب اور نگار، شہر لاہور کی ایک قدیم حویلی میں ''تکیہ تارڑ'' آباد کر رہے ہیں تو میرا جی چاہا کہ میں اس لیے اس محفل میں شریک ہو جاؤں کہ یہ گوپال چند کی اُس شاندار سہ منزلہ عظیم محرابوں والی حویلی میں منعقد ہو رہی تھی جس کی قدامت اور عجائبات کے میں نے بہت قصے سنے تھے۔۔ اس سے پیشتر میں ''تکیہ تارڑ'' کی کسی بھی محفل میں شریک نہیں ہوا تھا کہ اُلفت کی بُلبلیں دُور سے کُوکتی اچھی لگتی ہیں، اُن کے درمیان جا بیٹھنا اور اپنی تحریروں کی کُوک سننا، وہی شرمندگی کا باعث ہوتا ہے۔۔ اگر میں نے اس محفل میں شریک ہونے کا وعدہ کر لیا تو صرف اس لیے کہ مجھے لاہور کی اس کتاب کے لیے ایک اور حویلی کے نقشِ کُہن دیکھنے کا موقع مل جائے گا، اُس کی قدامت کو اپنی تحریر میں محفوظ کرنا نصیب میں آ جائے گا۔۔

یہ اویس میر کی حویلی تھی۔۔

اور ہاں۔۔ اس کے سوا، ایک اور کشش بھی تھی، کچھ مور تھے، جو شاید میرے من کے مور تھے جنہوں نے مجھ پر جادو ڈالا تھا اور وہ مور تحصیل بازار کی ایک آسیب زدہ حویلی کی چھت پر ٹہلتے تھے....ایک متروک شدہ

حویلی، شہر لاہور کی ہیرا منڈی کی ایک گلی میں، بازار حکیماں کی ایک گلی میں.... مجھے اُس حویلی کا کھوج لگانا تھا..
کیا پتہ وہ میرے ناول ''بہاؤ'' کے وہ مور ہوں جو دریائے سرسوتی کے پار موت کی علامت کے طور پر می آؤں، می آؤں کرتے تھے..وہ مور ہوں جو ''خس وخاشاک زمانے'' کے بخت جہان کے صحن میں ایک چاندنی شب میں نمودار ہو گئے تھے..اور اُس نے اُنہیں کُڑی یہاوے مور کا خطاب دیا تھا کہ وہ بھی اُس کی موت کی منادی کرنے آئے تھے..عین ممکن ہے کہ برسوں پہلے ایک سویر جب میں اپنے صحن میں داخل ہوا تو وہاں گلبرگ کی گھنی آبادیوں کے درمیان وہ جو ایک مختصر صحن تھا وہاں گُل بوٹوں کے پس منظر میں، آئیوی سے ڈھکی سبز دیوار کے پس منظر میں ایک مور کھڑا تھا، مجھے حیرت سے تکتا تھا..وہ کہیں سے ایک لمبی اُڑان کر کے میری صحن میں آ اُترا تھا، گھر کا رستہ بُھول گیا تھا..اور جب اگلے روز اُس کے مالک اُسے تلاش کرتے میرے گھر دستک دیتے تھے، اُس کی نشانیاں بتاتے تھے تو میں نے بادل نخواستہ وہ مور واپس کر دیا..عین ممکن ہے کہ وہی مور لاہور کی اُس قدیم حویلی کی چھت سے اڑان کرتا میرے صحن میں اترا ہو تو اُس بچھڑ چکے مور سے ملاقات کرنی چاہیے، ہو سکتا ہے وہ مجھے پہچان لے، مجھے دیکھ کر اتنا پُرمسرت ہو کہ میرے گرد ناچنے لگے..اور ہاں ایک اور مور جو کاسبو کے قصبے میں، رام مندر کے ایک پیڑ پر براجمان یکدم اڑان کر کے ایک اور شجر کی سُوکھی ٹہنی پر جا بیٹھا تھا اور وہ اڑان کے دوران جہاں جہاں سے گزرا تھا وہاں اپنے کچے رنگوں کے لہریے چھوڑ گیا تھا..کیا جانئے وہی مور.. اپنے تھر کے صحرا کو چھوڑ کر لاہور آ نکلا ہو..تو اتنے مور تھے اور ایسے مور تھے جن سے میں نے ملاقات کرنی تھی..

پانی والے تالاب کے قریب، لاہور میں سب سے پہلے قائم ہونے والے پُرتگالی چرچ کے سامنے والی تنگ گلی میں اویس میر کی حویلی کی چوبی بالکونیاں گلی کی نیم تاریکی میں سے بلند ہوتی شہر لاہور پر برستی گرم دھوپ میں نمایاں ہوتی تھیں..

حویلی کے باہر نہ صرف میر صاحب تھے، تنومند اور خوش لباس بلکہ ریڈرز ورلڈ کے وہ اراکین بھی منتظر تھے جو دور کے شہروں سے صرف ''تکیہ تارڑ'' میں شمولیت کے لیے آئے تھے..ساہیوال، میانوالی، ڈسکہ، دادو اور جانے کہاں کہاں سے.. باہر شہر لاہور تھا جو آج تھا، پُرشور اور بدذائقہ ہوتا ہوا اور حویلی کے اندر داخل ہوا تو وہاں وہ قدیم لاہور تھا جو ہم سے کب کا بچھڑ چکا..کیسی شاندار قدیم محرابیں ہم پر جھکتی تھیں..عجب کھڑکیاں اور آرائشیں تھیں، دیواروں پر مدھم پڑتی تاریخی تصویریں آویزاں تھیں، ہتھیار اور ظروف سجے تھے، لاہور کی ایسی متروک شدہ حویلیوں کی نیم تاریکی میں مجھے ہمیشہ ان لوگوں کے سسکیاں بھرتے سانس ٹھہرے ہوئے محسوس ہوتے جو یہاں کے مکین تھے اور تقسیم کے نتیجے میں مجبوراً یہ گھر چھوڑ گئے..انہیں قلق تو ہوا ہوگا، ایسی شاندار قدامت کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ جانا کتنا بڑا دُکھ ہوگا جو ہم کہاں محسوس کر سکتے ہیں..گراؤنڈ فلور پر بلند محرابوں اور ایک دل کش چھت کے نیچے اور مجھے محسوس ہوا کہ اُس چھت میں کہیں پرندوں کے گھونسلے ہیں،

کبوتروں کی غٹرغوں سنائی دے رہی تھی، شاید یہ کبوتر بھی پرانے زمانوں کے ہیں، اپنے آبائی مالکوں کی یاد میں نوحہ کرتے ہیں، وہاں بوسیدگی اور پرانے پن کی مہک تھی اور وہ الماریوں میں سجے کانسی کے قدیم ظروف، بوسیدہ اور بُھرتے ہوئے دروازوں کے منقش کواڑوں، جھولوں، تخت پوشوں، قلمدانوں اور ان میں خشک ہو چکی سیاہی میں سے اٹھتی تھی، یہ مہک رنجیدگی اور جُدائی کی تھی..ایک جھروکے میں ہمارے لیے ایک پرانی نشست گاہ کا اہتمام تھا اور اُس کے عقب میں طارق عزیز کا ڈیزائن کردہ تکیہ تارڑ کا ایک پوری دیوار پر محیط پوسٹر تھا جس میں میری تصویر کے علاوہ ''لاہور لاہور ہے'' درج تھا..میرے ہمراہ میرے یار دوست دائیں بائیں تشریف رکھتے تھے..ذکاء الرحمٰن ایک بڑا اور نایاب افسانہ نگار..''دھنک'' والا سرور سکھیرا..سرفراز ملک، تنویر خواجہ، ڈاکٹر نسیم..وہاں چینی آنکھوں والی لُبنیٰ کیک والی لڑکی بھی تھی جو ''تکیہ تارڑ'' کو ایک کیک کی صورت تخلیق کر کے لائی تھی اور وہاں آصف گُجر، اپنے دو تین تنومند دوستوں اور نائیوں کے ہمراہ میرے پروٹوکول میں متحرک ہوتا تھا..

''تکیہ تارڑ کا اجلاس اختتام کو پہنچا..تو میر صاحب ہمارے راہنما ہو گئے، اپنی حویلی کے بام و در سے آگاہ کرنے لگے..مجھ میں سکت تو نہ تھی پر مجھ میں اشتیاق بہت تھا، ہوس بہت تھی کہ ذرا دیکھوں تو سہی کہ بالائی منزلوں پر کیسے کیسے ٹھہر چکے قدیم موسم ہیں، میں دوستوں کے سہارے چڑھتا گیا اور اگلے روز بہت پچھتایا کہ میری ٹانگوں کے پٹھے اکڑ چکے تھے بلکہ الو کے پٹھے ہو چکے تھے، چلا نہ جاتا تھا..اشتیاق اور حرص کی یہی تو سزائیں ہیں، آپ اپنے بدن کے زوال کو فراموش کر دیتے ہیں، پھنّے خاں ہو جاتے ہیں کہ میں بھلا اس بلندی کو کہاں خاطر میں لاتا ہوں، چڑھ جاؤں گا، سامان والے گدھے چڑھے جا رہے ہیں تو میں کیوں نہیں چڑھ سکتا، کیا میں کسی گدھے سے کم ہوں..امریکہ میں ایک چٹانی کھوہ کے برابر میں ایک ندی بلندی سے اترتی تھی اور چٹانوں میں کُھدا ایک پُرپیچ راستہ بلندی تک جاتا تھا، کم از کم تین سو سیڑھیاں تھیں جو فلک تک اُٹھتی تھیں..مجھے منع کیا گیا کہ بابا جی باز آ جاؤ..بابا جی باز نہ آئے اور پوری تین سو سیڑھیاں چڑھ گئے..ازاں بعد پورے تین دن ہائے ہائے کرتے رہے، میر صاحب نے مہربانی کی کہ تکیہ تارڑ کے لیے اپنی حویلی کو مفت میں فراہم کر دیا ورنہ وہ ہمیں ذہن نشین کرواتے تھے کہ یہاں نہ صرف محفلیں ہوتی ہیں بلکہ ٹیلی ویژن کے ڈرامے بھی شُوٹ ہوتے ہیں اور بھاری معاوضے کے عوض شُوٹ ہوتے ہیں.... یُوں اُن کا نوادرات جمع کرنے کا شوق اُن کے لیے منافع بخش بھی ثابت ہوتا ہے..ایک نیم تاریک کمرے میں پلاسٹک میں ملفوف چند قدیم دروازے دیواروں سے ٹیک لگائے آراستہ تھے..یقیناً وہ بہت دل کش قدیم بناوٹوں والے تھے..ہر ایک پہ دل آتا تھا اور میر صاحب نے نہایت لاپروائی سے بتایا کہ اس دروازے کے لیے ایک گورا ایک کروڑ روپے دیتا تھا، میں نے انکار کر دیا..مجھے شک ہے کہ یہ دروازے جنہیں میر صاحب کے شوق نے لاہور میں ڈھائی جانے والی پرانی حویلیوں کے ملبے میں سے دریافت کر کے خریدا، انہیں بعد ازاں بھی خریدا جاتا ہوگا..میر صاحب نے مجھے

ایک ایسی حویلی کے بارے میں بتایا جو انہوں نے خرید لی ہے البتہ مکمل قبضہ ابھی تک نہیں ہوا..

شنید ہے کہ وہ قدیم حویلیوں کے کھوجی ہیں، انہیں حاصل کر لیتے ہیں۔اس دوران آصف نے ایک نہایت انوکھا انکشاف کیا..اور وہ شہر لاہور کی رگ رگ سے واقف ہے..اس رگ میں کتنے افیونی اور چرسی ہیں، کتنے جھروکے اور کونسی متروک شدہ حویلیاں ہیں، کونسے اب کاٹھ کباڑ سے اندھے ہو چکے کنویں ہیں جہاں سے کبھی شہر لاہور کے معشوق پانی بھرا کرتے تھے، قبضہ گروپوں کے کیا سلسلے ہیں اور کونسے عظیم صوفی بزرگوں کے مزار ہیں جن میں کوئی بھی دفن نہیں ہے، محض قبضے کی خاطر یہ مزار وجود میں لائے گئے تھے تو آصف نے بتایا کہ حاجی صاحب، شہر لاہور میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو قدیم برتنوں، گھریلو سامان، دروازوں اور کھڑکیوں کی کھوج میں رہتے ہیں، انہیں حاصل کر کے اپنے گھروں کو عجائب گھر بناتے ہیں اور مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں، شہر کے جتنے بھنگی، چرسی، افیونی اور نشے باز ہیں اُن میں سے بیشتر اُن کے ''تنخواہ دار'' ہوتے ہیں..وہ انہیں نہ صرف افیون اور چرس وغیرہ مہیا کرتے ہیں بلکہ ایک آدھ کوٹھڑی رہائش کے لیے بھی عطا کر دیتے ہیں، ان عنایات کے معاوضے میں نشہ باز شہر میں گھومتے جھومتے نظر رکھتے ہیں کہ کونسا پرانا مکان یا حویلی گرائی جا رہی ہے..افغان لوگ اُسے مسمار کر کے وہاں جوتیوں کے کارخانے قائم کر رہے ہیں اور وہ اطلاع کر دیتے ہیں۔ یُوں شہر لاہور کے جھروکوں، دروازوں، کھڑکیوں اور پرانے ظروف ان منافع باز حضرات کی دسترس میں آ جاتے ہیں..حویلی کی گیلری کی پُر پیچ آرائش میں غور کرتے ہیں تو اُس کا نام کندہ ہے جو اس کا مالک تھا..''رام گوپال'' اسے قلق تو ہوا ہوگا اس حویلی کو چھوڑتے ہوئے..جیسے ڈنگا سنگھ بلڈنگ کو چھوڑتے ہوئے باوا ڈنگا سنگھ کی اولاد کو ہوا ہوگا..اسی حویلی کی قربت میں واقع ایک عظیم الشان رہائش گاہ کو ترک کرتے ہوئے بلاقی شاہ کو ہوا ہوگا..

جو اپنے خون پسینے کی کمائی سے ایک گھر، ایک حویلی تعمیر کرتے ہیں، صرف وہ جانتے ہیں کہ اسے مجبوراً چھوڑ جانا کیسا قلق ہوتا ہے..وہ کیا جانیں جو ان گھروں اور حویلیوں میں آ کر بیٹھ گئے، قابض ہو گئے کہ چھوڑ جانا کیسا قلق ہوتا ہے..

اولیس میر کی حویلی دراصل ایک گھر تھا، میر جی خود گارڈن ٹاؤن میں رہتے تھے، اس گھر میں نہ رہتے تھے، اگر بہ فرض محال ہمارا ایسا گھر ہوتا تو ہم نہ گلبرگ اور نہ ڈیفنس میں رہتے، ایسے گھر میں رہتے..

ہم باہر آئے، دوپہر کی کڑی دُھوپ میں آ گئے..

ایک ملنگ ڈفلی بجاتا..پھجے کی سری پائے کی دوکان کے عین سامنے دھوپ میں، مست مست..جھومتا تھا اور گرتا تھا..

میں نے اُسے ایک سٹور کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا، وہ ایک سرو قد چھریرے بدن کی نازک لڑکی تھی، وہ مجھ سے دور چلی جاتی تھی اور میں اُس کی پشت سے اندازہ لگاتا تھا کہ وہ کیسی سوہنی مٹیار ہوگی، وہ سٹور کے اندر گئی اور کب جب باہر آئی تو آئس کریم کھا رہی تھی، وہ لڑکی نہ تھی، ایک خواجہ سرا تھا پر بہت کشش آلود صورت والا تھا..

یہ جو علاقے ہیں، ہیرا منڈی، بازار حکیماں، چیت رام روڈ، ٹبی گلی اور تحصیل بازار والے، پاکستان بھر میں ان جیسے فراخ دل، ہر ایک کو قبول کرنے والے، چاہے اُس کی جنس کوئی بھی ہو اُن سب کو بنا کسی نفرت اور تضحیک کے اپنے برابر میں جگہ دینے والے، ایسے علاقے پاکستان بھر میں کہیں اور نہیں ہیں..

کسی بارات میں شامل ہونے کے لیے متعدد ''خواتین'' بنی ٹھنی، نہایت متانت سے چلی آ رہی ہیں اور ان میں سے کچھ ابھی ڈھلی نہیں ہیں، ابھی قبول صورت ہیں اور کوئی بھی انہیں حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا کہ یہ تو محلے والیاں ہیں....صبح سویرے پھجے کی دکان پر ایسی صورت آ بیٹھتی ہیں جن کے چہروں پر شبِ وصال کا کچھ اضمحلال نہیں، تر و تازہ سوہنی صورتیں اور کوئی بھی ان کی جانب اخلاقیات کے تیر نہیں پھینکتا، وہ اپنی ہیں، محلے والیاں ہیں....کہا تو یہی جاتا ہے کہ ہیرا منڈی کی مصنوعات کہیں اور منتقل ہو گئی ہیں، وہ جو بیچتے تھے دوائے دردِ دل وہ طبیب چلے گئے ہیں..جھانجھریں خاموش ہو چکی ہیں، طبلے پر آخری تھاپ پڑ چکی ہے اور سارنگیاں رو رو کر چپ ہو گئی ہیں، یہاں شرافت کا راج ہے جو شاید مقامی تھانیدار ہے..ایسا ہی ہوا ہے..پہلے زمانوں میں یہ ایک ایسا سُپر سٹور ہوا کرتا تھا جہاں گاہکوں کو وہ سب ''سامان'' اور ''خوراک'' مل جاتی تھی جو اُسے گھر میں نہ ملتا تھا، وہ اپنی حرص کے سامان اور ہوس کی خوراک اسی سٹور سے خرید لیتا تھا..بہر طور خریدار کو خصوصی طور پر اس علاقے میں آنا پڑتا تھا لیکن اب اُس کے لیے فقیہہ شہر نے آسانیاں پیدا کر دی ہیں..وہ جو ''مال'' تھے ''سامان'' تھے اور ''خوراک'' تھی، ممنوع قرار پائے تو اس سٹور کی درجنوں فرنچائز شاخیں شہر بھر میں کُھل گئیں، گاہکوں کے لیے آسانیاں پیدا ہو گئیں..اہلِ ہوس اور حضراتِ حرص کو اب اپنے محلوں میں ہی، گلبرگ، گارڈن ٹاؤن، جوہر ٹاؤن اور ڈیفنس ایسے محلوں میں ہی یہ سب ''سہولتیں'' دستیاب ہیں..لیکن وہ جنہیں تماشبین کا لقب دیا جاتا ہے، جو گائیکی، موسیقی اور کلاسیک رقص کے شائق تھے، یعنی ایک ذوق جمال رکھتے تھے وہ قدرے آزردہ ہو گئے کہ اُن کے لیے ہیرا منڈی کی اصل کشش وہ ماحول تھا جو صرف اس کی گلیوں میں شام کے ڈھلنے کے بعد اس کے کوٹھوں، بالکونیوں اور جھروکوں میں سے جنم لینے والی جھنکاروں اور سُریلی پکاروں سے جنم لیتا تھا..

اُن میں سے جھانکنے والے دعوتی چہروں کے پامال شدہ حسن سے پُھوٹتا تھا..موتیے کے ہار فروخت کرنے والے نشئی، کاندھے پر مولویوں ایسا صافہ ڈالے قابل فروخت اشیاء کی تشہیر کرتے ہوئے..روئی کے عطر میں بھگوئے ہوئے پھاہے کو آپ کے کانوں میں زبردستی اڑسنے والے عطر فروش..اور تماش بینوں کے سَرمدی قہقہے

اور بے خودی سے اُبلتی مسرتیں..اگرچہ ''ٹیک اوے'' اور ''ہوم ڈیلیوری'' کی سہولتیں تو حاصل ہو گئیں لیکن میکلوڈ روڈ کے سینماؤں کی رونق اور لاہوریوں کے میلے میں ''نشاط چانپ کارنر'' میں اپنی مرضی سے توے پر گردے کپورے اور چانپیں، سیاہ مرچ اور مکھن کے تڑکے سے بنوا کر اُنہیں مکھن سے لتھڑے ہوئے نانوں کے ساتھ کھانا اور بات ہے اور وہی خوراکیں اگر آپ کے گھر پہنچا دی جائیں تو وہ ماحول سے جُدا ہو کر ذائقہ تو نہ دیں گے.. یُوں جانئے کہ ہیرا منڈی کی وہ رونق بھری راتیں ایک فل ہارمونک آرکسٹرا کی مانند تھیں جس کی بلند آہنگ موسیقی آپ پر حاوی ہو کر آپ کو اُن درجنوں سازوں کا ہم نوا اور ہم ساز کر دیتی تھیں اور اب کوئی ایک وائلن یا بانسری آپ کے ہمسائے میں آ جاتی ہے، آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے تو وہ پورے آرکسٹرا کا ماحول تخلیق کیسے کر سکتی ہے..

اگر آپ اس نوعیت کی مخرب الاخلاق واہیاتیوں میں دلچسپی رکھتے ہیں تو براہ کرم شورش کاشمیری کی کتاب ''اُس بازار میں'' کا مطالعہ ضرور کیجئے..آغا صاحب اگرچہ اسلام کے سر بہ کف مجاہد تھے، عطاء اللہ شاہ بخاری کے پیروکار تھے، یقیناً پاک دامن تھے لیکن اس کے باوجود اور وہ مسلسل ہمیں اپنی پاک دامنی کا یقین دلاتے رہتے ہیں، انہوں نے کیا ہی لاجواب کتاب لکھی ہے، اس احتیاط کے ساتھ کہ کیچڑ میں چلتے ہوئے اُن کی پرہیز گاری کی چادر پر ایک چھینٹ بھی نہیں پڑا.. چونکہ ہمارے بزرگ ہیں اس لیے بزرگوں کی خطا کو پکڑنا بھی تو خطا ہوتی ہے..وہ ایک شورش پسند سیاسی ادیب اور شاعر تھے اور ان کی قادرالکلامی میں کچھ شک نہ تھا.. ''اُس بازار میں'' اُن کے کلام کی قدرت حیرت انگیز ہے..ان کی شاعری کی دیگ کے کچھ دانے ملاحظہ کیجئے۔

یہ کون ناچ رہی ہے بلند کوٹھے پر۔فضا میں تیر رہا ہے سرودِ چنگ و رباب ہر ایک بول ہے دامن کشِ شکیب وقرار۔شراب لاؤ کہ ہستی کا اعتبار نہیں صدائے منبر و محراب؟ اے خدا کی پناہ۔کہ یہ مے نغمۂ چنگ و رباب بہت ہے۔حرم فروش فقیہوں کے حوضِ کوثر سے۔مغنیہ کے لبوں کی شراب بہتر ہے۔..

''خرید و فروخت''

رات اس بازار میں ایک حوروش کی سیج پر۔
اِک فقیہ شہر کی ریشِ حنائی بِک گئی
دھن دھنا دھن کی صدا میں کھو گیا احساسِ زُہد۔
منبر و محراب کی شعلہ نوائی بِک گئی
بِک گئی بکنے کی شے تھی پارسائی بِک گئی

''ریشم میں ٹاٹ کا پیوند''

بسترِ سنجاب پر چودہ برس کی بیسوا۔ اِک بہتّر سال کے بڈھے سے ہم آغوش ہے
کہکشانی جسم بکتے ہیں بھرے بازار میں۔ بالا خانوں کی بُلندی معصیت بردوش ہے
اور..اس طُرفہ تماشے پر خدا خاموش ہے۔

آصف کے مختصر قامت گھٹے ہوئے پہلوانی بدنوں والے ہرکارے بھاگتے پھرتے تھے، اُن کا بس چلتا تو وہ دن کی روشنی میں بھی مشعلیں جلا کے غلاموں کی مانند میرے آگے آگے چلنے لگتے اور ''حاجی صاحب زندہ باد'' کے نعرے لگانے لگتے..اور وہ حاجی کون تھا، میں تھا..

ہیرامنڈی کے ''عارف ہوٹل'' کے تقریباً ایئر کنڈیشن ہال میں مخدوش صفائی والی میزوں پر دُنبے کے گوشت کی کڑاہی کے متعدد طشت سجتے گئے، چکن اور اوجھڑی گوشت اس کے سوا تھے، سب نے دوہائی دی کہ گوشت کے اتنے طشت کون کھائے گا..اور یقین کیجئے کہ ہم سب وہ کھا گئے، کڑاہیوں کو کھرچ کھرچ کے اُن کی سیاہی کو بھی کھا گئے..وہ گوشت اتنا خستہ اور عُمدہ ذائقے والا تھا..میں نے حسبِ معمول طے کر لیا کہ بد پرہیزی نہیں کرنی، گوشت کے چند قتلے اور ایک گرم روٹی..اپنے آپ کو محدود رکھنا ہے..لیکن وہ کڑاہی گوشت ایسا تھا کہ میری پرہیز گاری کو خس و خاشاک کی مانند بہا لے گیا اور میں بخوشی بہتا چلا گیا..کوئی میری طرح کے اخلاق باختہ بزرگ کیمسٹ کے ہاں گئے اور ویاگرا کی متعدد گولیاں طلب کیں، کیمسٹ نے کہا، بزرگو، انہیں کھا کر آپ مر جائیں گے تو انہوں نے کہا، بعد میں مریں گے ناں! تو میں نے بھی یہی منطق اختیار کی کہ کھاتے چلے جاؤ، کھانے کے بعد ہی مریں گے ناں!

خواجہ تنویر کو اُس کی بیگم کا سرزنش بھرا فون آ گیا ''تم کہاں ہو؟''

بجائے اس کے کہ تنویر کہتا کہ میں تو نوگزے کی قبر پر نوگز کا فاتحہ پڑھنے آیا ہوں، کہنے لگا ''ہیرامنڈی میں۔''

اُس کی بیگم کا سانس رُک گیا ''ہا ہائے۔ تم وہاں کیوں گئے ہو؟''

اس پر تنویر نے نہایت متانت سے کہا ''نہ تم مجھے رات کے وقت یہاں آنے کی اجازت دیتی ہو، اب دن کے ٹائم آیا ہوں تب بھی اعتراض کرتی ہو۔ تم چاہتی کیا ہو؟''

کامران اور عاطف کھاتے کم تھے اور تصویریں زیادہ اتارتے تھے..

جیسے کسی پارٹی میں ایک مکمل طور پر مخمور شدہ شخص، نشے میں ہونے کے باوجود اپنے حواس میں رہتا

ہے کہ ایک کونے میں تنہا بیٹھی ایک لڑکی پر اُس کا دل آ گیا ہے اور اُس نے بہر طور اُس سے رابطہ کرنا ہے، اُس کے قریب ہونے کی کوشش کرنی ہے.. اسی طور بے شک اور میں بھی تو شامل تھا، سب لوگ کڑاہی گوشت کی دُنبہ شراب سے مخمور ہو چکے تھے لیکن.. میرے گمان میں کوئی لڑکی نہ تھی، مور تھے..

وہ پرانی بوسیدہ حویلی تھی جس کی چھت پر مور رہتے تھے، مجھے تو کچھ خبر نہ تھی، یہ مجید شیخ کا روزنامہ ''ڈان'' میں باقاعدگی سے شائع ہونے والا ہفتہ وار کالم ''ہارکنگ بیک'' تھا جو ہر ہفتے مجھے قدیم لاہور کی داستانیں سناتا تھا، ایک شہرزاد کی مانند ہر ہفتے نئی حیرت انگیز کہانیاں سناتا تھا اور مجھے بہکاتا تھا.. اور اس ہفتے کہانی تھی ایک آسیب زدہ حویلی کی چھت پر ایک مدت سے قیام پذیر موروں کی.. آج سے گیارہ برس پیشتر شیخ مبارک نام کے ایک دکاندار نے تحصیل بازار میں مجید شیخ کو ایک آسیب زدہ، ویران ہو چکی حویلی کے بارے میں بتایا ''تحصیل بازار میں چلتے جاؤ، دائیں ہاتھ پر پہلی گلی میں مڑ جاؤ، رُک جاؤ، اوپر دیکھو اور پھر حویلی کے قدیم پھاٹک پر دستک دو..... شیخ مجید نے ان ہدایات پر عمل کیا.. اور جب انہوں نے اوپر دیکھا تو حویلی کی چھت پر تین مور ٹہل رہے تھے جو اُنہیں دیکھ کر شور مچانے لگے، مجید شیخ نے دستک دی، اندر سے کوئی جواب نہ آیا.. ایک راہگیر رُک گیا ''کیا تم پاگل ہو.. یہ گھر آسیب زدہ ہے، یہاں جو بھی رہائش کرے اُس کے بچے مر جاتے ہیں..'' مجید شیخ دروازہ دھکیل کر اندر چلے گئے.. حویلی کے اندر اس کی آرائش اور فرنیچر جوں کا توں تھا.. دھول آلود جیسے وہاں برسوں سے کوئی آیا نہ گیا، پھر کوئی عجب ہولناک آواز آئی جیسے اینٹیں گرتی ہوں، مور چیخنے لگے اور وہ گھبرا کر باہر آ گئے.. اس حویلی کے مکینوں نے کسی عامل کو بلایا، انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ حویلی پر جن آ گئے ہیں.. کہا جاتا ہے کہ عامل نے عمل کرتے ہوئے یکدم دوہائی مچا دی اور بھاگ نکلا.. جن قابض ہو گئے ہیں، اس حویلی سے نکل جاؤ ورنہ تمہارے بچے مر جائیں گے، سب لوگ نکل گئے لیکن.. ''ماما'' اپنے سات بیٹوں کے ہمراہ مقیم رہا اور پھر ہر بقر عید پر اُس کا کوئی ایک بیٹا حادثے کا شکار ہو جاتا اور یوں سات برسوں میں اُس کے سات بیٹے اجل کا شکار ہو گئے.. مجید شیخ کا کہنا ہے کہ انہوں نے ذاتی طور پر ہسپتال میں ریکارڈ چیک کیے، وہاں ان کی موت کا اندراج تھا.. اور وہ واقعی بقر عید کے آس پاس فوت ہوئے تھے.. شیخ صاحب اپنے کالم کے آخر میں لکھتے ہیں ''اس کالم کو تحریر کرنے سے قبل میں گلی میں کھڑا اوپر دیکھ رہا تھا جب وہ چھجے سے نیچے جھانکنے لگے اور مجھے دیکھ کر طنزیہ انداز میں چیخنے لگے..''

آپ مجھ سے کچھ نہ کچھ تو واقف ہیں، میری کھوج کی خصلت سے آگاہ ہیں کہ پوری حیات میں نے سرابوں کے تعاقب اور خرابوں میں بھٹکتے اُن کے بھید جاننے کی سعی میں بسر کی ہے۔ اگرچہ یہ ایک سعی لاحاصل تھی کہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا ہے لیکن اُس ''کیا'' نے ہمیشہ مجھ سے پردہ کیا، جاننے نہ دیا.. گھونگھٹ کا پٹ نہ کھولا.. اپنے آپ کو ظاہر نہ کیا، مجھے نظارہ نہ کرنے دیا.. اُلجھن ہی رہی کہ گھونگھٹ کی اوٹ میں وہ کون ہے جو

ایک گورکھ دھندا ہے، مجھے شک ہوتا جاتا ہے کہ اگر بہ فرضِ محال گھونگھٹ وا ہو جاتا تو وہاں کوئی رادھا نہ ہوتی، میں خود ہوتا، میری شکل ہوتی، جیسے عطار کے پرندوں کے سامنے پردہ اٹھنے پر اُنہی کی شکل کے پرندے بیٹھے تھے.. اس لیے اچھا ہوا کہ گھونگھٹ نہ کھلا.. نظارہ نہ ہوا، بھید آشکار نہ ہوا..

اس آسیب زدہ حویلی کی داستان نے بھی مجھے مسخر کر لیا، اس کی چھت پر ٹہلتے موروں نے میرا جینا عذاب کر دیا.. میں نے اُنہیں دیکھنا تھا..

جیسے "کے ٹو کہانی" کی مہم کے دوران میں اور ڈاکٹر عُمر دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کی جانب پہلے دن کے سفر کی صعوبت میں بمشکل چل رہے ہیں تو دائیں جانب ایک سنگریزوں سے بھری ریتلی دیوار چلی جاتی ہے تو میں ڈاکٹر عمر سے کہتا ہوں.. خان صاحب آپ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں، آپ میں سکت ہے تو براہ کرم اس دیوار پر چڑھ کر اس کے پار جھانکئے کہ اس کے پار کیا ہے.. شاید کوئی ان چھوئے کنوارے پانیوں والی جھیل ہو.. اور پھر مجھے بتایئے کہ اس کے پار کیا ہے.. ڈاکٹر عمر کا حال بھی کچھ اچھا نہ تھا، انہوں نے اس بے وجہ مشقت سے صاف انکار کر دیا.. "چوہدری صاحب.. ایک تو آپ ہم سب معصوم لوگوں کو ورغلا کر ان بلندیوں کے قہر کا سامان کرنے کے لیے لے آئے ہو اور اب کہتے ہو کہ دیوار پر چڑھ جاؤ.."

چنانچہ میں نے اپنی دُکھتی ہوئی کمر باندھی، میرے پہاڑی بُوٹوں میں تھکاوٹ کے جتنے پژمردہ پرندے تھے ان کو مزید پژمردہ کیا اور دمے کے ایک مریض کی مانند ہونکتا، بمشکل سانس سنبھالتا سنگریزوں کی اُس دیوار پر چڑھ گیا، پار دیکھا اور پھر پھسلتا ہوا واپس آ گیا..

"ہاں جی چوہدری صاحب، دیوار کے پار کیا تھا.."

"کچھ بھی نہ تھا.. ایک پتھریلا ویرانہ تھا.. جیسا منظر اُدھر ہے ویسا ہی دیوار کے پاس ہے.."

"تو پھر آپ کی مشقت چڑھائی کی رائیگاں گئی؟"

"ہرگز نہیں.. اگر میں اس دیوار پر چڑھ کر پار نہ دیکھتا تو پوری زندگی مجھے ایک چُبھن کھٹکتی رہتی کہ جانے اُس دیوار کے پار کیا تھا.. اب تشفی ہو گئی ہے کہ دیوار کے پاس کچھ نہیں ہے.."

تو اس حویلی کا بھی یہی معاملہ تھا..

بے شک وہاں موروں کی بجائے کوّے کائیں کائیں کر رہے ہوں لیکن مجھے دیوار کے پاس جھانکنا تھا..

چنانچہ ہم کڑاہی گوشت کے طشت در طشت نوش کر کے نکلے اور تحصیل بازار میں موروں والی حویلی کی تلاش میں بھٹکنے لگے.. تھڑوں پر بیٹھے نشے بازوں اور ایسے پُرانے لاہوریوں سے پوچھا جن کی آنکھوں میں لاہور کے بام و در نقش ہوتے تھے..

؎ تم یونہی ناراض ہوئے ہو، ورنہ مے خانے کا پتہ
ہم نے ہر اُس شخص سے پُوچھا جس کے نین نشیلے تھے..

غلام محمد قاصر کی اس لازوال غزل کے بقیہ شعر بھی دیکھ لیجئے..

؎ شوق برہنہ پا چلتا تھا اور رستے پتھریلے تھے
گِھستے گِھستے گِھس گئے آخرٔ کنکر جونوکیلے تھے
سارے سپیرے گھوم رہے تھے ویرانوں میں بین لئے
شہر میں رہنے والے لیکن سانپ بڑے زہریلے تھے
کون غلام محمد قاصرؔ، بیچارے سے کرتا بات!
چالاکوں کی بستی تھی اور یہ حضرت شرمیلے تھے

مے خانے کا پتہ نہ ملتا تھا..

جب بہت بھٹک چکے، خوار ہو گئے تو میں نے مجید شیخ کو فون کیا ''حضور، مور نہیں ملتے، ہیں بھی کہ نہیں..راستہ بتلا دیجئے..''

وہی راستہ جو کالم میں درج تھا، تحصیل بازار..پہلی گلی کا پہلا گھر..اور وہاں واقعی وہ حویلی موجود تھی.. بہت صدیوں کے موسموں کا مارا ہوا ایک قدیم دروازہ مقفل تھا، نظر اٹھا کے دیکھا تو اُس کی منڈیروں پر کوئی مور نہ تھا..

مجھے پہچان کر ایک مندھی آنکھوں والا نوجوان ڈولتا ہوا آ گیا..''بسم اللہ..تارڑ جی..کیا بات ہے.. آپ کی کیا بات ہے..کدھر آ گئے ہو..کہتے ہیں کہ اس حویلی کی چھت پر مور شور رہتے ہیں، ایک ملنگ اُن موروں کے ساتھ رقص کرتا تھا۔ پر اب یہ فروخت ہو گئی ہے، یہاں جوتیاں بنانے کا کارخانہ قائم ہو گیا ہے.. کونسے جن بھوت..جوتیوں کے سامنے جن بُھوت کہاں ٹھہرتے ہیں..آج اتوار ہے، کارخانہ بند ہے اس لیے آپ حویلی کی سیر نہیں کر سکتے..آپ اتنے بوڑھے کیسے ہو گئے ہو..سر پر سفید بالوں کا ایک گھونسلا بنا رکھا ہے... آپ کی کیا بات ہے..''

کیا یہ وہی آسیب زدہ حویلی ہے جس کے آسیب نے ''مامے'' کے سات بیٹے ہلاک کر دیئے تھے یا میں کہیں اور آ نکلا ہوں..

اُس شب میں نے دوبارہ شیخ صاحب کو فون کیا تو وہ کہنے لگے ''اتوار کے روز میں اور شیرو آپ کو اُس حویلی تک لے چلیں گے اور وہاں مور ہیں..''

مجھے یقین ہے کہ اگر مجید شیخ کہتے ہیں تو وہاں اب بھی مور ہوں گے..اگر ہوئے تو میں اُن کے بارے

میں ایک اور مور داستان لکھوں گا..لیکن اس دوران اِک عجب سانحہ ہو گیا.. مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ اُس آسیب زدہ حویلی کی چھت پر ابھی تک مور ٹہلتے ہیں یا نہیں کہ وہ میرے لیے اب سامری کا ایک سنہری بچھڑا ہو چکے ہیں.. میں مسحور ہو چکا ہوں، اُس کی پرستش میں مبتلا ہو چکا ہوں.. بے شک اُس حویلی کی چھت پر رہنے والے تین مور کب کے کُوچ کر چکے ہیں لیکن وہ چھت ویران تو نہ ہوگی، وہاں سرسوتی کے پار کُوکتے، بخت جہان کے صحن میں رقص کرتے، نگر پارکر کے قصبے کا سبکی ریتلی گلیوں میں ٹہلتے، رام مندر کے سُوکھ چکے شجروں پر براجمان، نزدیکی شجروں کی جانب اُڑان کرتے، اپنے رنگ فضا میں بکھیرتے، اور میرے صحن میں اترنے والا اجنبی مور..اور من مور ہوا متوالا والا مور، یہ سب کے سب اُس حویلی کی چھت پر اُتر آتے ہوں گے...اور ان سب موروں کی مہین آنکھوں میں ایک بوڑھے سفید برف بالوں والے آوارہ گرد کی پژمردہ سُرخ آنکھیں نقش ہوں گی..جو اُن کا متوالا ہے..

ے من مور ہوا متوالا رے.. یہ کس نے جادو ڈالا رے..



''زنانِ لاہور یعنی لاہور کی لڑکیاں''

ہمارے وہ زمانے جو کب کے خس و خاشاک ہو چکے، ایک سُندر سپنے کی مانند بیت چکے ان میں جو لاہوری سیانے ہوتے تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ جو بھی لڑکی لاہور آ جاتی ہے اُسے پَر لگ جاتے ہیں، یعنی بے شک وہ چک جھمرہ یا ساہیوال کی ہو جب وہ لاہور منتقل ہوتی ہے تو اسے فیشن اور سوہنے پن کے پَر لگ جاتے ہیں، وہ دل پذیر، دل رُبا اور دل نشیں ہو جاتی ہے.. میں تذکرہ کر چکا ہوں کہ اداکار پران لاہوری کے مطابق یہ شہر برصغیر میں جدید ترین فیشن کا موجد ہوا کرتا تھا، یہاں تک کہ اگر ایک سویر ایک لاہوری لڑکی غلطی سے اپنی دونوں چوٹیوں میں ایک ہی رنگ کے ربن باندھنے کی بجائے ایک سُرخ اور ایک نیلا رنگ باندھ لیتی تھی تو راس کماری سے کشمیر تک کی لڑکیاں اپنے بالوں میں الگ الگ رنگوں کے سرخ اور نیلے ربن باندھنے لگتی تھیں.. کہ لاہور کی لڑکیاں یہ فیشن کرنے لگی ہیں.. آج بھی اگر آپ جائزہ لیں تو بیشتر فیشن تخلیق کرنے والوں کا آبائی شہر لاہور ہے، کیا آپ جانتے ہیں کہ نہ صرف امرتسر، پٹیالہ، جالندھر بلکہ دلّی میں بھی شادی کے موقع پر بیشتر دلہنیں جو خوش نظر اور خوش رنگ لباس زیب تن کرتی ہیں وہ لاہور کے فیشن ڈیزائنر کے کرشمے ہوتے ہیں، امرتسر میں مجھے بتایا گیا کہ وہ لوگ خصوصی طور پر شادی کے ملبوسات کے چناؤ کے لیے لاہور آ کر خریداری کرتے ہیں کہ یہاں جتنے بھی فیشن گھر ہیں، جو مرد اور بیشتر خواتین اپنے نام سے اپنے تخلیق کردہ لباسوں کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں، ہندوستان میں پُوجے جاتے ہیں.. ہم دور کیوں جائیں، قریب کی بات کریں، میرے بچپن کے اور آج تک کے دوست خاور زمان کی کزن سارہ زمان نے ''بریزے'' کے نام سے خواتین کے ملبوسات کا ایک فیشن ہاؤس قائم کیا.... آج ''بریزے'' نہ صرف پاکستان بھر میں بلکہ دوبئی، لنڈن اور دلّی وغیرہ میں بھی اپنے انوکھے اور نت نئے رنگوں کے ساتھ دھوم مچا رہا ہے، ہمارے ہاں جو بھی مہمان ہندوستان سے آتا ہے اُس کی پہلی فرمائش ''بریزے'' ہوتی تھی، کہا جاتا تھا کہ اگر ہندوستان میں آپ کو کسی بڑے افسر کی سفارش درکار ہے تو اُس کی بیگم کے لیے ''بریزے'' کا ایک سُوٹ لے جائیے، کام ہو جائے گا.. اس کی ایک برانچ جب دلّی میں قائم ہوئی تو پہلے دن ہی اُن کا مہینے بھر کا سٹاک ختم ہو گیا اور انہیں ایک خصوصی پرواز کے ذریعے مزید سٹاک پہنچایا گیا..

اگرچہ ہندوستان اپنے کھدر کی مصنوعات کے حوالے سے بہت شہرت رکھتا ہے لیکن جب کبھی میرا دوست ونود دعا لاہور آتا ہے تو ہمیشہ ''کھادی'' کا رُخ کرتا ہے، درجنوں کھدر کے کُرتے خرید کر لے جاتا ہے اور اُس کا کہنا ہے کہ نہ صرف پاکستانی کھدر ہندوستانی کھدر سے کہیں زیادہ دیرپا اور ملائم ہے بلکہ ''کھادی'' کے ڈیزائن کی خوش ذوقی دور سے پہچانی جاتی ہے..

چنانچہ لاہور آنے والی لڑکی کو اس لیے پَر لگ جاتے تھے کہ وہ فیشن کیپیٹل آف انڈیا میں قدم رکھتے ہی یہاں کے ذوق لباس اور ذوق آرائش سے آگاہ ہو کر اپنے آپ کو یُوں سنوار لیتی تھی کہ اُسے خوبصورتی کے پَر لگ جاتے تھے..علاوہ ازیں کسی بھی حسن کو قیامت خیز کرنے میں شاید لاہور کے پانیوں کا بھی اعجاز تھا..جیسے پشاور کے پانیوں میں کچھ ایسی تاثیر ہے کہ اگر ایک بوڑھی بے دُودھ بھینس کا گوشت بھی اُن میں بھُونا جائے تو وہ جاپان کے کوبے بیف سے بھی بڑھ کر ذائقے دار ہو جاتا ہے..بے شک اُن جاپانی گائیوں کو ایک خاص خطے کے موسموں میں پالا جاتا ہے، اُن کی پیاس بیئر سے بجھائی جاتی ہے اور اس کے باوجود وہ بوڑھی بھینسیں اور ناکارہ بھینسے جو کبھی بیئر کے کڑوے ذائقے سے آشنا نہیں ہوتے جب پشاور کے پانیوں میں کڑھائیوں پر چڑھتے ہیں تو وہ جنت تاثیر ہو جاتے ہیں..

تو یُوں جانئے کہ لاہور کے پانیوں میں بھی حسن کو نکھارنے کی کوئی تاثیر ہے..اور اس کی گواہی وہی لوک گیت دے گا کہ..مجھے بتاؤ تو سہی کہ شہر لاہور اندر جتنے کنویں ہیں اُن میں سے کس کے پانی کھارے اور بدذائقہ ہیں اور کن کے پانی میٹھے اور شیریں ہیں تو جان لو کہ جن کنوؤں سے لاہوری معشوق پانی بھرتے ہیں وہ سب میٹھے پانیوں والے ہیں اور باقی سب کھارے پانیوں کے ہیں ویسے حسن کے نکھار میں لاہور کے شدید موسموں کا بھی تو کچھ حصہ ہے..

موسم گرما میں جب لاہور ایک تندور ہو جاتا ہے تو اُس کی سلگتی کچی مٹی کے ساتھ جتنے بھی چہرے چسپاں ہوتے ہیں، ہولے ہولے دہکنے لگتے ہیں..اُن کے رخسار آتشی گلاب ہو جاتے ہیں اور آنکھوں میں عشق آتش کے الاؤ روشن ہونے لگتے ہیں..جیسے آم کڑی دھوپ اور شدت کی سلگتی گرمی میں پکتا ہے، رسیلا ہوتا ہے، ایسے ہی لاہوری لڑکیاں رسیلی اور بیروں کی مانند پک جاتی ہیں..

سرما کے دن اترتے ہیں، دھوپ مدھم ہو جاتی ہے، ان کے بدن ٹھٹھرنے لگتے ہیں، ہونٹ نیلے پڑنے لگتے ہیں تو حسن اپنی نیلاہٹ میں اوجِ کمال کو پہنچتا ہے..

برساتوں میں یہ لڑکیاں بھیگ بھیگ جاتی ہیں تو اُن کے بدنوں سے پیاسی مٹی پر گرنے والی بارش کی پہلی بُوند ایسی مہک اٹھنے لگتی ہے اور تب ''تیرے بھیگے بدن کی خوشبو سے'' ایسے گیت جنم لیتے ہیں..

اور جب باغ جناح کے بزرگ شجر خزاں کی بستیوں کو کُوچ کر جاتے ہیں اور وہ سب بستیاں زرد

رنگت میں رنگی ہوتی ہیں تو شہر لاہور کی لڑکیاں، زرد رنگت کی خزاں آلود چینی شہزادیاں ہو جاتی ہیں..

لاہور کے پانیوں اور موسموں میں ایسی تاثیراں ہیں..کمال کی تعبیراں ہیں..بہت مدت پہلے ایک دوست ہندوستان گئے، انہیں ایک شخص نے دلّی کے کسی فٹ پاتھ پر ''شا کیجئے'' کہہ کر روکا اور پوچھا ''آپ لاہور کے ہیں؟'' میرے دوست کچھ حیرت میں ہو گئے اور کہا ''آپ کیسے جان گئے کہ میں لاہور کا ہوں؟''

تو اُن صاحب نے کا ''آپ کا رنگ رُوپ لاہور کا ہے..دُور سے پہچانے جاتے ہیں..''

لاہور کا یہ سحر انگیز رنگ ورُوپ خصوصی طور پر یہاں کی لڑکیوں کے چہروں پر درجنوں سورجوں کی مانند دمکتا ہے، دور سے دکھائی دیتا ہے۔ حسن کے اس معجزے میں صرف لاہور کے پانیوں کا ہی کمال نہیں، اس کے موسموں کا اعجاز ہی نہیں، اس میں شہر لاہور کے اندرون میں آباد درجنوں قوموں اور نسلوں کے اختلاط کا بھی عمل دخل ہے..ہمیں بالمیک کی ''رامائن'' میں سراغ ملتا ہے جب لنکا سے واپسی پر سیتا پر شک کیا گیا اُس پر تہمت لگی تو اُس نے دریائے راوی کے کنارے ایک کُٹیا میں مقیم شُودھر سنت بالمیک کے ہاں بسیرا کیا اور تب وہ ماں بننے والی تھی، بچے سے تھی اور بالمیک کی دعا کے اثر سے اُس کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے..لوہ اور کسو، رام کے بیٹے..کسو نے قصور کی بنیاد رکھی اور لوہ نے لاہور بسایا..تو اہل لاہور کے خون میں سیتا کے بیٹوں کی نسل کے خون کے بھی کچھ آثار تو ہوں گے..ان کی دیوداسیوں کے من موہنے چہروں کے کچھ نقش بھی تو منتقل ہوتے چلے آئے ہوں گے..لاہور راجپوت بھٹیوں کا مسکن بھی رہا، راجپوتانہ کے سرخ صحراؤں کے ملاحت بھرے تشنہ حسن کے کچھ تو پرتو کہیں نہ کہیں لاہور کی لڑکیوں کی شکلوں میں عکس تو ہوتے ہوں گے..جے پال اور آنند پال ایسے جری راجپوت راجوں کی رانیوں کے مکھڑوں کی تھوڑی بہت جھلک تو آج بھی چھب دکھلاتی ہو گی..
محمود غزنوی کے تُرک بھی بہت سے لاہور کے اسیر ہو کر یہاں آباد ہو گئے، محمود کا ایاز جب برباد شدہ لاہور کا گورنر مقرر ہوا اور اس نے اس شہر کو دوبارہ تعمیر کروایا اور اسے کبھی اپنا غزنی یاد نہ آیا، لاہور کا ہو رہا اور یہیں رنگ محل میں دفن ہوا تو وہ اکیلا تو نہ ہو گا، ایران طُوران کے بہت سے باشندے بھی اُس کے ہمراہ آباد ہوئے ہوں گے..ایاز کے حرم میں بھی آرمینیا، سیستان، خراسان اور منگولیا کی شہزادیاں تھیں تو ان کی شباہتیں معدوم کہاں ہوئیں، ان کی اولادوں میں شکل ہو کے کوئی نہ کوئی نشانیاں تو چھوڑ گئیں..مُغلوں کے عہد میں ان گنت ایرانی، تورانی اور ملک شام کے خاندان تھے جو بہتر مستقبل کے لیے لاہور میں آباد ہوئے..ان میں کٹڑہ ولی شاہ میں آباد ایرانی سیدوں کی اولاد اور قزلباش گھرانوں میں آج بھی فارسی بولی جاتی ہے..نور جہاں ایرانی اور اُس کا بھائی لاہور کا گورنر آصف جاہ، اسی خاک میں دفن ہوئے..مہاراجہ رنجیت سنگھ کی رانیاں اور مہارانیاں بھی کثرت سے تھیں، سِکھ، ہندو اور مسلمان ''سرکاریں'' تھیں کہ ایسی رانیاں جن سے مہاراجہ نے باقاعدہ بیاہ کیا اُن کے نام کے ساتھ ''سرکار'' پکارا جاتا تھا مثلاً سرکار موراں یا سرکار گُل بیگم وغیرہ..تو ان سب کی صُورتیں آج

کی لاہورنوں کے چہروں پر لالہ و گُل کی صورت کچھ نہ کچھ تو نمایاں ہوتی ہوں گی.. لاہور میں یورپی خون کی بھی آمیزش ہے.. مہاراجہ کے فرانسیسی اور اطالوی جرنیلوں نے مقامی روایات کے احترام میں بے دریغ مقامی عورتوں سے شادیاں کیں، ان کے حرم، مہاراجہ سے بھی وسیع تھے، انگریز اُن کے پیچھے پیچھے چلے آئے.. پنجاب میں تو سراغ نہیں ملتا لیکن برصغیر کے بہت سے نواب اور نظام حضرات نے بخوشی اپنی بیٹیاں سرکار برطانیہ کے اہلکاروں کے عقد میں دے دیں اور ان کے بطن سے جو بچے پیدا ہوئے وہ ''وہائٹ مغل'' کہلائے.. انگریزوں نے یقیناً لاہور میں بھی اپنا لُچ تلا ہوگا.. اگر نور جہاں نے ''دُسن وے بلوری اَکھ والیا'' گایا تو بے وجہ تو نہیں گایا.. بلوری آنکھیں بھلا کہاں سے آ گئیں.. اگر کوئی لاہورن نیلی آنکھ والی ہوتی ہے اور وہ ہوتی ہیں تو یہ سب یورپ سرکار کا کرم ہے.. اچھا یہی نہیں کہ سب لاہورنیں اور لاہوری گورے چٹے اور بلوری آنکھوں والے ہوتے ہیں بلکہ اکثر مُشکی رنگت کے معمولی شکل کے اور کچھ تو بہت کالے کالے بھی ہوتے ہیں، یہ یاد دلانے کے لیے کہ اُن مہاراجوں اور نوابوں اور شہزادوں کے بہت سے افریقی غلام بھی تو ہوا کرتے تھے اور وہ بیکار تھوڑا بیٹھے رہتے تھے.. اسی لیے نور جہاں نے جہاں بلوری آنکھوں کو سُروں میں ڈھالا ہے وہاں ''کالا شاہ کالا.. ساڈھا کالا ہے دِلدار تے گوریاں نُوں پراں کرو..'' بھی گایا ہے.. یہ لاہور کے افریقی خون کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے.. یعنی لاہوریوں کی نسل خالص نہیں ہے، اس میں بے شمار نسلوں اور قومیتوں کی آمیزش ہے یعنی وہ یکسر حلال کے نہیں ہیں، معافی کے ساتھ!

لاہور کے قدیم باسی ککے زئی پٹھان، مسجد وزیر خان کے پہلو میں، بہت پڑھے لکھے اور زیرک اور ان کی خواتین لڑنے جھگڑنے میں ایک مکمل ادارہ.. اور پھر کشمیری برادری جن کے دم قدم سے حسن کی برانگیختگی بھی ہے، پکوانوں کے ذائقے بھی ہیں اور قانون سے سرکشی بھی ہے.. تازہ ترین حملہ آور حسب معمول افغانستان سے آئے اور حسب معمول لاہور پر قابض ہو گئے.... فصیلوں کے اندر جو شہر ہے وہاں قدیم لاہوری عنقا ہوتے جاتے ہیں اور افغان غالب آ رہے ہیں یہاں تک کہ اندرون شہر میں پنجابی کی بجائے پشتو زیادہ سنائی دیتی ہے.. عجب ستم ہے کہ ہم نے ان لوگوں کے لیے ''جہاد'' کیا اور وہ اپنا ملک چھوڑ کر ہمارے شہر پر قابض ہو گئے، زبردستی کے مہمان ہو گئے، ایسے مہمان جو جانے والے نہیں، وقت کے ساتھ وہ بھی لاہور کے نسلی دھاریوں میں مدغم ہو جائیں گے.. لاہور میں داخل ہونے کے تو بہت سے راستے ہیں لیکن اس میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں..

عبداللہ آہن گر کے پاس اپنے چرخے کا تکلا سیدھا کروانے کے لیے جو ہندو عورت آئی اُس کے حسن میں کچھ کلام نہ تھا..

شاہ حسین جب شہر لاہور کی گلیوں میں رقص کرتے پھرتے تھے تو یہ ایک کشمیرن تھی جس کی خوش شکلی

نے اُن کے دل پر وار کیا اور وہ اُس سے لپٹ گئے..

میں اپنے کو دوہرانے میں کچھ قباحت نہیں سمجھتا کہ خشونت سنگھ جب لاہور کے کنیئرڈ کالج میں لیکچر دینے کے لیے گئے تو انہوں نے کہا کہ میرے سامنے جو سینکڑوں لاہوری لڑکیاں بیٹھی تھیں، میں نے بہت غور سے اُن کا جائزہ لیا، یہ جاننے کے لیے کہ ان میں سے کون ہے جو معمولی شکل کی ہے، ایک بھی نہ تھی..

زنانِ لاہور کے چہروں پر دل کشی کی دمک ہے اس لیے بھی ہے کہ لاہور ایک قلعی گر ہے..

شاید کسی کو یاد ہو کہ ایک زمانے میں ہمارے گھروں کے سب برتن، پیالے، ٹھوٹھیاں، رکابیاں اور ہانڈیاں وغیرہ کچے مٹی کے ہوتے تھے، کمہاروں کے چاک کی گھماٹ سے وجود میں آتے تھے، چند ایک متمول گھرانوں میں چینی کے برتن ہوتے تھے جو ہمیشہ کارنس پر سجے رہتے تھے، استعمال میں کم ہوتے تھے.. پھر تِکّے برتنوں کا رواج ہو گیا، کانسی تانبے کے برتنوں کا.. اور یہ مسلسل استعمال سے ماند پڑ جاتے تھے، بے رُوح ہو جاتے تھے اور تب ایک صدا سُنائی دیتی تھی ''بھانڈے قلعی کرالو''.. وہ قلعی گر گلی میں حیرت انگیز طور پر ایک پمپ کی پھنکار سے لمحوں میں ایک چُولہا روشن کرتا تھا، ایک بھٹی تخلیق کرتا تھا.. کانسی تانبے کے برتنوں کو اُس چُولہے کی سلگتی تیز آگ پر دھر کے اُنہیں بھی دہکا دیتا تھا اور پھر وہ ایک معجزہ کرتا تھا، اُن دہکے ہوئے برتنوں پر ایک پاؤڈر چھڑک کر جو شاید نوشادر تھا، وہ ایک دھجی سے برتن کو یُوں رگڑتا تھا کہ وہ یکدم دمکنے لگتا تھا، نیا نکور ہو کر لشکنے لگتا تھا..

لاہور بھی ایک قلعی گر ہے...... وہ اس میں آباد نسوانی چہروں کو، جو ماند پڑتے جاتے ہوں، ملول اور رنجیدہ ہو چکے ہوں اُنہیں اپنی بھٹی میں دہکا کر اُن پر اپنی قدیم تاریخ اور ثقافتوں اور نسلوں کا نوشادر پاؤڈر چھڑک کر شاہ حسین کے سُرخ لبادے سے پُونچھ کر چمکا دیتا ہے، نوا اں نکور کر دیتا ہے اور یوں لاہور کی لڑکیاں دمکتی کھنکتی پھرتی ہیں، انہیں پازیبیں پہننے کی حاجت نہیں کہ اُن کی دمک اور کھنک اُن کی آمد سے چھنکتی جاتی ہے..



''حویلی بیج ناتھ کے بُجھ چکے چراغ''

گہرے جامنی رنگ کے لشکیلے پہناوے میں، سیاہ دھاریوں والے ایک بوسیدہ ہوتے گرم سویٹر میں، جامنی رنگ کی ہی چادر اوڑھے ہوئے جس میں سے اُس کے مہندی رنگ بال ایک ایسے چہرے پر نمایاں ہوتے تھے جس پر بہت موسم گزر رہے تھے اور اُس کی رنگت اگرچہ دھندلا گئی تھی پر اُس دُھند میں پوشیدہ اُس کا دُودھیائی ماضی جھلکتا فریاد کرتا تھا کہ.. کبھی ہم بھی خوبصورت تھے.. پژمردہ آنکھوں میں کجلے کی دھاریں سیاہ سوگ میں تھیں اور ناک میں شاید چاندی کا بجھتا ہوا ایک کیل بمشکل دکھائی دیتا تھا تو کیا وہاں کبھی ایک نتھنی ہوا کرتی تھی، خزاں آلود ہونٹوں پر، ہونٹوں کی رنگ کی ہلکی سی لِپ سٹک کا لیپ، ایک اُنگلی کے گرد لپٹا چھلّا چاندی کا اور کلائی میں ایک سنہری کڑا جو سونے کا ہوسکتا تھا پر نہ تھا.. ایک گم گشتہ تمکنت کی حامل ایک عورت، ایک نرالے انداز کی پروقار عورت، کسی ایسے سحر کو پوشیدہ کیے ہوئے جس میں گزر چکے زمانوں کی پائل کی چھنک تھی، کسی بیت چکے سُندر سپنے کی پرچھائیاں، کسی پریم میں سب کچھ ہار جانے کی جھلکائیاں تھیں۔ وہ ہمارے استقبال کے لیے اُٹھی اور اپنے بالوں کا دھیان کیا تو اُس رکھ رکھاؤ میں ماضی کے دھندلکوں میں گمشدہ کسی تہذیب کی سرگوشیاں تھیں، ایک ایسی عورت جو آپ سے احترام اور وقار کا تقاضا کرسکتی ہے، وہ کوئی معمولی عورت نہ تھی، وہ ظہیر کاشمیری کے اس شعر کی تفسیر تھی کہ..

؎ ہمارا عشق ہمیں تمکنت سکھاتا ہے
کشیدہ سر بھی ہیں، پابندِ زلف یار بھی ہیں

''پھولوں والی گلی'' کے اختتام پر ایک زمانوں کے قدموں میں روندی گئی گِھس چکی چوکھٹ میں نصب میں بوسیدگی کا شکار ایک شاہکار بلند دروازہ جو بمشکل دھکیلنے سے کھلتا تھا اُس کے اندر حویلی بیج ناتھ کے قدامت میں سِسکتے در و دیوار کی دبیز دیواروں کے اندر مغل اور سِکھ محرابوں والے گھر میں وہ جانے کب سے رہتی تھی، جس کے صحن میں اُبھی تک اُن چار فواروں کے تالاب کے خشک ہو چکے آثار تھے جن میں سے چاندنی راتوں میں پانیوں کے جھرنے چھوٹتے، حویلی کے وسیع کوٹھے پر اترتے ماہتاب سے بوندوں کی باتیں کیا

کرتے تھے، اور وہاں شالیمار باغ کے آبشاری تختے ایسا ایک مختصر سنگ مرمر کا تختہ سُوکھا پڑا تھا اور کبھی اُس کی ڈھلوانوں پر بھی پانی اٹک اٹک کر رم جھم کرتے اُس تالاب میں گرتے تھے.. رم جھم رم جھم پڑے پھوار کی نم آلود تصویراں وجود میں آیا کرتی تھیں.. اُس قدیم صحن کے ایک کونے میں جو شجر اس خشک ہو چکے پانیوں کے گلزاروں پر سایہ فگن ہوتا تھا، وہ پیپل کا تھا یا برگد کا اس سے کیا فرق پڑتا ہے لیکن یہ طے ہے کہ ان باغوں میں کبھی جھولے پڑا کرتے تھے..

وہ عورت جس نفاست اور آراستگی سے حویلی بیج ناتھ کی محرابوں، طاقچوں، بُجھ چکے چراغوں، قدیم ظروف اور منقّش چھتوں کے بجھ چکے آئینوں کے تلے حرکت کرتی تھی، وہ مجھے شناسا سا لگی، دیکھی ہوئی، کسی حد تک جانی پہچانی لگی، اگرچہ یہ تو ممکن نہ تھا اور پھر مجھ پر کھلا کہ وہ تو ''راکھ'' کی نُوراں کی ہمزاد تھی، اگرچہ نُوراں میرے تصور کا ایک واہمہ کردار تھا، لال حویلی کے در و دیوار میں بھٹکتے ایک خشک ہو چکے فوارے اور اُس کی چھت پر واقع ایک مُجرا مقام میں سانس لیتے ہوئے وہ میرے تخیل کے پانیوں میں سے ایک کنول کی مانند ظاہر ہو گئی تھی.. نوراں محض ایک کردار تھی جب کہ یہ عورتِ حویلی بیج ناتھ میں نُوراں کی مانند جوتیوں کے تلوں میں سریش لگا کر ایڑھیاں چسپاں کرنے کی مزدوری نہیں کرتی تھی، اس حویلی کی مالک تھی..

> ''اور جب وہ کھڑی ہوئی تو اُس کی ایستادگی میں ایک عجیب شاہانہ پن تھا، ایک حسن کا گم گشتہ غرور تھا... اُس کا سراپا آئینوں میں چلتا تھا.. اور کون ہے آئینوں میں.. بس تُو ہی تُو ہے..''

''راکھ''

حویلی بیج ناتھ کی شکستہ چھت میں نصب آئینوں کی جو ٹکڑیاں اندھی ہو چکی تھیں، اُن آئینوں میں اگر دمک ہوتی تو وہ بھی اس سراپے کا تماشا کرتے.. اور کون ہے آئینوں میں..

اُس عورت کا نام بھی یکتا تھا، خاور خورشید..

اُس کا کہنا تھا کہ بیج ناتھ دیوان، مہاراجہ رنجیت سنگھ کا بیٹا تھا.. اگرچہ یہ قرین از قیاس نہ تھا.. بے شک اس شیرِ پنجاب کی اولادوں کا کچھ باقاعدہ شمار نہ تھا کہ وہ اتنا وسیع القلب مہاراجہ تھا کہ اگر اُس کی کسی سرکار مہارانی کے بطن سے کسی بہشتی یا معمولی درباری اہلکار کی کاوشوں سے کوئی برخوردار ظہور پذیر ہو جاتا تھا تو وہ اُسے بخوشی اپنی جائز اولاد میں شامل کر لیتا تھا.. لیکن اس فراخ دلی کے باوجود بیج ناتھ کسی طور اُس کا بیٹا نہیں ہو سکتا تھا کہ زمانوں کا بہت فرق تھا.. بیج ناتھ انگریز سرکار کے زمانوں میں لاہور کا نائب ڈپٹی کمشنر ہوا کرتا تھا.. اس حویلی کے بارے میں ایک اور امکان رد نہیں کیا جا سکتا، بہر طور یہ انگریزوں کے عہد سے پہلے کی تعمیر ہے، بلکہ اس کے در و دیوار گواہی دیتے ہیں کہ شاید یہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت سے بہت پہلے شاید دارا شکوہ کے

کرتے تھے، اور وہاں شالیمار باغ کے آبشاری تختے ایسا ایک مختصر سنگ مرمر کا تختہ سُوکھا پڑا تھا اور کبھی اُس کی ڈھلوانوں پر بھی پانی اٹک اٹک کر رم جھم کرتے اُس تالاب میں گرتے تھے..رم جھم رم جھم پڑے پھوار کی نم آلود تصویراں وجود میں آیا کرتی تھیں..اُس قدیم صحن کے ایک کونے میں جو شجر اس خشک ہو چکے پانیوں کے گلزاروں پر سایہ فگن ہوتا تھا، وہ پیپل کا تھا یا برگد کا اس سے کیا فرق پڑتا ہے لیکن یہ طے ہے کہ ان باغوں میں کبھی جھولے پڑا کرتے تھے..

وہ عورت جس نفاست اور آراستگی سے حویلی بیج ناتھ کی محرابوں، طاقچوں، بُجھ چکے چراغوں، قدیم ظروف اور منقش چھتوں کے بجھ چکے آئینوں کے تلے حرکت کرتی تھی، وہ مجھے شناسا لگی، دیکھی ہوئی، کسی حد تک جانی پہچانی لگی، اگرچہ یہ تو ممکن نہ تھا اور پھر مجھ پر کھلا کہ وہ تو ''راکھ'' کی نُوراں کی ہمزاد تھی، اگرچہ نُوراں میرے تصور کا ایک واہمہ کردار تھا، لال حویلی کے در و دیوار میں بھٹکتے ایک خشک ہو چکے فوارے اور اُس کی چھت پر واقع ایک مُجرا مقام میں سانس لیتے ہوئے وہ میرے تخیل کے پانیوں میں سے ایک کنول کی مانند ظاہر ہو گئی تھی..نوراں محض ایک کردار تھی جب کہ یہ عورت حویلی بیج ناتھ میں نُوراں کی مانند جوتیوں کے تلوں میں سریش لگا کر ایڑھیاں چسپاں کرنے کی مزدوری نہیں کرتی تھی، اس حویلی کی مالک تھی..

''اور جب وہ کھڑی ہوئی تو اُس کی ایستادگی میں ایک عجیب شاہانہ پن تھا، ایک حسن کا گم گشتہ غرور تھا...اُس کا سراپا آئینوں میں چلتا تھا..اور کون ہے آئینوں میں..بس تُو ہی تُو ہے..''

''راکھ''

حویلی بیج ناتھ کی شکستہ چھت میں نصب آئینوں کی جو ٹکڑیاں اندھی ہو چکی تھیں، اُن آئینوں میں اگر دمک ہوتی تو وہ بھی اس سراپے کا تماشا کرتے..اور کون ہے آئینوں میں..

اُس عورت کا نام بھی یکتا تھا، خاور خورشید..

اُس کا کہنا تھا کہ بیج ناتھ دیوان، مہاراجہ رنجیت سنگھ کا بیٹا تھا..اگرچہ یہ قرین از قیاس نہ تھا..بے شک اس شیرِ پنجاب کی اولادوں کا کچھ باقاعدہ شمار نہ تھا کہ وہ اتنا وسیع القلب مہاراجہ تھا کہ اگر اُس کی کسی سرکار مہارانی کے بطن سے کسی بہشتی یا معمولی درباری اہلکار کی کاوشوں سے کوئی برخوردار ظہور پذیر ہو جاتا تھا تو وہ اُسے بخوشی اپنی جائز اولاد میں شامل کر لیتا تھا..لیکن اس فراخ دلی کے باوجود بیج ناتھ کسی طور اُس کا بیٹا نہیں ہو سکتا تھا کہ زمانوں کا بہت فرق تھا..بیج ناتھ انگریز سرکار کے زمانوں میں لاہور کا نائب ڈپٹی کمشنر ہوا کرتا تھا..

اس حویلی کے بارے میں ایک اور امکان رد نہیں کیا جا سکتا، بہرطور یہ انگریزوں کے عہد سے پہلے کی تعمیر ہے، بلکہ اس کے در و دیوار گواہی دیتے ہیں کہ شاید یہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت سے بہت پہلے شاید دارا شکوہ کے

زمانوں کے لاہور میں تعمیر کی گئی تھی کہ اس میں مغل عمارتوں ایسی تعمیری آرائشیں اور بناوٹیں ہیں... بے شک بعدازاں ان میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں جیسے تخت شاہی پر براجمان ہونے والے شاہ بدلتے رہتے ہیں، تخت نہیں بدلتے، ایسے یہ جو شاہانہ رہائش گاہیں، محلات اور حویلیاں ہوتے ہیں یہ بھی اپنے مکین بدلتے رہتے ہیں..خود نہیں بدلتے..جیسے میکلوڈ روڈ چوک میں سربلند لکشمی بلڈنگ کے ماتھے پر آویزاں لکشمی دیوی کی مُورتی طاقچے میں سے اکھاڑ کر اُسے کوڑے کے ڈھیر میں پھینک کر اُس کی جگہ ''ماشاءاللہ'' کی تختی آویزاں کر دی جائے تو بھی وہ لکشمی بلڈنگ ہی رہتی ہے، مکینوں کا مذہب اختیار نہیں کرتی..

حویلی نیچ ناتھ کے صحن میں جو آبشاری تختہ اور فواروں کا تالاب ہے، یہ شالیمار طرز کی ایک مغل خواب گری ہے..اور پھر یہ امکان بھی ہے کہ یہ حویلی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانوں کی ایک یادگار ہے اور چونکہ ابھی مغلوں کو رُخصت ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، یہاں تک کہ مہاراجہ کی درباری زبان بھی فارسی چلی آتی تھی، یہاں تک کہ اگر آپ آج جیل روڈ کے مسیحی قبرستان میں داخل ہو کر دائیں جانب چلتے جائیں تو آپ کے قدموں تلے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی پرنسس بمباں سدرلینڈ کی قبر آ جائے گی جس کے کتبے پر انگریزی کے علاوہ فارسی زبان کی ایک رباعی درج ہے.. چنانچہ مغلوں کی زبان اور فن تعمیر کی پرچھائیاں مہاراجہ کے سنہری عہد کو ابھی تک اجاگر کر رہی تھیں..مہاراجہ کے عہد میں شہر لاہور بے شمار پُرشکوہ حویلیوں اور رہائش گاہوں سے آراستہ ہوا. سکھ سردار، شہزادے، وزیر اور خالصہ فوج کے جرنیل لاہور شہر میں شاندار حویلیاں تعمیر کرنے لگے..جیسے غرناطہ کے ''البیسین'' محلے میں مُور مسلمانوں نے مراکو طرز تعمیر کو اپنا کر حویلیاں تعمیر کیں، آگرہ کے نواح میں مغل شہزادوں اور وزیروں نے بے مثل رہائش گاہوں کی بنیاد رکھی ایسے ہی لاہور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں شاہانہ تعمیرات کا آغاز ہوا..

بے شک حویلی نیچ ناتھ، شہر لاہور کی سب سے یادگار اور خوش نظر حویلی دھیان سنگھ اور حویلی نونہال سنگھ کی ہمسری تو نہ کرتی تھی، اُن کے مقابلے میں یہ ہیچ ہے لیکن اس کی پوشیدہ سحر انگیزی اور سامری جادوگری میں بھی کچھ کلام نہیں..

وہ عورت خورشید اُس حویلی کے دربار ہال یا مرکزی حصے کی وسعت میں ایک متروک شدہ مہارانی کی مانند، ایک عجب چال سے چلتی تھی اور جب کھڑی ہوتی تھی تو اُس کی کاجل زدہ آنکھیں ہم سے داد طلب کرتی تھیں کہ دیکھو میں کیسے ایک فراموش کردہ خاموش جہان میں رہتی ہوں..

محراب در محراب..صحن کی جانب کھلتے دروازوں کے چوکھٹوں میں نصب رنگین، سرخ، زرد، سبز اور نیلے شیشے جن پر صحن میں پھیلے ہوئے شجر کے پتے نقش ہوتے تھے..بھڑکیلے رنگوں کے قدرے عامیانہ پردے، پرانے صوفے جن کی بوسیدگی جھالروں والی چادروں سے ڈھکی ہوئی تھی، طاقچوں میں بجھے ہوئے چراغ، فرش

پر بچھے ہوئے اپنے رنگ کھو چکے قالین جن پر چھت سے پیوستہ شکستہ چوبی نقش اور ان میں جڑے ہوئے اندھے ہو چکے شیشے گرتے رہتے تھے..

وہ ایک سُگھڑ عورت تھی..

اگرچہ ہم اچانک آ نکلے تھے اس کے باوجود وہ خوش لباس تھی..کوئی بھی عورت اگر وہ ایک تہذیب کی پروردہ ہو، سُگھڑ پن سے آراستہ ہو تو وہ ایک معمولی گھر کو صاف ستھرا اور خوش نظر رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے..وہ اُسے اپنے ذوق جمال سے غیر معمولی بنا دیتی ہے اور اگر ایک عورت..کسی بہت قدیم حویلی بیج ناتھ میں مقیم ہو، زندگی کے شب و روز اُس کی قدامت کی سوندھی مہک میں بسر کرتی ہو جس کے کمروں کی تعداد کا بھی اُسے محض اندازہ ہو اور اُن کمروں میں خفیہ راستے اور سیڑھیاں پوشیدہ ہوں، چھتوں کی آرائشیں بوسیدہ ہو کر گرتی رہتی ہوں اور وہ انہیں ایک گراں بہا متاع کی مانند سنبھالتی پھرتی ہو.. اُس تخت کا دھیان کرتی ہو جہاں کبھی بیج ناتھ براجمان ہو کر رعایا کی فریادیں سن کر انصاف کرتا ہو..جو شاید ہر شب حویلی کے اندھیارے گوشوں میں مٹی کے دیئے روشن کرتی ہو تو ایسے گھر کی دیکھ بھال کے لیے جو سُگھڑ پن درکار ہوتا ہے اُس کی تربیت نہیں دی جا سکتی، وہ اُس گھر میں زندگی کرنے سے، اُس کی قدامت کی سرگوشیاں اور آہٹیں سننے سے اور اُس کی قدر کرنے سے ہولے ہولے وجود میں آتا ہے..اور اس حقیقت کی شناسائی سے کہ یہ کوئی گلبرگ یا ڈیفنس کا بے رُوح اور بے شناخت گھر نہیں ہے، دیوان بیج ناتھ کا گھر ہے جس کے اندر جانے کن کن زمانوں کی رُوحیں بھٹکتی پھرتی ہیں اور اگر روحیں ہیں اور بھٹکتی پھرتی ہیں تو اُن کے لیے اس حویلی میں قیام کے بہت سے مناسب مقام ہیں..مثلاً تہہ خانے میں اترتی تاریک دُھول بھری سیڑھیاں جہاں کوئی نہیں جاتا، یہاں تک کہ کبوتر اُن سیڑھیوں پر گھونسلے بنائے بے خطر انڈے دیتے ہیں..یا پھر وہ تاریک راستے جو کمروں میں سے نقب لگا کر جانے کن گلیوں میں جا نکلتے ہیں..بلکہ کچھ مدت پیشتر کھنڈر ہو چکی رہائش گاہوں، آسیب زدہ مکانوں اور پرانی حویلیوں میں رہائش پذیر روحوں اور جنات کی موجودگی دریافت کرنے والی یہاں کسی ٹیلی ویژن چینل کی ٹیم ادھر آ نکلی تھی، اُنہیں یقین تھا کہ کم از کم لاہور کی اس تقریباً گمنام حویلی میں کہیں نہ کہیں تو کچھ جن بھوت وغیرہ قیام پذیر ہوں گے لیکن نہ تو اُن کی کسی ایک آوارہ مزاج رُوح سے ملاقات ہوئی اور نہ ہی کسی نابالغ قسم کے چھوٹے موٹے جن سے پالا پڑا اور وہ مایوس ہو کر چلے گئے..

چنانچہ خورشید نے اپنے سُگھڑ پن سے..اس حویلی کے در و دیوار کو اپنے محدود وسائل اور لامحدود ذوق جمال سے سجا رکھا تھا..حویلی بیج ناتھ میں جامنی رنگ کے لشکیلے پہناوے میں، جس کا سُندر سپنا بیت چکا تھا، ناک کے کوکے کی چاندی بجھ چکی تھی..

''آپ جب آئے تو میں آپ کو پہچان نہ سکی..آپ بہت دیکھے ہوئے لگے..اور پھر..آپ کہیں وہ مشکل نام والے تو نہیں ہیں..''

''جی..میں وہی ہوں..''

''آپ اِدھر کیسے آ نکلے..'' خاور خورشید نے ایک مسرت سے پھوٹتی ہوئی حیرت میں اپنی ناک پر ہتھیلی رکھ کر کہا...

اگر کوئی مجھ سے کہتا کہ ''دیکھ لاہور'' تو میں ذرا بے اعتنائی سے کہتا کہ دیکھ لیا لاہور..اب اور کتنا لاہور دیکھوں..دلّی دروازے کی شاہی گزرگاہ، شاہی حمام، گلی سُرجن سنگھ، مسجد وزیر خان کہاں تک دیکھوں لیکن کراچی سے ''ہوم بوائے'' ایسے تہلکہ خیز ناول کا مصنف ایچ ایم نقوی ایسا گنجا عقاب وارد ہو گیا اور وہ ایک عرصے سے تمنائی تھا کہ میں اپنے شہر کی قدامت سے اُس کا تعارف کرواؤں، اُس کے آثار پر نگاہ کرنے کے لیے اُس کی رفاقت کروں..(اور یہاں میں اپنے بیانیے کو ایک لمحے کے لیے موقوف کر کے آپ کو ایک صدمے سے دوچار کرتا ہوں..میں حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ عین اس لمحے جب میں اپنی تحریر میں ایچ ایم نقوی کا نام لکھ رہا ہوں تو عین اِسی لمحے میرے موبائل پر اُس کا نام روشن ہو گیا..فون اُس کا تھا..وہ کیسے جان گیا کہ لمحۂ موجود میں میرے قلم کی نیلی روشنائی اُس کا نام تحریر کر رہی ہے..مجھے اُس سے ڈر آنے لگا ہے کہ کسی گنجے عقاب میں ایک شیطان کی رُوح بھی تو حلول کر سکتی ہے)..

کراچی میرے لیے، ریڈرز ورلڈ کے لوگ ہیں، عرفان جاوید اور محمد حنیف ہے اور انگریزی ادب کا ''بالڈ ہیڈڈ ایگل'' نقوی اور اُس کی اہلیہ عالیہ بیگم ہے تو میں کیسے انکار کر سکتا تھا، یہ مہربان لوگ میری بوسیدہ ہو چکی عمر رسیدہ کشتی کے بادبانوں میں میزبانی، اُلفت اور محبت کی ہوائیں پھونک کر اُسے دوستی کے سمندروں میں رواں کر دیتے ہیں..

میں نے اُسے جمخانہ کلب کی رہائش گاہ کے گیٹ کے باہر سے اٹھایا اور ہم چل دیئے..میں ایک نیلی شلوار قمیص، پولو کی نیلی جیکٹ اور زرد رنگ کے جوگرز میں اور وہ اپنے مگرمچھ کے چمڑے کے فُل بوٹوں اور ایک ترچھے ہیٹ میں..ہم چل دیئے..

ہم رواں ہوئے اُس سحری سرد سویر میں مال روڈ پر..

اتوار کی صبح کی سرد ویرانیاں تھیں..مال روڈ کے گرد جو قدیم شجر تناور تھے وہ ابھی ابھی کسی خواب میں سے جاگے تھے اور اُن کے پتوں میں سے زرد کرنیں چھنکتی مگر بے آواز پھوٹتی تھیں اور مال روڈ کے ویران

تارکول پر بچھتی چلی جاتی تھیں اور کہیں دھوپ تھی اور کہیں چھایا تھی، اور ہماری کار اس دھوپ چھاؤں میں کبھی دُھوپ میں آتی تھی اور کبھی چھاؤں میں چلی جاتی تھی..

؎ تو نے ہم سفر دیکھا
صبح کے اُجالے میں
راہ کا سہانا پن
دائیں بائیں دورویہ
شادماں درختوں کی،
جھومتی قطاریں ہیں
دھوپ کی خلیجیں ہیں
چھاؤں کے جزیرے ہیں
اِک عجب سُہانا پن
صبح کے اُجالے میں

(مجید امجد)

ہماری کار کے ٹائروں تلے چھاؤں کے جزیرے مَسلے جاتے تھے، دھوپ کی خلیجیں روندی جاتی تھیں، صبح کے اجالے میں..

ڈِ نگا سنگھ بلڈنگ، لکشمی مینشن، دیال سنگھ مینشن، گنگا رام بلڈنگ سب کی سب صبح کی سرد دھوپ میں اور چھاؤں میں..

ہم کچھ دیر کے لیے شاہ عالمی چوک میں رُکے..کیا واقعی یہ وہ مسجد ہے جو ایماں کی حرارت والوں نے شب بھر میں بنادی تھی اور من اپنا پرانا پاپی ہے..کیا یہ وہی شاہ عالمی ہے جو سپردِ آتش ہوا اور جس کی راکھ سے ''راکھ'' نے جنم لیا...نقوی، ایک حیران بچہ، بے یقین کہ میں کس تاریخی جادوگری کی قدیم سلطنت میں آنکلا ہوں..

دلّی دروازے کے باہر کامران سلیم، محمد عباس اور لاہور شہر کا سب سے گھاگ گائڈ جاوید سُریلا ہمارے منتظر تھے..

وہ سب شاہی حمام کی بُھول بھلیوں میں بھٹکتے پھرے، جاوید گیت گاتا پھرا اور میں نے موقع غنیمت جان کر اپنے ایک قدیمی آشنا ریڑھی والے سے کچّی لسّی کا ایک گلاس پیا جس میں مکھن کے متعدد گھنے ذرّے

تیرتے پھرتے تھے، نقوی کو گلی سرجن سنگھ کی وہ دنیا کی سب سے تنگ گلی دکھائی گئی جس کے باسی بمشکل اُس میں سے سمٹ کر، ذرا ترچھے ہو کر باہر نکلتے تھے اور اس کے بارے میں میں نے لکھا تھا کہ اگر اس گلی میں سامنے سے تمہارا ایک عشقِ خاص چلا آتا ہو تو کیسی شاندار مٹھ بھیڑ ہو جائے.. وہ لاکھ کسمسائے پھر بھی آپ کے پہلو سے نکلنے نہ پائے..

''پھولوں والی گلی'' کی نکڑ پر وہی بوڑھا لاہوری چند پھول سجائے بیٹھا تھا.. اُن پر پانی چھڑک کر اُنہیں تر و تازہ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا...

''بسم اللہ.. بسم اللہ..'' اُس نے مجھے دیکھ کر کہا..

پچھلی بار اُس نے بہت آزردہ ہو کر مجھے اپنے دُکھ میں شریک کیا تھا کہ تارڑ صاحب.. زمانہ بدل گیا ہے.. میرے دادا اللہ بخشے اسی تھڑے پر بیٹھ کر پھول بیچتے تھے بلکہ اسی تھڑے پر بیٹھے بیٹھے دم دے دیا.. والد صاحب اُن کی جگہ آ بیٹھے اور پھر میں یہاں بیٹھا بیٹھا بوڑھا ہو گیا ہوں لیکن میری اولاد نے کچھ اور ہی پیشے اختیار کر لیے.. انہوں نے اس پھولوں والی گدی پر بیٹھنے سے انکار کر دیا.. تو میں پھولوں والی گلی کا آخری گل فروش ہوں.. زمانہ بدل گیا ہے..

اس گلی کے دائیں جانب حویلی دینا ناتھ کی بلند فصیلیں تھیں جن کی اُبھرتی ہوئی سُرخ اینٹوں میں کبوترں کے لیے کچھ طاقچے تعمیر کیے گئے تھے اور کبوتر نسل در نسل دینا ناتھ کے زمانوں سے اب تک اپنے آبائی گھونسلوں میں قیام پذیر تھے.. میں اس حویلی کے اندرون سے واقف تھا، وہاں کچھ بھی باقی نہ تھا، سوائے ایک چوکھٹ اور چند فواروں کے خشک آثار کے.. جہاں میں لاہور کے آخری ''صداکار'' سے ملا تھا جو محمدؐ کی صدائیں دیتا بھیک مانگتا تھا..

تو پھر جاوید سُریلا کیوں پھولوں والی گلی میں چلا جاتا تھا.. حویلی دینا ناتھ تو میں دیکھ چکا..

گلی کے آخر میں حویلی دینا تھ کے پہلو میں ایک پرانا دروازہ تھا اور جاوید سُریلا اُسے کھول کر اندر چلا گیا، کچھ دیر بعد نمودار ہوا اور کہنے لگا ''آ جائیے تارڑ صاحب..''

''اندر کیا ہے؟''

''حویلی بیج ناتھ.. آ جائیے.. میں نے اجازت حاصل کر لی ہے..''

چوکھٹ کو پار کیا تو ایک تاریک سا ماحول تھا، اُس ماحول کے باہر قدم رکھا تو روشنی تھی.. ایک دھوپ بھرا صحن تھا، لاہور کی ایک گمنام حویلی کے آثار سانس لیتے تھے.. ایک مکمل مدھ بھری خاموشی تھی جس میں کبوتروں کی غٹرغوں کی غنائیت کانوں میں غُوں غُوں کرتی اترتی تھی.. شہر لاہور کے شور شرابے اور شور و غل کے درمیان میں خاموشی کی ایک بستی تھی..

مرجھائی ہوئی کجلا بھری آنکھوں والی خاور خورشید، کسی سحر کو پوشیدہ کیے ہوئے ایک جامنی رنگ کے پیراہن میں ملبوس ایک عورت..ہمیں خوش آمدید کہتی تھی..

نقوی، کراچی کے جزیرے میں کب سے گُم، اپنے شہر کے جہان کو کُل جہان سمجھنے والا، اس جہانِ حیرت کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا..اُسے توقع ہی نہ تھی..

''یہ لاہور ہے تارڑ صاحب؟''

''ہاں یہ وہ لاہور ہے جس کی نہ صرف تمہیں..بلکہ محمد حنیف، ندیم اسلم، عظمیٰ اسلم خان اور کاملہ شمسی کو بھی خبر نہیں کہ تم انگریزی میں ناول لکھنے والے بے شک بین الاقوامی شہرت کے لُطف اٹھاتے ہو..اپنی تخلیق کردہ دنیاؤں میں مست رہتے ہو اور نہیں جانتے کہ ان سے پرے بھی ایک اور دنیا ہے جو..لاہور ہے..''

''کیا آپ کو خبر تھی؟'' نقوی دانت نکوس کر بولا..

''نہیں..'' میں نے اقرار کیا ''مجھے اس حویلی کے وجود کی تو کچھ خبر نہ تھی..''

''تو کہیں آپ بے خبر اور کہیں ہم بے خبر..''

خاور خورشید نے کمال کی مہربان میزبانی کی اور ہمیں اپنی حویلی کا چپّہ چپّہ دکھلایا..سرخ سیمنٹ کا ابتدائی فرش دکھلایا جس میں ابھی تک صدیوں سے روندے جانے کے باوجود کوئی دراڑ نمودار نہ ہوئی تھی بلکہ ہمیں اُس کی چھت بھی دکھلائی کہ ذرا دیکھئے، ذرا اوپر نگاہ کیجئے..مرکزی ہال کی چھت کا ایک حصہ ابھی تک اپنی ابتدائی تعمیر کے نقوش اور آرائشیں سنبھالے ہوا تھا اگرچہ اُس پر زمانے کی گذران کے زوال کی سیاہی کی پرچھائیاں سیاہ ہو رہی تھیں..جیومیٹریکل تراش کے نمونوں میں کہیں کہیں چوکور اور گول شیشے جڑے ہوئے تھے بے شک اُن پر بیت چکے ان گنت موسموں کی یلغار نے اُن کا آئینہ پن بجھا دیا تھا، وہ اس قابل نہ رہے تھے کہ اگر کوئی ماہ رو اُن کے سامنے آئے تو اُسے اپنا چاند چہرہ نظر آ جائے..وہ اندھے ہو چکے تھے..

خاور خورشید ایک عجیب حسرت آمیز حُزن سے اُس شاندار نگار والی چھت کو تک رہی تھی جیسے کبھی اُس میں جڑے ہوئے شیشوں میں اُسے اپنا عکس، تصویر دکھائی دیتا ہوگا..اس چھت کے کنارے ڈھیتے جاتے تھے، زمانے کے بہاؤ کی شدت سے اس کے کنارے مسمار ہو رہے تھے..

''ہاں..'' میرے استفسار پر خاور خورشید نے سر ہلایا ''اسی چھت کے ٹکڑے منقش جالیاں اور آئینے گرتے رہتے ہیں اور میں اُنہیں نہایت احتیاط سے سنبھالتی رہتی ہوں..آپ کو دکھاؤں گی..''

اس مرکزی نشست گاہ سے ذرا بلند سطح پر ایک تخت بچھا تھا، تخت تو خیر کیا تھا ایک کمرے کے کونے میں ایک چوکور تھڑا تھا پرانی اینٹوں کا جس پر ایک چادر بچھی تھی، یہ بیج ناتھ کی نشست تھی جس پر جلوہ افروز ہو کر وہ نیچے ہال کمرے میں جمع فریادی مخلوق کی دوہائیوں پر کان دھرتا تھا شاید انصاف کرتا تھا..دھوپ ایک تیز دھار خنجر

کی مانند ایک ترچھے روزن میں سے داخل ہو کر کمرے کی نیم سیاہی میں اترتی جاتی تھی..

آخر یہ دیوان بیج ناتھ کون تھا..ایک مدت تک بہت لوگ اس مغالطے کا شکار رہے کہ پھولوں والی گلی کی یہ دونوں حویلیاں دیوان دینا ناتھ کی ہیں لیکن اب جا کر کُھلا کہ یہ دونوں حویلیاں آپس میں منسلک نہیں، دینا ناتھ اور بیج ناتھ کے زمانوں میں بہت فرق ہے..

بیج ناتھ کون تھا، اس گُتھی کو سلجھانے کے لیے ہم ایک مرتبہ لاہور کے محسن محقق اپنے منشی کنہیالال سے رجوع کرتے ہیں..

''دیوان بیجا ناتھ کو تحصیلداری کا عہدہ ملا پھر وہ ترقی کرتا ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور ہوا مگر اُس کی تبدیلی لاہور سے امرتسر ہوگئی..اُس کا باپ دیوان اجودھیا پرشاد 1870ء میں مرگیا..بعدازاں بیج ناتھ جوالا جی کے درشن کو گیا اور اُس جگہ ہیضے کی بیماری سے مرگیا..یہ شخص خوش مزاج، خوش خلق، نیک طینت اور صاحبِ مروت تھا، یہ کشمیری خاندان کا چشم و چراغ تھا..''

یعنی بیج ناتھ ہرگز مہاراجہ رنجیت سنگھ کا بیٹا وغیرہ نہ تھا.. بلکہ انگریزوں کے زمانے میں لاہور کا ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہوا کرتا تھا..

ایک روایت کے مطابق جب یہ دونوں حویلیاں، دینا ناتھ اور بیج ناتھ کی رہائش گاہیں تعمیر کی گئیں تو ان کے صدر دروازے، مسجد وزیر خان کے داخلے کی محراب کے عین سامنے کھلتے تھے..

ایک بوسیدہ سی تپائی پر قلعہ لاہور کی ایک واٹر کلر تصویر کا پرنٹ آویزاں تھا جس کی مصور کردہ گھاس میں اتنی کاملیت تھی کہ وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اگرچہ یہ خالد اقبال کی پینٹنگ نہ تھی..

ایک طاقچے کی محراب کو دھواں چاٹ رہا تھا اور اُس کے اندر مٹی کا ایک دیا جانے کب سے بجھا پڑا تھا..

شاید میرے وجود کے اندر جو طاقچے ہیں اور ان میں وہ سب دیئے جو کبھی روشن ہوا کرتے تھے، خواہشوں اور تمناؤں کے، روشن راستوں اور آئندہ زمانوں کو سنوارنے اور دل کش بنانے کے وہ سب کے سب اس آخری عمر میں بجھ چکے ہیں، دل میں نہ کوئی حسرت ہے اور نہ ہی بقیہ چند روزہ حیات میں کچھ کمال کر جانے کی خواہش تو شاید اسی لیے اور کسی نے نگاہ نہ کی صرف میری نگاہ اُن سب محرابوں، طاقچوں کارنس اور صندوقوں پر سجے مٹی کے دیئوں کی جانب چلی گئی جو اس حویلی کی نس نس میں بُجھے پڑے تھے، اگرچہ وہ بُجھے ہوئے تھے لیکن جب میری آنکھیں اُن پر ٹھہرتیں تو مجھے لگتا کہ وہ روشن ہو گئے ہیں..

پورے آٹھ چراغ بُجھے ہوئے ایک بوسیدہ الماری پر جسے کروشیے کے غلاف سے ڈھکا گیا تھا..ان

چراغوں کے گرد کچھ پھول اور رنگین کاغذوں کی کترنیں یوں پڑی تھیں جیسے کسی نے ان پر چڑھاوے چڑھائے ہوں.. ہر طاقچہ اور ہر محراب گویا ایک ''درگاہ'' تھی.. چراغوں کی ایک سجاوٹ کے عقب میں جو دیوار تھی اُس پر سورۃ یٰسین کی خطاطی آویزاں تھی..

چراغ کہیں بھی چار نہ تھے..

کہیں آٹھ تھے اور کہیں چھ تھے..

یعنی وہ جو ہر مجذوب.. پانچواں چراغ جلانے کے لیے آتا ہے جہاں ہمیشہ چار چراغ جلتے ہیں، اُس کے لیے ایک اور چراغ جلانے کی گنجائش نہ تھی..چار چراغ ترے بلن ہمیشہ..پنجواں میں بالن آئی جھولے لالن..اور جھولے لال کون تھا، عثمان مروندی شہباز قلندر نہ تھا، ایک ہندو فقیر تھا..

مجھے اس حویلی کی ''بجھی ہوئی دیوالی'' سمجھ میں نہ آتی تھی..ایک دبیز دیوار کی اوٹ میں ایک آسانی سے دکھائی نہ دینے والے طاقچے میں، ردّی اخباروں پر چھ مٹی کے دیئے سجے ہیں اور اُن کے اندر تیل کی چند بوندیں باقی ہیں، لگتا ہے کہ پچھلی شب انہیں روشن کیا گیا تھا کہ ان کی باچھوں میں سے سیاہ تیل اخباری کاغذ پر گرا ہوا تھا..انہیں پچھلی شب کسی نے روشن کیا ہوگا، جامنی رنگ کے شکیلے پہناوے والی ہماری میزبان خاتون کے سوا اور کس نے کیا ہوگا..لیکن میں نے مناسب نہ جانا کہ اُن سے سوال کروں کہ اے مہربان بی بی، بجلی کی موجودگی میں، لیمپوں، چھتوں سے لٹکتے بلبوں اور ٹیوبوں کے باوجود ان سب چراغوں کو سرِ شام اگر کوئی روشن کرتا ہے تو کیوں..ایسا تو نہیں کہ دیوان بیج ناتھ اور اُس کے بیٹوں کی روحیں چتا میں راکھ ہو جانے کے باوجود قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ہوں اور اب اپنی آبائی حویلی میں سرِ شام چراغ جلانے کے لیے وارد ہو جاتی ہوں.... کیا ایک دُکھ بھری حیات کا مداوا یہی ہے، ناآسودہ تمناؤں کی آسودگی کا اظہار یہی ہے کہ آپ اس حویلی کے کونے کھدروں اور محرابوں میں جتنے بھی دیے ہیں اُن سب کو جلا کر تاریکی حیات میں آس امید کے کچھ جگنو ٹمٹما دو.. میں کیسے پوچھتا..ویسے یہ سب جو شائبے اور سراب ہیں، میرے خیال اور جنوں انگیز قیاس ہیں شاید میرے واہموں کے صحرا میں بگولوں کی مانند اُٹھتے ہیں اور اِن بجھے ہوئے چراغوں کے گرد مولانا رُوم کے درویشوں کی مانند گھومتے چلے جاتے ہیں، ان کا اعتبار نہ کیجئے گا..

اس مرکزی ہال سے متصل ایک اور کمرہ دنیا جہان سے الگ ایک قدیم تنہائی کی دبیز دیواروں میں پوشیدہ..اور دیواروں پر بھی محرابوں کے نقش..ایک کونے میں فرش کے نشیب میں چوکور بناوٹ کا ایک ''کھرا'' تھا جہاں پانی بہایا جاتا ہوگا کہ دیوار میں اخراج کا ایک سوراخ نمایاں نظر آتا تھا..اس روپوشی میں یہاں گھر کے گندے برتن تو مصفا نہیں کیے جاتے ہوں گے، کوئی نہ کوئی تو یہاں ان دبیز دیواروں کی پردہ پوشی میں اشنان کرنے کے لیے بے لباس تو ہوتا ہوگا..

زرد چادر سے ڈھکی ایک چارپائی کے برابر میں ایک پنجابی حقّہ دھرا تھا.. یونہی تو نہ دھرا تھا.کوئی نہ کوئی تو اس حویلی کا گزشتہ مکین اس کمرے میں، جہاں ایک دیوار میں، چھت کے قریب ایک چوکور بناوٹ کے اندر دِکھتی سیڑھیاں جانے فرار کے کونسے راستوں تک جاتی تھیں،کوئی نہ کوئی تو اس حقّے کے کش لگاتا ہوگا..وہ خاور خورشید تو نہیں ہوسکتیں تو پھر کون تھا..

''پیار کا پہلا پنجاب'' میں سیالکوٹ کے راستے میں واقع ایک ایسے مجذوب کی داستان درج ہے جس نے وصیّت کی تھی کہ مجھے دفن نہ کیا جائے،اُن کا تابوت آج بھی ایک مقفل کمرے کے اندر زنجیروں سے لٹکتا ہے یہ مجذوب بھی علامہ اقبال اور میرے اباجی کی مانند حقّے کا دم لگا کردم لیتے تھے چنانچہ اُن کے کمرے میں سرِشام ایک سلگتا حقّہ رکھ دیا جاتا ہےاور روایت کے مطابق وہ اپنے معلق تابوت سے اٹھ کر پوری رات وہ حقّہ گڑگڑاتے ہیں اور فجر سے پہلے پہلے پھر سے اپنے تابوت میں جالیٹتے ہیں..

حویلی بیج ناتھ کے ایک پوشیدہ کمرے میں اگر یہ حقّہ دھرا ہےتو وہ کون ہے جو اس کے کش لگاتا ہے..

اس مرکزی ہال سے پیوستہ ایک دبیز محراب کے اندر ایک اور حیرت کدہ آماجگاہ کے پوشیدہ در و دیوار ہیں اور یہ محض ایک کمرہ نہیں سورج کی روشنی سے گریز کرتی ہوئی ایک اوجھل رہائش گاہ ہے..میں اس کی قدیم شانداری اور محراب در محراب سحر انگیزی کو حرفوں کی قید میں لانے سے یکسر قاصر ہوں.. یہ کنگرے دار گھنی محرابوں، جھروکوں، طاقچوں اور دلکش چوکھٹوں سے تزئین کردہ ایک مقام تھا..اور ہر محرابی چوکھٹے کے اندر جتنے بھی تصویری چراغ تھے وہ سب بجھا دیئے گئے تھے،سب نشانیاں رادھا کرشن اور ہمارے لیے اجنبی دیوی دیوتاؤں کی جو کبھی نقش تھیں،مٹ چکی تھیں اور مٹا دی گئی تھیں..ہم قدیم عجائب کے اس آثار میں جھجک جھجک کر حرکت کرتے تھے تاکہ ایک وسیع پلنگ پر چمکیلی رضائی میں لپٹا وہ شخص جو نیم خوابیدہ حالت میں کروٹیں بدلتا ہے اور خورشید کا بیٹا ہے.. ہماری آمد سے بیزار نہ ہو.. چونکہ اس حویلی کی گھنی دیواروں میں سے سورج کی روشنی سرایت نہیں کرسکتی تھی اور اس آماجگاہ میں ابھی تک نیم اندھیارا راج کرتا تھا اس لیے رضائی میں لپٹے شخص کو خبر ہی نہ تھی کہ صبح ہوچکی ہے..

صرف ایک سلاخوں میں جڑی کھڑکی تھی جو بازار پر کھلتی تھی اور وہ بھی ایک ایسے زاویئے پر ثبت تھی کہ دھوپ اُس سے گریزاں ہوکر کسی اور جانب سفر کرجاتی تھی..

وسیع پلنگ پر چمکیلی رضائی میں لپٹا وہ نوجوان جائز طور پر ہمیں جھڑک بھی سکتا تھا کہ ہم اُس کی خوابگاہ میں دندناتے ہوئے چلے آئے تھے،اُسے کچّی نیند سے بیدار کرکے بیزار کردیا تھا لیکن وہ ایک رکھ رکھاؤ والی تہذیب یافتہ خاتون کا سپوت تھا،اُس نے کچھ نہ کہا..البتہ بار بار کروٹیں بدل کر اپنی بیزاری کا اظہار بہرطور کرتا رہا...

لاہور آوارگی کے برسوں میں کچھ عجب سے اتفاقات مشاہدے میں نقش ہوتے رہے یعنی اکثر میں نے قدیم حویلیوں، پرانے گھروں اور زوال پذیر رہائش گاہوں کی کچّی کوٹھڑیوں میں، اگر موسم سرما ہے تو کسی رضائی میں لپٹے ہوئے اور اگر گرمیوں کے دن ہیں تو چھت پر کھلے آسمان تلے لاہوری نوجوانوں کو دن چڑھے تک خواب خرگوش میں گم نیند میں دھت بے خبر سوتے دیکھا ہے تو میں نے ایک بار جاوید سے پوچھا کہ اے سُریلے میاں یہ نوجوان اتنی دیر تک کیوں سوئے رہتے ہیں تو اُس نے نہایت سنجیدگی سے کہا ''سر جی یہ لاہور کے شہزادے ہیں، مغل چلے گئے اپنے شہزادے چھوڑ گئے..''

''یہ کرتے کیا ہیں؟''

''دوپہر تک سوتے ہیں، جاگتے ہیں، شہابے کی حلوہ پُوڑی کھاتے ہیں، پھجے کے پائے نوش کرتے ہیں اور گئی رات تک گلیوں میں گھومتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں..''

''لیکن یہ کرتے کیا ہیں؟''

''بس یہی کرتے ہیں سر جی..''

''میرا مطلب ہے اپنی گزر اوقات کے لیے کیا کرتے ہیں؟''

''یہ تو اللہ ہی جانتا ہے..''

بہرطور حویلی بیج ناتھ کے سب سے شاہانہ اور پُرکشش حصّے میں ریشمی رضائی میں لپٹا نوجوان اُن مغل شہزادوں میں سے نہ تھا..وہ کوئی نہ کوئی کام کاج کرتا تھا، آج محض اس لیے دیر تک سویا ہوا تھا کہ چھٹی کا دن تھا.. ویسے مجھے اس نوجوان کی قسمت پر بہت رشک آیا کہ اس کے نصیب میں کیسی خواب ناک خوابگاہ ہے، دبیز ستون، منقّش چھت، قدیم شکلوں کے فرش، محرابوں میں پوشیدہ ایسے طاقچے جن میں چراغ بجھے پڑے تھے اور دیواروں پر ایسے محرابی چوکھٹے جن میں کہیں کہیں اُن میں نقش کی گئی تصویروں کے مٹتے ہوئے آثار تھے اور ایک خاموشی..اور یہ خاموشی ایک ٹھنڈک بھری زوال پذیر مہک میں بہت خاموش..اور میں نے اپنے آپ کو جان بوجھ کر ایک دیوانگی میں مبتلا کیا کہ اگر یہ محراب در محراب قدیم خاموشی میں سانس لیتی ہوئی خواب گاہ میری ملکیت ہوتی تو میں اسے کیسے آرائش کرتا..اپنی رہائش کے لیے اس کی تزئین کے سامان کن صورتوں میں کرتا.. یقیناً بجلی کے بلب اور ٹیوبیں اُتار دیتا.. یہاں پنکھوں کی بھی حاجت نہ تھی کہ ٹھنڈک کا ایک موسم اس کی دبیز دیواروں میں ٹھہرا ہوا تھا.. چوکھٹوں میں جن دیومالائی دیویوں اور دیوتاؤں کی تصویریں قلعی کے پوچے سے مٹا دی گئی تھیں، اُنہیں پھر سے ظاہر کر کے اسے ایک آرٹ گیلری کا روپ دیتا اور پھر یہاں کیا کرتا.. کس طور

شب و روز کرتا، سب چراغ محرابوں اور طاقچوں کے روشن کر کے کسی عشق خاص کی شکل دیکھتا تو یہ سب دیوانگی کی شکلیں ہیں، عمر خیام نے برلبِ آب، ایک ندی کنارے ارغوانی مے کے ایک پیالے، شعروں کی ایک کتاب اور اپنے عشق خاص کے چہرے کی تمنا کی تھی..

انگریزی زبان کا ایک محاورہ ہے کہ..اگر خواہشیں گھوڑے ہوتیں تو بیوقوف اُن پر سواری کرتے..

میں بھی وہی بیوقوف تھا..

•

اس ٹھنڈک بھری روپوشی میں مبتلا خواب گاہ کے پہلو میں سے کچھ تنگ سیڑھیاں نیچے اترتی جاتی تھیں..

ہم اُن پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے تھے..

اُن کی تہہ میں پہنچے تو وہاں ایک اور خاندان خوش و خرم آباد تھا..

حویلی بیج ناتھ ایک بُھول بھلّیاں تھی، ادھر بُھولے، اُدھر نکلے، اُدھر اترے تو جانے کہاں اتر گئے..

مجھ میں ایک مینوفیکچرنگ فالٹ ہے یعنی جب کوزہ گر نے اپنا چاک گھما کر مجھے تخلیق کیا تو مجھ میں کچھ خامی رہ گئی، جامِ سفال کی بناوٹ میں کجی رہ گئی، صراحی کی گردن میں خم آ گیا اور میں ادھورا رہ گیا، یعنی کسی اَن دیکھے منظر کے روبرو ہوا تو اُس کے نظارے نے مجھے برباد کر دیا، کسی چہرے کی خوش نمائی یا کسی قدیم کھنڈر کی اداس ویرانی پر نظر گئی تو میں اپنے آپ میں نہ رہا..ایک ایسے ہیجان میں مبتلا ہوا کہ کوئی بھی مجھ سے بات نہ کرے، کلام نہ کرے اور حویلی بیج ناتھ نے مجھے اسی آفت سے دوچار کیا، میں اپنے ساتھیوں کی موجودگی سے بے خبر ہو گیا...ایک ایسے ہیجان کے بخار میں پُھنکنے لگا کہ نہ مجھے کسی کی آواز سنائی دیتی تھی اور نہ ہی مجھے سوائے اُس حویلی کے در و دیوار اور بجھے ہوئے چراغوں کے کچھ اور دکھائی دیتا تھا..

''سر جی..'' جاوید سُریلے نے مجھے گمشدہ اور اپنے خبط میں کچھ غتر بود ہوتے دیکھ کر نہایت تشویش ناک انداز میں سرگوشی کی..

''کون ہے؟''

''میں ہوں سَر..''

''تم کون؟''

''میں آپ کا جاوید سُریلا..سَر جی اس حویلی کی چھت پر عمر حیات کے خاندان کے لوگ بسیرا کرتے ہیں، اُنہیں آپ کی آمد کی خبر ہوئی ہے تو نوجوان حیات کی خواہش ہے کہ آپ اوپر چھت پر چلیں اور شہر لاہور کے بہترین نظارے کریں..اور وہاں بقول اس نوجوان کے پورے چھ سو کبوتر آپ کو خوش آمدید کہنے کے لیے

غٹرغوں غٹرغوں کرتے ہیں.."

"چھ سو کبوتر.. کچھ کم نہیں ہو سکتے.."

"آپ کہتے ہیں تو دو تین کم کر لیتے ہیں.." جاوید ثریلا کی آبائی حسِ مزاح کبھی کبھار مزا دے جاتی تھی.. اُن قدیم آماجگاہوں میں آباد خاندانوں کے درمیان بجا طور پر ملکیت کے کچھ جھگڑے ہوتے ہیں لیکن خاور خورشید معترض نہیں "دیکھ آئیے.."

چھت پر جانے والی سیڑھیاں حسب معمول تنگ اور ایک دو ٹانگوں پر کھڑے ہونے والے گھوڑے کی مانند الف ہو رہی تھیں..

"تارڑ صاحب.. کچھ ضروری نہیں کہ چھت پر جایا جائے.." نقوی میرے لیے فکرمند ہو گیا.. "آپ کے لیے مشکل ہو گی.."

"برخوردار میں ابھی چند ماہ پیشتر حراموش پر چڑھ گیا تھا تو ان سیڑھیوں کی کیا حیثیت ہے.. بے شک سیڑھیاں چڑھتے میرا دل تھم جائے پر میں نہیں تھموں گا کہ میں ایک ہیجان میں ہوں.. ہٹ جاؤ.."

دوسری منزل پر پھیلی وہ چھت کیا تھی ایک وسیع میدان نما صحن تھی، جس کے کناروں پر مغل جالیوں کا حصار تھا اور اُس پر پورا آسمان اترتا تھا، پورا سورج روشن ہوتا تھا.. دائیں جانب رہائشی کمروں کے مقفل اور کچھ نیم وا بوسیدہ دروازے جن کے گرد محرابیں ہار ہوتی تھیں.. در و دیوار کائی زدہ موسموں کے مارے ہوئے تھے..

ایک نیلے ڈرم کے اوپر سرخ پتھر کی دو تین سِلیں جو یقیناً کبھی فرش ہوا کرتی تھیں تہہ در تہہ رکھی تھیں اور اُن پر دھرا طوطے کا پنجرہ سلوں کی ناہمواری کے باعث ذرا ٹیڑھا ہو رہا تھا اور اُس میں قید میاں مٹھو بھی ذرا ٹیڑھا ہوا جاتا تھا، وہ بار بار پَر پھڑپھڑا کر اپنا توازن قائم رکھنے کی سعی کرتا لیکن پھر سے ترچھا ہو جاتا.. کوئی بھی اُس کی حالتِ زار پر رحم کھا کر اُن سلوں کو دوبارہ سے ایک دوسرے پر جما کر ہموار نہیں کرتا تھا.. ہموار سلوں پر رکھا پنجرہ بھی ہموار ہتا جس کے نتیجے میں میاں مٹھو بھی اطمینان سے ہموار ہو کر بیٹھتا پر اُس کے نصیب میں یہی لکھا تھا کہ وہ ٹیڑھا ہی بیٹھے رہنے پر قناعت کر جائے..

طوطے کے سوا جالیوں سے آراستہ سرخ بھربھری منڈیر پر چُہلیں کرتے دو سفید برف کبوتر تھے جو غالباً لکّے کبوتر کہلاتے ہیں جن میں سے ایک کبوتری تھی جو اپنے حسن کے نکھار پر نازاں، ایک سفید مور کی مانند اپنی دُم کی جھالر پھیلائے کبوتر سے بے اعتنائی برتتی گویا ایک بیلے رینا کی مانند "سوان لیک" کے آپرا میں رقص کرتی تھی..

اس وسیع چھت کے ایک حصّے میں سے آہنی سلاخوں اور جالیوں سے مزین کبوتروں کی رہائش گاہ

کا ایک آہنی جالیوں والا سکائی سکریپر، کم از کم چار پانچ منزلہ بلند اُس لاہوری آسمان پر اٹھتا تھا جہاں پابندی کے باوجود کم از کم تین آوارہ پتنگیں بے راہرو طوائفوں کی مانند کندھے مارتی ڈولتی پھرتی تھیں، فی الحال اس سکائی سکریپر پنجرے میں چند ایک کبوتر بیکار بیٹھے تھے اور بقیہ کبوتر جو یہاں رہائش پذیر تھے، گمان غالب ہے کہ فی الحال ہماری نظروں سے اوجھل فضائے بسیط میں اڑانیں کرتے پھرتے تھے..

تب میں نے اُس خوش طبع ریش بردار نوجوان حیات سے استفسار کیا کہ اس سکائی سکریپر جنگلے میں عام طور پر کتنے کبوتر سما جاتے ہیں اور وہ کس کے ہیں؟

''بھائی جان کے ہیں..''

''کُل کتنے ہیں؟''

''چھ سو کے قریب ہوں گے..''

''کچھ کم نہیں ہو سکتے؟''

''بھائی جان کہتے ہیں کہ چھ سو ہیں.. میں نے خود نہیں گنے... سبھی کبوتر ایک ہی وقت میں پنجرے میں اکٹھے نہیں ہوتے، کچھ صبح سویرے اُڑانیں کرتے چلے جاتے ہیں اور رات گئے لوٹتے ہیں اور کچھ نہیں لوٹتے، اگلی سویر واپس آتے ہیں..''

''یہ پوری رات غائب رہنے والے کبوتر کہاں جاتے ہیں؟''

''کبوتریوں کے ہاں..''

''بہت خوب..'' کبوتر داستان پُراسرار ہوتی جاتی تھی ''یعنی یہ بے راہ رو قسم کے بدمعاش کبوتر ہوتے ہیں جو کبوتریوں کے ساتھ شبیں گزارتے ہیں..''

''نہیں جی.. شہر کے نہایت کاروباری کبوتر باز بھائی جان کی نایاب نسل کے کبوتروں کو پھانسنے کے لیے اپنی کبوتریاں کھلی چھوڑ دیتے ہیں لیکن یہ پھنستے نہیں کبوتریوں کے ساتھ موج میلہ کر کے واپس آجاتے ہیں.. البتہ ان کی کبوتریاں بے شمار انڈے دینے لگتی ہیں جن میں سے بھائی جان کی نایاب نسلوں کے کبوتر نکل آتے ہیں..''

میں تو کبوتروں کی اس پوشیدہ جنسی حیات کے رموز سے واقف ہی نہ تھا، میں خود ایک حیرت زدہ کبوتر ہو گیا..

''ویسے بھائی جان کرتے کیا ہیں؟''

''بس یہی کرتے ہیں..''

''پورے چھ سو کبوتر ہیں؟''

''میں نے کبھی گنے نہیں.. بھائی جان کہتے ہیں کہ چھ سو ہیں..''

ویسے اُس کئی منزلہ بلند سکائی سکریپر پنجرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہاں سو دو سو نہیں کئی سو کبوتر رہائش پذیر ہو سکتے ہیں..

''بھائی جان کبوتروں کا کاروبار کرتے ہیں؟''

''نہیں انکل..'' حیات میری سادگی پر مسکرایا ''بس شوق ہے..''

''اور شوق کا تو کوئی مول نہیں..''

''ہاں انکل..''

''کمال کا شوق ہے..''

ویسے بھائی جان نے اپنے شوق کی خاطر جتنے بھی کبوتر پال رکھے تھے، ان کی دیکھ بھال کرنا ایک فُل ٹائم جاب ہے.. اُنہیں دانہ ڈالنا، پانی پلانا، اُن کی عمومی صحت کا خیال رکھنا، بیماری کی صورت میں کسی ڈنگر ڈاکٹر سے رجوع کرنا، ان کے پروں کو سنوارتے اُن میں سے جُوئیں نکالنا، وصل کے موسموں میں کبوتروں کو کبوتریاں اور کبوتریوں کو کبوتر مہیا کرنا، روزانہ پنجروں کی صفائی ستھرائی کرنا اور پھر اُنہیں پنجروں سے نکال کر مائل پرواز کر دینا، سارا دن آسمان پر ٹکٹکی لگائے اُن کی واپسی کے منتظر ہونا اور واپسی پر اُن کے پروں کو تھپک کر شاباش دے کر پنجروں میں سُلا دینا، یہ ایک فل ٹائم جاب نہیں تو اور کیا ہے..

ویسے مجھے شک ہے کہ بھائی جان کبوتروں کا کچھ نہ کچھ تو کاروبار کرتے ہوں گے ورنہ چھ سو کبوتروں کو کھلانے کے لیے دانے دال کی کم از کم تین چار بوریاں تو درکار ہوتی ہیں..

ایک زمانے میں، میں اس تاریخی مغالطے کا شکار تھا کہ یہ کبوتر بازی، بٹیر بازی تاش اور شطرنج کی بازی اور ایک اور بازی جسے علتِ مشائخ بھی کہا جاتا ہے یہ صرف مسلمان اقوام کا شعار ہیں، لاہور تو کیا دلّی، دمشق یہاں تک کہ یارقند اور کاشغر کے گھروں کی چھتوں پر بھی میں نے کبوتروں کے آہنی پنجروں کے آثار بلند ہوتے دیکھے ہیں اور یارقندی حضرات کو بھی مُنہ اٹھائے کبوتروں کی اڑان کے دھیان میں غرق دیکھا ہے اور پھر مجھ پر کُھلا کہ صرف ہم نہیں ایک دنیا کبوتروں کی غٹرغوں کے عشق میں مبتلا ہے...امریکہ اور یورپ میں بھی کبوتر دیوانگی کا کچھ شمار نہیں.. خاص طور پر ہالینڈ نایاب اور سدھائے ہوئے کبوتروں کی سب سے بڑی منڈی ہے اور چینی حضرات اُن کے سب سے بڑے گاہک ہیں، وہ لاکھوں ڈالر میں ایسے کبوتر خریدتے ہیں جو پیغام رسانی کے لیے پرورش کردہ ہوتے ہیں، وہ ہزاروں کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے سرحدیں عبور کر کے ایک طے شدہ منزل تک پہنچ جاتے ہیں، گویا ایک پنجابی لوک گیت کی تفسیر کرتے ہیں کہ..

واسطہ اِی رَب دا تُوں جاویں وِے کبوترا

چٹھی میرے ڈھول نُوں پہنچاویں وے کبوترا!

ان زمانوں میں قربتِ قیامت کے آثار ہیں کہ حضرت انسان اپنی من مرضی سے فی الحال جانوروں اور پرندوں کو کلون کر کے مخلوط کر کے عجب سے جانور اور پرندے بنا رہے ہیں، جو کام رَب نے کرنا ہے وہ خود کر رہے ہیں.. ایسے طوطے مخلوط کر رہے ہیں کہ اُن کے پروں میں درجنوں مختلف رنگ نا قابل یقین رنگت کے رنگین ہوتے ہیں، ایسے پھول تخلیق کر رہے ہیں جن کی ہر پتّی کا رنگ جدا ہوتا ہے، ایسی بلّیاں بنائی جا رہی ہیں جن کے کان گھوڑوں کی مانند کھڑے ہوتے ہیں اور دونوں آنکھوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور ایسے ایسے عجوبہ کبوتر دیکھنے میں آ رہے ہیں جو دور سے سفید اُون کا ایک گیند نظر آتے ہیں اور اُس سفیدی میں سے ایک سرخ چونچ نمودار ہو کر غٹرغوں کرنے لگتی ہے، قربِ قیامت کے آثار..

''تو بھائی جان صرف شوق کی خاطر پورے چھ سو کبوتر پالتے ہیں..''

''ہاں جی.. پر میں نے کبھی گنے نہیں..''

اس میدان نما چھت کے اختتام پر چند کائی زدہ سیڑھیاں اس چھت کے کناروں پر پھیلے ایک مستطیل شکل کے کوٹھے تک جاتی تھیں اور یہاں مجھے یاد آیا کہ ہم اپنے سہ منزلہ چیمبرلین روڈ والے مکان کی پہلی چھت کو کوٹھا کہتے تھے اور اُس سے اوپر جو ایک اور چھت کھلے آسمان تلے تھی اُسے ''ڈھور کوٹھا'' کا نام دیا جاتا تھا.. اب اُس ڈھور کا مطلب مجھے زبان کے شناور بتا دیں، شاید یہ آخری کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا.. عین ممکن ہے کہ ہمارے ایک قدیم لوک گیت ''چَن کتھاں گذاریا ای رات وے'' میں جہاں ایک مصرع ''کوٹھے تے پر کوٹھڑا'' آتا ہے اس سے مراد یہی ''ڈھور کوٹھا'' ہو.. یعنی آخری چھت..

کھلے آسمان تلے اس آخری چھت سے ذرا احتیاط سے نیچے جھانکتے تو نیچے حویلی بیج ناتھ کا صحن نظر آتا ہے اور اگر سامنے دیکھئے تو حویلی دینا ناتھ کی غیر آباد چھت پر اُگی سنہری رنگت کی گھاس اُلجھی ہوئی اور ہوا کے زور سے سرسراتی دکھائی دیتی ہے اور اس کے پس منظر میں مسجد وزیر خان کا ایک مینار قدیم عمارتی گنجلکوں میں سے بلند ہوتا اپنی پرشکوہ شکل سے شہر لاہور پر اپنی مُہر ثبت کرتا نظر آتا ہے..

اس چھت پر شاہی قلعہ کی نولکھا پویلین کی شباہت کی ایک مسمار ہوتی، کائی زدہ، ٹوٹ پھوٹ کی شکار، جس کی شکستہ اینٹوں میں سے گھاس اُگتی تھی، ایک فراموش شدہ عمارت تھی جس کا قدیم حسن آنکھوں میں اتر کر اِن میں ایک بے نام حُزن بھرتا تھا.... شاید یہ بیج ناتھ کی شبوں کی بیٹھک تھی یا پھر ایک گھریلو پرستش گاہ تھی جس کے اندرون میں اب کاٹھ کباڑ کے علاوہ کبوتروں کے دانے کی بوریاں پڑی تھیں..

''انکل..'' حیات مجھ سے گویا ہوا ''آپ کبھی کسی بسنت کے دن یہاں آتے تو دیکھتے کہ یہاں کیسی کیسی رونقیں ہوا کرتی تھیں، لوگ دور دور سے ہماری چھت پر بسنت منانے کے لیے آتے، لاہوری پکوانوں

کی دیگیں چولہوں سے اترتیں.. آس پاس کے کوٹھوں پر ہر جانب زرد پیراہن نظر آتے اور موسیقی کا شور ہوتا، ڈھول بجتے، یہ رونقیں اب تو تمام ہو چکیں اور انکل بسنت کی رات کٹی ہوئی پتنگیں اور گڈیاں شب بھر اس چھت پر گرتی رہتیں، ہم اگلی سویرا اوپر آتے تو پوری چھت رنگ رنگ کی پتنگوں سے ڈھکی ہوتی..''

ہم ایک مرتبہ پھر نچلی چھت پر اتر آئے.. حیات نے کمروں کے اوپر جو محرابی چوکھٹے شکستگی سے دوچار تھے، اُن کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ کسی زمانے میں ان سب درجنوں چوکھٹوں میں اُن زمانوں کے مصوّروں نے اپنے ہاتھوں سے تصویریں نقش کی تھیں جو سب کی سب یا تو مٹ گئیں اور یا مٹا دی گئیں.. البتہ ایک چوکھٹے میں کچھ بکھرے ہوئے ٹوٹ پھوٹ کا شکار کچھ ٹکڑے باقی تھے جنہیں تصور میں جوڑنے سے کسی پرندے کی شکل کا گمان ہوتا تھا، وہ کونسے پرندے تھے جو کبھی ان محرابوں میں تصویر ہوا کرتے تھے..

چلئے ہم بھی ایک ایسے بے وقوف ہوتے ہیں جو خواہشوں کے گھوڑے پر سوار ہو کر اس گمان میں مبتلا ہوتے ہیں کہ جالیوں سے آراستہ شکستہ دیوار پر چُہلیں کرتے وہ سفید کبوتر اور خاص طور پر وہ رقص کرتی کبوتری بیلے رینا اور پنجرے میں بند وہ طوطا گئے زمانوں میں دراصل ان محرابوں کے چوکھٹوں میں تصویریں ہوا کرتے تھے اور جب انہیں محسوس ہوا کہ نہ صرف تاریخ بلکہ وقت بھی یوں بدلا ہے کہ وہ جو اس حویلی کے آبائی باشندے تھے، جو انہیں ہمیشہ آنکھ بھر کے دیکھتے تھے، اُن کی جگہ وہ آ گئے ہیں جن کے پاس حسن کو پرکھنے والی آنکھیں ہی نہیں ہیں اور وہ انہیں ملیامیٹ کر کے ثواب کمانا چاہتے ہیں اور ہر تصویر اور ہر نقش مٹایا اور بجھایا جا رہا ہے تو وہ اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے ملیامیٹ ہونے سے بچانے کے لیے محرابوں اور چوکھٹوں کی تصویری قید میں سے پھڑ پھڑاتے ہوئے باہر آ گئے..

دو سفید لکّے کبوتر اور ہریل طوطا.. گئے زمانوں کی تصویریں جو زندہ ہو گئی تھیں..

کبوتری جالیوں والی سرخ دیوار پر اِٹھلاتی، اپنی دُم کی سفید جھالر پھیلائے، اینٹوں پر اپنے پنجے یوں دھرتی تھی جیسے ایک بیلے رینا پنجوں کے بل رقص کرتی تھی اور طوطا اداس اور مجہور چُپ بیٹھا تھا..

حویلی نیج ناتھ کے اُس زیرِ زمین نیم تاریک خفیہ تہہ خانے میں اترنے والی بُھر بُھری اینٹوں کی سیڑھیوں پر زمانوں کی مٹی آرام کرتی تھی جس پر میں قدم دھرتا تو اُس میں سے دُھول اٹھتی جس کے ہر ذرّے پر گمشدہ وقتوں کی پرچھائیاں موہوم ہوتی تھیں.. اینٹوں اور دیواروں میں سے گمنامی کا سفید نمک پھوٹتا تھا..

اس حویلی کی قبر کی تہہ میں تو نہ موسم اترتے تھے اور نہ ہی کہیں سے دھول بھری ہواؤں کا گزر ہوتا ہے تو پھر ان سیڑھیوں پر گرد کی اتنی دبیز تہہ کہاں سے آ گئی، شاید یہ اس کی چھت کی بوسیدگی میں سے کبھی کبھار ایک پھوار کی صورت گرتی ہے.. یا پھر یہ زمانوں کی راکھ ہے جو ان سیڑھیوں پر تہہ در تہہ اترتی اور بجھتی چلی گئی..

''انکل، ذرا احتیاط سے..'' حیات نے دیکھا کہ سیڑھیاں اترتے ہوئے مجھے دیوار کو تھامنا پڑتا

ہے..میں بہت احتیاط سے قدم دھرتا تھا..میری چال میں توازن باقی نہ رہا تھا اور مجھے اس خلل سے کچھ شکایت بھی نہ تھی کہ ستتر برس کی عمر میں بھی، میں اگر سیڑھیاں چڑھتا اور اترتا تھا اور سنبھل جاتا تھا تو یہ شکایت کا نہیں شکر کا مقام تھا..

''میں بھی ایک مدت کے بعد تہہ خانے میں اترا ہوں، یہاں کوئی نہیں آتا..پچھلے دنوں اس کی چھت کا کچھ حصہ مسمار ہو گیا تھا جسے سہارنے کے لیے شہتیر آویزاں کیے گئے تھے، ان شہتیروں پر ہاتھ نہ رکھئے گا..ذرا احتیاط سے..''

ہم ایک اندھیارے جہان میں اندھے تھے جو ٹٹول ٹٹول کر چلتے تھے..پھر کسی نے اپنے موبائل کی ٹارچ روشن کر دی، ایک جگنو راہ دکھانے لگا..جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ بیج ناتھ میں..اس دوران حیات نے کچھ تاریں جوڑ کر تہہ خانے کی چھت سے لٹکتا ایک بلب جلا دیا اور وہ زیر زمین متروک شدہ جہان اُس کی مدھم روشنی میں لرزتا ایک بھُوری ہو چکی پرانی تصویر کی مانند دکھائی دینے لگا..

اور اس تصویر کے بیان میں مجھے جان بوجھ کر کچھ مبالغہ کرنا ہے...جیسے استنبول کے سلطان احمد چوک کے ایک پرانے پھاٹک میں سے آپ زیر زمین موجود بازنطائن عہد کے ایک وسیع آبی ذخیرے تک اترتے ہیں تو دنگ رہ جاتے ہیں..تاحد نظر پانیوں کا ایک ذخیرہ ہے جس میں قدیم ستون ایک حیرت میں بلند ہوتے ہیں، اُن کی بنیادیں پانی میں ڈوبی ہوئی ہیں اور وہ پرانی چھت تک چلے جاتے ہیں اور پھر آپ ایک کشتی میں سوار ہو کر ہنستے بستے آباد پُرشور شہر کے عین نیچے روپوش اور خاموش اس آبی ذخیرے کی نیم تاریکی کے اندر تک چلے جاتے ہیں..

حویلی بیج ناتھ کے تہہ خانے میں جو منظر ہمارے سامنے نیم تاریکی میں کھلا اُس میں ستونوں کی بجائے درجنوں محرابیں تھیں جو اپنی دبیز دیواروں سے اس کی چھت کو سہارے ہوئے تھیں..ایک خنک فراموش کردہ موسم تہہ خانے کے اندر جانے کب سے ٹھہرا ہوا تھا..البتہ محرابوں کے پاؤں میں پانیوں کی پائل نہ تھی، کاٹھ کباڑ، شکستہ اینٹیں، چارپائیاں اور کچھ شکستہ مٹکے پڑے تھے..ہم ان گھڑوں پر پاؤں دھرنے سے گریز کرتے تھے اور یہ گھڑے چھت سے برسے تھے..تہہ خانے کی چھت کا بیشتر حصہ اگرچہ کسی حد تک شکستہ تو تھا پر قائم تھا البتہ جہاں سیڑھیوں کا اختتام ہوتا تھا اُن کے اوپر کچھ حصّہ مسمار ہو چکا تھا جسے سہارا دینے کی خاطر شہتیر آویزاں کیے گئے تھے..آپ اوپر نگاہ کرتے تھے تو مسمار شدہ چھت میں درجنوں کی تعداد میں ایک دوسرے میں پیوست گھڑے منہ کھولے آپ کو دیکھتے نظر آتے تھے.. پرانی رہائش گاہوں کو شدید موسموں سے محفوظ رکھنے کی خاطر ان کی چھتوں میں گھڑے یا مٹکے اگرچہ مختصر جسامت کے اور انہیں آپ مٹکیاں بھی کہہ سکتے ہیں نصب کیے جاتے تھے اور یہ قدیم ٹیکنیک ان دنوں بھی مستعمل اور کارآمد ہے..میرا بیٹا سُمیر چونکہ بنیادی طور پر

ایک ماہر آرکی ٹیکٹ بھی ہے تو اُس نے جب ہمارا موجودہ ڈیفنس والا گھر تعمیر کیا تو اس کی چھتوں میں بھی گھڑوں کی ایک تہہ بچھائی..

فرش پر بکھرے گھڑے اسی مسمار شدہ چھت سے کبھی کبھار گرتے تھے اور ہم سنبھل کر پاؤں رکھتے تھے..کہ ان گھڑوں میں ہماری بہت سی لوک شاعری اور سوہنی کے ارمان پوشیدہ تھے..

ے سوہنی گھڑے نُوں آ کھدی..اَج مینوں پار لنگھا گھڑیا
ے جاوے کچے گھڑیا تیرا کی اعتبار
تُوں عشق سمندر کی جانیں، توں دولہراں دی مار

اور پھر میاں محمد صاحب کا وہ شعر جو تصوف کے دیوانوں پر بھاری ہے..

ے لوئے لوئے بھر لے کُڑیے جے تُدھ بھانڈا بھرناں
شام پئی بن شام محمد گھر جاندی نیں ڈرناں

اور شام کون ہے، رادھے شام والا شام ایک الوہی محبوب..

اس تہہ خانے کے آخری کونے کے پہلو میں ایک محراب کے اندر اندھیرے میں گم ایک مختصر سا کسی بھی روزن یا روشندان کے بغیر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا..اور وہاں میرے موبائل کی روشنی کا ایک ٹمٹماتا جگنو جب ٹمٹمایا تو میں نے دیکھا کہ وہاں ایک چار پائی بچھی ہے، ایک بستر ہے یعنی کوئی نہ کوئی یہاں تنہا رہائش رکھتا تھا، تو وہ کون تھا..اوپر حویلی میں درجنوں کمرے ویران پڑے تھے تو وہ کون ہے جو وہاں نہ سوتا تھا یہاں بسیرا کرتا تھا..

مجھے معاً ''قربت مرگ میں محبت'' کی تثلیث کا ایک کردار غلافی آنکھیں یاد آنے لگا اور وہ عورت اپنے ادھیڑ عمر محبوب سے اس خواہش کا اظہار کرتی ہے کہ میں چاہتی ہوں کہ تمہیں ایک کوٹھڑی میں بند کرلوں ایک ایسے شخص کی مانند جسے اغوا کیا گیا ہو اور صرف میں اُس کوٹھڑی کا قفل کھولوں کہ چابی میرے بلاؤز میں محفوظ ہوگی، تمہارے ساتھ ایک شب بسر کر کے صبح سویرے تمہیں پھر سے مقفّل کر کے واپس چلی جاؤں..شاید غلافی آنکھوں کے تصور میں کسی تہہ خانے کے نیم اندھیاروں میں اوجھل اسی نوعیت کی ایک کوٹھڑی تھی..

تہہ خانے میں موت ایسی ٹھنڈک اور مرگ خاموشی طاری تھی..جتنے بھی ستون تھے اُن کی گولائیوں کی تعمیر میں جو سفید پلستر کا حجاب تھا وہ امتداد زمانہ سے گر چکا تھا..اور ان میں پوشیدہ نانک شاہی اینٹیں ظاہر ہو گئی تھیں اور اُن کی درزوں میں سے نمک کے ذرّے گرتے تھے..وہاں اُن نیم تاریک ٹھنڈک کے متروک شدہ موسموں میں سانس لیتے ہوئے وہ ذرّے حلق میں اترتے تھے کہ یہ نمک عشق کا تھا..ذرا سی آہٹ بھی چونکا دیتی

تھی.. کیا میرے آس پاس چھت میں سے جھانکنے والا ایک اور مٹکا اپنے قدیم مسکن سے بچھڑ کر میرے قدموں میں آ گرا اور چُور ہوا.. اور اگر چُور ہوا، ٹوٹ گیا تو کیا غم.. یہ تو جام سفال ہے جام جم تو نہیں.. اور لے آئیں گے بازار سے اگر ٹوٹ گیا.. صدیوں پرانی خستگی کے جام سفال اگر ٹوٹ گئے تو کیا غم.. لیکن کیا بازار میں اتنی تعداد میں جام سفال برائے فروخت مل جائیں گے..

ہم نے ایک پوری سویر حویلی بیج ناتھ کی نذر کی اور جب اس کی گھسی ہوئی چوکھٹ سے باہر پھولوں والی گلی میں قدم رکھا تو ہمارے پیچھے پیچھے ایک فریب چلا آیا... ایک گمان کانوں میں اترا.. حویلی بیج ناتھ کے صحن میں صدیوں سے خشک پڑے فوارّے پھر سے رواں ہو گئے ہیں، آبشاری تختے پر پانی رم جھم رم جھم کرتے اٹک اٹک کر اترنے لگے ہیں.. اور اُن پانیوں کی ہر بوند میں اُس حویلی کے طاقچوں، محرابوں اور روزنوں میں جتنے بھی بجھ چکے چراغ تھے وہ جل اٹھے ہیں اور اُن میں عکس ہوتے روشن ہو رہے ہیں.. قدیم محرابوں کے چوکھٹوں میں نقش جتنی بھی تصویریں مٹا دی گئی تھیں یا مٹ چکی تھیں وہ سب یوں ظاہر ہونے لگی ہیں جیسے ابھی ابھی مصور نے اُنہیں چونے کے کینوس پر پینٹ کیا ہو، اُن کو چھو کر نہیں دیکھنا کہ اُن کے رنگ ابھی گیلے ہیں، تمہارے پپوٹوں پر چپک جائیں گی.. اور وہ جو اپنی تصویری قید سے پھڑ پھڑا کر آزاد ہو گئے.. ہمارے ساتھ چلے آتے ہیں، میرے ایک کاندھے پر وہ ہریل طوطا آ کر بیٹھ گیا ہے اور اُس کے کچّے سبز رنگ میرے کاندھے میں سرایت کرتے میرے دل تک پہنچتے ہیں اُسے ہرا بھرا اور سرسبز کرتے ہیں اور میرے دوسرے کاندھے پر وہ دو سفید لکے کبوتر آبراجمان ہوئے ہیں..

کبوتری اپنی سفید دُم کی جھالر پھیلائے ایک رُوسی بیلے رینا کی مانند رقص کرتی غٹرغوں کرتی کہتی ہے کہ.. پھر کب آؤ گے!



Rs. 1400.00

www.sangemeel.com

